

تفسیر منظر ہری

تالیف
حضرت علامہ قاضی محمد شمس الدین عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع تصدیق تعلقات
مولانا سید عبد الہی اکرم الجلالی

دارالاشاعت
لاہور پاکستان

1981ء
1982ء

تفسیر مطہری

جلد ہشتم

سورۃ ہود سے سورۃ نحل تک
پارہ ۱۲ تا پارہ ۱۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد شہار اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبد الدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دارالانشاعت

اردو بازار کراچی ۱ — فون ۲۱۳۷۸

کاپی رائٹ رجسٹریشن نمبر
اس ترجمہ و کمپوزنگ کے حقوق ملکیت پاکستان میں حق دار الاشاعت کراچی محفوظ ہیں۔

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دار الاشاعت کراچی
طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات در ۶ جلد

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارۃ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ المدادیہ فی ملی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26۔ ناٹھ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔ چیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

فہرستِ عنوانات

تفسیر مظہری (اردو)

جلد ششم

”سورہ ہود“

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۲۳	(۱۵) اللہ مؤمن کو اپنے قریب کریگا، اپنی پناہ میں لے گا، اسکا پردہ رکھے گا اور فرمائے گا، تجھے اپنا فلاں گناہ معلوم ہے۔ حدیث۔	۱۲	(۱) ہر شخص کی تقدیر، عمر، عمل، رزق وغیرہ۔
۲۳	(۱۶) اعضاء بدن، اوقات اور مقامات وغیرہ شہادت دینگے۔ حدیث۔	۱۳	(۲) اللہ کا عرش پانی پر تھا۔
۲۴	(۱۷) حضرت نوحؑ کا قصہ۔	۱۴	(۳) آسمان، زمین اور ان کی درمیانی کائنات کی پیدائش رسول اللہ ﷺ اور مؤمنوں کے لئے ہوئی ہے۔
۲۸	(۱۸) کشتی نوحؑ کا بیان۔	۱۵	(۴) مؤمن کیلئے ہر صورت میں بھلائی ہوتی ہے۔ حدیث
۳۰	(۱۹) تنور کا تذکرہ۔	۱۶	(۵) کوئی کسی پر فخر اور زیادتی نہ کرے۔ حدیث
۳۱	(۲۰) کشتی میں تمام جانوروں کے جوڑے رکھنے کا حکم	۱۷	(۶) آیت فَاَتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ اِیْکَ شَبْہِہٖ اِسْرٰہٖ
۳۱	(۲۱) آیت اَلَا مِّنۡ سَبۡقِ عَلَیۡہِ الْقَوَلِۙ کَا مَصۡدَاقِ یٰوۡسٰی اَوۡرِیۡۙ بَیۡنَا کُنَعَانَہِیۡۙ	۱۸	ازالہ۔
۳۱	(۲۲) کشتی میں کتنے لوگ سوار تھے۔	۱۹	(۷) کافروں کو دنیا میں ہی ان کی نیکیوں کا ثواب دیدیا جاتا ہے۔
۳۲	(۲۳) حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والوں کی تعداد کیا تھی؟	۲۰	(۸) دکھاوٹ کا عمل شرک ہے۔ حدیث
۳۲	(۲۴) شیطان کا نوحؑ کی کشتی میں گدھے کی دم پکڑ کر سوار ہونے کی کوشش کرنا۔	۲۱	(۹) آخرت کا طلبگار، دنیا کا طلبگار، دونوں کا فرق، حدیث
۳۲	(۲۵) حضرت نوحؑ علیہ السلام کی درخواست اِنَّ اَبْنِیۡۙ	۲۱	(۱۰) حدیث اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ النَّاسَ یَوْمَ الْقِیۡمَةِ۔
۳۵	(۲۶) آیت وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَہُمُ الْبَاقِیۡنَ پَر اِیْکَ شَبْہِہٖ اِسْرٰہٖ	۲۱	(۱۱) آیت نُوْفِ اِلَیْہِمۡۙ اَعۡمَالُہُمۡۙ اَوۡرِیۡۙ حَدِیۡثِ لَا یَاۡتِیۡہِۙ مِّنْہَاۙ اِلَّا مَا کُتِبَ لَہٗ فِیۡ تَضَادِ کَاشِبِہٖ۔
	اس کا ازالہ۔		(۱۲) اِزَالۡہٗ شَبْہِہٖ۔
			(۱۳) حضرت علیؑ باسب علم تھے اور معرفت کے قطب۔
			(۱۴) جو شخص بھی ﷺ (کی رسالت) کا ذکر سن لے اور ایمان نہ لائے وہ کافر ہے۔

۵۹	آئے گا جبکہ دوزخ کے اندر کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اس قول کی تشریح۔	۳۶	(۲۷) حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ۔
۶۰	(۳۲) دوزخ کے اندر کافروں کا ہمیشہ رہنا بالاجماع ثابت ہے، اس مسئلہ کی متعدد احادیث۔	۳۹	(۲۸) اسلام تمام سابق گناہوں کو ڈھادیتا ہے۔ حدیث (۲۹) قوم عاد بھی قوم ہود سے ہے۔
۶۱	(۳۳) آیت اَلَا مَآ شَاءَ رَبُّكَ کی تشریح میں اہل تفسیر کے اقوال۔	۴۱	قوم ثمود کا ذکر
۶۲	(۳۴) دوزخ نے (اپنی شدت کی) رب سے شکایت کی اللہ نے اس کو (ہر سال) دو مرتبہ دم لینے کی اجازت دیدی۔ حدیث۔	۴۳	(۳۰) حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ۔
۶۳	(۳۵) گناہ گار اہل ایمان کا دوزخ میں داخل ہونا اور نکلنا۔	۴۴	(۳۱) قوم لوط کو ہلاک کرنے کیلئے آنے والے فرشتوں کا سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آنا اور حضرت اسحاقؑ و حضرت یعقوبؑ کے پیدا ہونے کی قبل از وقت بشارت دینا۔
۶۴	(۳۶) آیت فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ کی تشریح پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔	۴۵	(۳۲) حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے تعجب پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔
۶۵	(۳۷) اہل جنت کو بعض اوقات ایسی نعمت سے بھی سرفراز کیا جائے گا جو جنت سے بھی اعلیٰ ہوگی، یعنی اللہ کا دیدار۔	۴۶	(۳۳) فرشتوں کا حضرت لوطؑ کے پاس پہنچنا۔
۶۶	(۳۸) اَلْمَنْتُ بِاللّٰهِ کو پھر اس پر استقامت رکھو۔ حدیث (۳۹) دین آسان ہے جو دین میں شدت اختیار کرے گا آخر مغلوب ہوگا شدت پر قائم نہ رہ سکے گا۔	۴۷	(۳۴) آیت قَالَ يَقَوْمِ هَوْلًا بِنَاتِي الْخِمْ تفسیر۔
۶۷	(۵۰) دین آسان ہے اس میں جو شدت اختیار کرے گا تھک جائے گا۔	۴۸	(۳۵) اللہ رحمت کرے میرے بھائی لوطؑ پر انہوں نے کسی مضبوط سہارے کی طرف رجوع کرنے کا اظہار کیا تھا۔ حدیث
۶۸	(۵۱) ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی موجب عذاب ہے، کامل جھکاؤ کا تو ذکر ہی کیا ہے، اور خود ظلم کرنا اور ظلم کرنے میں منہمک ہونا تو بدترین چیز ہے، ناقابل بیان۔ ظالم کی صحبت اختیار کرنے اور اس کو مدد پہنچانے کا بیان۔	۵۰	حضرت شعیبؑ کا قصہ
۶۹	(۵۲) ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھنے کا معنی اور اس کے متعلق فقہاء کے اقوال۔	۵۱	(۳۶) مسئلہ: اگر ناپ تول کر کوئی چیز خریدے تو جب تک دوبارہ خود اس کو وزن و کیل نہ کر لے نہ اس کو فروخت کر سکتا ہے نہ کھا سکتا ہے۔
۷۰	(۵۳) نیکیوں سے پانچوں نمازوں سے اور رمضان کے روزوں سے گناہوں کا اتار ہو جاتا ہے۔	۵۲	(۳۷) جب تک دو مرتبہ غلہ کو پیانہ سے نہ ناپ لیا جائے (ایک بار بائع دینے کے لئے اور ایک بار مشتری لینے کیلئے) اس وقت تک (اس میں تصرف کرنے کی) رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔ حدیث
۷۱	(۵۴) مسئلہ: امر ارادہ سے جدا ہے جس چیز کے ہونے کی اللہ کی مشیت ہو اس کا ہونا لازم ہے۔	۵۳	(۳۸) جھکتا ہوا تول کر دو۔ حدیث
۷۲	(۵۵) رسول اللہ ﷺ نے چند لکیریں کھینچ کر فرمایا۔ حدیث	۵۴	حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ
۷۳	(۵۶) سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ حدیث	۵۵	(۳۹) اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے جب پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔
		۵۶	(۴۰) جو روح بھی پیدا ہوئی ہے اسکی جگہ جنت یا دوزخ میں پہلے سے لکھ دی گئی ہے۔
		۵۹	(۴۱) حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ ایک وقت ایسا بھی

سورہ یوسف

۱۲۵	اپنے باپ کو خبر کیوں نہ دی، شبہ اور اس کا ازالہ۔	۵۷	(۵۷) کریم بن کریم کون تھا؟۔ حدیث
۱۲۶	(۷۰) حضرت یعقوبؑ کا دل باوجود پیغمبر اور عارفِ کامل ہونے کے حضرت یوسفؑ کے ساتھ کیوں وابستہ تھا۔	۵۸	(۵۸) خواب کی حقیقت اور اقسام، اس کے متعلق متعدد احادیث
۱۲۷	(۷۱) دنیا ملعون ہے۔ حدیث	۵۹	(۵۹) آیت هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَآ كِی تفسیر۔
۱۲۸	(۷۲) کسی بڑے شخص نے ایک مکان تعمیر کرایا اور اس میں کھانا چنوا یا اور سب لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ حدیث	۶۰	(۶۰) ہمہ (ارادہ) دو طرح کا ہوتا ہے۔
۱۲۹	(۷۳) جنت کی مٹی خوشبودار اور پاکیزہ ہے۔ وہاں کاپانی شیریں ہے، وہاں میدان بھی ہیں۔ جنت کے درخت سبحان اللہ وغیرہ۔	۶۱	(۶۱) اگر نادان و جاہل کسی عالم کا علمی مرتبہ نہ جانتے ہوں تو اپنا علمی درجہ پہنچانے کیلئے عالم اپنا علمی پایہ بیان کر سکتا ہے، یہ اپنی پاکدامنی پر غرور نہ ہو گا اولیاء اللہ نے جو کبھی کبھی اپنے فضائل کا اظہار کیا ہے نادان ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔
۱۳۰	(۷۴) ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔	۶۲	(۶۲) اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحمت نازل فرمائے اگر وہ جیل سے رہا ہونے والے ساتھی سے یہ نہ فرماتے کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کر دینا تو اتنی مدت تک قید خانہ میں نہ رہتے۔ حدیث
۱۳۱	(۷۵) حضرت مجددؑ کی تحقیق پر دو شبہات۔	۶۳	(۶۳) مسئلہ: موقعِ تمت سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہئے، خصوصاً اگر آدمی قوم کا مقتدا اور پیشوا ہو تب تو احتیاط رکھنی اور بھی ضروری ہے۔
۱۳۲	(۷۶) شبہ کا ازالہ۔	۶۴	(۶۴) حضرت یوسفؑ کے صبر کی تعریف۔ رسول اللہ ﷺ مرتبہ نزول میں کامل تھے۔
۱۳۳	(۷۷) دوسرا شبہ اور اس کا ازالہ۔	۶۵	(۶۵) مسئلہ: تقریرِ قضاء و حکومت کی درخواست اور اپنی اہلیت کا اظہار جائز ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس درخواست گزار کا ہم پلہ موجود ہی نہ ہو تو اللہ کے احکام جاری کرنے اور محکمہ قضاء کو معطلی سے بچانے کیلئے کبھی طلبِ قضاء مستحب ہو جاتی ہے اور کبھی واجب۔
۱۳۴	(۷۸) رسول اللہ ﷺ کے حسن و جمال کا بیان اور حضرت یوسفؑ کے حسن کا تذکرہ۔	۶۶	(۶۶) بادشاہ اور حاکمِ اعلیٰ کافر ہو یا فاسق بہر حال اس کی طرف سے اقامتِ حق کیلئے قاضی اور حاکم بنا اور اس عہدہ کو قبول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اقامتِ حق کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔
۱۳۵	(۷۹) اگر کسی کے دل میں باپ اور اولاد کی محبت سے زیادہ میری محبت نہ ہو تو وہ مؤمن نہیں ہو سکتا۔ حدیث	۶۷	(۶۷) نظر لگنا حق ہے۔ حدیث
۱۳۶	(۸۰) تین باتیں ہیں۔ جس کے اندر یہ تینوں باتیں ہوں گی اس کو ایمان کا مزہ آئے گا۔	۶۸	(۶۸) احتیاطِ تقدیر کو نہیں ٹال سکتی۔ حدیث
۱۳۷	(۸۱) مصیبت کے وقت رونا اور افسوس کرنا جائز ہے، رسول اللہ ﷺ اپنے صاحب زادے حضرت ابراہیم اور اپنے نواسے کی وفات پر رو دیئے تھے۔	۶۹	(۶۹) ایک شبہ: حضرت یوسفؑ نے اپنی موجودگی سے
۱۳۸	(۸۲) ہمارا رب ہر رات کو آسمان سے دنیا کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے۔ حدیث		
۱۳۹	(۸۳) وفات کے وقت رسول اللہ ﷺ نے آیت مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ الخ پڑھی تھی۔		
۱۴۰	(۸۴) دو آدمیوں نے خرید و فروخت کے لئے کپڑا پھیلا یا ہو گا، ابھی وہ خرید و فروخت نہ کر پائے ہوں گے اور نہ کپڑے کو تہہ کر سکے ہوں گے کہ اچانک قیامت پھا ہو جائے گا۔ حدیث		
۱۴۱	سورہ رعد		
۱۴۲	(۸۵) ہر شخص کا چچا، اسکے باپ کا ہمزاد (دو شاخہ) ہوتا ہے۔		
۱۴۳	(۸۶) مسئلہ: حمل کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کا		

۱۸۲	(۱۰۶) بعض لوگوں کے سامنے قیامت کے دن ان کے چھوٹے گناہ لائے جائیں گے اور ان کے کبیرہ گناہ پوشیدہ رکھ لئے جائیں گے، پھر ہر بدی کے عوض اس کو نیکی دی جائے گی۔	۱۵۳	بیان۔ (۸۷) مسئلہ: ایک بطن میں زیادہ سے زیادہ کتنی تعداد ہوتی ہے۔
۱۸۳	(۱۰۷) لوح محفوظ کا بیان اور اس لوح کا ذکر جس کے کچھ مندرجات کو مٹا دیا جاتا ہے اور کچھ تحریروں کو قائم رکھا جاتا ہے۔	۱۵۴	(۸۸) مسئلہ: ایک جھلی میں زیادہ سے زیادہ کتنے بچے ہو سکتے ہیں۔
۱۸۵	سورہ ابراہیم	۱۵۵	(۸۹) رات اور دن کے اعمال لکھنے والے فرشتوں کا تبادلہ حدیث۔
۱۸۶	(۱۰۸) لوگ خیر و شر میں قریش کے پیرو ہیں۔ حدیث	۱۵۸	(۹۰) رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں پر مامور ہے۔
۱۸۷	(۱۰۹) جس نے کوئی نیک طریقہ جاری کیا یا برا طریقہ جاری کیا۔ حدیث	۱۵۹	(۹۱) گرج سننے کے وقت کیا کہا جائے۔
۱۸۸	(۱۱۰) اے اہل مدینہ علم میں لوگ تمہارے پیرو ہیں۔ حدیث	۱۶۰	(۹۲) اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر میرے بندے میرے احکام پر چلتے تو میں رات کو ان پر مینہ برساتا، دن کو سورج نکالتا اور گرج کی آواز بھی نہ سناتا۔ حدیث
۱۸۹	(۱۱۱) گھر والوں کے لئے سر پرست ایسا ہے جیسا امت کے لئے اس کا نبی۔ حدیث	۱۶۱	(۹۳) لہ دعوة الحق سے کیا مراد ہے ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔
۱۹۰	(۱۱۲) علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ حدیث	۱۶۲	(۹۴) صلہ رحمی کا حکم۔ احادیث
۱۹۱	(۱۱۳) لوگ تمہارے پیرو ہیں۔ حدیث	۱۶۳	(۹۵) گناہ کرو تو اس کے بعد نیکی بھی کر لو۔ نیکی بدی کو مٹا دے گی۔
۱۹۲	(۱۱۴) صابر اور شکر گزار ہونا مؤمن کا عنوان ہے۔	۱۶۴	(۹۶) گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کر لو۔
۱۹۳	(۱۱۵) صبر و شکر کے متعلق احادیث۔	۱۶۵	(۹۷) میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے میل جول رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ حدیث
۱۹۴	(۱۱۶) تسبیح، تحمید اور تہلیل کی فضیلت کا بیان۔	۱۶۶	(۹۸) ایک شبہ۔
۱۹۵	(۱۱۷) کلمہ طیبہ کی تفسیر۔	۱۶۷	(۹۹) شبہ کا حل۔
۱۹۶	(۱۱۸) شجرہ طیبہ (پاکیزہ درخت) کھجور کا درخت ہے۔ حدیث	۱۶۸	(۱۰۰) جنت کے اندر ملائکہ (اللہ کی طرف سے) مؤمنوں کے پاس تحفے اور سلام کے ساتھ پہنچیں گے۔
۱۹۷	(۱۱۹) ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے یہ مؤمن کی مثال ہے۔ حدیث	۱۶۹	(۱۰۱) ظلم اور قطع رحم کا بیان۔
۱۹۸	(۱۲۰) جس نے سبحان اللہ العظیم کہا اس کے لئے جنت کے اندر کھجور کا ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔	۱۷۰	(۱۰۲) جس دل میں خوف و امید دونوں ساتھ ساتھ جمع ہوں گے اللہ اس کو وہی عطا فرمائے گا جس کا وہ امیدوار ہو گا اور اس عذاب سے محفوظ رکھے گا جس سے اس کو خوف ہو گا۔ حدیث
۱۹۹	(۱۲۱) قبر کے اندر منکر نکیر کا سوال، اور قبر کا عذاب و ثواب۔ احادیث	۱۷۱	(۱۰۳) طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔
۲۰۰	(۱۲۲) تقدیر پر ایمان لانے کا حکم۔ حدیث	۱۷۲	(۱۰۴) قضاء مبرم و معلق کی بحث اور اس سلسلہ کی احادیث
۲۰۱	(۱۲۳) بنی مغیرہ اور بنی امیہ کی مذمت حدیث میں اور یزید کا کافر ہونا۔	۱۷۳	(۱۰۵) ملا طاہر لاہوری مجددی کا قصہ۔
۲۰۲	(۱۲۴) اللہ نے جس روز آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا اسی	۱۷۴	

۲۳۲	(۱۳۹) اللہ نے سورہ حمّیں پیدا کی ہیں۔ حدیث	۲۰۶	روز اس شہر یعنی مکہ کو حرم بنا دیا تھا۔ حدیث
۲۳۸	(۱۴۰) سبع مثانی سے کیا مراد ہے کسی کے نزدیک سورہ فاتحہ مراد ہے اور کسی کے نزدیک سات سورتیں۔	۲۰۹	(۱۲۵) حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہ کا قصہ یکہ کو شہر بنانا اور دونوں حضرات کی اس جگہ سکونت۔
۲۳۹	(۱۴۱) اللہ نے مجھے توریت کی جگہ سبع طوال اور انجیل کی جگہ آلہ والی سورتیں طس والی سورتوں تک اور طس والی سورتوں سے حم والی سورتوں تک زبور کی جگہ عنایت کیس اور حم والی سورتیں اور مفصل سورتیں مزید مرحمت فرمائیں۔	۲۱۲	(۱۲۶) دعا ہی عبادت ہے۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔
۲۳۹	(۱۴۲) حدیث لیس مبتا من لم یتغن بالقرآن۔	۲۱۳	(۱۲۷) نمرود کا صندوق میں بیٹھ کر گدھوں کے بازوؤں پر سوار ہو کر اڑنا۔
۲۴۱	(۱۴۳) کسی فاجر کے عیش و آرام پر رشک نہ کرو۔ حدیث	۲۱۶	(۱۲۸) زمین و آسمان کا بدل جانا۔ حدیث
۲۴۱	(۱۴۴) اپنے سے نیچے والوں کو دیکھو اور والوں کو نہ دیکھو۔ حدیث	۲۱۷	(۱۲۹) میرے مکان اور میرے ممبر کے درمیان جنت کا ایک باغ ہے۔ حدیث
۲۴۱	(۱۴۵) قیامت کے دن کن امور کی باز پرس ہوگی۔ حدیث	۲۱۸	(۱۳۰) آدھے دن کی مدت میں تمام لوگوں کا حساب ہو جائے گا۔ حدیث
۲۴۵	(۱۴۶) رسول اللہ ﷺ پر اگر کوئی اچانک افتاد آجاتی تھی تو فوراً گھبرا کر نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ حدیث	۲۱۸	سورة الحجر
۲۴۶	(۱۴۷) میرے پاس یہ وحی نہیں آئی کہ مال جمع کرو اور تاجر بن جاؤ بلکہ یہ حکم آیا ہے کہ اللہ کی پاکی بیان کرو۔ حمد و ثناء کرو اور نماز پڑھنے والوں میں شامل ہو جاؤ۔ حدیث	۲۱۸	(۱۳۱) مومن گناہ گار جب دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے تو وہاں کافران کو عار دلائیں گے (کہ تم تو حق پرست تھے، پھر کیوں دوزخ میں داخل ہوئے) اس پر اللہ کو غصہ آئے گا اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو گا اس کو دوزخ سے نکالنے کا حکم دیدے گا۔ حدیث
۲۴۶	سورة النحل	۲۲۲	(۱۳۲) شیطان چوری چھپے (فرشتوں کی کچھ گفتگو) سن پاتے ہیں اور کافروں کے دل میں وہ بات لا کر ڈال دیتے ہیں۔ حدیث
۲۵۲	(۱۴۸) اگر کوئی پیشاب کرنے بیٹھے تو ہوا کی طرف پشت کر کے بیٹھے۔ حدیث	۲۲۳	(۱۳۳) اعیان ثابتہ اور عالم مثال کا قول کہاں سے اخذ کیا گیا، جب کبھی تیز ہوا چلتی تھی رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر دعا کرتے تھے، اے اللہ اس کو رحمت بنا دے۔ حدیث
۲۵۲	(۱۴۹) اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا، پھر مخلوق پر اپنے نور کا کچھ حصہ ڈال دیا۔ جس پر نور کا کچھ پر تو پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا۔ حدیث	۲۲۴	(۱۳۴) جو جس حالت پر مرے گا اللہ اسی حالت پر اس کو اٹھائے گا۔ حدیث
۲۵۵	(۱۵۰) جس میں ذرہ برابر غرور ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا اور جس میں ذرہ برابر ایمان ہو گا وہ دوزخ کے اندر داخل نہ ہوگا۔ حدیث	۲۲۵	(۱۳۵) روح علوی و روح سفلی کا بیان ارواح علوی پانچ ہیں، حدیث روح پھونکنے اور بدن میں سرایت کرنے کی تحقیق۔
۲۵۶	(۱۵۱) غرور و ایمان میں مقابلہ کی وجہ۔	۲۳۰	(۱۳۶) جہنم کے دروازوں کی تفصیل۔ حدیث
۲۵۶	(۱۵۲) صوفیاء کے اصطلاحی لفظ فنا کی تشریح۔	۲۳۱	(۱۳۷) جس نے مسلمانوں پر تلوار کھینچی، اس کا حکم وغیرہ رسول اللہ ﷺ جب تک تبارک الذی اور حم السجدہ نہ پڑھ لیتے تھے نہیں سوتے تھے۔
۲۵۶	(۱۵۳) جو ہدایت کی طرف بلائے گا اس کو ان سب لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا جو اس ہدایت پر چلیں گے۔ حدیث	۲۳۲	(۱۳۸) خوف و امید کے متعلق احادیث۔

۲۶۱	کیا گیا۔	۱۵۴) اللہ نے فرمایا میرے بندوں نے مجھے جھوٹا قرار دیا اور میری تکذیب اسکے لئے جائز نہ تھی اور میرے بندے نے مجھے گالی دی۔ حدیث
۲۹۳	(۱۷۰) مسائل: اکرہ (جبر) کی تعریف، اقسام اور احکام وغیرہ۔	۱۵۵) میں وہ چیز دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ بات سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ حدیث
۲۹۴	(۱۷۱) حضرت خبیثؓ کو کفر پر مجبور کیا گیا اور انکار کرنے پر آپ کو شہید کر دیا گیا۔	۱۵۶) آسمان چرچر لیا۔ حدیث
۲۹۵	(۱۷۲) میلہ کذاب نے دو مسلمانوں سے اپنی نبوت کا اقرار کرانا چاہا، ایک نے بطور تقیہ اقرار کر لیا اور دوسرے نے انکار کر دیا انکار کرنے والے کو میلہ نے شہید کر دیا۔	۱۵۷) خالق کی نافرمانی ہوتی ہو تو مخلوق کی اطاعت ناجائز ہے۔ حدیث
۲۹۶	(۱۷۳) مکڑہ کے تصرفات صحیح ہیں یا غلط، علماء کا اختلاف (۱۷۴) ایک شبہ اور ازالہ شبہ۔	۱۵۸) امر بالمعروف ترک کر دیا جاتا ہے تو عذاب نازل ہو جاتا ہے۔
۳۰۳	(۱۷۵) حضرت ابراہیمؑ کو دنیا میں خلعت عطا فرمائی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے خلعت کی طلب کی تو ایک ہزار سال کے بعد یہ دعا قبول ہوئی۔	۱۵۹) شہد کے شفاء ہونے کا تذکرہ۔ اور ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔
۳۰۴	(۱۷۶) فائدہ۔	۱۶۰) اللہ نے فرمایا جن و انس کا یہ بہت بڑا حادثہ ہے میں پیدا کرتا ہوں اور دوسروں کی پوجا کی جاتی ہے۔ حدیث
۳۰۵	(۱۷۷) اللہ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو جمعہ (عبادت کے لئے) عطا فرمایا لیکن انہوں نے انکار کر دیا، ایک نے ہفتہ کا دن اختیار کیا اور دوسرے نے اتوار کا۔ اس امت کو جب جمعہ کا حکم دیا گیا تو اس نے قبول کر لیا۔	۱۶۱) ایک شبہ جس کا وہم کیا جاسکتا تھا ازالہ شبہ۔
۳۰۶	(۱۷۸) حضرت حمزہؓ کو شہید اور مشلہ کرنے کا بیان۔	۱۶۲) جو دنیا سے محبت کرتا ہے وہ اپنی آخرت کا نقصان کرتا ہے اور جو آخرت کو چاہتا ہے وہ اپنی دنیا کا ضرر کرتا ہے۔ حدیث۔
۳۰۷	(۱۷۹) رسول اللہ ﷺ کا غم اور ارادہ انتقام اور کافروں کو مشلہ کرنے کا اظہار۔	۱۶۳) دنیا میں مؤمن کی زندگی پاکیزہ زندگی ہے۔ پاکیزہ زندگی ہونے کی تشریح۔
۳۰۸	(۱۸۰) فائدہ۔	۱۶۴) اللہ جنت والوں سے فرمائے گا کیا تم راضی ہو گئے؟ اللہ کی خوشنودی جنت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ حدیث۔ ایک شبہ۔ ازالہ شبہ۔
۳۰۸	(۱۸۱) مشلہ کرنے کی ممانعت۔	۱۶۵) تم سب سے اللہ کو زیادہ جاننے والا اور سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا میں ہوں۔ حدیث
۳۰۸		۱۶۶) مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ سراسر خیر ہے۔ حدیث
۳۰۸		۱۶۷) مسائل: قرأت سے پہلے اَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھنا۔ بعض کے نزدیک قرأت کے بعد پڑھنا۔ نماز کے اندر اَعُوذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کے متعلق علماء کا اختلاف۔ تعویذ کی کیفیت اور حقیقت..... فائدہ.....
۳۰۸		۱۶۸) مؤمن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔
۳۰۸		۱۶۹) حضرت عمارؓ اور آپ کے والدین کو جب کفر پر مجبور

اے اللہ!

تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، ہم تیری ثنا کرتے ہیں ہر عیب سے تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتے ہیں، تیری مدد کے خواستگار ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی کے طلبگار ہیں، تیرے شکر گزار ہیں، تجھ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کرتے ہیں ہم کو اپنے ان نیک بندوں میں شامل کر دے جن کو (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہو گا نہ غم یہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی ہمارا مالک ہے، آسمان وزمین کا مالک ہے اور زمین و آسمان کے اندر اور اوپر جو مخلوق ہے اس کا مالک ہے بلاشبہ ہر چیز تیرے قابو میں ہے، ہم دعاء رحمت کو سلامتی کرتے ہیں اپنے آقا اور مولے محمد ﷺ کے لیے جو تیرے رسول ﷺ اور حبیب تھے اور ساری مخلوق کے سردار تھے اور آپ ﷺ کی آل و اصحاب کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو آل و اصحاب کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں روز قیامت تک۔ اے ارحم الراحمین اپنی رحمت سے ہماری دعا قبول فرما۔

..... سورہ ہود ❁

اس سورت کی ۱۲۳ آیات ہیں سوائے آیت اقم الصلوٰۃ طرفی النهار الخ کے باقی پوری سورت مکی ہے۔

❁ بسم اللہ الرحمن الرحیم ❁

الذین کنتم احکمت ایتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر ﴿۱﴾
 الزیہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ ساتھ) صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں، یہ ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔
 احکمت یعنی اس کی آیات موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں ان کی ساخت پر داخت مضبوط ہے نہ اس کے الفاظ میں کوئی نقص ہے نہ معنی میں کوئی عیب۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات غیر منسوخ ہیں یہ مطلب اس وقت صحیح ہو گا جب آیات کتاب سے صرف اس سورت کی آیات مراد ہوں کیونکہ اس سورت کی کوئی آیت منسوخ نہیں (باقی قرآن میں بعض آیات منسوخ ہیں) یا مضبوط کرنے سے مراد ہے دلائل اور براہین سے پختہ کی ہوئی یا احکمت کا مطلب ہے پُر حکمت بنائی ہوئی یعنی علمی اور عملی حکمتیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں حکم ضمہ کے ساتھ حکیم ہو گیا فصلت یعنی جس طرح ہار کے درمیان جگہ جگہ ڈریکدانہ پروئے جاتے ہیں اسی طرح اس کی آیات الگ الگ کر دی گئی ہیں، کہیں اعتقادات، کہیں عملی احکام، کہیں مواعظ، کہیں واقعات کی اطلاع یا فصل کر دینے سے مراد ہے الگ الگ سورتیں مقرر کر دینا یا تھوڑا تھوڑا (حسب ضرورت دنیا میں) بھیجنا مراد ہے یا یہ مطلب ہے کہ جن امور کی (اصلاح بشری کے لیے) ضرورت تھی ان کو بطور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔
 من لدن اس کا تعلق وصفی یا کتاب سے ہے یا دوسری خبر ہے یا احکمت سے تعلق ہے یا فصلت سے مطلب یہ ہے کہ اللہ ظاہر اور باطن سے واقف اور باخبر ہے اسی کی طرف سے ان آیات کا یا کتاب کا نزول ہے اور اسی نے اس کی آیات کو محکم بنایا ہے۔

الَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿۲﴾
 کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو میں اس کی طرف سے (ایمان نہ لانے والوں کو عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان دار نیکو کاروں کو نجات و ثواب کی) خوش خبری دینے والا ہوں۔

یعنی شرک کے عذاب سے ڈرانے والا اور توحید کے ثواب کی بشارت دینے والا ہوں۔
 وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ
 اور یہ بھی کہ تم (کفر و معصیت کی) اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف (ایمان و اطاعت کے ساتھ) لوٹو،

یعنی پچھلے گناہوں کی اپنے رب سے معافی چاہو اور آئندہ طاعت کے ساتھ اس کے طرف رجوع کرو۔ فراء نے کہا تم اس جگہ (ترتیب اور تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) واو کے معنی میں ہے (یعنی مطلق عطف کے لیے ہے) اور استغفار کے معنی ہیں توبہ کرنا (معطوف اور معطوف علیہ میں اس جگہ مغایرت نہیں ہے) یعنی ایک کا معنی دوسرے کے معنی کو لازم ہے (مطلب یہ کہ دونوں میں اتحاد التزامی ہے اگرچہ ذاتی افتراق ہے)۔

وَيَسْتَعِمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى
 وہ تم کو اچھی (خوشگوار پُرامن، فراخ حال) زندگی عطا فرمائے گا، مرتے دم تک۔

گناہوں سے مصائب اور بلائیں آتی ہیں، اللہ نے فرمایا ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ جو مصیبت تم پر آتی ہے اپنے کرتوت کی وجہ سے آئی ہے اور اللہ بہت سے جرائم سے تودر گذر فرمادیتا ہے (پھر بھی بعض گناہوں کی پاداش میں تم پر مصائب آتی جاتے ہیں) بعض علماء کا قول ہے متاع حسن سے مراد ہی قسمت خداوندی پر راضی رہنا اور تقدیر الہی پر صبر کرنا۔ چونکہ ہر شخص کی مدت زندگی مقرر ہے اور وقت موت معین ہے اس لئے اجل مسمی سے مراد ہے وقت موت۔

وَيُؤْتِي كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ
 اور وہ ہر فضیلت والے کو اس کی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا۔
 یعنی دینی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا، دنیا میں توفیق، اطمینان قلب، چین اور اللہ کی یاد کی لذت اور سعادت، آخرت کی خوشخبری اور آخرت میں ثواب کی کثرت اور مراتب قرب کی بلندی عطا فرمائے گا۔

وَأَن تَوَلَّوْا فَمَا فِي آخِافِكُمْ عَذَابٌ يَوْمَ كَيْدِكُمْ ﴿۳﴾
 اور اگر (اللہ کی عبادت اور توحید سے) روگرداں ہو گے تو مجھے تمہارے متعلق ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

بڑے دن سے مراد ہے قیامت کا دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی بلکہ وہ (عذاب کا دن) غیر محدود ہوگا (یعنی کافروں کے لیے عذاب غیر مختتم ہوگا اور مؤمنوں کیلئے ثواب لامتناہی)

إِلَىٰ اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ
 تمہارے تمام امور کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے۔ (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۴﴾
 اور وہ ہی ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

یعنی دنیا اور آخرت میں ہر جگہ سزا جزا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ یہ آیت سابق آیات کی تاکید اور تقریر ہے۔
 إِلَّا أَنَّهُمْ يَتَنَوَّنُونَ صِدْقًا وَرَهُمْ لِيَسْتَخَفُوا مِنْهُ
 یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کر دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا پیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ یعنی کچھ مسلمان خلوت میں بھی برہنہ ہونے اور کھلی جگہ میں عورتوں سے صحبتی قربت کرنے سے شرماتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے بھی بواسطہ محمد بن عباد بن جعفر حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن المنذر نے باسناد ابن ابی ملیحہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت إِلَّا أَنَّهُمْ يَتَنَوَّنُونَ

صَدُّوْهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنِّي پڑھ کر فرمایا کہ لوگ کپڑوں میں لپٹے لپٹائے دفع ضرورت اور عورتوں سے قربت کرتے تھے کھلی فضا میں برہنہ ہونا ان کو پسند نہ تھا۔

بغوی نے عبد اللہ بن شداد کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بعض منافقوں کے حق میں ہوا تھا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جب ان کا گذر ہوتا تھا تو وہ سینہ اور پشت کو حضور ﷺ کی طرف سے موڑ کر سر جھکا کر منہ چھپا کر نکل جاتے تھے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ان پر نہ پڑ جائے، ابن جریر وغیرہ نے بھی، عبد اللہ بن شداد بن ہاد کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ مگر یہ روایت قابل پزیرائی نہیں کیونکہ آیت تو مکی ہے اور منافق مدینہ میں (ہجرت کے بعد) پیدا ہوئے (مکہ میں کوئی منافق نہیں تھا) بہر حال اس روایت کے بموجب منہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہوگی (اللہ کی طرف راجع نہیں ہوگی)۔

بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت احسن بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش رو تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتا تھا تو وہی بات کہتا تھا جو حضور ﷺ کو پسند ہوتی تھی مگر دل میں اس کے خلاف پوشیدہ رکھتا تھا، اس وقت یَسْتَخْفُونَ صَدُّوْهُمْ سے مراد یہ ہوگی کہ وہ سینوں کے غلاف کے اندر کفر، کینہ اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی چھپائے رکھتے ہیں۔

قنادہ نے کہا وہ سینوں کو ٹیڑھا کرتے اور جھک لیتے تھے تاکہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا ذکر نہ سن پائیں۔

سدی نے کہا یَسْتَخْفُونَ كَالْفِظَانِ عِنَانِي کے محاورے سے بنایا گیا ہے (میں نے لگام موڑ لی) یعنی وہ اپنے دلوں سے اعراض کرتے ہیں (دلوں کا رخ موڑ لیتے ہیں) بعض روایات میں (ضعیف قول یہ بھی) آیا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوٹھڑی میں گھس کر دروازہ کا پردہ چھوڑ کر سینہ کو جھکا کر اور چادر اپنے بدن پر لپیٹ کر کہتے تھے کہ کیا اللہ اب بھی میرے دل کی بات جان سکتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خوب سن لو وہ لوگ جب اپنے
 اَلَا حِينَ يَسْتَخْفُونَ ثِيَابَهُمْ لَا يَعْلَمُ مَا يُسْتَرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ
 کپڑے اوڑھ لیتے ہیں یعنی سروں کو کپڑوں سے چھپا لیتے ہیں، تب بھی اللہ ان امور سے واقف ہوتا ہے جن کو وہ (دلوں کے اندر یا کسی اور طریقہ سے) چھپاتے ہیں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو وہ زبانوں سے ظاہر کرتے ہیں۔

یقیناً اللہ سینوں یا دلوں کے اندرونی رازوں کو خوب جانتا ہے۔ اور جب
 اِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ
 اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تو اپنے رسول اور مومنوں کو جن باتوں سے واقف کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے اور آئندہ جس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کر دے گا۔



..... بار ہواں پارہ شروع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

..... پارہ و مامن دابۃ (ہود)

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا
اور نہیں ہے زمین پر کوئی ریگنے والا جانور مگر اللہ ہی کے
ذمہ ہے اس کی روزی، کیونکہ اللہ نے اپنی رحمت اور مہربانی سے ہر جاندار کی پرورش کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔
عَلَى اللَّهِ (بذمہ خدا) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس امر کی طرف کہ رزق ضرور پہنچے گا، اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اہل
تفسیر نے لکھا ہے کہ علی اللہ میں علی بمعنی من یعنی وہ مقررہ رزق جو علم میں ہے اللہ کی طرف سے بندہ کو ملے گا اللہ اس کا
ذمہ دار ہے کسی دوسرے کی طرف سے نہیں مل سکتا۔ مجاہد نے کہا رزق سے مراد وہ رزق ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے بعض
اوقات اللہ رزق نہیں دیتا اور آدمی بھوکا مر جاتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا
اور وہ ہر ایک کی (مستقل) قیام گاہ اور (عارضی) قرار گاہ کو جانتا ہے۔
بنو نے ابن مقسم کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی آیا ہے کہ مستقر سے مراد
ہے وہ جگہ جہاں رات دن جاندار رہتا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر اسی جگہ آکر قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مراد ہے دفن
ہونے کی جگہ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد ماں کا پیٹ اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ سعید بن
جبیر، علی بن طلحہ اور عکرمہؓ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مستقر سے مراد جنت یا
دوزخ اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ حسنات مستقر جنت کے لیے اور سئات مستقر دوزخ کے لیے فرمایا ہے۔
کُلُّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ⑤ ہر ایک معنی ہر جاندار اور ہر جاندار کا حال اور رزق لکھا ہوا ہے۔ کھلی کتاب یعنی لوح محفوظ یا اعمال لکھنے والے فرشتوں
کے کتابچوں میں۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس
ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی قسمیں لکھ دی تھیں، حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ (اس وقت) اللہ کا تخت پانی پر تھا (رواہ
مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ اللہ کی سچے رسول ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے (ہر) ایک کا مادہ تخلیق ماں کے
پیٹ میں چالیس روز بصورتِ نطفہ جمع رہتا ہے، پھر اپنی ہی مدت میں بصورتِ علقہ (بستہ خون یا جونک) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت

(۱) دابۃ ریگنے والا جانور دبیب ریگنا۔ عموماً عرف عام میں دابۃ چوپایہ کو کہتے ہیں لیکن اس جگہ لغوی معنی مراد ہے یعنی ہر جاندار جو
زمین پر چل سکتا ہے خواہ کوئی کیرا ہو یا چوپایہ یا پرندہ یا آدمی۔
اہل سنت کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ اللہ پر کوئی عمل واجب نہیں، لیکن اللہ اگر اپنی رحمت سے خود کسی بات کا وعدہ فرمائے تو تکمیل وعدہ
واجب ہے جیسے نیکوں کا جنت میں داخلہ، مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے رحمت و مہربانی کا لفظ بڑھا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں بوٹی (بے جان لو تھرا) پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لیے مامور فرماتا ہے وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی مدت زندگی (یا وقت موت) اور اس کا رزق اور اس کا سعید یا شقی (نیک بخت مؤمن یا بد نصیب کافر) ہونا لکھ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) حضرت ابو درداءؓ کی روایت کے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ہر بندے کی پانچ باتیں لکھنے سے فارغ ہو چکا ہے۔ مدت زندگی، اعمال، مقام موت، آثار، رزق، رواہ احمد۔

گویا اس آیت میں اللہ کا عالم کل ہونا اور آئندہ آیت میں اللہ کا قادر مطلق ہونا توحید ثابت کرنے اور مندرجہ بالا وعدہ و وعید کو پختہ کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے (اس آیت سے اللہ کے علم کا ہمہ گیر ہونا اور اگلی آیت وهو الذی سے اللہ کی قدرت کا محیط کل ہونا ظاہر کیا جا رہا ہے تاکہ گذشتہ آیت میں جس توحید اور وعدہ و وعید کا ذکر کیا گیا تھا اس کا اثبات اور تقریر ہو جائے۔) **وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ** اور وہ اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو مع ان کی تمام موجودات کے چھ روز میں اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ آسمانوں سے مراد ہیں بالائی چیزیں اور زمین سے مراد نشیبی چیزیں، یعنی کائنات بالا و پست۔ آسمانوں کو بصیغہ جمع اور زمین کو بصیغہ واحد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائناتِ علویہ میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے جدا ہے اور ہر ایک دوسرے سے اصل کے اعتبار سے مختلف ہے اور کائناتِ سفلیہ کی اصل و ذات ایک ہے۔

وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ اور (آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے) اس کا تخت پانی پر تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ پانی ہو اکی پشت پر تھا، کعب احبار کا قول ہے کہ اللہ نے ایک یا قوت سبز پیدا کیا اور اس پر نظر جلال ڈالی تو وہ آب لرزاں بن گیا، پھر اللہ نے ہو ا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی کو قائم کیا) پھر عرش کو پانی پر قائم کیا۔ ضمیر ہ نے کہا اللہ کا تخت پانی پر تھا، پھر اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا پھر اس سے وہ تمام چیزیں لکھ دیں جو ہونے والی تھیں اور جن کو وہ آئندہ پیدا کرنے والا تھا اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہزار برس تک قلم نے اللہ کی تسبیح و تحمید کی تھی۔ حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور اس کا تخت پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور یادداشت (غالباً لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی (الحديث) عرش کے متعلق جو اخبار و احادیث آئی ہیں ان کا کچھ حصہ سورہ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کی ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

لِيَبْلُوَكُمْ فِيكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔ یعنی باوجود عالم کل ہونے کے پھر بھی جانچ کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے تاکہ تمہارا استحقاق ثواب و عذاب ظاہر ہو جائے کیونکہ آسمان و زمین اور ان کی موجودات تمہاری ہستی اور معاش کے اسباب و ذرائع اور اصول ہیں ان سے تمہارے تمام احوال و اعمال وابستہ ہیں ان کا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو پھر یہ ساری کائنات وجود صالح کی دلیل اور (توحید صالح کی) خصوصی نشانی ہے اس سے تم معرفت الہیہ حاصل کر سکتے ہو۔

لِيَبْلُوَكُمْ کا تعلق خلق سے ہے گویا اس لفظ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ سارے جہان اور موجودات جہان کی تخلیق بجائے خود مقصود نہیں بلکہ تخلیق انسان اور انسانوں میں بھی اہل ایمان کی تخلیق کی تمہید ہے اور مؤمنوں میں سے بھی ان لوگوں کی پیدائش کا تمہیدی مقدمہ ہے جن کے اعمال اچھے ہوں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ سے مشابہت رکھنے والے

۱۔ حضرت مفسر کی یہ تشریح فلسفہ مشائیہ کے طبعزاد مسئلہ پر مبنی ہے کہ ہر آسمان کا مادہ دوسرے آسمان کے مادہ سے جدا ہے رہی صورت جسمیہ اور نوعیہ وہ تو بہر حال الگ الگ ہی ہے اور تمام عناصر کا مادہ ایک ہے اور صورت جسمیہ بھی طبیعت نوعیہ ہے جس کا تحقق تمام عناصر میں برابر ہے۔ البتہ ہر عنصر کی صورت نوعیہ جدا جدا ہے، مگر یہ فلاسفہ کی خرافات ہے اسلامی تصریحات میں کسی جگہ اس کی تائید نہیں ملتی۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)

صالحین۔

أَحْسَنُ عَمَلًا فِي عَمَلٍ كَالْقَلْبِ عَقِيدَهُ أَوْ أَعْمَالَ أَعْضَاءِ جَسْمَانِي دُونِ كُشَاثِلِهِ۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ أَحْسَنُ عَمَلًا (سے مراد ہے) سب سے اچھی سمجھ والا ممنوعاتِ الہیہ سے سب سے زیادہ پرہیز رکھنے والا اور اوامر کی تعمیل میں تیزی کرنے والا۔ بلاشبہ سب سے اچھے اعمال دلوں کے اعمال (عقائد و میلانات) ہیں اور قلبی اعمال میں سے بھی سب سے اچھا عمل اللہ کی محبت اور اس کی یاد میں ڈوب جانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمان وزمین کو پیدا کرنے کا مقصدی لفظ اہل اللہ کا وجود ہے۔ لفظ احسن تعلیم دے رہا ہے اس بات کی کہ علم و عمل کے درجات پر زیادہ سے زیادہ چڑھنا چاہیے۔

وَلَكِنْ قُلْتُ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِسْحَاقٌ مُبِينٌ ﴿٥﴾
اور اگر آپ ان (مشرکوں) سے کہیں کہ مرنے کے بعد تم کو یقیناً اٹھنا ہوگا تو منکر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہذا یعنی مرنے کی بعد جی اٹھنا یا قیامت کا قول، یا یہ قرآن جس کے اندر قیامت کے آنے کا ذکر ہے، کھلا ہوا جادو ہے۔ ابن ابی حاتم نے قنادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا قیامت تو قریب آچکی (اس ڈر کی وجہ سے) کچھ لوگوں نے برے کام چھوڑ دیئے مگر کچھ ہی مدت بعد پھر بد کرداری میں مبتلا ہو گئے، اس پر آیت اَنْتِ اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوئی یہ سن کر کچھ لوگ کہنے لگے لو حکم خدا آ ہی پہنچا۔ یہ خیال کر کے ڈر کر گناہ چھوڑ دیئے مگر کچھ مدت کی بعد پھر اسی بد اعمالی کی طرف لوٹ گئے، تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے بحوالہ ابن جریج بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔

وَلَكِنْ اٰخِرًا عَنْهُمْ الْعَنَابُ اِلَى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَيَقُولَنَّ مَا يَجِبُ سَهْطًا
اور اگر کچھ مدت ہم ان سے عذاب کو ملتوی رکھتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ عذاب کو کون چیز روک رہی ہے۔ صاحب قاموس نے لفظ اُمَّة کی معانی میں سے ایک معنی وقت بھی لکھا ہے، بغوی نے اس کا ترجمہ اجل کیا ہے (یعنی میعاد) اصل میں امة جماعت کو کہتے ہیں یعنی ایک جماعت کے ختم ہونے اور دوسری جماعت کے پیدا ہونے تک، بیضاوی نے امة کا ترجمہ اوقات کا مجموعہ کیا ہے اور معدودة کا ترجمہ قلیل۔

اَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦﴾
یاد رکھو جس روز (مقررہ وقت پر) عذاب ان پر آپڑے گا تو پھر کسی کے ٹالنے نہ ٹلے گا اور جس (عذاب) کا مذاق بناتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا۔

یعنی وہ عذاب جو اللہ کے علم میں مقرر ہے جیسے جنگ بدر کا عذاب ان پر جس دن آجائے تو پھر اس کو نہیں لوٹایا جائے گا اور جس عذاب کا یہ مذاق بنایا کرتے تھے اور بطور استہزاء کہتے تھے کہ آیا کیوں نہیں، آنے سے کون مانع ہے فوراً آجائے وہ عذاب ان کو ہر طرف سے گھیرے گا (پھر بچاؤ کا ہر راستہ بند ہو جائے گا) چونکہ آئندہ عذاب کا آنا یقینی تھا اس لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا وہ آچکا اس میں تحقق وقوع کے لیے قوت کے ساتھ تمہید بھی ہے۔

وَلَكِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِتَارَ حِمَّةٍ ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَكُوْسُ كَفُوْرًا ﴿٧﴾
اور اگر ہم انسانوں کو (بلا استحقاق) اپنی طرف سے رحمت یعنی کسی نعمت (امن، صحت، دولت وغیرہ) کا مزہ چکھا دیتے ہیں پھر کچھ مدت کے بعد اس سے اپنی نعمت چھین لیتے ہیں تو وہ بالکل نرا اس اور ناشکر ہو جاتا ہے۔

الانسان (میں الف لام جنسی ہے) یعنی عام انسان۔ یئوس بالکل نرا اس، ناامید، نعمت کے زوال کی بعد چونکہ اس کو صبر

نہیں رہتا اور اللہ پر اس کا اعتماد نہیں ہوتا اور حکم خداوندی پر وہ رضامند نہیں ہوتا، اس لیے قطعاً حصول نعمت سے ناامید ہو جاتا ہے اور سابق اور موجود نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے، پچھلی نعمتوں کی بھی ناشکری کرنے لگتا ہے اور جو نعمتیں بالفعل اس کو حاصل ہوتی ہیں ہستی بقاء ہستی زندگی اور اس کے باقی رکھنے کے اسباب سب کو بھول جاتا ہے بالکل ناسپاس ہو جاتا ہے۔

وَلٰكِنْ اَذْقَنَهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتَهُ لِيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي ۗ اِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾

اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اس کو راحت کا مزہ چکھا دیتے ہیں (دکھ کے بعد کچھ سکھ دیتے ہیں) تو انسان کہتا ہے اب تو تمام مصیبتیں مجھ سے چلی گئیں (اللہ کی طرف مصائب دور کرنے کی نسبت نہیں کرتا بلکہ تقاضا نیچر کے زیر اثر مصائب کا خاتمہ سمجھتا ہے) یہ حقیقت ہے کہ وہ بڑا اترانے والا، شیخیاں مارنے والا ہو جاتا ہے۔

حصول مقصد سے دل میں جو لذت پیدا ہوتی ہے اس کو فرح (یا فرحت) کہتے ہیں فرح سے مراد ہے نعمت پر مغرور اترانے والا، خود بڑا شیخی باز جو اپنے کو نعمت کا حقدار قرار دیتے ہوئے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے اور یہی اکڑ اور غرور اس کو ادائے شکر سے روکتے ہیں۔

مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنہوں نے (مصائب پر) صبر رکھا اور

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

نیک کام کیے۔

یعنی اہل ایمان اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہیں وہ نہ اس اور ناشکرے نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے فضل کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کی سابقہ و موجودہ نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہیں نہ اتراتے اور اکڑتے ہیں نہ نعمت پا کر دوسروں پر اپنی بڑائی جتاتے ہیں۔ یہ خصوصیت اہل ایمان کی ہی ہے کہ دکھ میں صبر کرتے اور سکھ میں شکر ادا کرتے ہیں۔

حضرت صہیبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کی ہر بات اچھی ہے اور یہ خصوصیت صرف مؤمن ہی کی ہے اگر اس کو سکھ ملتا ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہو جاتا ہے۔ (راوی مسلم)

فراء کے نزدیک استثناء منقطع ہے اور الا کا معنی ہے "لیکن، اس صورت میں اِلَّا نَسَانَ (میں الف لام عہدی ہو گا اور اس) سے مراد ہو گا کافر انسان۔

یہ ہی لوگ ہیں جن کے لئے (اللہ کی طرف سے گناہوں کی)

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

مغفرت اور بڑا اجر ہے یعنی اللہ کی خوشنودی اور جنت۔

حضرت عیاض بن حمار اجمعی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تواضع کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے رواہ مسلم۔

سو شاید آپ (تنگ ہو کر) ان احکام میں سے چند جو وحی کے ذریعہ

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضُ مَا يُوحٰى اِلَيْكَ

سے آپ کے پاس بھیجے جاتے ہیں چھوڑ دینے والے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مشرکوں نے کہا تھا کوئی ایسا قرآن پیش کرو جس میں ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہا گیا ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس قول پر بعض مابووحی سے مراد ہو گی وہ وحی جس میں کافروں کے معبودوں کو برا کہا گیا ہو۔

(چونکہ آیت میں لفظ لعل آیا ہے جس کا معنی ہے شاید، توقع ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شان کے خلاف تھا کہ وہ کافروں کی رعایت سے وہ آیات بیان کرنا ترک کر دیتے جن کے اندر مشرکوں کے بتوں کو برا کہا گیا ہے پھر شاید اور توقع ہے کہنے کا کیا مکان تھا اس لیے) بیضاوی نے (اس شبہ کو دور کرنے کے لیے) لکھا ہے کہ کسی چیز کا سبب، داعی اگر موجود ہو تب بھی اس چیز کا وقوع ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ داعی ہونے کے باوجود کوئی مانع بھی موجود ہو جس کی وجہ سے اس شئی کا وقوع نہ ہو سکے۔ اس جگہ بھی یہی صورت ہے کہ گو ترک تبلیغ کی توقع کا سبب موجود ہے، لیکن رسول خیانت سے پاک ہوتا ہے وہ وحی میں خیانت

نہیں کر سکتا اور تبلیغ میں تقیہ رسول کی ذات سے ناممکن ہے، اسی لیے ترک تبلیغ کی توقع کا وقوع نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں بیناوی کی اس تقریر سے یہ شبہ دفع ہو گیا کہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کی توقع کا اظہار ہو تو اس چیز کا وقوع لازم ہے (کیونکہ اللہ کے لیے کسی حالت کا انتظار ناممکن اور دلیل عجز ہے اس کے لیے ہر منشاء کا وقوع بالفعل ضروری ہے۔)

وَصَاحِبِ بُرْجٍ يَخْتَلِعُ فِيهِ صِدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أَنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ
اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا، یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی کلام کرتا) کیوں نہیں آیا۔

یعنی آپ کو ان کے اس قول سے دلی تنگی ہوتی ہے کہ محمد ﷺ پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا کہ بادشاہوں کی طرح لوگوں کو اپنا تابع اور فرماں بردار بنانے میں خرچ کرتا یا اس کے ساتھ کوئی (محسوس) فرشتہ کیوں نہیں آیا جو اس کے تصدیق کرتا۔ حاصل یہ کہ ان کے اس قول سے آپ کبیدہ خاطر اور ملول ہوتے ہیں۔ عبد اللہ بن امیہ مخزومی نے یہ بات کہی تھی، آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ مشرک اللہ کی وحی کی کوئی قدر نہیں کرتے اس لیے آپ شاید وحی کے بعض حصوں کی تبلیغ ترک کر دیں مگر اللہ کے حکم کو ترک کرنے سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، ترک امر الہی موجب دل تنگی ہے اور تعمیل حکم سبب انشراح صدر اور ترک تبلیغ کا باعث یہ ہو کہ یہ لوگ آپ کے قول کی ہنسی اڑاتے ہیں آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ استہزاء کریں گے اور اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کو رد کر دیں گے اور ان کی اس بات سے آپ کو کبیدگی خاطر ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا اور تصدیق کرنے والا کوئی فرشتہ اس کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ لَئِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ

آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، آیات عذاب پیش کرنے والے ہیں وہ رد کر دیں نہ مانیں یا سوائے اس قرآن کے کسی دوسرے قرآن کے طلبگار ہوں آپ پر اس کا کوئی جرم عائد نہیں ہوتا پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کے استہزائیہ قول اور رد کر دینے کے خوف سے تبلیغ وحی ترک کر دیں یا ان کے اس قول سے کبیدہ خاطر ہوں۔

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۱۷﴾ اور اللہ ہر چیز کا نگران (اور فہم دار) ہے۔ اور ان کو ان کے قول کی سزا ضرور دے گا۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ
کیا کفار کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے قرآن خود اپنی طرف سے بنایا ہے آپ کہہ دیجئے (اگر یہ بات ہے) تو پھر تم بھی اس جیسی ہی دس سورتیں بنا کر پیش کرو۔

..... ایک شبہ

سورہ یونس میں آیا ہے۔ فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهِ۔ ایک سورت اس جیسی پیش کرو۔ مگر غیر مسلم ایک سورت بھی قرآن جیسی نہیں پیش کر سکے اب یہاں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی اس کے کیا معنی۔ جو شخص سائل کو ایک روپیہ دینے سے قاصر رہا ہو اس سے کیا دس روپیہ طلب کیے جاسکتے ہیں کیا اس قسم کا کلام نامناسب بلکہ مہمل نہیں سمجھا جائے گا۔

..... ازالہ

سورہ ہود کی یہ آیت جس میں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے پہلے نازل ہوئی پھر جب دس سورتیں نہیں پیش کی جاسکیں تو سورہ یونس میں صرف ایک ہی سورت پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا سورہ یونس کا نزول اس سورت کے بعد ہوا۔ مبرد نے اس جواب کو خلاف واقعہ قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ سورہ یونس ہی پہلے نازل ہوئی پھر شبہ کا جواب کیا ہوگا۔ مبرد نے کہا دونوں سورتوں میں مثلیت کا مفہوم جدا جدا ہے۔ سورہ یونس میں قرآن جیسی ایک سورت پیش کرنے کی دعوت دی، یعنی غیبی اطلاعات، احکام، وعدہ ثواب اور وعید عذاب میں گزشتہ آسمانی کتابوں کے طرز پر کوئی ایک سورت بنا لاؤ۔

مگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اب اس سورت میں دس سورتیں بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی جو صرف بلاغت اور حسن طرز میں قرآن جیسی ہوں۔ میں کہتا ہوں جب وہ لوگ ایسا بھی نہ کر سکے تو پھر سورہ بقرہ میں فرمایا قَاتُوا بِسُورَةِ مِّنْ مِّثْلِهِ (یعنی ندرتِ اسلوب اور بلاغتِ کلام میں دس سورتیں قرآن جیسی پیش نہیں کر سکتے تو) صرف ایک ہی صورت صرف عبارت کی ساخت کے لحاظ سے اس کی طرح بنا لاؤ۔

مُفْتَرَاتٍ (دس سورتیں) خود ساختہ۔ اپنی طرف سے بنائی ہوئی۔

آخر تم لوگ بھی میری طرح خالص عرب اور قادر الکلام ہو بلکہ بڑے مشتاق ہو باہم سیکھتے سکھاتے اور کہتے بتاتے ہو۔
وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۷﴾
چاہو اور جن کو بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر سچے ہو (تو ایسی کوشش کر دیکھو)
فَاَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ پھر اگر کفار تم لوگوں کا چیلنج پورا نہ کر سکیں۔

لکم کی ضمیر خطاب یا تو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے، تعظیم رسول کے لیے جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ یا مسلمان مخاطب ہیں کیونکہ مسلمان بھی مشرکوں کو مقابلہ کی دعوت دیتے تھے اور جو حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا کہ کافروں کو دعوتِ مقابلہ دو، وہ حکم ضمناً تمام مسلمانوں کو بھی تھا۔ کیونکہ سوائے بعض خاص خاص احکام کے باقی احکام کے مکلف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام مسلمان بھی ہیں۔ یا مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دعوتِ مقابلہ سے مسلمانوں کے ایمان میں ثبات اور یقین میں مزید استحکام پیدا ہو گا اس لیے اس سے غفلت مسلمانوں کو نہ کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے آگے فرمایا۔

پس جان لو کہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اللہ کے سوانہ کوئی اس
فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِزِّ اللَّهِ (کی حقیقت) کو جانتا ہے نہ اس کو بنا سکتا ہے۔

اور یہ بھی جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں۔ کیونکہ اللہ ہی ایسے امور سے واقف
وَأَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اور ان چیزوں پر قادر ہے جن کا علم و قدرت اس کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ ان کے (باطل) معبود بالکل عاجز ہیں اور اس کلام کی سچائی اس بات ہی سے ثابت ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کلام نہیں بنا سکتا۔ اس کلام میں تمہید بھی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ اللہ کے عذاب سے مشرکوں کے معبود نہیں بچا سکتے۔

پس کیا تم اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں) یعنی کیا تم اسلام پر ثابت قدم، مستحکم
فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۸﴾ اور مخلص الارادہ رہو گے جب کہ قرآن کا اعجاز تمہارے نزدیک محقق ہو گیا تو کیا اسلام پر جمے رہو گے (یعنی جمے رہو)۔

بھی ممکن ہے کہ مذکورہ بالا تمام خطابات کے مخاطب مشرک ہوں اور کم یَسْتَجِيبُوا کی ضمیر فاعلی مِّنْ اسْتَطَعْتُمْ کی طرف راجع ہو، مطلب اس طرح ہو گا کہ جب اے مشرکوں! تمہارے مددگاروں نے دعوتِ مقابلہ قبول نہیں کی اور تم جان گئے کہ وہ سب اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں تو اب تم کو جان لینا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ ہی نے اپنی طرف سے اتارا ہے اور تم کو جو توحید کی دعوت دی جا رہی ہے وہ سچی ہے پس کیا ایسی قطعی دلیل اور روشن حجت کو دیکھ کر تم اسلام میں داخل ہو جاؤ گے (یا اب بھی اپنی سرکشی پر قائم رہو گے)۔

کلام کا سوالیہ طرز ایک بلیغ اسلوب ہے، طلبِ فعل اور امر کا، اور تنبیہ ہے اس بات پر کہ اب ہر قسم کا عذر ختم ہو گیا اور تعمیلِ حکم کا موجب ناقابل انکار ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَرَزَقْنٰهَا نُوْفِ الْيَوْمِ اَعْمٰهُمُ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يَبْخَسُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ
جو شخص (اپنے نیک اعمال سے) محض
دنیوی زندگی (کی منفعت) اور اس کی رونق حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم ان کو ان کے اعمال کا دنیا میں ہی پورا پورا بدلہ دیتے ہیں اور ان

کے لیے دنیوی زندگی میں ثواب کی کمی نہیں کی جاتی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں۔
یعنی جو لوگ اپنے عمل اور نیکی کے عوض محض (دنیوی زندگی کی درازی، صحت، مال و اولاد کی کثرت، حسین بیویاں اور
نوکر چاکر، خدمت گار حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم دنیا میں ان کو یہ چیزیں ان کے اچھے اعمال کے بدلہ میں پوری پوری دیدیتے ہیں
کسی قسم کی حق تلفی اور ادائے عوض میں کمی نہیں کرتے مگر آخرت میں ان کے اچھے عمل کا کوئی اچھا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ وہاں
سوائے دوزخ کے ان کو اور کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اچھے کاموں کا اچھا بدلہ تو ان کو دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور برے کام رہ جاتے
ہیں سوائے ان کا برابر آخرت میں ملے گا۔

وَحِطَّ مَا صَنَعُوا فِيهَا
اور انہوں نے دنیا میں جو کچھ اچھا کام کیا تھا وہ آخرت میں سب کا سب ناکارہ ثابت ہوگا۔
یعنی دنیا میں جو انہوں نے نیکیاں کی ہوں گی ان کا ثواب آخرت میں باقی نہیں رہے گا یہ مطلب ہے کہ آخرت میں ان
کے لیے کوئی ثواب نہ ہوگا، کیونکہ انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تو نیکیاں کی نہیں تھیں کہ ان کو آخرت
میں اجر دینا اللہ کے ذمے ضروری قرار پاجاتا۔
فیہا کی ضمیر اگر آخرت کی طرف لوٹائی جائے تو اس کا تعلق جط سے ہوگا۔ اور اگر دنیا کی طرف راجع کی جائے تو منعوا
سے تعلق ہوگا۔

وَبَطُلُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾
اور جو (نیکیاں دنیا میں) وہ کرتے ہیں وہ حقیقت میں بے کار جائیں
گی، کیونکہ جس جذبے کے تحت ان کو ہونا چاہیے تھا وہ جذبہ اور وہ رُخ مفقود تھا۔ بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آیت کافروں کے
حق میں ہے۔ بخاری نے ایک طویل حدیث حضرت عمرؓ کی روایت کردہ بیان کی ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ بیان مذکور ہے میں
نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خدا کی قسم مجھے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں سوائے تین کچے چمڑوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا میں نے عرض
کیا یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ اللہ آپ کی امت کو فراخی عنایت فرمادے۔ اہل فارس اور اہل روم کو تو اللہ نے وسعت مالی عطا فرمائی
ہے اور باوجود کہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے مگر ان کو دنیا دیدی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک یہ لگائے
ہوئے تھے یہ سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا ابن خطاب کیا تم اس خیال میں ہو (یہ لوگ تو دنیا کے طالب ہیں پس) ان کو دنیوی زندگی
میں ان کی لذتیں دے دی گئی ہیں اور مؤمن کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور ارادہ آخرت غالب ہے اس لیے اس کو نیکیوں
کا بدلہ دنیا میں بھی دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مؤمن پر ظلم نہیں کرتا (اس کی) نیکی کا اجر دنیا میں (بھی)
اس کو دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کا ثواب دیا جائے گا ہاں کافر کہ اس کی نیکیوں کے عوض دنیا میں اس کو کھانے کو دیا جاتا ہے پھر
جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کو کوئی بھلائی دی جائے۔ رواہ مسلم و احمد۔

میں کہتا ہوں آیت لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ میں خود قرینہ ہے کہ اس کا نزول کافروں کے حق میں ہوا کیونکہ
باجماع علماء اہل ایمان کا آخر کار جنت میں جانا ثابت ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت کا نزول ریاکاروں (دکھانے کے لیے نیکی
کرنی والوں) کے حق میں ہوا حضرت ابو سعید بن فضالہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن (یعنی ایسے دن
) جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اللہ سب لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس نے کوئی عمل اللہ کے لیے کیا
ہو مگر اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر لیا ہو تو وہ اپنے عمل کا اجر اسی شریک سے طلب کرے اللہ تو ہر شرک سے
بے نیاز ہے۔ رواہ احمد۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے نیت آخرت کی طلب کی ہوتی ہے اللہ اس کے دل میں (دنیا
کی ہر چیز سے) بے نیازی پیدا کر دیتا ہے اور اس کی پریشان حالی کو ٹھیک کر دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس (دوڑنی) آتی ہے

اور دنیا کی طلب کی نیت ہوتی ہے تو فقر (احتیاج) کو اللہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیدا کر دیتا ہے (یعنی اس کی سامنے احتیاجات و ضروریات غیر محدود طور پر آجاتی ہیں) اور اللہ اس کو پریشان حال کر دیتا ہے اور دنیا اتنی ہی اس کو ملتی ہے جتنی اللہ نے اس کے لیے لکھ دی ہے۔ رواہ الترمذی، یہ حدیث امام احمد اور دارمی نے بوساطت ابان حضرت زید بن ثابت کی روایت سے نقل کی ہے۔

..... ایک شبہ ❁

آیت نُوفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ اور حدیث لَا يَأْتِيهِ مِنْهَا إِلَّا مَا كُتِبَ لَهُ۔ میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اعمال کا بدلہ پورا پورا دے دیا جاتا ہے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی ملتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا۔

ازالہ :- دونوں میں کوئی تضاد نہیں، تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ ملنا بھی اللہ نے لکھ دیا ہے پس اعمال کا پورا بدلہ ملے گا یعنی وہی ملے گا جو لکھا ہوا ہے اس سے زائد نہیں ملے گا خواہ دنیا طلب آدمی آن گنت چیزوں کا طلب گار ہو (ایک حدیث کا مفہوم ہے) اگر آدمی کے پاس دو وادی بھر سونا ہو تب بھی وہ تیسری وادی (زرّیں) کا طالب ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر آیت کا حکم ریاکاروں کے متعلق ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ جو اعمال انہوں نے دکھاوٹ کے لیے کئے ہوں گے ان کا بدلہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ ہو گا۔

کیا منکرِ قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو اس قرآن پر قائم ہو جو
أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ
اس کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

بینہ دلیل جو حق اور امرِ صحیح کی راہنمائی کرتی ہے جس کی روشنی میں وہ بت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی اختیار کرتا ہے اور دنیا کی (ناجائز) فانی لذتوں کو ترک کر کے آخرت کی دوامی راحت کو پسند کرتا ہے۔

اس جملے کی خبر محذوف ہے اور مَنْ كَانَ مبتدا ہے اور فَمَنْ میں فاء تعقیب کے لیے ہے اور استفہام انکاری ہے۔ صحیح علم کے بعد بھی جو لوگ کافروں اور ریاکاروں کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی سزا بھی دوزخ ہے۔ دونوں باہم مشابہ ہیں۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ جو شخص خدا کی نازل کردہ دلیل پر قائم ہو، کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو محض دنیا کا طلب گار ہے۔ مَنْ كَانَ سے مخلص مؤمن مراد ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ مراد ہیں یعنی حضور ﷺ کی ذات مع تابعین کے۔ کیونکہ لفظ مَنْ عام ہے (خاص ذات مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں) پھر آگے آیت أُولَٰئِكَ يَوْمَئِذٍ فِيهَا مِنْ لَّدُنِّي وَمَنْ لَّدُنِّي فَسَوْءَ مَا يَكْفُرُونَ میں مَنْ کی طرف جمع کی ضمیر بھی لوٹائی گئی ہے۔

بقول ابوالشیخ ابو العالیہ اور ابراہیم نخعی کے نزدیک مَنْ كَانَ عَلٰی بَيِّنَةٍ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی ہے ابوالنعیم نے معرفۃ میں بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔ بَیِّنَةٌ سے مراد قرآن مجید ہے۔

اور اس بینہ (قرآن) کی اللہ کی طرف سے ایک شاہد (یعنی جبرئیل یا اللہ کا رسول) ویتلوا شہادۃً
تلاوت کرتا ہے۔

اور اس کے (نزول سے) پہلے موسیٰ کی کتاب (یعنی توریت اللہ کی طرف سے شاہد ہے جو قرآن کی تصدیق کر رہی ہے) اِمَامًا وَرَحْمَةً
وہ (موسیٰ کی کتاب) ہے جو تعلیم احکام کے لحاظ سے (امام اور رحمت ہے شاہد سے مراد جبرئیل ہیں، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، اور ابن مردویہ نے مختلف سندوں سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں

”شاہد“ سے جبرئیلؑ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور جس طرح قرآن رسول اللہ ﷺ پر انہوں نے تلاوت کیا اسی طرح اس سے پہلے توریت کی تلاوت حضرت موسیٰؑ پر انہوں نے کی تھی۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ اس تفصیل کی نسبت علقمہ، ابراہیم، مجاہد، عکرمہ، ضحاک اور اکثر اہل تفسیر کی طرف بھی کی ہے۔

حسن اور قنادہ کے قول پر ”شاہد“ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک، یعنی قرآن کی تلاوت کرے گا اللہ کی طرف سے ایک شہادت دینے والا جو محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور قرآن کی صداقت کی شہادت حضرت موسیٰؑ کی کتاب بھی دے رہی ہے جو قرآن سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابو الشیخ نے حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (یعنی محمد بن حنفیہؓ) کا بیان نقل کیا ہے۔ محمد نے فرمایا میں نے اپنے والد (حضرت علیؑ) سے عرض کیا، لوگوں کا خیال ہے کہ آیت **وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ بَيْنَهُ** میں شاہد سے مراد آپ ہیں، فرمایا کاش وہ میں ہوتا مگر (ایسا نہیں ہے) وہ شاہد محمد ﷺ کی زبان مبارک تھی، ابو الشیخ نے ابونجیح کی سند سے مجاہد کا بھی یہی قول نقل کیا ہے (کہ ”شاہد“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) بعض علماء کا قول ہے تیلو (تلاوت سے مشتق نہیں ہے بلکہ) **تَلَوْتُ** سے مشتق ہے اور **تَلُو** کا معنی ہے پیروی کرنا پیچھے چلنا اور شاہد سے مراد ہے۔ محافظ فرشتہ۔ اور **يَتْلُوهُ** کی مفعولی ضمیر **مَنْ كَانَ** کی طرف راجع ہے یا بینۃ کی طرف جس کا معنی ہے۔ برہان، دلیل، واضح۔ اور **مَنْ قَبْلَهُ** کتاب موسیٰؑ ایک الگ جملہ ہے اس سے نئے کلام کا آغاز کیا گیا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ **مَنْ كَانَ عَلِيٌّ بَيْنَهُ** رسول اللہ تھے اور شاہد ایک فرشتہ تھا جو آپ ﷺ کی حفاظت پر مامور تھا۔ بعض لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ شاہد سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا قریش کے ہر آدمی کے متعلق کوئی نہ کوئی آیت ضرور نازل ہوئی ہے کسی نے عرض کیا آپ کے متعلق کیا نازل ہوا؟ فرمایا (آیت) **وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ بَيْنَهُ** (میرے متعلق نازل ہوئی)

حضرت علیؑ کو شاہد کیوں کہا گیا۔ اس کی توجیہ شاید یہ ہو کہ سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے پھر رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی اول ترین شہادت دینے والے آپ ہی ہوئے۔

میرے نزدیک سب سے زیادہ قوی وجہ آپ کو شاہد کہنے کی یہ ہے کہ آپ تمام کمالات ولایت کے مرکزی نکتہ تھے، قطب ولایت تھے، تمام اولیاء بلکہ تمام صحابہ بھی مقام ولایت میں آپ کے پیچھے اور تابع ہیں۔ خلفاء ثلاثہ (حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ) ضرور آپ سے افضل تھے مگر ان کی فضیلت کی وجہ دوسری ہے جس کی تشریح حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوبات کے آخر میں کی ہے۔

اس صورت میں آیت کا تشریحی مطلب اس طرح ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک قطعی دلیل اور روشن حجت لے کر آئے ہیں جو آپ کی رسالت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی ہے یہ روشن دلیل کیا ہے۔ آپ کے معجزات کثیرہ جن میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور وہ علوم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو حاصل ہوئے پھر آپ کے پیچھے اور آپ کے تابع حضرت علیؑ اور دوسرے اولیاء جو حضرت علیؑ سے مشابہت رکھنے والے ہیں آئے جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے شاہد ہیں، اولیاء کی کرامتیں حقیقت میں رسول اللہ کے معجزات ہیں اور اولیاء کے الہامی اور کشفی علوم بھی وہی علوم ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے حاصل ہوئے تھے، پس اولیاء کی کرامات اور الہامی علوم سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

ترمذی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **أَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا** میں سچے علوم کا گھر ہوں اور علیؑ اس گھر کا دروازہ ہیں۔ **وَأَنَا مَدِينَةُ الْعُلُومِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا** اور میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس شہر کا دروازہ ہیں۔ **فَمَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ الْبَابَ** پس جو علم کا خواستگار ہو اس کو دروازہ پر آنا چاہیے (تاکہ علم کے شہر میں داخل ہو سکے) اس حدیث کو

ابن عدی نے اکامل میں اور عقیلی نے الصعفاء میں اور طبرانی و حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، نیز ابن عدی اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں حکمت و علم سے علوم اولیاء کی طرف اشارہ ہے فقہاء کے علوم کی طرف اشارہ نہیں ہے علوم فقہیہ کا مدار تو صرف علیؓ پر نہیں ہے۔ علم فقہ کے متعلق تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔

بعض کے نزدیک "شاہد" سے مراد انجیل ہے اور مِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى سے مراد توریت ہے بعض نے کہا بینۃ عقیلی برہان سے اور شاہد قرآن ہے۔ حسین بن فضل نے کہا قرآن کا اسلوب بیان اور اعجاز شاہد ہے مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس اپنے مذہب کی کوئی دلیل عقلی اور برہان نقلی نہو اس کی طرح کیا وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا قول و عمل دلائل کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی تائید اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب یعنی قرآن سے بھی ہو رہی ہے اور قرآن سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب بھی برہان نقلی پر (اور قرآن کی تائید میں) شہادت دے رہی ہے۔ اس صورت میں مَنْ كَانَ سے مراد ہو گا سچا مؤمن مخلص۔

یہ ہی جماعت اس پر پکا ایمان رکھتی ہے۔

أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ
 اُولَئِكَ سے اشارہ مَنْ كَانَ کی طرف ہے کیونکہ بینہ پر قائم رہنے والی مسلمانوں کی جماعت ہے پس مسلمانوں کی جماعت ہی اُولَئِكَ سے مراد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاہد کی جانب اشارہ ہو بشرطیکہ شاہد سے مراد حضرت علیؓ اور آپ کے پیرو ہوں۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ

اور جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس کا انکار کرے گا تو

دوزخ اس کے وعدے کی جگہ ہے۔

احزاب (گروہ) سے مراد (مسلمانوں کے علاوہ) تمام مذاہب والے ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت (دعوت) میں سے جو کوئی کافر و مشرک اور یہودی اور عیسائی ایسی حالت میں مرے گا کہ جس (ہدایت) کو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان نہ لایا ہو گا تو وہ ضرور دوزخیوں میں سے ہو گا۔ (رواہ مسلم)

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۴﴾

سو (اے مخاطب!) تو قرآن کی طرف سے شک میں نہ پڑنا بلا شک و شبہ وہ سچی کتاب ہے تیرے رب کے پاس سے آئی ہے لیکن (باوجود ان دلائل کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی فکر کی خرابی اور قوت غور کی کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اور ان لوگوں سے زیادہ ظالم (حق ناشناس) کون ہے جو اللہ پر اپنی وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا
 طرف سے دورغ بندی کرتے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کی اولاد یا شریک قرار دیتے ہیں یا اس کی طرف ان احکام و تعلیم کی نسبت کرتے ہیں جو اس نے نازل نہیں کیے یا ان احکام کا انکار کرتے ہیں جو اس نے نازل کیے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہدایات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں یا کسی چیز کی تحریم کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کی تحریم اس کی طرف سے نہیں کی گئی یا کسی چیز کی تحلیل کو اس کی جانب منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کو اس نے حرام کر دیا ہے۔

أُولَئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ
 ان سے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ
 اور گواہ کہیں گے یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے کہیں گے۔

ابو الشیخ نے مجاہد کا یہی تفسیری قول نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اشہاد سے مراد انبیاء اور پیغمبر ہیں۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے اس تفسیر کی تائید آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا

گا۔ رات بھی اسی طرح کہتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مال بڑا سبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم اور (ضرور تمند) مسافر کو دیا جائے گا خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا۔ اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ ابو نعیم نے طاؤس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن مال اور صاحب مال دونوں کو لایا جائے گا اور دونوں باہم جھگڑا کریں گے (الحديث)۔

اللَّذِينَ يَصْنَعُونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ

اور اس میں کجی نکالنے کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔

یعنی دین الہی کو حق سے پھرا ہوا قرار دیتے تھے، یہاں یہ مطلب ہے کہ مؤمنوں کو مرتد بنا کر ٹیڑھے راستے پر لے جانے کے

خواہشمند تھے۔

اور وہی آخرت کے بھی منکر تھے۔ یہ جملہ حالیہ ہے ہوا کا مکرر ذکر

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَفِرُونَ ۱۹

کرنا کافر ہونے کی تاکید کے لیے ہے اور یہ بتانے کے لیے ہے کہ روز آخرت سے انکار ان کی خصوصیت ہے۔

یہ لوگ (تمام) زمین پر اللہ کو (کہیں بھی) عاجز نہیں کر سکتے

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ

تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے معجزین کا ترجمہ کیا ہے ”آگے نکل جانے والے“ اور قتادہ نے کیا ہے ”بھاگ جانے والے“ اور مقاتل

نے کیا ہے ”چھوٹ جانے والے“ مطلب سب کا ایک ہی ہے یعنی یہ لوگ اللہ کو دنیا میں سزا دینے سے روک نہیں سکتے۔

اور (دنیا میں) اللہ کے عذاب سے ان کو بچانے والا کوئی ان کا

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ

حمایتی نہیں، مگر اللہ نے ہی خود ان کے عذاب کو آخرت پر ٹال رکھا ہے تاکہ ان کو عذاب سخت اور لافانی میں مبتلا کر دے۔ (دنیا کا

عذاب کتنا ہی بڑا ہو آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کم ہے اور ختم ہو جائیو الا بھی ہے۔ آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا شدید

اور غیر منقطع ہے)

ایسے لوگوں کو (اوروں سے) دو گنی سزا ہوگی، بعض علماء نے کہا ہے کہ عذاب کی یہ وجہ ہے

يُضَعَّفُ لَهُمُ الْعَذَابُ

کہ یہ دوسروں کو بہکاتے ہیں اور ان کے چیلے ان کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ لوگ (گوشِ حق نیوش سے) نہ سن سکتے

مَا كَانُوا يَسْتَمِعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ۲۰

نہ (چشمِ بصیرت سے تصویر حق کو) دیکھ سکتے تھے یعنی اللہ نے حق کو سننے کی ان میں استعداد ہی نہیں پیدا کی۔ اس لیے حق کو نہیں

سنتے۔ ان کے پاس گوشِ حق نیوش ہی نہیں اور سیدھا راستہ ان کو نہیں دکھائی دیتا، اللہ نے ان کے دلوں میں بصیرت پیدا ہی نہیں

کی، اس لیے آیاتِ خداوندی کو دیکھنے سے بے بہرہ ہیں۔

یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ

کر پھروں کی پوجا کو اختیار کیا اور جنت دے کر دوزخ مول لی۔

اور ان کے خود تراشیدہ معبود ان سے غائب اور گم ہو گئے۔ یعنی

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يُفْتَرُونَ ۲۱

بتوں کی سفارش کرنے کا جو ان کا خیال تھا اور یقین رکھتے تھے کہ بت شفاعت کر کے ان کو بچالیں گے، ایسا نہ ہو سکے گا۔

لا محالہ وہ ہی آخرت میں سب سے بڑھ کر نادم ہوں گے

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْآخِرُونَ ۲۲

لاجرم (کی لفظی ساخت اور معنوی (دلالت) میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک لازاوند ہے، یعنی مشرکوں کے

گمان کے موافق ہوگا۔ اس کے بعد جرم فعل ماضی متعدی ہے اس کے اندر ضمیر فاعل ہے اور انہم فی الآخرة مفعول ہے

اس وقت جرم کا معنی ہوگا کسب یعنی ان کا گمان آخرت میں یہ نتیجہ پیدا کرے گا کہ وہی سب سے خسارے میں رہیں گے یا

جَرَمَ فعل ماضی ہے لازم بمعنی وَجَبَ اور بعد والا جملہ اس کا فاعل ہے یعنی آخرت میں سب سے بڑھ کر نامراد ہونا واجب ہو گیا ہے۔

بعض کے نزدیک لَا جَرَمَ دو لفظوں سے مرکب ہے اور مرکب کا معنی ہے تھا اور بعد والا جملہ فاعل ہے، یعنی ان کا سب سے زیادہ نامراد اور ہناحق اور ثابت شدہ ہے یا لَا جَرَمَ کا معنی ہے لامحالہ۔ قاموس میں ہے لَا جَرَمَ اور لَا ذَا جَرَمَ اور لَا أَنْ جَرَمَ اور لَا أَنْ ذَا جَرَمَ اور لَا جَرَمَ سب کا معنی ہے کوئی پارہ نہیں کہ، یا یقیناً لامحالہ۔ یہ تو لفظ جَرَمَ کی لغوی وضعی تنقیح ہے لیکن استعمال میں کبھی اس کو بجائے قسم کے لے آتے ہیں اور اس وقت جواب میں لَ تاکید استعمال کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں لَا جَرَمَ لَا تَبْنُکَ

الْأَخْسَرُونَ اسم تفہیل کا صیغہ ہے یعنی سب سے زیادہ نامراد اور خسارہ یاب بات یہ ہے کہ دوسروں کی نامرادی تو کفر اور معاصی کی وجہ سے ہوگی، اور یہ خود کافر ہونے کے علاوہ دوسروں کو بھی ایمان سے روکنے والے ہیں اس لیے ان کی نامرادی سب سے زیادہ ہوگی۔

إِنَّ الدِّينَ أَمْنٌ وَعَمَلٌ وَالصَّالِحِينَ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۳﴾

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف جھکے وہی جنتی ہوں گے، وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ نے أَخْبَتُوا کا ترجمہ کیا ہے خَافُوا (ڈرے، اللہ سے خوف کیا) قتادہ نے کہا رجوع کیا، اللہ کی طرف لوٹے، مجاہد نے کہا اطمینان حاصل کر لیا (یعنی ایمان کے بعد مرتبہ اطمینان پر فائز ہو گئے) قاموس میں ہے أَخْبَتَ فروتنی کی، خشوع کیا خَبِيتَ حقیر چیز۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ دونوں فریقوں کی مثال (ایسی ہے) دونوں فریقوں سے مراد ہے مؤمنوں کا فریق اور کافروں کا فریق۔

كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ جیسے (ایک) اندھا بہرا ہو اور (دوسرا) بینا شنوا۔ کافروں کے پاس گوشِ حق نیوش نہیں، وہ حق کی بات نہیں سنتے اور راہِ حق نہیں دیکھتے، حق کا راستہ ان کو سمجھائی نہیں دیتا، اس لیے وہ اندھے بہرے کی طرح ہیں اور مؤمن پیامِ حق سنتے اور اس کو قبول کرتے ہیں اور راہِ حق اپنی قلبی خدا اور روشنی سے دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں اس لیے ان کے حالت بینا اور شنوا کی طرح ہے۔

هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا کیا یہ دونوں فریق تمثیل میں یا صفت میں یا حالت میں برابر ہیں۔
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۴﴾ کیا اب بھی تم نصیحت اندوز نہیں ہو گے یعنی ان تمثیلات کے بیان اور ان پر غور کرنے کے بعد بھی نصیحت قبول نہیں کرو گے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ ۖ إِذِ انبأَهُمْ لِقَوْمِهِمْ ۖ أَن يَدْعُوا لِلَّهِ مِثْلَ الدَّعْوَىٰ ۗ وَأَن يَتَّبِعُوا دِينَهُ ۗ وَكَانُوا قَوْمًا كَافِرِينَ ﴿۱۵﴾ اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو پیغمبر بنا کر ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اور) نوحؑ نے کہا تھا کہ میں تم کو (اللہ کے عذاب سے) واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

مُسَبِّحِينَ كَأَنَّهُمْ يَدْعُونَ لِلَّهِ ۗ وَكَانُوا قَوْمًا كَافِرِينَ ﴿۱۶﴾ میں تم کو عذاب اور ثواب کے اسباب سے کھول کر اطلاع دے رہا ہوں۔
أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۗ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ إِلَيْنِمْ ﴿۱۷﴾ کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ اللہ کی سوا کسی کی پوجانہ کرو۔ (اگر ایسا نہ کرو گے تو) مجھے دکھ والے دن کے عذاب کا تمہارے متعلق ڈر ہے إِلَيْنِمْ بمعنی المراساں

۱۔ مَثَلٌ مَثَلٌ اور مَثَلٌ کے معنی ہم ضمیمہ ہم شکل اور نظیر کے بھی ہیں اور صفت کے بھی اور عظیم الشان حالت کے بھی اور نفس کیفیت و حالت کے بھی اس جگہ یا تمثیل مراد ہے یا صفت یا حالت۔ حضرت مفسر کی تشریح میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(دکھ دینے والا) نہ حقیقت میں عذاب کی صفت ہے نہ وقت عذاب کی بلکہ عذاب دینے والا حقیقت میں الم رساں ہوتا ہے عذاب اور زمان عذاب کی صفت اس کو مجازاً فرار دیکھا جاتا ہے۔ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں۔ یعنی تم کو ہم پر کوئی ایسی فضیلت نہیں کہ تم واجب الاطاعت نبی ہو جاؤ، گویا ان کی مراد یہ تھی کہ نبی کو بادشاہ یا فرشتہ ہونا چاہئے اور تم نہ فرشتہ ہو اور نہ بادشاہ ہماری طرح معمولی آدمی ہو۔

مَلَائِكًا (اس کا لغوی ترجمہ ہے "بھرنے والے" مراد سردارانِ قوم کیونکہ) سرداروں ہی کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بھر جاتی ہے اور جلسوں میں انہی کی وجہ سے رونق اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

بادی یابدو (بمعنی ظہور) سے مشتق ہے۔ یعنی بغیر سوچے سٹھی ظاہری نظر کے ساتھ۔ یابدء (بمعنی ابتداء) سے ماخوذ ہے یعنی ابتدائی رای، رذیل سمجھنے کی وجہ یا تو یہی تھی کہ انہوں نے بغیر تاویل کے حضرت نوح کا اتباع کر لیا تھا یا یہ وجہ تھی کہ وہ غریب تھے، دنیوی مال و جاہ ان کے پاس نہ تھا اور ان کے نزدیک وہی رذیل تھا جو مالدار نہ ہو اور دنیوی عزت و جاہ سے خالی ہو۔ اور ہم تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

بَلْ نُنظِّمُ كَذِبِيْنَ ۝۱۷ بلکہ ہم تم سب کو جھوٹا خیال کرتے ہیں تم کو نبوت کے دعویٰ میں جھوٹا سمجھتے ہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس دعوے میں کاذب جانتے ہیں کہ ان کو تمہاری سچائی معلوم ہو گئی۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

وَأَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ۝۱۸ اور رحمت کو تم پر چمٹا دین گے اور بجز تم سے قبول کرائیں گے ایسا نہیں ہو سکتا قادم نے کہا اگر انبیاء میں یہ قدرت ہوتی کہ بجز لوگوں کو مؤمن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

وَأَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ۝۱۸ اور رحمت کو تم پر چمٹا دین گے اور بجز تم سے قبول کرائیں گے ایسا نہیں ہو سکتا قادم نے کہا اگر انبیاء میں یہ قدرت ہوتی کہ بجز لوگوں کو مؤمن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

وَأَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ ۝۱۸ اور رحمت کو تم پر چمٹا دین گے اور بجز تم سے قبول کرائیں گے ایسا نہیں ہو سکتا قادم نے کہا اگر انبیاء میں یہ قدرت ہوتی کہ بجز لوگوں کو مؤمن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔ وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بُشْرًا نوح کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رِذْلٌ کی جمع آرِذْلٌ ہے اور آرِذْلٌ کی جمع آرِذِلٌ جیسے کلب کی جمع اکلِب اور اکلِب کی جمع اکالِب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رِذْلٌ کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جو لاپرواہی، موچی برائی آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

کو اپنے پاس سے نکال دو گے اس درخواست کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلْمَعُونَ ۗ وَمَا أَنَا بِمُطْفِئِ نَارِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِبِ أَرْضِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِئِ سَعْيِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِئِ أَعْيُنِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِئِ أَسْمَاعِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِئِ أَسْمَاعِهِمْ ۗ وَمَا أَنَا بِمُجْرِئِ أَسْمَاعِهِمْ ۗ

اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں میں ان کو نکالنے والا نہیں (کیونکہ) یہ لوگ یقیناً اپنے رب سے ملیں گے اور وہاں نکالنے والے سے جھگڑا کریں گے، یا یہ مطلب کہ یہ لوگ رب کے قرب کو پہنچیں گے اور ضرور کامیاب ہو جائیں گے ایسے مقرر یا خداوندی کو میں اپنے پاس سے کیسے نکال سکتا ہوں۔

وَلَكِنِّي أَرْكَبُ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿۲۹﴾

لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جہالت کر رہے ہو۔ یعنی اپنے رب کی پیشی سے ناواقف ہو یا اپنے انجام سے ناواقف ہو یا ان مؤمنوں کے مرتبہ قرب کو نہیں جانتے یا اس بات سے ناواقف ہو کہ تمہارا ان کو ذیل قرار دینا حماقت ہے یا ان کو نکال دینے کی درخواست نادانی سے کر رہے ہو۔

وَلَيَقَوْمٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذَا تَدْرَسَتْ عَلَيْهِمْ

اور اے میری قوم (ایسے مرتبہ والوں کو) جب میں نکال دوں گا تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا اور میرے اوپر سے اس کے عذاب کو کون دفع کرے گا۔

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۳۰﴾

تو کیا اب بھی تم نصیحت پذیر نہ ہو گے۔ اور اتنی بات بھی نہیں سمجھو گے کہ ان کو نکال دینا صحیح نہیں ہے۔

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خِزَايِنُ اللَّهِ

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے ذخیرے میرے پاس جمع ہیں یعنی مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں تم پر مالی فضیلت رکھتا ہوں اور میرے پاس خدا داد مال کے خزانے ہیں۔

وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ

اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب سے واقف ہوں کہ تم کو میری اس بات پر تعجب ہو اور تم مجھے جھوٹا سمجھو یا یہ مطلب ہے کہ میں غیب دان نہیں کہ ان لوگوں کا بغیر غور و تأمل کے محض سطحی طور پر ایمان لانا مجھے معلوم ہو جائے۔

وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ

اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں کہ تم انکار کر سکو اور تم کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ تو تو ہماری طرح آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے۔

وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا

اور جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقیر جانتی ہیں میں نہیں کہتا کہ اللہ ان کو بھلائی عطا نہیں فرمائے گا۔

یعنی جن لوگوں کو ان کی مفلسی کی وجہ سے تم حقیر سمجھتے ہو اور ان کو ذلیل کہتے ہو چونکہ ظاہری ناداری اور مفلسی کو آنکھوں سے دیکھ کر وہ حقیر جانتے تھے ان کے کمالات اور خصائلِ فاضلہ پر غور نہیں کرتے تھے۔ اس لئے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کلام کو پُر زور بنانے کے لئے کر دی (ورنہ آنکھوں کا کام حقیر جاننا نہیں تحقیر ہو یا اعزاز اس کو جاننا انسان کے دماغ کا کام ہے) بلکہ دنیا میں اللہ نے ان کو ایمان و ہدایت کی جو توفیق عطا فرمادی اور آخرت میں جو بلندی مرتبہ اور جنت عطا فرمائے گا وہ تمہارے اس دنیوی مال و جاہ سے بہتر ہے (پھر میں کیسے کہہ دوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں عطا فرمائے گا)

اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ﴿۳۱﴾

ان کے دلوں میں (کیسی اللہ کی محبت ہے اور ان کے عقائد و خصائل کتنے صحیح اور اعلیٰ ہیں) جو کچھ بھی ہے اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔

إِنِّي إِذْ أَلَمْتُ الظَّالِمِينَ ﴿۳۲﴾

ایسی حالت میں (اگر میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں اور کہہ دوں کہ اللہ ان کو کوئی بھلائی عطا نہیں فرمائے گا تو) میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ﴿۳۳﴾

قوم والوں نے کہا نوحؑ جھگڑا تو تم ہم سے بہت کر چکے (یہ باتیں سب بیکار ہیں ان کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا) اب تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس کی دھمکیاں تم ہم کو دیتے ہو اگر (نبوت کے دعوے میں اور عذاب کی (وعید میں) تم سچے ہو۔

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۳۴﴾

نوحؑ نے کہا (میرے اختیار میں نہ

عذاب لانا ہے نہ تمہاری درخواست فوراً پوری کرنا) اگر اللہ ہی چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا اور تم اس کو بے بس بنا دینے والے نہیں (کہ آئے عذاب کو ٹال سکویا اس سے بھاگ سکو)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نَصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ

اور اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہے اور میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں تو میری نصیحت تمہارے لئے کچھ سود مند نہ ہوگی۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گمراہ کرنے کا تعلق بھی اللہ کی مشیت سے ہے اور مشیت الہیہ کے خلاف واقع ہونا ناممکن ہے (اگرچہ حکم خدا کے خلاف واقع ہونا ممکن ہے بلکہ بکثرت نافرمانیاں کی جاتی ہیں) یا يُغْوِيَكُمْ کے معنی ہیں یُهِلِكُمْ یعنی اللہ اگر تم کو ہلاک کرنا ہی چاہتا ہے تو میری نصیحت تمہارے لئے مفید نہ ہوگی (اور تم ہلاکت سے نہ بچ سکو گے) اس وقت یہ لفظ غَوَى الْفَصِيلُ سے ماخوذ ہوگا (غَوَى الْفَصِيلُ اونٹ کا بچہ ہلاک ہو گیا)

وہی تمہارا رب ہے یعنی خالق ہے اور جس طرح چاہے تصرف کرنے والا ہے۔

هُوَ رَبُّكُمْ

اور اسی کی طرف تم کو لوٹا کر لے جایا جائے گا، وہی تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَالْبِئْسَ تَرْجِعُونَ ﴿۳۳﴾

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ قرآن خود بنا کر اللہ پر دروغ بندی کی ہے (مقاتل) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (اس جملہ کا اور اس کے بعد والے خطابي جملہ کا تعلق بھی حضرت نوحؑ کے قصے سے ہے) کیا نوحؑ کی قوم والے کہتے تھے کہ نوحؑ نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ

قُلْ (اے محمدؐ یا اے نوحؑ) آپ کہہ دیجئے۔

اگر میں نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے تو میرے جرم کا وبال مجھ پر پڑے گا۔

إِنْ افْتَرَيْتَهُ فَعَلَىٰ إِجْرَامِي

إِجْرَامٍ جرم کرنا، گناہ کرنا۔

اور میں تمہارے جرم سے پاک ہوں۔ یعنی تم جو کہہ رہے ہو کہ تو نے اللہ

وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿۳۴﴾

پر دروغ بندی کی ہے یہ تم لوگوں کا جرم ہے میں اس سے بیزار ہوں۔

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نوحؑ کی قوم والے آپ کو اتا مارتے تھے کہ آپ گر پڑتے تھے اور مردہ سمجھ کر لوگ لبادہ میں لپیٹ کر گھر ڈال جاتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ نوحؑ مر گئے، لیکن دوسرے روز آپ پھر باہر آ کر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاٹھی کے سہارے سے جا رہا تھا اس کا بیٹا ساتھ تھا بیٹے سے اس نے کہا میرے بیٹے اس دیوانے بوڑھے کے دھوکے میں نہ آ جانا، بیٹے نے کہا باپ مجھے لاٹھی دیدیجئے، باپ نے لاٹھی دے دی، بیٹے نے لاٹھی لے کر حضرت نوحؑ کے سر پر ماری اور آپ کو سخت زخمی کر دیا اس پر حضرت نوحؑ کے پاس مندرجہ ذیل وحی آئی۔

وَأَوْحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ

کہ تمہاری قوم کے جو لوگ ایمان لا چکے (لا چکے) اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔

اب جو کچھ (تکذیب اور ایذا کا سلوک) یہ تیرے ساتھ کرتے رہے ہیں

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۵﴾

اس سے رنجیدہ نہ ہو (عنقریب ان کو ہلاک کر دیا جائے گا)

اللہ نے نوحؑ کو آئندہ کسی کے مؤمن ہونے سے ناامید کر دیا تاکہ آپ لا حاصل تبلیغ کی تکلیف سے محفوظ رہیں اور آئندہ کسی کو سرکشی سے نہ روکیں اور کوئی فکر نہ کریں جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ ان کو ہلاک کرنے والا ہے تو دعا کی رت لَا تَذَرُ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر لیشی کی روایت سے لکھا ہے کہ قوم نوحؑ والے حضرت نوحؑ کو پکڑ کر پچھاڑ کر اتا گلا گھونٹتے تھے کہ آپ بیہوش ہو جاتے تھے۔ جب آپ کو ہوش آتا تو دعا کرتے الہی میری قوم کو معاف کر دے وہ نادان ہیں، جب قوم کی

تافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے ڈکھ اور اذیت میں اضافہ مسلسل ہوتا رہا تو آپؑ ناامید ہو گئے اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت یاب ہو جائے یونہی نسل در نسل چلتی گئی اور ہر پچھلا نسل سے زیادہ خبیث ہوتا رہا اور پچھلے لوگ کہنے لگے یہ دیوانہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آتا ہے یا گل ہے وہ اس کو منہ نہیں لگاتے تھے آخر حضرت نوحؑ نے اللہ سے اپنا دکھ عرض کیا اور دعا کی رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَنَهَارًا اِیْسٰی کَلَامِ کَے آخر میں عرض کیا رَبِّ لَا تَذَرُ عَلٰی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اِس وقت وحی آئی۔

اور بنا کشتی ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق یعنی ہم نے جیسا بنانا تجھے بتایا ہے ویسی بنایا ہمارے حکم کے موافق بنا (اس صورت میں وحی کا معنی ہو گا حکم)

حضرت ابن عباسؓ نے اَعِیْن کا ترجمہ کیا ہے ”نظر“ اور مقاتل نے اعین سے مراد لی ہے ”علم“ بعض نے ترجمہ کیا ہے نگرانی، حفاظت۔ آنکھ کو نگرانی اور حفاظت میں دوسرے تمام حواس سے زیادہ دخل ہے اس لئے نگرانی کو اعین (چشم) کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وَلَا تُخَاطِبُنِیْ فِی الدِّیْنِ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۵﴾ اور ان ظالموں کو بچانے کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی خطاب (دعا) نہ کرنا کیونکہ بلاشبہ یہ غرق کئے جانے والے ہیں (ان کو ضرور غرق کیا جائے گا) مطلب یہ کہ ان کو

ڈبونے کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ بغوی نے اس قصہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ سے آکر کہا آپ کا رب آپ کو کشتی بنانے کا حکم دے رہا ہے۔ نوحؑ نے کہا میں تو بخار (بڑھئی) نہیں ہوں کیسے بناؤں۔ جبرئیلؑ نے کہا آپ کا رب فرماتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے ہے کشتی بنا (غلطی نہ ہوگی) نوحؑ بنانے لگے اور ٹھیک ٹھیک بنانے لگے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے کشتی پرندہ کے سینہ کی شکل کی (یعنی سینہ ابھری ہوئی) بنائی۔

وَيَصْنَعُ الْفُلَکَ ۚ اور نوحؑ کشتی بنا رہے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ قوم کی طرف سے غافل ہو کر کشتی بنانے میں مشغول ہو گئے ادھر قوم نوحؑ کی ساری عورتیں بانجھ ہو گئیں اس کے بعد ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نوحؑ تختے چیرنے اور لوہا لگانے اور کشتی کے لئے ضروری سامان کی تیاری کرنے لگے مثلاً تار کول یا دوغن قیر (ملنے لگے) لوگ ادھر سے گزرتے اور آپ کو مشغول دیکھ کر کہتے تھے۔

وَكَلَّمَآ مَرَّ عَلَیْہِ مَلَاۤءِیْمٌ مِّنْ قَوْمِہٖ سَخِرُوْا مِنْہُ ۚ اور جب سردار ان قوم ادھر سے گزرتے تھے تو نوحؑ سے ٹھٹھا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ خشکی میں کشتی بنا رہے تھے قریب کہیں پانی بھی نہیں تھا اس لئے لوگ ٹھٹھول کرتے اور کہتے تھے نوحؑ پہلے تم نبی تھے اب درود گر ہو گئے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ لوگ پوچھتے نوحؑ کیا بنا رہے ہو حضرت نوحؑ جواب دیتے میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا لوگ آپ کی ہنسی بنانے لگتے۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنْہٗ فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْکُمْ کَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۲۶﴾ نوحؑ نے کہا اگر (آج) تم ہم سے ٹھٹھا کر رہے ہو تو (آئندہ) ہم بھی تم سے ایسا ہی ٹھٹھا کریں گے جیسا تم کر رہے ہو۔ یعنی جس طرح کشتی بننے دیکھ کر تم ہم سے ٹھٹھا کر رہے ہو آئندہ ہم بھی تم کو طوفان میں ڈوبتے اور دوزخ میں جلتے دیکھ کر ٹھٹھا کریں گے اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ جس طرح تم اب ہم کو نادان اور جاہل قرار دیتے ہو، آئندہ ہم بھی تم کو جاہل قرار دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت تم ہماری ہنسی بنا رہے ہو آئندہ تم کو اپنی اس ٹھٹھول بازی کا انجام دیکھنا ہو گا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لَآمِنٌ بِآیٰتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ ۚ وَیَعْلُ عَلَیْہِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۲۷﴾ اور آئندہ تم کو معلوم ہو جائے گا کہس پر رُسوا کن عذاب آئے گا اور اہل عذاب نازل ہو گا۔ چنانچہ طوفان میں غرق ہونے کا عذاب ان پر آگیا اور سب ڈوب کر عالم برزخ میں پہنچ گئے جہاں قیامت تک ان پر عذاب ہوتا رہے گا پھر قیامت میں ان پر عذاب ہو گا اور دوزخ میں

ڈال دیا جائے گا۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تورات کا خیال ہے کہ اللہ نے نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ساگون یا سار کی لکڑی کی کشتی بنائیں جس کا سینہ آگے کو نکلا ہو اور کشتی کے اندر باہر ہر طرف روغنِ قار کا پالش کر دیں، کشتی کی لمبائی اسی ہاتھ، چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تین ہاتھ ہو۔ ہاتھ سے مراد ہے انگلیوں کے پوروں سے مونڈھے تک پورا ہاتھ (یعنی آدھا گز مراد نہیں ہے) اور تین منزلیں بنائیں، پختی، درمیانی اور بالائی منزل میں درخت رکھیں۔ حضرت نوحؑ نے حکم کے مطابق کشتی بنائی۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اللہ نے جب نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو نوحؑ نے عرض کیا میرے مالک تختے کہاں ہیں اللہ نے فرمایا ساگون یا سار۔ کاد رخت لگاؤ، نوحؑ نے سار کاد رخت بویا بیس برس تک وہ درخت پرورش پاتا رہا اس مدت میں نہ حضرت نوحؑ نے تبلیغ کی نہ قوم والوں نے کوئی استہزاء کیا، جب درخت بھر پور ہو گیا تو اللہ کے حکم سے نوحؑ نے اس کو کاٹ کر خشک کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں گھر (یعنی کشتی کی شکل) کیسے بناؤں۔ حکم ہوا اس کی تین شکلیں رکھو اگلا سر اتومرغ کے سر کی طرح ہو اور پچھلا حصہ بھی مرغ کی دم کی طرح اور سینہ پر ندے کے سینہ کی طرح (آگے کو نکلا ہو) اور دونوں پہلوؤں پر درختے ہوں اور لوہے کی کیلوں سے اس کو مضبوط کر دیا گیا ہو۔ اللہ نے جبریلؑ کے ذریعہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھادی۔

ابن عساکر نے سعید بن مسیب کی وساطت سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت کعب کا بیان بھی یہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نوحؑ نے دو سال میں کشتی تیار کی، کشتی کا طول تین سو ہاتھ اور عرض پچاس ہاتھ اور اوپر کو بلندی تین ہاتھ تھی۔ کشتی کی ساخت سار کے تختوں کی تھی اور تین درجے تھے، نچلے درجہ میں جنگلی جانور اور درندے اور چوپائے تھے، درمیانی منزل میں گھوڑے، اونٹ (اور پالتو چوپائے) تھے اور بالائی منزل میں حضرت نوحؑ اور آپ کے ساتھی اور کھانے پینے کا ضروری سامان تھا۔

ابن مردویہ نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ کشتی کا طول تین سو ہاتھ، عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تین ہاتھ تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے جو روایت کی ہے اس میں عرض کا ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے قنادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں لمبائی تین ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا اندہ ہے کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ کشتی کے تین طبقے تھے، ایک طبقے میں جنگلی جانور، چوپایہ اور درندے تھے دوسرے طبقے میں پرندے تھے۔ شرح خلاصۃ السیرین میں آیا ہے کہ نچلے طبقے میں پرندے، چوپائے اور جنگلی جانور وغیرہ تھے اور درمیانی طبقے میں کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے تھے اور بالائی طبقہ آدمیوں کے لئے تھا۔

شامی نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسی ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ اور بلندی اوپر کو تین ہاتھ اور ہاتھ سے مراد ہے (بچہ سے مونڈھے تک)

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی کی لمبائی چھ سو ہاتھ تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں حسن کا قول آیا ہے کہ کشتی کا طول بارہ سو ہاتھ اور عرض چھ سو ہاتھ تھا۔ مشہور اول روایت ہے کہ طول تین سو ہاتھ تھا۔

زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ سو برس تک درخت بوتے اور (لکڑی) کاٹتے رہے اور سو برس تک کشتی بناتے رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس برس تک درخت بوتے اور چالیس برس تک (ان کی لکڑی کو) خشک کرتے رہے۔ کعب احبار کا قول آیا ہے کہ نوحؑ نے تین برس میں کشتی بنائی۔ یہ بھی منقول ہے کہ کشتی کی تین منزلیں تھیں، نچلا درجہ چوپایوں اور جنگلی جانوروں کے لئے تھا، درمیانی منزل میں آدمی تھے اور بالائی طبقے میں پرندے، جب جانوروں کا گوہر زیادہ ہو گیا تو نوحؑ کے پاس

وحی آئی ہاتھی کی دم دباؤ دم دباتے ہی ہاتھی کے اندر سے ایک سور اور شوریا نکل پڑی اور دونوں نے گوبر (کھا کر) صاف کر دیا۔
چوہوں نے جب کشتی کو نقصان پہنچایا اور رسیاں کاٹنے لگے تو اللہ کی طرف سے نوح کو حکم ہوا شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان
ضرب لگاؤ، ضرب لگاتے ہی شیر کی ناک کے سوراخوں سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے دونوں چوہوں پر دوڑ پڑے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ ۗ

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم آپہنچا اور تنور ابل پڑا۔
ابوالشیخ نے عکرمہ اور زہری کا قول نقل کیا ہے کہ تنور کا معنی ہے روئے زمین، بغوی نے بھی یہی نقل کیا ہے سعید بن منصور، ابن
جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی کی ہے۔ صورت اس طرح ہوئی
کہ حضرت نوحؑ سے کہا گیا جب تم روئے زمین پر پانی اُبلتا دیکھو تو کشتی میں سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے
قنادہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تنور سے مراد ہے زمین کا اونچا بلند حصہ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس
قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں عین الوردہ مراد۔ جو جزیرہ میں ایک چشمہ تھا۔

ایک روایت میں حضرت علیؑ کا قول آیا ہے کہ قناد التَّنُور کا مطلب یہ ہے کہ فجر نکل گئی اور صبح کی روشنی ہو گئی۔ حسن، مجاہد
اور شعبی نے تنور سے مراد یہی تنور بتائی ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بروایت عطیہ حضرت
ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح فرمایا جب تم اپنے گھر کے تنور
سے پانی نکلتا دیکھو تو سمجھ لو یہ تمہاری قوم کا پیام ہلاکت ہے۔ حسن نے کہا پتھروں سے بنا ہوا ایک تنور تھا جس میں حضرت حواری
پکایا کرتی تھیں (وراثت) وہ حضرت نوحؑ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کو حکم ہوا کہ جب تنور سے پانی اُبلتا دیکھو تو تم اپنے ساتھیوں کو
لے کر سوار ہو جانا۔

یہ تنور کہاں تھا مجاہد اور شعبی نے کہا کوفہ کے ایک کنارہ پر تھا۔ شعبی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تنور کوفہ کے کنارہ سے ہی
جوش زن ہوا تھا۔ نوحؑ نے کوفہ کی مسجد کے اندر ہی کشتی تیار کی تھی اور باب کندہ کی جانب سے مسجد میں داخل ہونے والے کے
دائیں جانب وہ تنور تھا اور تنور سے پانی کا اُبلنا حضرت نوحؑ کے لئے (بطوفان آب کی) علامت تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مسجد کوفہ کے اندر باب کندہ کی
جانب سے تنور اُبلتا تھا۔ ابوالشیخ نے باسناد شعبی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس نے دانہ کو چیرا
اور جاندار کو پیدا کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی چار مسجدوں میں چوتھی مسجد ہے اور سوائے مسجد حرام (کعبہ) اور مسجد رسول اللہ ﷺ
کے دوسری کسی مسجد میں دس رکعت نماز پڑھنے سے اس مسجد میں دو رکعت پڑھنا مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسی کے دائیں جانب قبلہ
کی طرف تنور اُبلتا تھا۔

مقاتل نے کہا یہ حضرت آدمؑ والا تنور تھا اور شام میں اس جگہ واقع تھا جس کو عین وردہ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں
حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا (معلوم نہیں ہند سے مراد ہندوستان ہے یا وہ مقام جو عراق میں ہے) یہ قول
ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔

(فَارَ ماضی کا صیغہ ہے اس کا مصدر فَوْرَانُ ہے) نوران کا معنی ہے جوش زن ہونا (اُچھلنا اُبلنا)
قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ
ہم نے کہا ہر ایک (قسم کے جانوروں) میں سے ایک ایک نر اور
ایک مادہ یعنی دو عدد کشتی میں چڑھا لو۔

زوجین زوج نر مادہ کا جوڑ ہوتا ہے اور مادہ نر کا جوڑ، نر یا مادہ کوئی بھی دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوتا اس لئے ہر ایک
کو جوڑ کہا جاتا ہے ہر ایک موزہ کو دوسرے موزہ کا اور ہر جوتہ کو دوسرے جوتہ کا زوج (جوڑ) کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حیوان کا ایک
جوڑ، نر مادہ، کشتی میں سوار کر لو، لفظ اثْنین، زوجین کی تاکید ہے اور زوجین مفعول ہے۔

بنغوی نے اسی قصے کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے عرض کیا پروردگار میں ہر ایک کا جوڑا کس طرح لوں، اللہ نے آپ کے سامنے درندوں اور پرندوں کو جمع کر دیا اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ ان پر مارے، دایاں ہاتھ نر پر پڑا اور بایاں ہاتھ مادہ پر اس طرح ایک نر اور ایک مادہ آپ کے ہاتھ میں آگیا اور آپ نے ان کو کشتی میں سوار کر لیا۔

وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَن آمَنَ
اور اپنے گھر والوں کو بھی باستثناء اس کے جس (کے ڈوبنے) کا حکم پہلے ہی نافذ ہو چکا ہے اور (گھر والوں کے علاوہ دوسرے) مؤمنوں کو بھی یعنی ازل میں اللہ نے جن کو غرق کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے ان کو چھوڑ کر دوسرے گھر والوں کو سوار کر لو۔ حضرت نوحؑ کی بیوی واہلہ اور واہلہ کے پیٹ سے حضرت نوحؑ کا بیٹا کنعان یہ دونوں کافر تھے۔ مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ سے یہ ہی دونوں مراد ہیں۔
وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۶۱﴾ اور نوحؑ کے ساتھ ایمان لانے والے بس تھوڑے ہی تھے۔

..... نوحؑ پر ایمان لانے والوں کی تعداد کیا تھی؟ ❁

اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ قتادہ، ابن جریر اور محمد بن کعب قرظی کے قول پر کشتی میں سوار ہونے والے صرف آٹھ آدمی تھے، حضرت نوحؑ، آپ کی بیوی، آپ کے تین لڑکے سام، حام، یاقث اور تینوں کی بیویاں۔ ابن جریر، ابوالشیخ نے ابن جریر کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ اپنے تینوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کو سوار کر لیا تھا۔ حام نے کشتی میں اپنی بیوی سے قربت کر لی، حضرت نوحؑ نے بددعا کی کہ اس کے نطفہ کا رنگ بدل جائے، چنانچہ اس عورت سے حبشی پیدا ہوئے۔

اعمش کا قول ہے کہ کشتی میں کل سات آدمی تھے، نوحؑ ان کے تین بیٹے اور بیٹوں کی تین بیویاں۔ یہ دونوں قول صراحت قرآنی کے خلاف ہیں۔ آیت میں مَن آمَنَ كَا عَظْفِ آهْلِكَ پر ہے اور مذکورہ بالا تمام لوگ نوحؑ کے گھر والوں میں داخل تھے۔ (لہذا گھر والوں کے علاوہ کچھ دوسرے مؤمنوں کا بھی کشتی میں ہونا لازم ہے)۔ ابن اسحاق نے کہا اس شخص تھے حضرت نوحؑ، آپ کے تینوں بیٹے سام، حام، یاقث اور چھ دوسرے مؤمن اور سب کی بیویاں یعنی دس مرد اور دس عورتیں مقاتل نے کہا کل آٹھ آدمی تھے آدھے مرد اور آدھی عورتیں، تین بیٹے اور ان کی بیویاں اور بہتر دوسرے مؤمن۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی میں کل اسی مرد تھے جن میں سے ایک جرہم بھی تھا ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نوحؑ نے اپنے ساتھ اسی آدمیوں کو سوار کر لیا تھا اور آپ کی زبان عربی تھی یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے کشتی میں چھوٹی چھوٹی کو لیا اور سب سے آخر میں گدھے کو، گدھا داخل ہونے لگا اور اس کا سینہ اندر آگیا تو ابلیس اس کی دم سے لٹک گیا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اٹھ نہ سکیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا ارے اندر آ جا گدھا اٹھا مگر اٹھ نہ سکا حضرت نے فرمایا ارے اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو یہ لفظ بیساختگی میں آپ کی زبان سے نکل گیا ان الفاظ کو سنتے ہی شیطان نے گدھے کا راستہ چھوڑ دیا، گدھا اندر آگیا اور شیطان بھی اس کے ساتھ داخل ہو گیا حضرت نوحؑ نے فرمایا دشمن خدا تجھے کس نے داخل کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے (گدھے سے) نہیں فرمایا تھا کہ اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ آپ نے فرمایا دشمن خدا نکل جا۔ شیطان نے کہا اب تو مجھے اپنے ساتھ سوار کرنے کے بغیر آپ کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے شیطان کشتی کی پشت پر تھا۔

بعض اہل روایت کا خیال ہے کہ سانپ اور بچھو حضرت نوحؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمیں بھی چڑھا لیجئے حضرت نے فرمایا تم ضرر رساں اور سبب مصیبت ہو میں تم کو نہیں چڑھاؤں گا، کہنے لگے آپ ہمیں چڑھا تو لیجئے، ہم ذمہ دار ہیں کہ جو بھی آپ کا ذکر کرے گا ہم اس کو ضرر نہیں پہنچائیں گے، چنانچہ جس نے سانپ بچھو کے ضرر کے خوف سے سلام

عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ پڑھا اس کو سانپ اور بچھو نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔

حسن کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی میں صرف ان جانوروں کو چڑھایا جو بچہ یا انڈا دیتے ہیں جو کیچڑ سے پیدا ہیں جیسے مچھر، پسو وغیرہ ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا تھا۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا اور نوحؑ نے کہا کشتی میں سوار ہو جاؤ پڑھتے ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرَبًا وَمُرْسًا (یعنی ٹھہرنا) اور مُرْسًا یا ظرف زمان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا وقت یا ظرف مکان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا مقام یا مصدر ہے یعنی چلنا اور ٹھہرنا۔

إِن سَأَلْتَهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۴۱ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے یعنی اگر وہ تمہارے قصور معاف نہ کرتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم کو نجات نہ ملتی۔

بغوی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے جب ارادہ کیا کہ کشتی روانہ ہو جائے تو بسم اللہ کہا، کشتی چل دی اور جب کشتی کو ٹھہرانا چاہا تو بسم اللہ کہا کشتی ٹھہر گئی۔

وَهِيَ تَجْرِي بِمَوْجٍ مُّوجٍ كَالْجِبَالِ تَفْ مَوْجَةٌ كِي جَمْعٌ هِيَ لَهَا لَهَا۔ اور کشتی ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی۔ مَوْجٌ

وَنَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ اے میرے پیارے بیٹے! (ایمان لے آ اور) ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔ (یعنی کافروں کے مذہب یا ہم سے الگ رہنے میں کافروں کے ساتھ شامل نہ ہو) اس بیٹے کا نام کنعان یا عبید بن عمیر نام تھا۔

قَالَ سَاوِحِي إِلَى جَبَلٍ يَّعِصُنِي مِنَ الْمَاءِ پناہ پکڑ لوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا، (یعنی پہاڑ پر چڑھ کر ڈوبنے سے محفوظ رہوں گا)۔

قَالَ لَا عَصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ (ہے) بچانے والا کوئی نہیں، سوائے اس کے جس پر وہ رحم کرے۔

استثناء یا متصل ہے اور مَنْ محل رفع میں ہے۔ یعنی رحم کرنے والا اللہ ہی بچا سکتا ہے یا لفظ "مکان" محذوف ہے یعنی اسی شخص کا مقام بچا سکتا ہے جس پر اللہ رحم کر دے یعنی اہل ایمان کا مقام، مطلب یہ کہ پہاڑ وغیرہ کوئی چیز بچا نہیں سکتی، ہاں کشتی جو اہل ایمان کا مقام ہے ڈوبنے سے بچا سکتی ہے۔

يَا مَنْ مَحَلُّ نَصْبٍ فِيهِ، یعنی آج کوئی بھی محفوظ نہ رہے گا سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے۔ یا استثناء منقطع ہے یعنی سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے اللہ اس کو بچالے گا۔

وَحَالٌ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمَغْرِقِينَ ۝۴۲ اور دونوں کے درمیان یعنی نوحؑ اور ان کے بیٹے کے درمیان یا پسر نوحؑ اور پہاڑ کے درمیان لہریں حائل ہو گئیں اور وہ غرق کردہ لوگوں میں سے ہو گیا۔ یعنی ڈوبنے والوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔ یا غلیم الہی میں پہلے ہی یہ بات تھی، روایت میں آیا ہے کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے چالیس ہاتھ یا پندرہ ہاتھ اوپر چڑھ گیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے، بعض روایات میں آیا ہے جب گلی کو چوں میں پانی بہت بڑھ گیا تو ایک بچے کی ماں کو اپنے بچے کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوا وہ بچے کو لے کر پہاڑ کی طرف بھاگی۔ پہاڑ کے ایک تہائی حصہ پر ہی چڑھی تھی کہ کچھ دیر میں وہاں تک پانی پہنچ گیا عورت اور اوپر چڑھی اور دو تہائی پہاڑ تک پہنچ گئی، پانی وہاں بھی پہنچ گیا تو عورت اور اوپر چڑھی اور چوٹی پر پہنچ گئی، مگر

پانی وہاں بھی پہنچ گیا اور عورت کے گلے تک آگیا اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا، آخر پانی عورت کو بہا لے گیا۔ اگر (اس روز) اللہ کسی پر رحم کرنے والا ہوتا تو اس بچے کی ماں پر ضرور کرتا۔

میں کہتا ہوں یہ قصہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ طوفان آنے سے برسوں پہلے سے قوم نوح کی عورتیں بانجھ ہو گئی تھیں، طوفان آنے کے وقت کوئی بچہ ہی نہ تھا۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ
اور حکم دیا گیا (یعنی امیر طوفان پورا ہونے کے بعد زمین کو حکم دیا گیا) اے زمین اپنا پانی پی لے (نگل لے، جذب کر لے) یعنی وہ پانی باقی رہا اور دریاؤں اور نہروں کی شکل میں (سمٹ کر) بہنے لگا۔

نکلا ہو پانی جذب کر لیا۔ آسمان سے برسنا ہو پانی باقی رہا اور دریاؤں اور نہروں کی شکل میں (سمٹ کر) بہنے لگا۔ اور اے آسمان ٹھم جا، پانی برسنا ختم کر دے۔ آسمان سے بارش ہونی بند ہو گئی۔

وَلَيْسَ مَاءٌ أَقْلِعِي
اور پانی کم کر دیا گیا۔ یعنی اللہ نے پانی کو کم کر دیا۔ غَيْضَ فَعَلٍ لَّازِمٌ بَيْحِي۔ اس جگہ متعدی ہے۔

وَقَضَى الْأَمْرَ
اور کام تمام کر دیا گیا (کام پورا ہو گیا) یعنی اللہ نے کافروں کو ہلاک کرنے اور مؤمنوں کو بچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ
اور کشتی جوودی پر ٹھہر گئی۔ جوودی جزیرہ میں موصل کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے یا ملک شام میں ایک پہاڑ ہے۔

وَقِيلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰﴾
اور کہا گیا (یعنی اللہ نے فرمایا) دوری ہو ظالم قوم کو یا ظالم قوم اللہ کی رحمت سے دور ہو گئی، اور سب ہلاک ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے زمین کی خبر لانے کے لئے کوئے کو بھیجا وہ کسی مردار پر جا پڑا اور لوٹ کر نہیں آیا تو آپ نے کبوتر کو بھیجا، کبوتر واپس آیا تو اس کو چونچ میں زیتون کا ایک پتہ تھا اور پاؤں کیچڑ میں آلودہ تھے، یہ حالت دیکھ کر حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے کوئے کو بددعا دی کہ ہمیشہ ڈرتا رہے۔ اسی بددعا کا اثر ہے کہ کوا گھروں میں نہیں رہتا۔ اور کبوتر کی گردن میں ایک سبز کنٹھا ڈال دیا اور اس کو امن کی دعا دی، اس لئے وہ گھروں میں رہنے کا عادی ہے۔

عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بیان کیا تھا کہ دس رجب کو کشتی سب کو لے کر اٹھی اور ایک سو پچاس روز پانی میں رہی پھر دس محرم کو جوودی پر ٹھہری اور لوگ زمین پر اترے۔ ابن عساکر نے خالد زیات کی روایت سے اتنا زائد نقل کیا ہے کہ عاشورہ کے دن کشتی ٹھہری۔ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ والے جن و انس سے فرمایا آج روزہ رکھو۔

بغوی نے بھی لکھا ہے کہ نوحؑ ۱۰ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور چھ مہینہ تک کشتی چلتی رہی اور بیت اللہ (کعبہ) کی طرف سے گزری تو اس کے گرد اگردسات چکر لگائے کعبے کو اللہ نے اوپر اٹھا دیا تھا اس کی جگہ ڈوبنے سے باقی رہ گئی تھی۔ ۱۰ محرم کو کشتی سے اترے حضرت نوحؑ نے شکرانہ کا روزہ خود بھی رکھا اور ساتھ والوں کو بھی حکم دیا۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ صرف ایک کافر یعنی عوج بن عنق ڈوبنے سے بچ گیا تھا طوفان کا پانی اس کی کمر تک آیا تھا، محفوظ رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کشتی کے لئے سارے لکڑیوں کی ضرورت تھی اور ان کو ڈھونا ممکن نہ تھا تو اس نے ملک شام سے خود لا کر حضرت نوحؑ کو لکڑیاں دی تھیں۔

میں کہتا ہوں عوج کی یہ داستان قرآن مجید کی ظاہری عبارت کے خلاف ہے اللہ نے تو فرمایا ہے قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي

عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا دوسری آیت میں ہے قِيلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ اس سے پہلے آیا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ (ان تمام آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی کافر زندہ نہیں بچا تھا) عموم آیات سے کسی کی

خود لا کر حضرت نوحؑ کو لکڑیاں دی تھیں۔

میں کہتا ہوں عوج کی یہ داستان قرآن مجید کی ظاہری عبارت کے خلاف ہے اللہ نے تو فرمایا ہے قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي

عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا دوسری آیت میں ہے قِيلَ بَعْدَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ اس سے پہلے آیا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ (ان تمام آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی کافر زندہ نہیں بچا تھا) عموم آیات سے کسی کی

خود لا کر حضرت نوحؑ کو لکڑیاں دی تھیں۔

میں کہتا ہوں عوج کی یہ داستان قرآن مجید کی ظاہری عبارت کے خلاف ہے اللہ نے تو فرمایا ہے قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي

تخصیص بغیر قطعی نص کے ممکن نہیں اور قصہ مذکورہ کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے نہ نقل سے۔ (عوج کا قصہ محض افسانہ اور داستان ہے)

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ
اور نوح نے پکارا اپنے رب کو اور کہا اے میرے رب یہ واقعہ ہے کہ میرا بیٹا (کنعان) میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ بلاشبہ سچا ہے۔ جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کر لیا ہے (اس لئے میرے بیٹے کو ڈوبنے سے بچالے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈوبنے کے بعد حضرت نوح نے یہ عرض کیا ہو کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کر لیا تھا پھر میرے لڑکے کو کیوں نہیں بچایا۔

وَإِنَّتَ أَحْكَمُ الْحَكِمِينَ ﴿۵۱﴾ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔

کیونکہ تو سب سے زیادہ علم والا اور سب سے بڑھ کر منصف ہے، تیرے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا اور تو قوم کی ہلاکت اور میرے اہل کی نجات کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یا احکم الحاکمین کا یہ مطلب ہے کہ تو ہر حکم و حکمت والے سے زیادہ حکمت والا ہے (اس مطلب پر احکم کا ترجمہ ہو گا سب سے بڑی حکمت والا اور الحاکمین سے مراد ہوں گے حکم والے یا حکمت والے)

قَالَ يُنوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴿۵۲﴾
اللہ نے فرمایا نوح حقیقت یہ ہے کہ وہ تیرے اہل میں سے ہی نہیں (مؤمن کا کافر سے کوئی رشتہ مولایت نہیں) کیونکہ اس کے عمل درست نہیں۔ عمل سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی عمل والا۔ یہ مطلب ہے کہ اس کو بچانے کا سوال کرنا درست عمل نہیں ہے۔
فَلَا تَسْأَلِنَ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ﴿۵۳﴾
پس تو ایسی بات کا مجھ سے سوال نہ کر جس (کے صحیح یا غلط ہونے) کا تجھے علم نہیں۔

چونکہ نوح کی نداء کے اندر نجات اہل کا وعدہ تھا اور وعدہ کو پورا کرنے کی درخواست اس نداء کے اندر مضمیر تھی اس لئے نداء کو سوال قرار دیا اور سوال کی ممانعت فرمادی یا یوں کہا جائے کہ وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ نوح نے دریافت کی تھی، اس کو اللہ نے سوال قرار دیا اور ایسے سوال کی ممانعت فرمادی، اور اس سوال کو نادانی قرار دے کر اس سے روک دیا اور بطور زجر فرمایا۔
رَأْفًا أَعْطٰكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۵۴﴾
میں تجھے قطعی نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جائے۔

کیوں کہ جب مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کا نجات سے استثناء کر دیا تو خود ڈوبنے والوں کی کیفیت معلوم ہو گئی، مزید سوال کی ضرورت ہی نہیں رہی (بیان کردہ چیز پر غور نہ کرنا اور نہ سمجھنا اور سوال کرنا نادانوں کا کام ہے)۔
بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد و حسن نے کہا یہ لڑکا حضرت نوح کا نہ تھا حرامی تھا۔ امام ابو جعفر باقرؑ نے فرمایا وہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا تھا حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا، اسی لئے آپ نے مِنْ أَهْلِي (میری بیوی کا) کہا تھا۔ منیٰ میرا نہیں کہا۔
حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، ضحاک اور اکثر علماء کا قول ہے وہ حضرت نوح کا ہی حقیقی بیٹا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کسی پیغمبر کی بیوی نے زنا کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کا ہم مذہب نہیں، آپ کے دین والوں میں سے نہیں یعنی کافر ہے۔ اور إِنَّي أَعْطٰكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ کا یہ مطلب ہے کہ خود ہی کافروں کے ہلاک ہو جانے کی دعا کرتے رہے اور خود ہی ایک کافر کو بچا دینے کی درخواست کر رہے ہو یہ نادانی ہے۔

شیخ ابو منصور نے کہا حضرت نوح کا یہ بیٹا منافق تھا ظاہر میں مؤمن باطن میں کافر اور حضرت نوح کو اس کا باطنی کفر معلوم نہ تھا اور نہ آپ کبھی بھی إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي نہ کہتے نہ درخواست نجات کرتے جبکہ کافروں کے سلسلے میں بولنے کی آپ کو ممانعت کر دی گئی تھی اور فرمایا گیا تھا کہ لَا تَخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا (کافروں کے بچانے کے سلسلے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا) پھر اللہ نے حضرت نوح کو بتا دیا کہ تیرا یہ بیٹا (باطنی طور پر) کافر ہے۔

شیخ کا یہ قول قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ یا بُنَّیٰ اَرْكَبْ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ قَالَ سَنَاوِي اِلَى حَبْلِ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ وہ کافر تھا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهِ عِلْمٌ وَلَا اَتُغْفِرُ لِيْ وَتَرْحَمُنِيْ اَكُنْ مِنَ الْخَيْرِيْنَ ۝

نوح نے کہا اے میرے رب جس چیز (کی رحمت) کا مجھے

علم نہ ہو اس کے متعلق (آئندہ) سوال کرنے سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں اور ممانعت کے بعد اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے جو میں نے کافر کی نجات کی درخواست کی تھی اگر تو میری اس خطا کو معاف نہ کر دے گا اور (بصورتِ توبہ و عصمت مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں خاسر اعمال ہو جاؤں گا عملی خسارے میں رہوں گا۔

قَبِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ اٰمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ کشتی سے اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں لے کر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں (حضرت مولانا تھانوی نے جو دی سے زمین پر اترنا مراد لیا ہے) برکت کا معنی ہے ٹھوپذیر خیر۔ برکات سے مراد ہیں اللہ کے قرب کے درجات، اس کی رحمت و فضل، نسل کی کثرت اور قیامت تک ان کی بقاء اور انبیاء و اولیاء کا انہی میں سے پیدا ہونا۔

اَلَا تَسْمَعُ جَمَاعَتِيْنَ، یعنی وہ لوگ جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ وہ خود بھی جماعتوں کی شکل میں تھے اور تمام اقوام انہیں کی نسل سے پیدا ہونے والی تھیں اس لئے ان کو اُمم فرمایا۔ یا مَسْمَنٌ میں سے ابتداء سے ہے، یعنی وہ اقوام جو تمہارے ساتھیوں کی نسل سے پیدا ہوں گی ان پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی اور برکات کا نزول ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا قیامت تک جتنے مؤمن ہوں گے سب اس لفظ میں داخل ہیں۔

..... ایک شبہ

آیت) وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ کہ ہم نے نوح کی نسل کو ہی باقی رکھا بتا رہی ہے کہ صرف حضرت نوح کی نسل باقی رہی، دوسرے ساتھیوں کی نسل باقی نہ رہی۔

..... ازالہ

بے شک نوح کی نسل ہی باقی رہی لیکن آپ کے ساتھ کشتی میں آپ کے تینوں بیٹے بھی تھے انہی کی نسل چلی اور باقی رہی۔ دوسرے ساتھیوں کی نسل نہیں رہی (مَسْمَنٌ مَّعَكَ سے تینوں بیٹے ہی مراد ہیں)۔

اور (تمہارے ساتھیوں کی نسل وَ اُمَمٌ سَمَّيْتَهُمْ ثُمَّ يَسْأَلُكُمِنَا اَبْ اٰلِيْمٌ سے) کچھ ایسی قومیں ہوں گی جن کو (تحریر ازیلی کے مطابق دنیا میں) ہم بہرہ اندوز کریں گے پھر ہماری طرف سے (آخرت میں ان کے کفر کی وجہ سے) درد رساں عذاب ان کو پہنچے گا۔

بعض علماء کے نزدیک اُمم سے مراد حضرت ہوڈ، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب کی قومیں ہیں۔ اور عذاب الیم سے مراد ہے دنیوی عذاب۔

نِلْكَ مِنَ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ یہ (نوح کا قصہ) مجملہ غیبی خبروں کے ہے۔

یعنی جو خبریں تم کو معلوم نہیں تھیں (ان میں سے ایک نوح کا قصہ بھی ہے)۔

جس کو ہم تمہارے

نُوْحِيْهَا اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

پاس وحی کے ذریعے پہنچا رہے ہیں، نہ تم اس سے پہلے اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ اس کلام میں تشبیہ ہے اس بات پر کہ قصہ نوح کا علم ایک معجزہ ہے منجانب اللہ، کیونکہ آپ کی پوری قوم اس سے واقف نہیں تھی، ہم نے آپ کو اطلاع دی اور اسی کے

مطابق اطلاع دی جیسی گزشتہ آسمانی کتابوں میں تھی۔ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بیان سے اس اطلاع کی مطابقت یقیناً معجزہ ہے۔
فَاَصْبِرْ
پس نوح کی طرح تبلیغ رسالت پر اور تبلیغ کے راستہ میں کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دُکھوں

پر صبر کیجئے۔ کیونکہ

بلاشبہ (دنیا و آخرت میں) اچھا نتیجہ اور انجام انہیں لوگوں کے لئے ہے جو
إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۹﴾
لوگ شرک و معاصی سے بچنے والے ہیں۔ اس جملہ میں صبر کرنے اور نہ گھبرانے کی علت کا اظہار ہے۔

وَالِی عَادِ أَخَاهُمْ هُوْدًا
اور عاد کے پاس (ہدایت کے لئے) ان کے نسبی بھائی ہوڈ کو ہم نے بھیجا۔

قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ غَیْرَہٗ اِنَّ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۲۰﴾

ہوڈ نے کہا اے میری قوم (برادرانِ نسب) تمہا اللہ کی پوجا کرو (عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو) اس
کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (تم جو اس کی عبادت میں جبتوں کو بھی حصہ دار بنا لیتے ہو اور ان کو دربارِ الہی میں اپنا سفارشی قرار
دیتے ہو یہ محض اختراع ہے تم محض دروغ بندی کرنے والے ہو) کہ خود ایک عقیدہ تم نے تراش رکھا ہے اور خدا کی طرف اس
کی نسبت کر دی ہے (مترجم)

یَقَوْمِ لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا
اے قوم والو! میں اس نصیحت کا تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کہ
تم پر مالی بوجھ پڑے، اور بار پڑنے کی وجہ سے تم میری نصیحت کو نہ مانو۔ یا مال کا لالچ مجھے دروغ تراشی پر آمادہ کرے۔

اِنَّ اَجْرَیْ اِلَّا عَلَی الدِّیْنِ فَطَرْنِیْ
میرا ثواب تو بس اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا (یعنی ثواب کا
ذمہ تو اسی نے لے رکھا ہے اس لئے مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں۔ مترجم)

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۱﴾
کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی کیا اپنی اپنی عقل سے کام لے کر تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ایسے بے لالچ،
مخلص کا قول جھوٹ کے احتمال سے بھی پاک ہوتا ہے اور اس کی تصدیق کرنی تم پر لازم ہے۔

وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ
اور اے قوم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔ یعنی سابق شرک اور گناہ کرنے
کی معافی مانگو۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان لے آؤ، مسلم ہو جاؤ۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کی مرفوع روایت صحیح مسلم میں آئی ہے کہ

اسلام گزشتہ (گناہوں) کو ڈھا دیتا ہے۔

ثُمَّ تَوْبُوا اِلَیْہِ
پھر (شرک کو چھوڑ کر اور خالص توحید کے ساتھ مطیع بن کر) اس کی طرف لوٹو۔

یُرْسِلُ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِدْرَارًا وَّ یَزِدُّكُمْ قُوَّةً اِلَی قُوَّتِکُمْ
گا اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید ترقی دے گا۔
وہ خوب بارشیں تم پر برسائے

سورہ اعراف میں ہم نے بیان کر دیا ہے کہ قوم عاد ۱۰۰ سالہ کال میں مبتلا ہو گئی تھی، تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی
اور عورتیں بھی بانجھ ہو گئی تھیں، کسی کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ حضرت ہوڈ نے فرمایا اللہ سے استغفار اور توبہ کرو، وہی پانی
برسائے گا جس سے تمہاری مالی ترقی ہوگی اور وہی عورتوں کا بانجھ پن دور کرے گا اور بچے پیدا ہونے لگیں گے۔ اس طرح تم کو
مال و اولاد کی مزید طاقت حاصل ہو جائے گی۔ بعض نے قوت سے مراد لی ہے بدنی طاقت یعنی اللہ تمہاری جسمانی طاقت بڑھا
دے گا۔

وَلَا تَتَّوَلَوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۲۲﴾
اور مجرم رہ کر رُخ گردانی مت کرو۔ یعنی اپنے جرائم پر قائم رہتے ہوئے میری
دعوت سے منہ نہ پھیرو اور جس چیز کی طرف آنے کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ اس سے اعراض نہ کرو۔

قَالُوا یٰہُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ
قوم نے کہا ہوڈ تم نے کوئی قطعی دلیل پیش نہیں کی۔ یعنی ایسی دلیل پیش
نہیں کی جس سے تمہارے دعوے کی صحت ثابت ہو سکے۔ حضرت ہوڈ نے معجزات تو پیش کئے تھے (جو ثبوت رسالت کے لئے
کافی تھے) مگر قوم والوں کے دلوں میں عناد تھا اس لئے انہوں نے مذکورہ جملہ کہا۔

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۵۲﴾ اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کی عبادت چھوڑنے والے نہیں۔ اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں، یعنی تمہاری تصدیق نہیں کریں گی۔ مطلب یہ کہ نہ تمہارے قول کا عملی اتباع کریں گے کہ اپنے معبودوں کی عبادت ترک کر دیں۔ نہ اعتقادی تصدیق کریں گے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم کو ہمارے کسی معبود کا جھپٹا لگ گیا ہے۔

إِعْتَرَى (باب افعال) عَرَى يَرُوْهُ سے ماخوذ ہے، عَرَى کا معنی ہے پہنچ گیا۔ سوء سے مراد ہے جنون بدحواسی یعنی تم جو ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو اور ان کی عبادت سے ہم کو روکتے ہو تو ہمارے کسی معبود نے اس کا انتقام تم سے لیا ہے اور تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے کہ ایسی خرافات بک رہے ہو۔

یاماضی بمعنی مضارع ہے کہ تم جو معبودوں کو برا کہتے ہو ہمارا یقینی خیال ہے کہ کوئی معبود تم کو پٹ کر دے گا ہلاک کر دے گا، چونکہ ایسا ہو جانا قوم کے نزدیک ضروری اور یقینی تھا۔ اس لئے قطعی دھمکی دینے کے لئے مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ بولا۔ ہوڈ کا جواب آگے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ توجیہ اس کے مناسب ہے۔

قَالَ اِنِّي اَشْهَدُ اللّٰهَ وَاَشْهَدُ وَا اِنِّي بَرِيٌّ مِّمَّنْ اَنْشُرُ كُوْنٌ ﴿۵۳﴾ مِنْ دُوْنِهِ ہوڈ نے کہا میں اللہ کو شاہد بنا تا ہوں اور تم بھی گواہ ہو کہ تم جو اللہ کے سوا دوسرے (بتوں وغیرہ) کو اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نہ اللہ کے سوا بتوں کی پوجا کرتا ہوں نہ کسی بت سے ڈرتا ہوں۔

فَكَيْدًا وُنِي جَمِيْعًا پس اب تم سب (باہم امداد و تعاون کے ساتھ) مجھے دکھ پہنچانے اور ہلاک کرنے کی تدبیریں کر دیکھو۔

ثُمَّ لَا تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۴﴾ پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ حضرت ہوڈ کے اس کلام میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمہاری تدبیریں میری نظر میں حقیر ہیں۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ تمہارے معبود عاجز ہیں پتھر ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ آپ کا یہ قول ایک معجزہ تھا جو پورا ہوا، قوم والے شہ زور تھے بڑے طاقتور اور جابر ظالم تھے۔ آپ کے خون کے پیاسے بھی تھے مگر کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ سَبِّحْكُمْ مَّا مِنْ دَاٰبَةِ الْاٰهْوَا اِخِذْ بِنَاصِيَتِهَآ مجھے بلاشک و شبہ اللہ پر اعتماد ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہر جاندار کو اللہ پیشانی کے بالوں سے پکڑے ہوئے ہے، یعنی ہر جاندار اس کے پورے قابو میں ہے اس کی قدرت و قابو کے آگے عاجز و ذلیل ہے وہی جیسا چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔

بعوی نے لکھا ہے کہ ناصیہ کا لفظ خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اگر کسی چیز کی ذلت و بے بسی کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو عرب کہتے ہیں فلاں شخص کے پیشانی کے بال فلاں شخص کے ہاتھ میں ہیں (جس طرف کو چاہے موڑ دی اردو میں پیشانی کے بالوں کی جگہ گردن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص کی گردن فلاں شخص کے ہاتھ میں ہے۔ مطلب دونوں محاروں کا ایک ہی ہے۔ مترجم)

ضحاک نے کہا ناصیہ ہاتھ میں ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ فراء نے کہا وہی مالک اور قادر ہے۔ قسبی نے کہا وہی ہر جاندار کو مقهور (بے بس) کر دیتا ہے جس کی پیشانی کے بال تم پکڑ لو وہ بے بس (و مقهور) ہو جاتا ہے۔

اِن رَّبِّيْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے یعنی حق اور عدل پر قائم ہے نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا دے گا جو اس کا دامن پکڑ لے کبھی نامراد نہیں رہے گا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ (میرا کوئی نقصان نہیں) میں تم کو وہ پیام پہنچا چکا جس کو پہنچانے کے لئے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (اگر تم اعراض کرو گے تو اللہ تم کو ہلاک کر دے گا) اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ جو موجد ہوں گے اللہ ہی کے عبادت گزار اور اس کے فرماں بردار ہوں گے۔

وَلَا تَصْرُفْ وَذُنُوبُهُمْ (اور (روگرداں ہو کر) تم اس کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے (بلکہ اپنا ہی نقصان کرو گے) بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہارا وجود و عدم اس کے لئے برابر ہے۔ اس لئے اگر وہ تم کو ہلاک کر دے گا تو اس کا کچھ بگاڑ نہ ہوگا۔

إِنَّ رَبِّي عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (میرا رب یقیناً ہر چیز کا نگرال ہے تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے پوشیدہ نہیں ہے نہ وہ تم کو سزا دینے سے غافل ہے۔ یا یہ مطلب کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے ہر چیز اس کی نگہداشت میں ہے کوئی چیز اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَنَجَّيْنَاهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (اور جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم یا عذاب) ان کو پہنچا تو ہم نے ہود کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے مؤمنوں کو اپنی مہربانی کے ساتھ بچالیا اور سخت عذاب سے بچالیا۔ یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی رحمت سے ان کو محفوظ رکھا یا رحمت سے مراد ہے ایمان، یعنی ہم نے جو ایمان ان کو عطا کیا تھا اس کی وجہ سے ان کو محفوظ رکھا۔ مؤمنوں کی کل تعداد چار ہزار تھی۔ عذاب غلیظ سے مراد ہے طوفان جس سے قوم عاد کو ہلاک کیا گیا تھا۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ (اور یہ ہیں عاد کے قبائل یا عاد کی بستیوں کے نشانات جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی یعنی ہود اور دوسرے پیغمبروں کو نہیں مانا۔ ہر پیغمبر توحید کی دعوت دیتا ہے اور ہر پیغمبر کی تصدیق کرتا ہے اس لئے ایک کا انکار سب کا انکار ہے اور ایک کی نافرمانی سب کی نافرمانی۔ قوم عاد نے ہود کی رسالت کا انکار کیا۔ تو گویا پیغمبروں کا انکار کیا۔

وَاتَّبَعُوا أَمْرًا كُفْرًا كَلْبًا حَبْرًا عَنِيْدًا (اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔ عَنِيدٌ کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کرنے والے کو کہتے ہیں یہاں مراد ہے حق کو قبول کرنے سے انکار کرنے والا یہ لفظ عِنْدَ يَعْنِدُ عُنُودًا سے مشتق ہے۔ عُنُودًا انکار کرنا۔

ابو عبیدہ نے کہا عَنِيدٌ عُنُودٌ اور مُعَانِدٌ مخالفت کرنے والے مقابل کو کہتے ہیں۔ جبکہ عَنِيدٌ سے مراد ہیں قوم عاد کے سرکش سردار یعنی دعوت ایمان دینے والے ہادیان برحق کی تو انہوں نے نافرمانی کی اور جو تعلیم ان کے لئے ذریعہ نجات تھی اس کو ترک کر دیا اور ایسے لوگوں کے پیرو بنے جو کفر کی طرف لے کر جا رہے تھے اور ان کی تعلیم تباہ کن تھی۔

وَاتَّبَعُوا فِي هُدَايَا الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ (اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے (انسانوں اور فرشتوں کی) لعنت ڈالی گئی اور قیامت کے دن بھی (لعنت پڑے گی)۔

لعنت کا معنی اس جگہ ہے اللہ کی رحمت سے دور کر دینا مردود بنا دینا۔ یعنی انسانوں اور فرشتوں کی طرف سے ان پر لعنت ہونے کی دعا پڑے گی۔

الْآلِآنَ عَادًا كَفْرًا وَرَبُّهُمْ (گوش ہوش سے سن لو کہ عاد والوں نے اپنے رب کا انکار کیا تھا یا رب کی نعمتوں کی ناشکری کی تھی۔

الْآبَعْدَ الْعَادِ قَوْمِ هُودٍ (خوب سن لو دوری ہے (اللہ کی رحمت سے یا ہلاکت ہے) عاد کے لئے جو ہود کی قوم تھی۔

بغوی نے لکھا بعد کے دو معنی ہیں (۱) دُوری یعنی قُرب کی ضد (۲) ہلاکت۔ وکذانی القاموس۔ جملہ الَا بُعْدًا لِعَادِیْہِ
بددعائیہ ہے مراد یہ ہے کہ قوم عاد اپنے مذکورہ جرائم کی وجہ سے اس عذاب کی مستحق تھی جو ان پر آیا (مقصد یہ کہ جملہ اگرچہ
دعائیہ انشائیہ ہے مگر خبر یہ کہ معنی میں ہے دعا وہ شخص کرتا ہے جس کو کسی چیز کی خواہش ہو اور وقت دعا تک وہ حاصل نہ
ہوئی ہو اللہ تو محتاج نہیں پھر وہ کس طرح اور کس سے دعا کر سکتا ہے اس کے دعائیہ کلام کا مطلب محض خبر ہے اور اس جگہ تو خبر
کے ساتھ ساتھ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ قوم عاد عذاب کی مستحق ہی تھی جو عذاب ان پر آیا غلط نہیں آیا۔ (مترجم)

قوم عاد کی مزید تشریح ظاہر کرنے اور ان کی حالت کو سبق عبرت بنانے کے لئے حرف تنبیہ (الَا) کو مکرر ذکر کیا۔ قوم
ہوڈ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس بات کی طرف کہ قوم کو استحقاق عذاب و لعنت صرف اس وجہ سے ہوا کہ ہوڈ کی انہوں نے مخالفت
کی۔ ہوڈ کے اور قوم کے درمیان جو واقعات ہوئے انہوں نے قوم کو مستحق لعنت و عذاب بنا دیا۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ قوم ہوڈ
کننے کی یہ وجہ ہو کہ عاد نام کی دو قومیں گزری ہیں، عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ، یعنی قوم ثمود اور آیت میں عادِ اولیٰ یعنی قوم ہوڈ مراد ہے
قوم ثمود کا ذکر کرنا اس جگہ مطلوب نہیں ہے)

اور ہم نے ثمود کی
وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنِّ إِلَهٍ غَيْرُهُ
طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، صالح نے کہا اے میری قوم اللہ کی پوجا کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ
هُوَ أَنشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ
اسی نے تم کو زمین کے مادہ سے پیدا کیا یعنی تم کو آدم (کی نسل) سے پیدا کیا اور آدم
کو مٹی سے۔

وَاسْتَعْمَرَ كُمْ فِيهَا
اور تم کو زمین میں آباد کیا۔
استعمر کا مادہ عمر ہے اور عمر سے یہ لفظ بنا ہے۔ ضحاک نے ترجمہ کیا ہے تمہاری عمریں دراز کیں، ۳۰۰ سے ۱۰۰۰ برس
تک قوم ثمود والوں کی عمریں ہوتی تھیں۔ قوم عاد کی بھی یہی عمریں تھیں۔
استعمرکم فیہا کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو زمین میں آباد ہونے کی قدرت دی تم کو زمین کا آباد
کرنے والا اور زمین کا باشندہ بنا دیا۔
مجاہد نے کہا استعمر کا لفظ عمری سے مشتق ہے (عمری بہہ کی ایک قسم ہے عمر بھر کے لئے اگر کوئی چیز کسی کو دے
دی جائے اور موہوب لہ کے مرنے کے بعد وہ چیز واہب کی طرف لوٹ آئے تو ایسے بہہ کو عمری کہا جاتا ہے) یعنی اللہ نے یہ
زمین تمہارے لئے بنا دی ہے جب تک تم زندہ رہو پھر تمہارے مرنے کے بعد اللہ اپنی ملک میں لے لیتا ہے (یعنی تمہارا عارضی
قبضہ بھی ختم ہو جاتا ہے) یا یہ مطلب کہ زمین پر مکانوں میں تم کو عمر بھر رکھا جاتا ہے پھر تمہارے مرنے کے بعد تمہارے مکان
دوسروں کو دیئے جاتے ہیں۔

پس تم اللہ سے استغفار کرو تا دم و شر مسار ہوتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع
فَاَسْتَغْفِرُوا لَهُ ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ
کرو۔

إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿۴۱﴾
بلاشبہ میرا رب اپنے بندوں کے قریب ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا
ہے۔ یعنی اللہ کا بندوں سے قُرب ذاتی ہے، مگر کیفیت معلوم نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ بندوں سے قریب ہے کہ اس نے
وجود عطا کیا یا یہ مراد ہے کہ اللہ کی رحمت اپنے دوستوں سے قریب ہے۔

قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا
قوم ثمود نے کہا صالح تم تو ہم میں ہو نہمار معلوم ہوتے تھے، یعنی ہمیں
امید تھی کہ تم ہمارے سردار ہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر ہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم
امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر ہو گے اور ہمارے دین کی طرف رجوع کرو گے۔
اس سے پہلے یعنی نبوت کے دعوے اور ترک بت پرستی کی دعوت سے پہلے لیکن اب چونکہ ہم نے
قَبْلَ هَذَا

تمہاری یہ باتیں سن لیں تو ہماری امید تم سے ٹوٹ گئی۔

اِنَّهَا اَنْ تَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا
کرتے ہو) جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔

اور جس (توحید کو ماننے اور بت پرستی کو ترک کرنے) کی تم ہم کو دعوت دے رہے ہو ہم قطعی طور پر اس کی طرف سے تردد آفریں شک میں ہیں مُرِيْبٌ (اسم فاعل) اَرَابَ فِي الْاُمُوْرِ سے ماخوذ ہے۔ تردد پیدا کر دینے والا یا اَرَابَهُ سے ماخوذ ہے بے چینی، اضطراب طبع اور بے اطمینانی پیدا کر دینے والا۔
قَالَ يَقُوْمُ اَرَعَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ سَرَّبِيْ وَ اُنْتُنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُمْهُ تَد

آپ نے فرمایا اے قوم اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلائل پر قائم ہوں اور خدا نے مجھ کو نبوت سے نوازا ہے تب اگر میں خدا کی نافرمانی کرنے لگوں تو خدا کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا۔ چونکہ کافروں کو حضرت صالح کا صاحب بصیرت ہونا تسلیم نہ تھا، اس لئے آپ نے بھی لفظ اِنْ شَكِّیْ بولا اور نہ آپ کو اپنی جگہ یقین تھا کہ میں صداقت و بصیرت پر ہوں) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنْ (شرطیہ حکمیہ نہ ہو بلکہ) مخففہ ہو۔ یعنی بلاشبہ میں اپنے رب کی طرف سے بیٹنہ پر ہوں۔ رحمت سے مراد ہے نبوت اور حکمت۔ مَنْ اللّٰهِ سے مراد ہے مَنْ اللّٰهِ نافرمانی سے مراد ہے تبلیغ احکام اور ممانعت شرک میں کوتاہی کرنا۔

فَمَا تَزِيْدُ وُنِّيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝۱۶
(یعنی اللہ نے جو نبوت و ہدایت مجھے عطا فرمائی ہے تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔ اور اللہ کے عذاب کے مستحق بنتے ہو اور اس میں میرا سراسر نقصان ہے) پس تم لوگ میرے خسارے کو ہی بڑھا رہے ہو۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت صالح تو کبھی بھی خسارے میں نہیں رہے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے لئے خسارہ بڑھا رہے ہو بلکہ تخسیر کا معنی ہے کسی کی طرف خسارے کی نسبت کر دینا۔ خسارہ یا ب قرار دینا۔ جیسے تکفیر و تفسیق کا معنی ہے کسی کو کافر اور فاسق قرار دینا۔ کفر و فسق کی طرف منسوب کرنا آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تکذیب سے میرے لئے اس بات کا اضافہ ہو جاتا ہے کہ میں تم کو خاسر قرار دوں اور خسارہ یا ب کہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے تخسیر کا ترجمہ کیا ہے خسارے کو دیکھنا یعنی تمہاری تکذیب سے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تم بہت نقصان اٹھاؤ گے، بڑے خسارے میں رہو گے، یا بڑے خسارے اور نقصان میں ہو۔

قوم ثمود نے کہا اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے پتھر کی چٹان سے ایک اونٹنی جو دس ماہہ گا بھن ہو برآمد کر دو۔ حضرت نے دعا کر دی، فوراً چٹان سے ایک اونٹنی برآمد ہو گئی، جس کا بچہ بھی فوراً ہو گیا۔ اس وقت آپ نے فرمایا۔
وَلْيَقُوْمِ هٰذِهِ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةٌ
اور اے قوم والو! یہ (براہ راست بغیر ماں باپ کے پیدا کی گئی) اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک معجزہ ہے۔

پس اس کو اللہ کی زمین میں گھومتی پھرتی رہنے دو تاکہ زمین کا سبزہ چرتی پھرے اور زمین کا پانی پیتی رہے۔ تم پر اس کی خوراک اور پانی کا کوئی بار نہیں۔

وَلَا تَمْسُوْهَا بِسَوْءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝۱۷
اور اس کو بُری نیت سے ہاتھ مت لگانا
ورنہ تم کو عذاب الہی سے دوچار ہونا پڑ جائے گا۔

یعنی تین دن میں تم پر عذاب آجائے گا۔
فَعَقَرُوْهَا
پس ثمود نے اس کی کوچیں کاٹ دیں۔ یعنی قوم ثمود کے مشورے اور حکم سے قدار بن سالف نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔

فَقَالَ تَمْتَعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعَذَابٌ غَدِيْرٌ مَّكْدُوْبٌ ۝۱۸
صالح نے کہا تم

اپنے گھر (یعنی دنیا بستی) میں تین روز مزے اڑاؤ (تین روز کے بعد ہلاک کر دیئے جاؤ گے) یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے۔ یعنی چار شنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ، تین روز زندہ رہو گے، پہلے روز صبح کو تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ، پھر سب مر جاؤ گے۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِن خِزْيِ يَوْمِئِذٍ

پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آپہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ والے مؤمنوں کو اپنی رحمت کے سبب بچالیا اور اس روز کی رسوائی (یعنی ہلاکت) سے محفوظ رکھا۔

بلاشبہ تمہارا رب ہر شے پر قادر اور غالب ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ۝۱۱

اور جن لوگوں نے ظلم یعنی کفر کیا تھا ان کو ایک چیخ نے پکڑ لیا۔

وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ

یعنی جبریل نے ایک چیخ ماری یا آسمان سے ایک کڑک دار چیخ آئی اور زمین سے بھی ایک گرجدار چیخ نکلی جس کی وجہ سے ان کے دل پھٹ گئے۔

فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُنُودًا ۝۱۲

اور سب اپنے گھروں میں مردہ ہو گئے (یعنی صبح کو مرے کے مرے رہ گئے۔ مترجم)

كَانَ لَكُمْ يَوْمَئِذٍ فِيهَا

گویا گھروں میں رہتے ہی نہ تھے۔

خوب سن لو (قوم) تمہود نے اپنے رب

الْآنَ تَمُودُ أَكْفَرُ مَا كَفَرِ الْآبَعْدَ الشَّمُودَ ۝۱۳

کے ساتھ کفر کیا۔ خوب سن لو قوم تمہود کو رحمت سے دوری ہوئی۔

اور یقیناً پہنچے ہمارے قاصد (ملائکہ) ابراہیم کے پاس (اسحق اور

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى

یعقوب بن اسحاق کی پیدائش یا قوم لوط کی ہلاکت کی خوشخبری لے کر۔ بقول حضرت ابن عباس و عطاء یہ ملائکہ تین تھے۔ جبریل، میکائیل، اسرافیل۔ محمد بن کعب نے کہا جبریل اور ان کے ساتھ سات دوسرے ملائکہ تھے، ضحاک نے کہا نو تھے، مقاتل نے کہا ۱۲ تھے۔ سعدی نے کہا گیارہ تھے، سب ملائکہ خوبصورت لڑکوں کی شکل میں پہنچے تھے۔

فَرَشْتُوهُمْ نِجْمًا قَالَ سَاسًا

فرشتوں نے کہا (ہم آپ کو) سلام کرتے ہیں ابراہیم نے کہا تم پر بھی سلام ہو۔ فرشتوں نے جملہ فعلیہ استعمال کیا جو حدیث فعلی اور زمانے کو بتا رہا ہے اور حضرت ابراہیم نے سلام کہہ کے جملہ اسمیہ کہا جو استمرار و دوام پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابراہیم کا جواب فرشتوں کے سلام سے بہتر تھا۔

بعض علماء کے نزدیک سلاماً سے مراد ہے صلح و سلامتی، یعنی ہماری تم سے دشمنی اور جنگ نہیں ہے دوستی اور صلح

فَمَا لَبِثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ ۝۱۴

حَنِيزٌ گرم پتھر پر بھنا ہوا، قاموس میں ہے، حَنْدَ الشَّاةِ (ماضی) يَحْنِدُ (مضارع) حَنْدًا يَأْتِي حَنْدًا ذَا لَدُونِ مَصْدَرًا بَكْرِيًّا كَاغْوَشْتِ بَهُونًا، گوشت پر گرم پتھر بھوننے کے لئے رکھ دے حَنِيزٌ (صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول) بھونا ہوا۔

بعض نے کہا حَنِيزٌ کا ترجمہ ہے چربی ٹپکتا ہوا، حَنْدَتُ الْفَرَسِ میں نے گھوڑے پر جھول ڈال کر اس کے بدن سے پسینہ نکال دیا۔ قاموس میں ہے حَنْدَتُ الْفَرَسِ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کو ایک مخصوص حد تک دوڑ لیا۔ پھر اس پر تہ بہ تہ جھول ڈال کر دھوپ میں کھڑا کر دیا تاکہ خوب پسینہ آجائے۔

مؤخر الذکر ترجمہ پر بطور مجاز فریبہ پتھر امراد ہو گا اور دوسری آیت میں جَوْبَعِجْلٍ سَمِينٍ آیا ہے اس سے معنی مطابقت ہو جائے گی۔ قنادہ نے کہا حضرت ابراہیم کا اکثر مال گائیں تھیں (یعنی آپ بطور ذخیرہ گائے پالتے تھے)

فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ

جب ابراہیم نے دیکھا کہ یہ کھانے کی طرف راغب نہیں

ہیں تو ان سے اجنبیت محسوس کی۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ نَكَرَ (ثلاثی، مجرد باب سَمْع) اور اَنْكَرَ (ثلاثی مزید باب افعال) اور اِسْتَنْكَرَ (باب استفعال) ہم معنی ہے۔ قاموس میں ہے تَنْكَرَ (باب تَفْعَل) خوش گو اور حالت سے بدل کر کسی کا ناگو اور حالت پر پہنچ جانا۔ اور محسوس کیا اپنے دل میں ان کی طرف سے خوف۔ قاموس میں ہے۔ اَوْجَسَ محسوس کیا اور دل میں چھپایا۔ مقاتل نے کہا اَوْجَسَ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہو گیا۔ بغوی نے لکھا ہے وُجُوسٌ کا اصل (لغوی) معنی ہے داخل ہونا۔ یعنی خوف ابراہیمؑ کے دل میں داخل ہو گیا۔

سِنْهُمْ مہمانوں کی طرف سے دل میں خوف محسوس کیا۔ قتادہ نے کہا اس زمانہ میں ان لوگوں کا دستور تھا کہ اگر مہمان میزبان کا کھانا نہیں کھاتے تھے تو میزبان خیال کرتا تھا کہ یہ لوگ برے ارادے سے آئے ہیں ان کی نیت بخیر نہیں ہے رات کو آنے والے مہمان کو کھانا پیش کیا جاتا، اگر وہ کھالیتا تو گھر والے اس کی طرف سے بے خوف ہو جاتے اور نہ کھاتا تو ڈرنے لگتے کہیں یہ چور تو نہیں کہ لوٹنے آیا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی مہمانوں کی طرف سے برے ارادے کا اندیشہ ہوا۔ صحیح ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے (مگر آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں اللہ کو میری کوئی حرکت پسند نہ آئی ہو اور فرشتے کوئی مصیبت ڈالنے کے لئے بھیجے گئے ہوں یا ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔

قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمِ لُوطٍ ﴿۱۰﴾
مترجم (کوئی خوف نہ کریں ہم کو تو قوم لوط کی طرف ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے) بھیجا گیا ہے۔
اور ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ بنت ہاران بن ناخور جو حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی بیٹی تھی) کھڑی ہوئی تھی۔ پردہ کے پیچھے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹھے ہوئے تھے اور بیوی کھڑی مہمانوں کی خدمت کر رہی تھی۔

فَضْحِكْتُ پس حضرت سارہ بشارت سن کر ہنس پڑیں۔ مجاہد اور عکرمہ نے ترجمہ کیا ہے اس کو اسی وقت حیض ہو گیا۔ عرب بولتے ہیں ضَحِكْتُ الأرنبُ خرگوش کو حیض ہو گیا۔ قاموس میں بھی یہی ہے ضَحِكْتُ السَّمْرَةُ کیکر کے درخت سے گوند بننے لگا۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس جگہ ضَحِكْتُ سے مراد ہنس دینا ہی ہے۔ ہنسنے کا سبب کیا تھا علماء نے اس کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔

(۱) خوشی کی وجہ سے ہنس پڑی تھیں۔ فرشتوں نے جب لَا تَخَفْ کہا تو حضرت ابراہیمؑ کا خوف بھی جاتا رہا اور بیوی کا بھی۔ اس سے خوشی ہوئی اور خوشی سے ہنسی۔

(۲) سدی نے کہا ہنسی کا سبب تعجب تھا، حضرت ابراہیمؑ نے کھانا پیش کیا، مہمانوں نے نہیں کھایا۔ ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے خوف ہوا، خیال کیا کہ یہ چور نہ ہوں، پوچھا کیوں نہیں کھاتے۔ مہمانوں نے کہا ہم بغیر قیمت (ادا کئے) نہیں کھاتے۔ ابراہیمؑ نے کہا تو اس کی قیمت دے دو۔ مہمانوں نے پوچھا قیمت کیا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا اور کھانے کے بعد الحمد لله کہنا۔ یہ جواب سن کر جبرئیلؑ نے میکائیلؑ کی طرف دیکھا اور کہا اس شخص کو حق ہے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنا لے اس کے بعد بھی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ نے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھے نہ دیکھے تو سارہ تعجب سے ہنس دیں۔ اور بطور تعجب کہا ہم ان مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں ان کے اعزاز میں کھانا پیش کر رہے ہیں، تعجب ہے کہ یہ نہیں کھاتے۔

(۳) قتادہ نے کہا اس بات پر ہنسی کہ قوم لوط پر عذاب قریب آگیا اور وہ غفلت میں پڑی ہے۔
(۴) بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ میں نے ابراہیمؑ سے جو بات پہلے کہی تھی وہ ہی آخر صحیح نکلی، بیوی نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا تھا لوط کو اپنے پاس بلا لیجئے، مجھے نظر آرہا ہے کہ اس کی قوم پر عذاب آئے گا۔

(۵) مقاتل اور کلبی نے کہا بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ یہ تو تین شخص ہیں جن سے ابراہیم ڈر رہے ہیں اور ابراہیم کے ساتھ تمام نوکر چاکر خدمت گار موجود ہیں پھر ڈرنے کے کیا معنی۔

(۶) بیٹے اور پوتے کی بشارت اور قوم لوط کے ہلاک ہونے کی خبر سن کر خوشی سے ہنس پڑیں۔

(۷) حضرت ابن عباس اور وہب کا قول ہے کہ اس بات پر ان کو تعجب ہوا کہ میرا شوہر بوڑھا اور میں بوڑھی ایسی حالت میں اولاد ہونا عجیب بات ہے۔ اور عبارت میں کچھ تقدیم تاخیر ہے۔ **وَأَمْرًا تَقَائِمَةً** کے بعد ہے۔

فَبَشِّرْنَهَا بِإِسْحَاقَ ۖ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ﴿۴۱﴾
پس ہم نے عورت کو اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اسحاق کے پیچھے (اسحاق کے بیٹے) یعقوب کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ اس کے بعد ہے **فَضَحِكَتْ** یعنی یہ بشارت سن کر وہ ہنس پڑیں۔

عورت کو خصوصیت کے ساتھ بشارت دینے کی تین وجوہ تھیں۔

(۱) یہ بتانا مقصود تھا کہ اسحاق و یعقوب تیری نسل سے ہوں گے کسی دوسری صورت سے ابراہیم کی یہ نسل نہ ہوگی۔

(۲) اولاد ہونے کی خوشی مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے۔

(۳) بیوی بانجھ تھی اور اولاد سے ناامید۔ اس لئے اس کو بشارت دی گئی کہ تیرے لڑکا ہو گا اور پوتا بھی تیرے سامنے ہی

ہو جائے گا۔ تو پوتے کو بھی دیکھ لے گی۔ جب بیوی کو اولاد کی بشارت دی گئی تو اس نے منہ پیٹ لیا اور کہا۔

قَالَتْ يَوَيْلَتِي ۖ أَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ ۖ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا ۖ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ﴿۴۲﴾

کہنے لگیں کیا خوب بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے بچے ہوں گے یہ بڑے اچھے کی بات ہے۔

يَوَيْلَتِي کلمہ تعجب ہے، اصل لغت میں یہ کلمہ نوحہ ہے (جو کسی کے مرنے پر کہا جاتا ہے) پھر ہر مصیبت اور قابل

تعجب چیز میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیم کی بیوی کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۹۰ سال اور بقول مجاہد ۹۹ سال تھی۔

بَعْلٌ شوہر اصل میں کسی کام کے منتظم کو بَعْلٌ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۱۲۰ برس

اور بقول مجاہد ۱۰۰ سال تھی، اور بشارت سے ایک سال بعد بچہ پیدا ہو گیا تھا۔

قَالُوا أَلْعَجِبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ
فرشتوں نے کہا کیا اللہ کے حکم پر تجھے تعجب ہو رہا ہے۔ حکم سے مراد ہے اللہ

کی قدرت اور قضاء یعنی اللہ کی قدرت پر تجھے تعجب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اللہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا، پس وہ

چیز ہو جاتی ہے۔

..... ایک شبہ

تعجب نام ہے اس حالت کا جو کسی انوکھے اور غیر معمولی امر کو دیکھنے کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اور اولاد کی بشارت تھی بھی انوکھی، غیر معمولی چیز، لیکن کسی امر کے غیر معمولی اور انوکھے ہونے سے یہ بات تو نہیں کہی جاسکتی کہ وہ اللہ کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر نادار امر اللہ کی قدرت میں داخل ہے اور اس پر تعجب کرنا نامناسب (اور خلاف فطرت۔ مترجم) بھی نہیں ہے۔ پھر فرشتوں نے حضرت ابراہیم کی بیوی کے تعجب کا انکار کیوں کیا (اور اس کو نازیبا کیوں قرار دیا۔ مترجم)۔

..... ازالہ

کاشانہ نبوت اور مہبط وحی و معجزات میں رہنے والوں کے خصوصی مرتبہ کا تقاضا تھا کہ (روز مرہ) ہونے والے غیر معمولی واقعات اور خارق عادت حوادث ان کے لئے غیر معمولی اور کوئی اچھے کی چیز نہ ہوں۔ نہ ان کو ان پر کوئی تعجب کرنا چاہئے کوئی

ہوش مند (مؤمن) ایسے نادر واقعات پر (روز مرہ دیکھنے کے وجہ سے) تعجب نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی توساری عمر ایسے نشانہائے قدرت دیکھنے ہی میں بتی تھی ان کا تعجب کرنا تو بہت ہی زیادہ تعجب آفریں تھا۔
 رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ
 برکتیں ہیں یا ہوں۔

بعض علماء نے کہا یہ جملہ دعائیہ ہے بعض نے کہا خبر یہ ہے (ہم نے دونوں ترجمے کر دیئے ہیں۔ مترجم رحمت سے مراد ہے نعمت یا محبت اور برکت سے مراد ہے ہر خیر کی ترقی اور بڑھوتری، بعض علماء کے نزدیک رحمت سے مراد ہے نبوت اور برکات سے مراد ہیں نبی اسرائیل کے (بارہ) خاندان۔ کیونکہ تمام انبیاء نبی اسرائیل حضرت سارہ کی نسل سے ہوئے ہیں۔

رحمت اللہ مستقل جملہ ہے اور رفع تعجب کی علت ہے۔ مطلب یہ کہ اے اہل خانہ تم کو بشارت اولاد پر تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اللہ کی ایسی رحمتیں اور برکتیں تو تمہارے لئے بکثرت موجود ہیں۔ اَهْلَ الْبَيْتِ میں لام کا زیر فعل مدح کے محذوف ہونے کی وجہ سے ہے یا نداء کی وجہ سے یا فعل تخصیص مقدر ہونے کی وجہ سے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل نہ تھیں، آیت میں شیعہ کے اس قول کی تردید ہے (حضرت سارہ کو اہلبیت کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے) لغت کے لحاظ سے اہل خانہ تو بیویاں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں، دوسرے لوگوں کو تو جعاً اہل بیت کہا جاتا ہے۔
 إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝۴۶
 وہ نہایت قابل ستائش بڑی ہی شان والا ہے۔

حَمِيدٌ یعنی مستحق ستائش کام کرنے والا۔ مجد کے معنی جوہری نے صحاح میں لکھے ہیں (ذاتی) بزرگی اور (افادی) کرم کی وسعت۔ کریم اللہ کی صفت بھی ہے اور انسان کی بھی۔ اللہ کے کرم کا معنی ہے احسان اور پیہم عطائے نعمت، اور انسان کے کرم ہونے کا معنی ہے اس کے اخلاق و افعال کا قابل ستائش ہونا جب تک اخلاق حمیدہ کا ظہور انسان سے نہ ہوگا اس کو کریم نہیں کہا جاسکتا۔

بغوی نے لکھا ہے (لغت میں) مجد کا اصل معنی ہے بلندی شان۔ بیضاوی نے مجید کا ترجمہ کیا ہے کثیر الخیر والاحسان۔ قاموس میں ہے مجید بلند شان والا۔ کریم، شرف والا، فعال۔
 فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرُّوْعُ
 پھر جب ابراہیمؑ (کے دل) سے خوف جاتا رہا اور گھبراہٹ دور ہو گئی۔

وَجَاءَتْهُ الْبُشْرٰى
 اور اس کے پاس (اسحق و یعقوب کی) بشارت آگئی۔ یعنی خوف کی جگہ بشارت نے لے لی۔

يُجَادِلُنَا
 تو ہم سے جھگڑنے لگا۔ یعنی ہم سے کلام کرنے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے رب سے جھگڑا کرنا تو ممکن ہی نہ تھا اس لئے جھگڑنے سے مراد ہے سوال اور دعا کرنا۔

عام اہل تفسیر نے (مضاف کو محذوف مانا ہے اور) مطلب بیان کیا ہے ہمارے قاصدوں سے جھگڑنے لگا۔
 فِي قَوْمٍ لُّوْطٍ ۝۴۷
 قوم لوط کے بارے میں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ملائکہ سے فرمایا اگر لوط کی بستیوں میں پچاس مؤمن ہوں گے تو کیا تم ان کو ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے جواب دیا۔ نہیں فرمایا اگر چالیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ (ہلاک کریں گے) فرمایا اگر تیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ اسی طرح آپ پانچ تک پہنچے۔ اور فرشتے نہیں کہتے رہے۔ آخر آپ نے فرمایا اگر وہاں ایک مسلمان ہوگا تو کیا تم اس کو ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا تو وہاں لوط موجود ہے (اس لئے تم ان بستیوں کو ہلاک نہ کرو) فرشتوں نے کہا ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون (کون مؤمن) ہے۔ ہم لوط کو اور لان کی بیوی کے علاوہ دوسرے گھر والوں کو پچالیس گے۔ ان کی بیوی پیچھے رہ جانے اور ہلاک ہو جانے والے لوگوں میں شامل ہوگی۔
 اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوْاٰهٌ سَنِيْبٌ ۝۴۸
 واقعی ابراہیمؑ بڑے حلیم الطبع، رحیم المزاج، قیق القلب تھے۔

لَحْلِيمٍ سے مراد ہے مجرم سے انتقام لینے میں جلدی نہ کرنے والا (بردار، متحمل مزاج) آوَاهُ گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرنے والا، اور لوگوں کی حالت پر بڑا افسوس کرنے والا۔ مُنِيبٌ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا۔ قاموس میں ہے آوَاهُ یَقِينٌ کرنے والا۔ یا بہت دعا کرنے والا، یا مہربان، نرم دل، یاد اللہ مند۔ حبشی زبان میں آوَاهُ کا معنی ہے مؤمن۔
حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کو ہلاک نہ کرنے کے متعلق جو ملائکہ سے جھگڑا کیا اس کی وجہ آپ کے یہ تین اوصاف تھے، آپ کا دل نرم تھا، آپ کے دل میں بڑا جذبہ رحم تھا، آپ مجرم سے انتقام لینے میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر ابراہیمؑ کے جواب میں فرشتوں نے کہا۔

يَا اِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۗ اِنَّهٗ قَدْ جَاءَ اَمْرًا سَرِيًّا ۗ
ازلی کے موافق قوم لوط پر عذاب نازل ہونے کا تمہارے رب کا حکم ہو چکا۔
وَلَا تَهَمُّ اَنْ يَّهْمَ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۱۹﴾
جھگڑے سے نہ دعا سے، نہ کسی اور طرح سے۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا
اور جب ہمارے قاصد (یعنی وہی ملائکہ) لوط کے پاس پہنچے۔ نوخیز
خوبصورت بے ڈاڑھی مونچھ کے لڑکوں کی شکل میں۔

سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّكَ
تو لوط کو ان کا آنا ناگوار ہوا۔ حضرت لوط ان کو آدمی سمجھے اس لئے (قوم کی طرف سے خطرے کے زیر اثر) آپ کو فکر ہو گئی کہ کہیں قوم والے کچھ ناشائستہ ارادہ نہ کریں اور میں ان کو دفع کرنے پر قادر نہ ہوں۔
وَصٰقٍ يَّهْمُ دَرْعًا
ان قاصدوں کی وجہ سے لوط دل تنگ ہوئے۔

بَعُوْا نِزْرًا
بغوی نے ذرْع کا ترجمہ کیا ہے دل، بیضاوی نے لکھا ہے ان کی موجودگی سے لوط کا سینہ تنگ ہو گیا یعنی آنے والی مصیبت کو دفع کرنے کی قوت نہ تھی اور کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے آپ کے دل میں کوفت پیدا ہو گئی کہ اب کیا کروں، میں کہتا ہوں ذرْع کا لغت میں معنی ہے بانہ یا کلانی مجازاً قوت مراد ہوتی ہے۔ یَدٌ سے بھی بطور مجاز قوت مراد ہوتی ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت سے عاجز ہو گئی کذافی القاموس۔

وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۲۰﴾ اور کہا یہ بڑا سخت دن ہے۔

قادر اور سدی کا بیان ہے کہ ابراہیمؑ کے پاس سے نکل کر فرشتے لوط کے پاس ان کی بستی میں دوپہر کے وقت پہنچے، لوط اپنی زمین میں کچھ کام کر رہے تھے یا لکڑیاں جمع کرنے جنگل کو گئے تھے اور اللہ نے حکم دے دیا تھا کہ جب تک چار مرتبہ لوط اپنی قوم کے خلاف شہادت نہ دے دے تم ان کو ہلاک نہ کرنا۔ فرشتوں نے لوط کے پاس بطور مہمان رُکنا چاہا لوط ان کو لے کر چل دیئے، تھوڑی دیر چلے تھے کہ آپ نے مہمانوں سے پوچھا تم کو اس بستی کی حالت بھی معلوم ہے۔ فرشتوں نے پوچھا ان کی کیا حالت ہے۔ آپ نے فرمایا اس زمین پر سب سے زیادہ بد عمل بستی ہے۔ حضرت نے یہ الفاظ چار مرتبہ کہے غرض ملائکہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر آگئے۔ یہ بھی منقول ہے کہ آپ لکڑیاں اٹھائے آ رہے تھے اور فرشتے پیچھے پیچھے تھے، قوم کی ایک جماعت کی طرف سے گزر ہوا ان لوگوں نے آپس میں آنکھ ماری، حضرت لوط نے فرمایا اللہ کی مخلوق میں میری قوم سب سے زیادہ بُری ہے، اسی طرح دوسری جماعت کی طرف سے گزر ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور حضرت نے یہی فرمایا، تیسری جماعت کا قصہ بھی یونہی ہوا۔ حضرت لوط جب بھی مذکورہ الفاظ زبان سے ادا کرتے تھے حضرت جبریلؑ فرشتوں سے کہتے تھے گواہ رہو، آخر حضرت لوط اپنے گھر پہنچ گئے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ فرشتے حضرت لوط کے گھر پوشیدہ طور سے آئے تھے اور گھر والوں کے سوا کسی کو ان کا آنا معلوم نہ تھا لوط کی بیوی نے جا کر اپنی قوم کو اطلاع دی کہ لوط کے گھر ایسے لوگ آئے ہیں کہ ان سے زیادہ خوبصورت میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

وَجَاءَتْ قَوْمًا يُّهْرَعُونَ اِلَيْهِ
اور لوط کے پاس اس کی قوم والے لپکتے ہوئے آئے۔ حضرت ابن عباسؓ اور

قمانہ نے ترجمہ کیا ہے تیز تیز آئے۔ مجاہد نے کہا لپکتے آئے۔ ثمر بن عطیہ نے کہا تیز چال اور لپکنے کے درمیان چال سے آئے۔ حسن نے کہا دونوں چالوں کے درمیانی رفتار سے آئے۔ صاحب قاموس نے ہرغ کا ترجمہ کیا ہے، ایسی چال جس میں جھپک اور تیزی ہو۔

يَهْرَعُونَ (فعل مجہول) انتہائی سرعت و اضطراب پر دلالت کر رہا ہے، گویا کوئی (اندرونی یا بیرونی قوت) ان کو تیز تیز لئے جا رہی تھی۔

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ط اور اس سے پہلے بھی وہ بُری حرکتیں کرتے رہے تھے۔ مردوں سے لواطت کرتے تھے اور طرح طرح کی فحش حرکتوں کے عادی تھے بے حیا ہو گئے تھے اسی لئے ایسے برے ارادے سے علی الاعلان لپکتے جھپکتے آئے تھے۔

قَالَ يَقَوْمٌ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي لوط نے کہا اے میری قوم یہ میری لڑکیاں ہیں۔ یعنی تم ان سے نکاح کر لو۔

پہلے حضرت کی لڑکیوں سے نکاح کرنے کی درخواست قوم والوں نے کی تھی، مگر ان کی بدکاریوں کو دیکھ کر آپ نے انکار کر دیا تھا۔ درخواست کو رد کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کافر تھے۔ کافروں سے نکاح کی حرمت تو شریعتِ اسلامیہ میں بعد کو ہوئی ہے، پہلے ازدواجی رشتہ کافر و مؤمن کا جائز تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دونوں صاحبزادیوں کا رشتہ عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے نزولِ ممانعت سے پہلے کیا تھا۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت لوط نے اپنی لڑکیوں سے نکاح کی پیش کش ان کے مسلمان ہو جانے کی شرط پر کی تھی، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا بنائیں سے قوم کی ساری عورتیں مراد ہیں، ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں آیت النَّبِيِّ اُولٰٓئِیْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُ اُمَّهَاتُهُمْ کے آخر میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے اس قول مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ اس قول کی تائید اس امر سے بھی ہوئی ہے کہ حضرت لوط کی لڑکیاں دو تھیں اور لڑکوں کی طلب گار پوری جماعت تھی، دو لڑکیوں کا ایک جماعت سے نکاح کیسے ممکن تھا جو لوگ بنات سے مراد حضرت لوط کی لڑکیاں لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قوم لوط کے دوسرے دار تھے، سب لوگ ان کا حکم مانتے تھے انہی دونوں سے آپ نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کرنا چاہا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت لوط نے جو هَؤُلَاءِ بَنَاتِي فرمایا اس سے نکاح کی حقیقتاً پیشکش مقصود نہ تھی بلکہ) مقصد تھا قوم والوں کی بدترین خباثت کا اظہار اور دفاع۔

هٰنَ اَطَهَّرَكُمْ وہ زیادہ پاک ہیں تمہارے لئے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ لواطت پاک ہے اور آمد پرستی سے لڑکیوں سے نکاح زیادہ پاک ہے) مطلب یہ کہ تمہارے لئے اس فعل میں زیادہ نظافت ہے یا اسی میں بے حیائی کم ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسے چھینے ہوئے مال سے تو مردار زیادہ پاک اور زیادہ حلال ہے (ظاہر ہے کہ حلال نہ مردار ہے نہ مال معصوب، مگر مال معصوب کی زیادہ برائی ظاہر کرنے کے لئے ایسا جملہ بولا جاتا ہے)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ سے ڈرو۔ یعنی ان بے حیائی کے کاموں کو ترک کرو۔ وَلَا تُخْزَوْنَ اور مجھے رُسوانہ کرو۔ یہ لفظ یا خزئی سے بنا ہے خزئی کا معنی ہے رُسوانی (اسی کی مطابق ترجمہ کیا گیا ہے) یا خزایۃ سے بنا ہے خزایۃ کا معنی ہے حیا۔ یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔

فِي ضَيْفِي ط میرے مہمان کے معاملہ میں۔ مہمان کو ذلیل کرنے کا معنی ہے میزبان کو ذلیل کرنا۔

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ کیا تم میں کوئی بھی ہدایت یافتہ نہیں جو حق پر چلے اور بُری حرکتوں سے

پر ہیز کرے۔

ابن اسحاق نے رشید کا ترجمہ کیا ہے بھلائی کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا۔

قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ ط قوم والوں نے کہا (لوط) تم جانتے ہو کہ تمہاری لڑکیوں

پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ یعنی وہ ہماری بیویاں نہیں، ان سے ہمارا نکاح نہیں ہوا کہ ہم ان کے حقدار بن جائیں۔

بعض علماء نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ تمہاری لڑکیوں کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں۔

اور ہمارا جو کچھ ارادہ ہے اس کو تم یقیناً جانتے ہو، یعنی ہم لڑکوں کو چاہتے ہیں۔
لوط نے (ان سے) کہا اگر میرے بدن کے اندر تم کو دفع کرنے کی طاقت ہوتی۔
تو میں بچاؤ کر لیتا تم کو دفع کر دیتا۔

یا میں کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑ سکتا۔ یعنی یا میرا خاندان طاقتور ہوتا اور مجھے
برادری کی طاقت حاصل ہوتی تو میں برادری کی قوت پر تم سے اپنی حفاظت کر لیتا۔ رُكْنٌ شَدِيدٌ (مضبوط کھنم) سے قوت و
استحکام میں اپنے خاندان کو تشبیہ دی۔ اس سے مراد ہے قوی پہلو۔ صاحب قاموس نے رُكْن کے معنی لکھے ہیں قوی ترین پہلو۔
قوت کے تمام اسباب جیسے حکومت، فوج، عزت، غلبہ، اقتدار۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان
کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میرے بھائی لوط پر رحم فرمائے وہ رکنِ شدید کی پناہ لینے کے خواستگار ہوئے تھے۔ دوسری
روایت میں رحم فرمائے کی جگہ معاف فرمائے کا لفظ آیا ہے۔

ابن عساکر اور اسحق نے بسندِ جریرو مقاتل بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور بغوی نے بھی یہی
بیان کیا ہے کہ حضرت لوط نے دروازہ بند کر لیا ملائکہ اندر گھر میں تھے اور دروازہ کے اندر سے ہی آپ قوم والوں سے جھگڑا کر
رہے تھے اور ان کو قسمیں دے رہے تھے وہ لوگ سب دروازہ کے باہر تھے آخر وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر جانے کی تدبیر کرنے
لگے، جب ملائکہ نے لوط کی یہ حالت دیکھی تو۔

قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ
ہیں ان لوگوں کی دسترس آپ تک ہرگز نہیں ہو سکے گی دروازہ کھول دیجئے اور ہم کو ان سے نپٹنے دیجئے حضرت لوط نے دروازہ
کھول دیا، وہ لوگ اندر گھس آئے جبرئیلؑ نے اپنے رب سے عذاب نازل کرنے کی اجازت طلب کی، اجازت مل گئی تو انہوں نے
اپنی وہی صورت اختیار کر لی۔ جو ان کی عموماً اور معمولاً ہوتی ہے پر پھیلا دیئے، موتیوں کا ہار پہنے، چمکدار دانت، جھلکتی پیشانی، سر کے
بال گھنگھریالے برف کی طرح سفید اور دونوں پاؤں مائل بہ سبزی (یہ شکل تھی حضرت جبرئیلؑ کی) پھر جبرئیلؑ نے اپنا ایک پر ان
لوگوں کے منہ پر مارا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں پٹ ناہینا ہو گئیں، گھروں کا راستہ بھی بٹھائی نہیں دیتا تھا فوراً یہ کہتے ہوئے
پلٹ پڑے بھاگو بھاگو لوط کے گھر میں روئے زمین کے سب سے بڑے جادوگر آئے ہیں جنہوں نے ہم پر جادو کر دیا پھر حضرت
لوط سے کہنے لگے ذرا ٹھہرو صبح ہونے دو کل صبح ہم تم سے سمجھیں گے صبح کو تم کو پتہ چل جائے گا۔ لوط نے فرشتوں سے قوم
والوں کے ہلاک ہونے کی میعاد دریافت کی، فرشتوں نے کہا صبح کو۔ لوط نے کہا میں اس سے بھی جلد چاہتا ہوں۔ ابھی ان
کو ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے۔

قَالَ سُبْحَانَ إِلَهِكَ يَفْقَهُ مَنَ الْبَيْتِ
آپ اپنے گھر والوں کو لے کر کچھ رات سے ہی چل دیجئے۔ حضرت ابن
عباسؓ نے قطع کا ترجمہ کیا ہے ایک ٹکڑا ضحاک نے کہا بقیہ شب، قتادہ نے کہا اول رات گزرنے کے بعد۔ بعض نے فجرِ اول (صبح
کاذب)

وَلَا يَأْتِنَفْتٌ مِنْكُمْ أَحَدٌ
اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے۔ یعنی کوئی تمہارے ساتھ سے مڑ کر
پیچھے نہ رہ جائے۔

قاموس میں ہے لَفْتَةٌ اس کو موڑ دیا، رائے سے پھیر دیا۔ التفتات (افتعال) اور تلتفت (تفعّل) اسی سے بنا ہے۔ میں
کہتا ہوں کہ ثلاثی مجرد (نفت) متعدی سے اور ثلاثی مزید (افتعال اور تفعّل) لازم۔ بعض نے لایلتفت کا ترجمہ کیا ہے کوئی پیچھے کونہ
دیکھے۔ رات سے سب کو لے کر نکلنے کا حکم تو لوط کو دیا گیا اور منہ پھیر کر پیچھے کونہ دیکھنے یا مڑ کر پیچھے نہ رہ جانے کا حکم لوط کے
ساتھ والوں کو دیا گیا۔

إِلَّا أَمْرًا تَكَّ ۖ مگر اپنی عورت کو ساتھ لے کر نہ نکلویا سوائے تمہاری عورت کے اور کوئی عورت کو نہ دیکھے۔
 بغوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ إِلَّا أَمْرًا تَكَّ کا استثناء فَاَسْرَ بِأَهْلِكَ سے ہے۔ یعنی بیوی کو ساتھ نہ لو۔ قوم کے ساتھ
 چھوڑ دو۔ اس کا میلان قوم کی طرف ہے اس مطلب کی تائید حضرت مسعودی کی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعود کی
 روایت میں آیت اس طرح ہے فَاَسْرَ بِأَهْلِكَ إِلَّا أَمْرًا تَكَّ وَلَا يَلْتَفِتُ مِنْكُمْ أَحَدٌ حَاصِل کلام یہ ہے کہ زوجہ لوط کو
 ساتھ لے کر نکلنے کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک روایت میں ساتھ لے کر نکلنا مذکور ہے اس وقت ساتھ والوں کو حکم دیا گیا تھا
 کہ کوئی عورت کو پیچھے نہ دیکھے یا پیچھے رہ نہ جائے، مگر عورت نے منہ پھیر کر اپنی قوم کی طرف دیکھا اور ان کو ہلاک ہوتے دیکھ کر کہا
 ہائے میری قوم والے تباہ ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ عورت کو کافروں کے ساتھ چھوڑ کر جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ
 عورت کا قلبی جھکاؤ قوم کی طرف تھا۔ اسی اختلاف روایت کی وجہ سے إِلَّا أَمْرًا تَكَّ کے اعراب میں اختلاف منقول ہے ایک
 میں إِلَّا أَمْرًا تَكَّ آیا ہے اور دوسری روایت میں إِلَّا أَمْرًا تَكَّ کذا قال صاحب المدارک۔

اور چونکہ دونوں روایتوں کی بنا پر مفہوم حکم میں تضاد ہو جاتا ہے اور اس تضاد کو دور نہیں کیا جاسکتا اس لئے ایک روایت
 یقیناً غلط ہے یہی وجہ ہے کہ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ کوئی قرأت بھی مانی جائے بہر حال إِلَّا أَمْرًا تَكَّ استثناء لَا يَلْتَفِتُ
 مِنْكُمْ أَحَدٌ سے قرار دینا اولیٰ ہے یعنی التفات کی ممانعت سے عورت مستثنیٰ تھی یعنی اس کو ممانعت نہ تھی، لیکن کیا اس کو
 التفات کی اجازت تھی یہ بات آیت میں مذکور نہیں ہے۔

إِنَّهُ مُصِيبُهُمَا مَا أَصَابَهُمَا ۖ جو عذاب قوم والوں پر آئے گا وہ اس عورت پر بھی یقیناً آئے گا۔ بیضاوی کے
 قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود کی قرأت کی بنا پر خود ان کی تفسیر پر ہے۔ جب کہ اکثر اہل تفسیر کا خیال ہے کہ استثناء
 اہل سے ہے یعنی قرأت ابن مسعود روایت پر مبنی نہیں بلکہ ابن مسعود نے چونکہ استثناء اہل سے قرار دیا ہے اور آیت کی تفسیر
 اسی طرح کی ہے اس لئے آپ نے اس جگہ اعراب بھی وہی پڑھا جو تفسیر کے مناسب تھا۔ میں کہتا ہوں اِمْرًا تَكَّ کی تاء پر
 اگر زبر پڑھا جائے تو استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت لوط کی بیوی مؤمنہ صالحہ نہ تھیں اس لئے حضرت لوط کے
 اہل میں داخل ہی نہیں تھیں۔ حضرت نوح کے بیٹے کو عدم صلاح کی بناء پر اہل نوح میں شمار نہیں کیا گیا اور جب وہ اہل لوط میں
 داخل نہ تھیں تو لَا يَلْتَفِتُ مِنْكُمْ أَحَدٌ سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا وہ ان سے خارج تھی۔ ہاں اگر اِمْرًا تَكَّ کی تاء پر
 پیش پڑھا جائے تو ضرور اہل لوط میں داخل رہے گی مگر اس داخلے کی وجہ صلاحیت اعمال و ایمان نہیں بلکہ محض رشتہ زوجیت تھا
 زوجیت کی وجہ سے عورت لوط کی اہل تھی اور صلاح اعمال نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی اہل نہیں تھی دونوں اعتبارات
 مختلف ہیں۔

میں کہتا ہوں دونوں قرأتوں کا اختلاف اس وجہ سے نہیں ہے کہ ایک روایت میں عورت کا نکلنا مذکور ہے اور دوسری
 روایت میں نہ نکلنا۔ بلکہ زبر کی قرأت اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ اِمْرًا تَكَّ کا اہل سے استثناء ہے اور پیش کی قرأت پر أَحَدٌ سے
 استثناء ہے اول صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ اپنے اہل کے ساتھ نکل جاؤ۔ بیوی کو ساتھ نہ لو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ
 جن کو ساتھ لے کر جانے کا حکم دیا گیا وہ ساتھ گئے بھی تھے یا نہیں گئے تھے ایسی صورت میں نافرمان بیوی کا ساتھ جانا ضروری
 نہیں۔ جبکہ ساتھ لے جانے کا لوط کو حکم بھی نہیں دیا گیا نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ نہیں گئی۔ اور اگر أَحَدٌ سے استثناء مانا
 جائے تو حضرت لوط کے ساتھ والوں کو منہ پھیر کر دیکھنے کی ممانعت ہو جائے گی۔ بیوی کو ممانعت نہیں ہو گی اس صورت میں
 بھی بیوی کا ساتھ جانا معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں باتوں کی طرف سے آیت میں سکوت ہے، ممکن ہے وہ گئی ہو اور منہ پھیر کر
 دیکھا ہو اور ممکن ہے ساتھ ہی نہ گئی ہو خواہ لوط نے اس کو بھی حکم دیا ہو۔ کیونکہ بہر حال وہ سرکش اور نافرمان تھی ماننے والی نہ
 تھی۔

شاید بیضاوی نے جو لفظ اولیٰ استعمال کیا ہے اور واجب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی مصلحت یہی ہو۔

ان پر عذاب آنے کا وقت وعدہ یقیناً صبح ہے۔ یہ سابق حکم کی گویا علت ہے۔ یعنی تم اپنے ساتھیوں کو لے کر رات ہی سے نکل جاؤ، اس لئے کہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت صبح مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب حضرت لوط نے درخواست کی کہ جلد عذاب آجائے تو فرمایا۔

إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۖ

کیا صبح قریب نہیں ہے۔

پر جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم یا عذاب) آگیا۔ اول مفہوم کی تائید اگلی آیت سے ہو رہی ہے۔ تو ہم نے ان بستیوں کو الٹ کر زیر کر دیا۔ یعنی الٹ دیا اور پر کا تختہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا اگرچہ یہ فعل ملائکہ کا تھا ملائکہ نے اٹا تھا لیکن چونکہ بحکم الہی تھا اس لئے الٹنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی۔ اس سے اپنے امر کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔ بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں حضرت جبرئیل نے بستیوں کے نیچے اپنا ایک بازو ڈال کر اتنا اٹھا لیا کہ اوپر والوں نے مرغ کی بانگ کی اور گتوں کے بھونکنے کی آواز سنی اور کسی کا کوئی برتن بھی نہ اٹانے کوئی سویا ہوا شخص بیدار ہوا پھر بالکل الٹ دیا۔ سب زیر کر دیئے۔ ان پانچوں شہروں کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی۔ ان بستیوں کو مَوْتَفِكَاتُ الٹی ہوئی بستیاں کہا جاتا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؓ کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ اور ہم نے ان پر کنکریلے پتھر برسائے یعنی ان کو الٹنے کے بعد اوپر سے سنگ باری کی۔ یا یہ مطلب کہ جو ادھر ادھر بچے کچھے مقامات میں راہ گیر رہ گئے تھے۔ ان پر کنکروں کی بارش کی اور اس طرح ان کو ہلاک کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ کا قول ہے کہ سمیل سنگِ گل کا معرب ہے قتادہ اور عکرمہ کا قول ہے کہ سمیل سے مراد ہے کچڑ، کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ۔ مجاہد نے کہا شروع میں پتھر اور آخر میں خشک کچڑ کی بارش کی۔ حسن نے کہا وہ پتھر اصل میں کچڑ ہی کے تھے کچڑ خشک ہو کر پتھر ہو گئی تھی۔ ضحاک نے کہا سمیل سے مراد ہیں پختہ اینٹیں۔

بعض علماء نے کہا کہ سمیل کا لفظ سمیل سے بنا ہے اسماعیل کا معنی ہے رواں کر دینا، دے دینا گویا ہر پتھر بھیجا ہوا اور دیا ہوا تھا یا سمیل سے ماخوذ ہے سمیل لکھا ہوا۔ یعنی اللہ نے پتھروں پر لکھ دیا تھا کہ قوم لوط کو ان سے عذاب دیا جائے گا۔ بعض نے کہا سمیل اصل میں سمین دوزخ کا ایک طبقہ تھا نون کول سے بدل دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیوی آسمان کا نام سمیل ہے۔ بعض نے کہا کہ سمیل آسمان میں پہاڑ ہیں، اللہ نے فرمایا ہے وَيَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مِثْرًا مِّنْ جِبَالٍ فِيهَا مِن بَرَدٍ۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے پیہم نَضْدٌ کا معنی ہے ایک چیز پر دوسری چیز چننا۔

جو نشان زدہ تھے تمہارے رب کے پاس۔ ابن جریر نے کہا ان پتھروں پر ایک خاص علامت تھی وہ زمین کے پتھروں کے ہم شکل نہ تھے۔

قتادہ اور عکرمہ نے ان پر سُرخ دھاریاں بتائی ہیں۔ حسن اور سدی نے کہا وہ مہر زدہ تھے، مہر کی طرح ان پر نشان تھا۔ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس پر وہ گرنے والا تھا۔

اور وہ (اجاڑ بستیاں) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ الظالمین سے مراد ہے مشرکین مکہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور عکرمہ کے نزدیک الظالمین سے مراد ہیں اس امت کے ظالم، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ یعنی اس امت کے ظالم بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ ان پر سنگباری کی جائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا اللہ نے کسی ظالم کو ان پتھروں سے محفوظ نہیں رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر ظالم پر ہر وقت پتھر گر سکتا ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کے دریافت کرنے کے بعد حضرت جبرئیل نے کہا کہ آپ کی امت کے ظالم مراد ہیں۔ کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو ہر وقت پتھر اس پر گر سکتا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے ثعلبی نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور مجھے اس کی سند معلوم نہیں۔ درمثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے آیت مذکورہ کے ذیل میں ربیع کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ظالم کی سیدھ میں ایک پتھر موجود ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کب اس کو ظالم پر گرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ بھی ضمیر ان بستیوں کی طرف راجع ہے جو شام کو جاتے ہوئے کفارِ مکہ کے راستہ میں ادھر ادھر پڑتی تھیں۔

بغیر کو بصیغہ مذکر لانا (باوجود یہ کہ ضمیر ہی مؤنث ہے) اس وجہ سے ہے کہ بھی سے مراد پتھر یا مقام ہے (یعنی لفظ مؤنث کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ معنی کے لحاظ سے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا)۔

اور ہم نے قومِ مدین کے نسبی بھائی شعیب کو اہل مدین کی طرف
وَالِی مَدَیْنِ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا
(ہدایت کے لئے) بھیجا۔

حضرت ابرہیم کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا اسی کے نام پر حضرت شعیب کی بستی کا نام بھی مدین رکھ دیا گیا تھا۔ آیت میں مراد اہل مدین (مدین کے باشندے) یا مدین کی نسل ہے۔

قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ وَلَا تَنْفُسُوا الْمُلْكَ يَالِ الْيَمِينِ
شعیب نے کہا اے میری قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود واقع میں نہیں ہے اور ناپ تول میں (خریداروں کے ساتھ یا آپس میں) کمی نہ کرو۔ توحید پر ہی تمام احکام کا مدار ہے اس لئے اول توحید کی تبلیغ کی، پھر ناپ تول کی کمی سے روکا۔ قوم شعیب والے ناپ تول میں بے ایمانی کے خوگر تھے اور بے ایمانی عدل کے خلاف ہے اور تبادلہ اشیاء کی حکمت کے بھی منافی ہے۔

میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں۔ یعنی میں تم کو مالدار پاتا ہوں، آرام اور چین سے
إِنِّي أَرَاكُمْ مَخْبِرِينَ
ہو۔ لوگوں کے حق مارنے اور ناپ تول میں کمی کرنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔ یہی مطلب ہے کہ نعمتیں اور آسائشیں تم کو حاصل ہیں جن کا تقاضا ہے کہ تم اللہ کا شکر کرو اور لوگوں پر مہربانی کرو۔ کسی کا حق مارنے کا تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ مجاہد نے کہا حضرت شعیب نے ان کو ڈر لیا کہ اگر توبہ نہ کرو گے تو یہ نعمت تم سے چھین لی جائے گی ہر چیز کا نرخ گراں ہو جائے گا اور اللہ کا عذاب آجائے گا۔

اور مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس دن کے
وَأِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مَّحِيطٍ ﴿۸۲﴾
عذاب کا جو طرح طرح کی تکلیفوں کو اپنے گھیرے میں لینے والا ہوگا۔ یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر اس روز کا عذاب آجائے گا جو تم کو گھیر لے گا اور سب کو ہلاک کر دے گا۔ کوئی بھی نہیں بچے گا۔ بعض لوگوں نے سمیٹ کا ترجمہ کیا ہے ہلاک کرنے والا وَاَحِيْطًا بِشَمْرِهِ اور اس کے پھل تباہ کر دیئے گئے۔ عذابِ یومِ محیط سے مراد ہے روزِ قیامت کا عذاب یا سب کی جڑ بنیاد اکھاڑ پھینکنے اور سب کو تباہ کر دینے کا عذاب۔

اور اے میری قوم! ناپ تول پوری پوری کیا کرو۔ پہلے ناپ
وَلِيَقَوْمٍ اَوْفُوا بِالْمِكْيَالِ وَالْيَمِيْنِ
تول میں کمی کرنے کی ممانعت تھی (جس سے ضمناً پورا ناپنے تولنے کا حکم معلوم ہو گیا) پھر زور دینے کے لئے اس جملہ میں صراحت پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا اس صریح حکم سے اس امر پر بھی تنبیہ ہو گئی کہ قصد ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پورا پورا دینے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ کچھ زیادہ ہی دنیا پڑے، جس کے بغیر پورا پورا ادا کرنا مقصود نہ ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اگر کوئی پیمانے یا وزنی چیز کسی نے ناپ تول کر خریدی ہو اور بائع نے ناپ تول کر دی ہو تو

جب تک خریدار خود دوبارہ اس کی ناپ تول نہ کر لے نہ خود اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ نہ فروخت کر سکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے (خریدے ہوئے) غلہ کو فروخت کرنے سے اس وقت تک روکا ہے جب تک دوبارہ ایک بار بائع نے اور ایک بار مشتری نے اپنے اپنے پیمانوں سے اس کی ناپ تول نہ کر لی ہو۔ رسول اللہ کے زمانہ میں غلہ پیمانوں سے ناپ کر فروخت کیا جاتا تھا صاع یا فرق یا وستی وغیرہ غلہ ناپنے کے پیمانے تھے تول کر نہیں بیچا جاتا تھا یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے ابن ماجہ اور اسحاق بن ابی شیبہ نے نقل کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ ہے جس کی وجہ سے محدثین نے اس روایت کو معتدل قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے، لیکن

یہ روایت بھی ضعیف ہے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے اور ائمہ نے اس کو قبول کیا ہے اس لئے قابل استدلال ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

یہ بھی رسول اللہ نے فرمایا تھا وزن کر کے ذرا جھکتا ہو ادو۔ کیونکہ ہم گروہ انبیاء اسی طرح تولتے ہیں۔ رواہ احمد و ابو داؤد و الترمذی والنسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان۔ من حدیث سوید بن قیس حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بِالنَّقِیْطِ
وَالنَّصَافِ كَمَا تَحْتِ

اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ پہلے صرف ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی ہدایت تھی اس آیت میں عمومی حکم ممانعت ہے کہ ناپ سے بکنے والی چیز ہو یا تول سے مقداری ہو یا زرعی کیسی ہی چیز ہو اور جس کسی کے حق کی ہو اس میں کمی نہ کرو۔

وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱۵

اور زمین میں فساد کرتے ہوئے (حد تو حید و عدل سے ہمت نکلو۔

عشو (مصدر) ہر طرح کے فساد کو شامل ہے خواہ ادائے حقوق کی کمی کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ بعض علماء نے کہا کہ تجس جس کی پہلے ممانعت کی گئی ہے مراد ہے ٹیکس اور معاملات میں دوسری حق تلفیاں اور عشو (جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے) سے مراد ہے چوری، ڈاکہ رہزنی۔

لَا تَعْتُوا كَمَا مَعْنَى جَب لَاتُقْسِدُوا ہے تو پھر مفسدین کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ایک سوال کیا جاسکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مفسدین کہنے سے وہ صورتیں نکل گئیں جو واقعی صحیح ہوتی ہیں لیکن بظاہر فساد نظر آتی ہیں جیسے حضرت خضر کا فعل (بچے کو قتل کرنا، گشتی کا تختہ اکھاڑ دینا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفسدین (کا مفعول محذوف ہے اس لفظ کو بڑھانے) سے مراد یہ ہے کہ اپنے دینی امور اور دنیوی مصالح کو بگاڑ کر فساد کرتے نہ پھرو۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہے کیونکہ عشو کا معنی خود ہی افسد ہے (یعنی عشو جب افساد کا ہم معنی ہے تو مفسدین سے تاکید ہو گئی کوئی نیا معنی مراد نہیں ہے۔

بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ
اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بیچ جائے وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ صحیح صحیح ناپ تول کر دینے کے بعد جو حلال چیز باقی رہ جاتی ہے وہ بہتر ہے اس حرام مقدار سے جو ناپ تول میں کمی کر کے تم حاصل کرتے ہو۔

مجاہد نے کہا بَقِيَّتُ اللَّهِ سے مراد ہے اللہ کی اطاعت جیسے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ وَالْبَاقِيَّاتُ الصَّالِحَاتُ

دو
خیر۔

اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۙ
اگر تم مؤمن ہو۔ یعنی بَقِيَّتُ اللَّهِ کا تمہارے لئے بہتر ہونا ایمان کے ساتھ مشروط ہے مؤمن کو ہی نیکی کا اجر ملے گا۔ کافر کی بھلائیاں تو اکارت جائیں گی۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اگر تم میرے قول کو سچ مانتے ہو تو میں نے جو صحیح ناپنے تولنے کا تم کو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو۔

اور میں تمہارا پیرہ دینے والا نہیں ہوں کہ برائیوں سے تم کو بچالوں یا تمہارے اعمال کی نگہداشت کروں۔ اور پھر ان کا بدلہ دوں۔ میں تو صرف ناصح اور مبلغ ہوں، میرا فرض تو حکم پہنچانے کے بعد پورا ہو جاتا ہے (مانویانہ مانو) یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم اپنی بد اعمالی نہ چھوڑو تب بھی میں اللہ کی نعمت تم پر قائم رکھوں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔

قالوا ایشعيب اصلونك تأمر بك ان تترك ما يعبد اباؤنا اوان نفعنا في اموالنا ما نشاء

انہوں نے کہا شعیب کیا تمہاری نماز تم کو حکم دیتی ہے کہ جن جنتوں کی پوجا ہمارے بڑے کرتے چلے آئے ہیں ہم ان کو چھوڑ دیں یا اپنے مال میں اپنی منشاء کے مطابق جو ہم تصرف کرتے ہیں اس کو ترک کر دیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت شعیبؓ نماز بہت پڑھتے تھے اسی لئے کافروں نے آپ کی نماز کا تذکرہ کیا۔ اعمش کے نزدیک نماز سے مراد ہے نماز پڑھنا۔ حضرت شعیبؓ نے قوم کو توحید کی دعوت دی اس کے جواب میں انہوں نے آپ سے استہزاء میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس قسم کی دعوت تم سے یہ نماز کی پابندی اور مداومت کر رہی ہے اس نے تمہارے دماغ میں خلل پیدا کر دیا ہے ورنہ صحیح ہوش و خرد کا تو یہ تقاضا نہیں۔

واقعی آپ ہیں بڑے عقلمند و دین دار۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا

انك لانت الحليم الرشيد

انہوں نے حضرت شعیبؓ کو حلیم و رشید بطور طنز کہا تھا، حقیقت میں ان کا مقصد تھا یہ کہنا کہ تم سادہ لوح گمراہ ہو۔ عرب لوگ ایک مفہوم کی تعبیر اس کی ضد سے کر لیتے ہیں نیک شگون یا دعا کے طور پر اس شخص کو جس کو چھوڑ دے لے سلیم کہتے ہیں اور خطرناک بیابان کو مفازہ کامیابی کی جگہ۔ بعض علماء نے کہا انہوں نے حلیم و رشید بطور استہزاء کہا تھا، مقصد تھا حضرت شعیبؓ کے اندر سفاہت و ضلالت ثابت کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول پر استعمال مجازی ہو گا اور مؤخر الذکر قول پر حقیقی کنائی (یعنی بطور کنایہ مذمت مراد ہوگی) بعض نے کہا کلام مبنی بر حقیقت ہے اور کنایہ مذمت کرنا بھی غرض نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں تو تم بڑے سنجیدہ اور صاحبِ رشد ہو۔ ہم تو گمان بھی نہیں کرتے تھے کہ ایسی بات کہو گے حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی حضرت صالحؑ سے ایسا ہی کلام کیا تھا اور کہا تھا قد كنت فينا مرجوًا قبل هذا

بعض علماء نے کہا (بزرع عمك) کا لفظ مخدوف ہے اور کلام حقیقی ہے (یعنی) تم تو اپنے خیال میں حلیم و رشید ہو پھر ایسی بات تم نے کیوں کی۔

قال يقوم اربعين كنت على بينة من ربّي و سزقني منه رزقا حسنا

شعیبؓ نے کہا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا فرمایا ہے (تو کیسے اس کا حکم نہ مانوں)۔

بیتۃ بصیرت اور واضح بیان۔ من ربی اپنے رب کی طرف سے یعنی وحی اور نبوت کے ذریعے سے۔ رزقنی منه یعنی محنت مشقت اٹھائے بغیر اللہ نے حلال رزق عطا فرمایا۔ رزقا حسنا سے مراد ہے حلال رزق۔ کہا گیا ہے کہ حضرت شعیبؓ بڑے مالدار تھے۔

۱۔ اس فقیر کی نظر میں حضرت شعیبؓ کے مالدار ہونے نہ ہونے کو آیت کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپ نے قوم کو ایسے مبلغ طرز سے ہدایت کی کہ کسی کو برا ماننے کا موقع نہ ملے۔ آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ جب اللہ نے اپنی رحمت سے تم کو وحی کے ذریعے سے بصیرت عطا فرمادی اور واضح طور پر بیان کر دیا اور کثیر حلال رزق عطا فرمایا تو پھر شرک کرنا اور حرام رزق حاصل کرنے کی تدبیریں اور طریقے اختیار کرنا حماقت ہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے عبارت کو متکلم کے سانچے میں ڈھال لیا اور فرمایا کہ اگر مجھ پر اللہ کا اتنا کرم ہو گیا تو پھر اس کے احکام کی مخالفت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اسلوب کلام بدلنے اور خطاب سے متکلم کی طرف کلام کا رخ موڑنے سے ہدایت بحسن اسلوب ہو گئی اور مخاطب کی ناگواری کا احتمال بھی نہیں رہا۔ مترجم۔

دیاہ یا یہ مراد ہے کہ قوم لوط کی اجڑی ہوئی۔ بستیاں تم سے دور نہیں ہیں تمہارے ملک کے متصل ہیں یا یہ مراد ہے کہ شرک و معاصی کی وجہ سے مستحق عذاب ہونے میں قوم لوط تم سے بعید نہیں تھی (تم دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں) لفظ قریب و بعید اور قلیل و کثیر میں مذکور مؤنث برابر ہیں دونوں کے لئے ان کا استعمال ہوتا ہے اس لئے بعید کو بصیغہ مفرد لانے میں کوئی خرابی نہیں۔

اور اپنے رب سے گزشتہ شرک و معاصی کی معافی طلب کرو۔ یعنی ایمان لے آؤ۔ اور گزشتہ گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرو۔ اور معافی مانگو۔

پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ آئندہ اس کے احکام کی تعمیل کرو اور ممنوعات سے باز رہو۔

ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ
إِنَّ سَابِقِيَ الرَّجِيمِ ذُو دُونَ ۹۰

بلاشبہ میرا رب توبہ کرنے والے مومنوں پر بڑا مہربان اور ان سے بڑی محبت کرنے والا ہے۔ ذُو دُونَ بروزن فاعل اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسم مفعول کے معنی میں بھی۔ اللہ مومنوں سے محبت کرنے والا ہے اور مومن اللہ سے محبت کرتے ہیں، پس وہ محبت بھی ہے اور محبوب بھی۔

اول آیات میں حضرت شعیبؑ نے کفر و معصیت پر جمے رہنے کی صورت میں عذاب الہی سے ڈر لیا پھر توبہ کر لینے کی صورت میں مغفرت کا امیدوار بنایا۔

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا نَفَقْتَ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ

کہنے لگے شعیب ہماری سمجھ میں تو تیری بہت سی باتیں آتی ہیں۔ نہ توحید سمجھ میں آتی ہے نہ ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت نہ تیری بیان کی ہوئی دلیلیں۔ چونکہ ان کی قوتِ فہم کمزور تھی اور سوچنے سمجھنے سے وہ عاری اس لئے ایسی بات کہی یا یہ وجہ تھی کہ حضرت شعیبؑ کے کلام کو وہ حقیر نا قابل التفات سمجھتے تھے یا یہ وجہ تھی کہ ان کو حضرت کے پیام سے انتہائی نفرت تھی اس لئے اس کو سمجھنے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے۔ میرے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی تھی انسانوں کے دل اللہ کی چٹکی میں ہیں وہ جس طرف کو چاہتا ہے دلوں کو موڑ دیتا ہے۔

وَأِنَّا لَكِرَّالِكِ فِينَا ضَعِيفًا

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تم کو اپنے گروہ کے اندر کمزور پاتے ہیں اگر ہم تم کو کچھ دکھ پہنچائیں تو تمہارے اندر دفاع کی طاقت نہیں۔ یا ضعیفًا سے مراد ہے ذلیل یعنی ہم اپنے گروہ میں تم کو ذلیل پاتے ہیں ہم میں تمہاری کوئی عزت نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے ضعیف سے مراد ہے ضعیف البصر۔ حضرت شعیبؑ نابینا تھے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمیری محاورہ میں ضعیف اندھے کو ہی کہا جاتا ہے۔ مگر فینا کا لفظ بتا رہا ہے کہ ضعیف سے نابینا مراد نہیں ہے (اس فقیر کے نزدیک یہ بات ممکن ہے کہ بے بصر کہہ کر قوم کی مراد بے بصیرت ہو یعنی ہمارے گروہ میں تم بے بصیرت ہو بے وقوف ہو جو ایسی باتیں کہتے ہو۔ مترجم)

..... فائدہ

بعض علماء معتزلہ نے نبوت کو قضا اور شہادت پر قیاس کیا ہے ان حضرات کے نزدیک جس طرح نابینا شاہد اور قاضی نہیں ہو سکتا اسی طرح نبی بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ قیاس غلط ہے (قضا و شہادت کا تعلق معائنہ سے ہے اور نبوت کا مدار مشاہدے پر نہیں۔ واقعات کا اظہار اور فیصلہ الگ چیز ہے اور ہدایت و رسالت جُدا حیثیت رکھتی ہے۔ مترجم)

حضرت یعقوبؑ کا نابینا اور پھر بینا ہو جانا عبارت قرآنی سے ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَأَبْيَضْتُ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزَنِ فَهُوَ كَظِيمٍ۔ پھر فرمایا فَارْتَدَّ بِصِيرًا۔

اور اگر تمہارے قبیلے کی پاسداری نہ ہوتی تو ہم پتھر اوڑھ کر تم کو ہلاک کر دیتے۔

دیتے۔

بنغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم طاقت ور تھی اور آپ ان کی حفاظت میں تھے۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہاری قوم چونکہ ہم مذہب ہے اس لئے ان کی عزت ہماری نظر میں ہے اگر تمہاری قوم کی عزت ہماری نظر میں نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ حضرت شعیبؑ کے قبیلے کی طاقت کا خوف مراد نہیں ہے کیونکہ تین سے دس تک یا سات تک جس جماعت کے افراد ہوں اس کو رہٹ کہا جاتا ہے (اور ظاہر ہے کہ دس پانچ آدمیوں کی طاقت پوری بستی کے مقابل کیا ہو سکتی ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اول قول کی تائید آیت **تَسْعَةُ رَهْطٍ** سے ہوتی ہے جو ہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ دس سے کم کی جماعت کو رہٹ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا چالیس تک رہٹ کا اطلاق ہوتا ہے جزری نے نہایتہ میں لکھا ہے کہ رہٹ دس سے کم مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جن میں کوئی عورت نہ ہو۔ بعض نے چالیس سے کم کو رہٹ کہا ہے۔ قاموس میں ہے رہٹ کسی شخص کی قوم اور اس کا قبیلہ یا تین سے سات تک یا دس تک یا دس سے نیچے۔ (یعنی نو) تک کی جماعت جبکہ ان میں کوئی عورت نہ ہو۔ لفظ رہٹ کا کوئی مفرد اس لفظ سے نہیں (یعنی کوئی ایسا مفرد لفظ نہیں ہے جس کی جمع رہٹ ہو) بنغوی کے کلام میں بھی صاحب قاموس کے بیان کئے ہوئے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اور تم ہمارے لئے کوئی عزت والے نہیں ہو کہ تمہاری عزت تم کو سنگباری سے محفوظ رکھے۔ جو احمق، جاہل دلائل براہین کا جواب دلیل سے نہیں دے سکتے وہ گالیاں اور دہمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں۔ ما (حرف نفی) کے بعد **أَنْتَ** کا لفظ ذکر کرنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ کافروں کا کلام حضرت شعیبؑ کی ذات سے متعلق تھا۔ آپ کی عزت سے متعلق نہ تھا۔ عزت تو خاندان شعیب کی حضرت شعیبؑ کو ایذا دینے سے روک رہی تھی۔

قَالَ يَقَوْمِ أَرْهَطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَأَتَّخِذُ نَمُوَةً وَرَاءَ كُمُ ظَهْرِيًّا
شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ عزت والا ہے اور تم نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یعنی میرے خاندان کی رعایت سے تم نے مجھے قتل نہیں کیا اور اللہ کی طرف سے جو مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے اس خداداد رسالت کا تم نے کوئی لحاظ نہیں کیا اور اللہ کو بالکل فراموش کر دیا نہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہوئے تم کو کوئی اندیشہ ہوا نہ اس کے رسول کی توہین کرنے سے کوئی باک۔

اَرْهَطِي میں ہمزہ استفہام انکاری کا بھی ہو سکتا ہے اور زجر و تہدید کے لئے بھی۔ **ظَهْرِيًّا** ظہر (پشت) سے بنایا گیا ہے۔ پائے نسبت کی وجہ سے دوسرے تغیرات لفظی کے ساتھ ظا کو زیر بھی دے دیا گیا۔

إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ جو کچھ تم کر رہے ہو بلا شک و شبہ اللہ اس کو اپنے عملی دائرے میں گھیرے ہوئے ہے یعنی تمہارا کوئی عمل اس سے چھپا ہوا نہیں ہے وہ یقیناً تمام اعمال کا بدلہ دے گا۔
وَلْيَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ
اور اے میری قوم تم اپنی حالت میں عمل کرتے رہو۔ میں بھی اپنے طور پر عمل کر رہا ہوں اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا ہے مَکَانَةٌ سے مراد ہے عداوت پر قائم رہنا۔ مَنْ يَأْتِيهِ میں مَنْ استفہامیہ ہے (کس پر عذاب آئے گا تم پر یا مجھ پر) یا موصولہ ہے (جس پر عذاب آئے گا) سورہ انعام میں بھی ایسی آیت گزر چکی ہے۔ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ کا عطف مَنْ يَأْتِيهِ پر ہے یعنی عنقریب تم جانو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے تم پر یا مجھ پر اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا ہے تم یا میں۔

اور تم انجام کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ **رَقِيبٌ** **وَأَرْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ**

پیروی کی اور فرعون کا فکریہ و عملیہ محض گمراہی و کجروی تھا۔ نام کو بھی اس میں صلاح و رشد نہیں تھا۔ ہر پسند قابل ستائش امر کو رشد اور ہر بُرے امر کو غیّٰ کہا جاتا ہے۔

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت و حماقت کا اظہار ہے کہ فرعون اُلُوہیت کا مدّعی تھا باوجود یہ کہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر و شرک اور ظلم کرتا تھا اور موسیٰ ہادی برحق تھے۔ آپ کا قول مبنی برحق تھا، عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے کورن تھے کہ موسیٰ جیسے ہادی برحق کے اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیرو تھے۔

قیامت کے دن دوزخ کی جانب وہ اپنی قوم کا پیشوا یَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ہو گا اور دوزخ میں سب کو اتار دے گا۔ جس طرح دنیا میں گمراہی کی جانب بڑھنے میں سب کا امام تھا۔ قیامت کے دن چونکہ ایسا ہونا اتنا یقینی ہے کہ گویا ایسا ہو گیا اس لئے بجائے مستقبل کے ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور اَوْرَدَهُمُ فرمایا۔ وِرْدٌ کا معنی ہے چشمہ وغیرہ میں اترنا دوزخ کو پانی فرض کر کے اس میں داخل ہونے کو وِرْدٌ قرار دیا (گویا دوزخ ایک چشمہ یا تالاب ہو گا جس میں فرعون آگے آگے اس کے اتباع جو جانوروں کی طرح جاہل نا سمجھ تھے پیچھے پیچھے اس میں اتریں گے)۔

وَ يَسُّ الْوَرْدِ الْمَوْرُودُ ۹۱ اور وہ دوزخ بہت ہی بُری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جائیں گے۔ پانی میں اترنا، پیاس بجھانے اور خشکی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور دوزخ میں اترنے سے پیاس اور سوزش میں مزید اضافہ ہو گا، اس لئے فرمایا کہ بُرا چشمہ ہو گا۔

آیت وَمَا أَسْرَفُوعُونَ بِرِشِيدٍ ایک دعویٰ تھا اور يَقْدُمُ قَوْمَهُ الخ اس کی دلیل ہے کیونکہ جس کی رہنمائی دوزخ میں لے جائے وہ یقیناً غلط رو ہو گا اور اس کی رہبری تباہ کن ہو گی یا یوں کہا جائے کہ رشید وہ ہے جس کا انجام اچھا ہو اور فرعون کی پیشوائی کا انجام تباہ کن ہو گا۔ گویا دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح ہے۔

وَ اتَّبِعُوا فِي هَذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی وہ ملعون ہوں گے یعنی اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے انبیاء اور مؤمنوں کی زبانی ان پر لعنت کی گئی اور قیامت کے دن بھی ان پر لعنت کی جائے گی۔

بِسُّ الرِّفْدِ الْمَرْفُودِ ۹۲ بَرِّ النِّعَامِ ہے جو ان کو دیا گیا۔ رِفْدٌ کا معنی ہے مدد مَرْفُودٌ اسی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے یا رِفْدٌ کا معنی ہے عطیہ اور مَرْفُودٌ کا معنی ہے عطا کیا ہوا۔ قاموس میں ہے اِرْفَادٌ مدد کرنا اور عطا کرنا۔

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْقُرْآنِ یہ (جو ہم نے بیان کیا ہلاک شدہ) بستیوں کی کچھ اطلاعات ہیں۔ نَقُصَّةٌ عَلَيْكَ ہم آپ کو ان کی خبریں بتا رہے ہیں، یعنی ان کی خبریں آپ کو بتائی گئی ہیں۔ مِنْهَا قَائِمٌ وَ حَصِيدٌ ۱۰۰ ان بستیوں میں سے کچھ تو کھڑی ہیں۔ یعنی ان کے نشانات باقی ہیں اور کچھ کٹی ہوئی گھیتی کی طرح بے نشان ہو گئی ہیں۔ مقاتل نے کہا قَائِمٌ سے مراد ہیں جن کے نشان دکھائی دے رہے ہیں اور حَصِيدٌ سے مراد وہ ہیں جن کی نمود بھی نہیں دکھائی دیتی۔

بعض علماء نے قَائِمٌ کا ترجمہ آباد اور حَصِيدٌ کا ترجمہ ویران کیا ہے۔ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ اور ہم نے ان کو ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ کفر و معصیت کر کے اپنی جانوں کو تباہی کا مستحق بنا دیا جمع مذکر غائب کی ضمیریں بستیوں والوں کی طرف راجع ہیں۔

فَمَا آغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ لَمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ۱۱

اور جب آپ کے رب کی طرف سے ہلاکت کا حکم آگیا تو ان کے معبود جن کو وہ پوجتے تھے اور اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے کچھ بھی کام نہ آئے (اور عذاب کو دفع نہ کر سکے) اور ہلاکت آفرینی و بربادی کے سوا اور کچھ ان کے لئے نہ بڑھا سکے، امر رب سے مراد ہے عذاب تنبیہ بربادی، ہلاکت اور نقصان۔

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرْآنَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ط
اور مذکورہ اقوام کی گرفت کی طرح آپ کے رب کی طرف سے پکڑ دوسری بستیوں والوں کی بھی ہوئی ہے جبکہ وہ ظالم تھے۔ یعنی وہ ظالم ہونے کی وجہ سے مستحق عذاب تھے۔ اس لئے اللہ نے ان کی بھی گرفت کی۔

إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ۝۱۲
بے شک اللہ کی پکڑ سخت دکھ پہنچانے والی ہے جس سے رہائی ناممکن ہے
حضرت ابو موسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے آخر اس کی گرفت کرتا ہے تو ایسی کرتا ہے کہ پھر وہ چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور نے آیت كَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرْآنَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ تلاوت فرمائی رواہ الشیخان فی الصحیحین والترمذی (فی السنن) وابن ماجہ۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَن خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ط
بے شک اس میں (یعنی کافر و ظالم بستیوں کو ہلاک کرنے اور ان کے مذکورہ واقعات میں) بڑی عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے عذاب آخرت کی عظمت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ بحر مومن پر دنیا میں جو عذاب آیا وہ عذاب آخرت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ مطلب ہے کہ ان واقعات کے بیان کو سن کر وہ اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عذاب اس اللہ مختار کی طرف سے آیا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہے عذاب دے اور جس پر رحم کرنا چاہے رحم کرے رہے منکرین آخرت تو وہ جانوروں کی طرح ہیں نہ ان میں فہم ہے نہ بصیرت بلکہ وہ اس قسم کے عذاب کو محض اتفاق اور سلسلہ اسباب و مسببات کی پوشیدہ کڑی قرار دیتے ہیں۔

ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ
یہ (یوم قیامت جس میں عذاب ہوگا) ایسا دن ہوگا کہ سب لوگ اس روز جمع کئے جائیں گے۔ یعنی اس روز سب کی حساب فہمی ہوگی۔ جزا و سزا ہوگی اس کے لئے سب کو جمع کیا جائے گا۔
وَذَلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ۝۱۳
اور یہ ہی ایسا دن ہوگا کہ جس میں شہادت دینے والے لوگوں پر شہادت دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ سب کو حاضر کیا جائے گا کوئی غائب نہیں ہوگا۔

وَمَا تُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مُّعَدٍّ ۝۱۴
اور ہم اس دن کو صرف اس لئے پیچھے رکھ رہے ہیں کہ وہ مدت (زندگی) جو اللہ کے نزدیک مقرر ہے پوری ہو جائے۔ آجل سے پہلے لفظ انتہا محذوف ہے آجل سے پوری مدت زندگی مراد ہے ختم زندگی کا وقت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ ساعت اختتام میں تعدد نہیں اس کو محدود نہیں کہا جاسکتا۔

يَوْمَ يَأْتُ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ
جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا۔ یعنی شفاعت نہ کر سکے گا۔ یا ایسی کوئی بات نہ کہہ سکے گا جو اس کو فائدہ پہنچا سکے۔ دوسری آیت میں آیا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَدْنَىٰ لَهُ الرَّحْمَنُ

یوم یات میں یات کا فاعل یا اجزا ہے یعنی جس روز سزا و جزا آجائے گی یا یوم سے مراد ہے وقت اور یات کا فاعل ہے یوم یعنی جب اور جس وقت وہ دن آجائے گا یا اللہ فاعل سے یعنی جس روز اللہ آجائے گا اللہ کے ظہور کو دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُمَّ وَجَاءَ رَبُّكَ۔

فَمِنْهُمْ شَقِيحٌ وَسَعِيدٌ ۝۱۵
پس کچھ ان اہل حشر میں بد بخت ہوں گے اور کچھ خوش نصیب۔ جس کے لئے بد بختی لکھی گئی ہے وہ بد بخت ہوگا اور جس کے لئے خوش نصیبی لکھی گئی ہے وہ سعید ہوگا۔

حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا ہم ایک جنازہ کے ساتھ نکلے بقیع میں پہنچے تو رسول اللہ ﷺ بھی (چھڑی ہاتھ میں

لئے سامنے سے آتے) نظر آئے آپ تشریف لا کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر چھڑی سے زمین کریدتے رہے، پھر فرمایا کوئی جان کسی بدن میں پھونکی ہوئی ایسی نہیں کہ جنت یا دوزخ میں اس کی جگہ پہلے سے لکھ نہ دی گئی ہو یا اس کا شقی و سعید ہونا نہ لکھ دیا گیا ہو یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تو پھر اپنے مقدر میں لکھے پر بھروسہ کیوں نہ کروں اور عمل کو ترک کیوں نہ کر دوں۔ فرمایا نہیں عمل کئے جاؤ ہر ایک کو تقدیر میں لکھے ہوئے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ شقاوت والوں کو اہل شقاوت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور اہل سعادت کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے آیت فَآتَا مَنْ أَعْطَى وَ اتَّقَى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنَى الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ البغوی، بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث آئی ہے۔

سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں

فَأَمَّا الَّذِينَ شَفَعُوا فِي النَّارِ لِحُصْنِهَا زَفِيرٌ وَ شَهِيْقٌ ۝۱۶

ہوں گے۔ دوزخ میں ان کی چیخ و پکار ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زَفِيرٌ سخت آواز اور شَهِيْقٌ پست آواز۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت کو زفیر کہتے ہیں اور آواز کی آخری حالت جب آواز لوٹ کر گدھے کے پیٹ میں گھومتی ہے شہیق کہلاتی ہے۔ قاموس میں بھی یہی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا حلق میں ہونے کی حالت میں آواز کو زفیر اور سینے میں اترنے کی حالت میں آواز کو شہیق کہا جاتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے سانس کا باہر نکالنا زفیر ہے اور سانس کا لوٹا کر اندر لے جانا شہیق ہے۔ لیکن زفیر کا استعمال گدھے کی ابتدائی آواز کے لئے اور شہیق کا استعمال گدھے کی آخری آواز کے لئے ہوتا ہے۔ قاموس میں آیا ہے زَقْرَيزُ زَقْرُ آوَزَفِيرًا کھینچ کر سانس کو باہر نکالا (یعنی زفیر آہ بھرنے کو کہتے ہیں)۔

ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین

خَلِدَيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ

قائم ہیں۔

ضحاک نے کہا آسمان و زمین سے جنت و دوزخ کے آسمان و زمین مراد ہیں، جو چیز سر کے اوپر کی جانب ہو وہ سماء ہے اور جس پر قدم ٹکے ہوئے ہوں وہ ارض ہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ حشر میں سب لوگوں کا اجتماع ہوگا تو وہ کسی جگہ ہوگا قدموں کے نیچے بھی کوئی چیز ہوگی اور سر کے اوپر کی جانب بھی کچھ ہوگا۔ اہل معنی کہتے ہیں کہ عرب لوگ جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کو آسمان و زمین کے وجود کے ساتھ مشروط کرتے ہیں تو ان کی مراد اس فعل یا عدم فعل کا دوام ہوتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ کی مراد ہوگی۔ دوامی ہمیشہ۔

إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۝ ہاں اگر آپ کے رب ہی کو نکالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے یہ جملہ بظاہر دلالت برہا ہے کہ دوزخ کے اندر دوزخی ایک خاص وقت تک رہیں گے پھر مدت سکونت دوزخ ختم ہو جائے گی۔

ایک روایت میں حضرت ابن مسعودؓ و حضرت ابو ہریرہؓ کے جو اقوال آئے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ حالت اس وقت ہوگی جب لوگ اس میں آحقاب (صدیوں) تک رہ چکے ہوں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک بیان بھی اسی طرح آیا ہے صوفیاء میں سے شیخ محی الدین ابن عربی کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن یہ قول اجماع کے اور بصریحی آیات و احادیث کے خلاف ہے اللہ نے فرمایا فِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ عذاب میں ہی وہ ہمیشہ رہیں گے۔ طبرانی، ابو نعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دوزخیوں سے کہہ دیا جائے کہ تم کو (دوزخ میں) اتنے برسوں رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی تعداد ہے تو وہ اس کو سن کر خوش ہو جائیں گے اور اگر اہل جنت سے کہہ دیا جائے کہ تم جنت میں اس قدر مدت رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی گنتی ہے تو ان کو یہ سن کر غم پیدا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ ان سب دوزخیوں اور جنتیوں کے لئے وہاں دوام

سکونت مقرر کر دیا گیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا، حضرت معاذ وہاں پہنچے تو ایک تقریر میں فرمایا لوگو! میں اللہ کے رسول ﷺ کا قاصد ہوں مجھے تمہارے پاس یہ اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف وہاں دوامی قیام ہو گا دوامی زندگی ہو گی بغیر موت کے اور قیام ہو گا بغیر کوچ کے (یعنی کبھی وہاں سے کوچ نہیں کیا جائے گا) اور ایسے جسموں کے اندر ہو گا جو کبھی نہیں مریں گے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے پھر ایک منادی (دونوں فریق کے درمیان) ندا کرے گا، اے دوزخ والوں (آئندہ) موت نہیں اور اے جنت والو (آئندہ) موت نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہا جائے گا اے اہل جنت (جنت میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے اور اے اہل نار (دوزخ میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے۔

ایک اور حدیث جس میں موت کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے اس میں یہ بھی آیا ہے کہ ندا دی جائے گی، اے اہل جنت موت نہیں ہے اور اے دوزخ والو آئندہ موت نہیں ہے۔ یہ حدیث شیخین نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا اول الذکر قول اگر صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس کے اندر کوئی اہل ایمان میں سے نہیں رہے گا (سب کافر ہی رہ جائیں گے) اور کافر تو اس میں ہمیشہ بھرے رہیں گے۔

میں نے آیت لَبِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ یہ آیت بدعتی مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی۔ لیکن اکثر اہل تفسیر کے نزدیک احتساب سے مراد غیر متناہی صدیاں ہیں۔ جب علماء کا یہ اجماع ہو گیا کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے تو اب اس آیت کا اور آیت کے اندر جو دو استثناء کئے گئے ہیں ان کا مطلب کیا ہو گا۔ اس کی توضیح علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ میرے نزدیک سب سے اچھا مطلب یہ ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر جب ان کو بھڑکتی آگ سے نکال کر کھولتے اُبلتے پانی میں لے جا کر ڈالنا ہو گا تو جہنم سے کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

بغوی نے آیت يَطْوِفُونَ فِيهَا وَيَبِيْنُ حَمِيمٍ ان کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ جہنم و جہنم کے درمیان چکر لگاتے رہیں گے۔ آگ کی شدت کی وجہ سے جب وہ فریاد کریں گے تو گرم ابلتا پانی جو پگھلے ہوئے تانبے یا تیل کی طرح ہو گا ان کو پلایا جائے گا۔

اللہ نے فرمایا **وَإِنْ يَسْتَعْجِلُوْا عَاجِلًا نُّؤَا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ** یا آگ اور زہریر (سخت ترین سردی) کے عذاب میں چکر لگاتے رہیں گے۔ شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دوزخ نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کیا اے میرے رب میرے ایک حصے کو شدت گرمی کی وجہ سے دوسرا حصہ کھائے جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو سال میں دو سانس لینے کی اجازت دے دی ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں (موسم گرما میں) جو لوگ سخت ترین گرمی محسوس کرتے ہیں وہ دوزخ کی سانس کی وجہ سے ہوتا ہے اور سخت ترین سردی جو محسوس کرتے ہیں وہ بھی دوزخ کے سانس کے سبب سے ہوتا ہے۔ بزاز نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ آیت **فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا فِي اسْتِثْنَاءِ جُوعٍ** (گناہ گار) مؤمنوں کی طرف ہے۔ بد بخت مؤمنوں کو گناہوں کی سزا میں اللہ دوزخ میں ڈال دے گا پھر ایک مدت کے بعد وہاں سے رہا کر دے گا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگوں کو گناہوں کی سزا میں دوزخ کی لپٹ لگے گی، پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کو جنت میں داخل فرما

دے گا اور ان کو اہل جنت کی طرف سے جہنمی کہا جائے گا رواہ البخاری۔

حضرت عمر ان بن حصینؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے پھر ان کو جنت میں داخل کر لیا جائے گا لوگ ان کو جہنم والے کہیں گے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے بھی ایسی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ کہ وہ لوگ اللہ سے دعا کریں گے کہ جہنمی کا نام اللہ ان سے مٹا دے ان کی دعا پر اللہ یہ نام ان سے مٹا دے گا۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہ دوزخ میں رہیں گے۔ دوزخ میں مشرک ان کو عار دلائیں گے کہ تم کو تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (ہماری طرح تم بھی دوزخ میں ہو) اس پر اللہ ہر موحّد کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی موحّد وہاں باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی رَبَّمَا يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْوَكَاثِرُونَ مَسْلُمِينَ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں طبرانی اور ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور طبرانی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ گناہگار مؤمنوں کا دوزخ میں جانا پھر وہاں سے نکلنا اتنی احادیث میں آیا ہے جو حد تو اتر تک پہنچ چکی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے بدکار مؤمن دوزخ سے نکالے جائیں گے اور صحت استثناء کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ مجموعے سے کسی حکم کے منفي ہونے کے لئے بعض افراد سے حکم کا زوال کافی ہے۔ اور استثناء دویم سے یہی (گناہگار مؤمن) مراد ہیں عذاب کے زمانے میں باوجود مؤمن ہونے کے یہ لوگ جنت سے دور ہوں گے۔ دوامی، ابدی حکم کی نفی دونوں طور پر ہوتی ہے انتہا کی جانب منقطع ہونا اور ابتداء کی جانب نقطہ آغاز ہونا۔ پس یہ لوگ نہ دوامی سعید ہوں گے نہ ابدی شقی بلکہ گناہوں کی وجہ سے شقی اور ایمان و یقین کی وجہ سے سعید۔

... ایک شبہ ...

اس صورت میں تو فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ کہنا صحیح نہ ہو گا کیونکہ جب تیسری قسم نکل آئی جو سعید بھی ہے اور شقی بھی عقیدہ کے اعتبار سے سعید اور اعمال کی وجہ سے شقی تو شقی اور سعید کو دو بخشیں قرار دینا اور دونوں کو باہم مقابل اور حریف سمجھنا غلط ہو گا۔

... ازالہ ...

تقابل اور دو چیزوں کے انفصال کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔
 (۱) دونوں چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں اور نہ یہ ممکن ہو کہ دونوں نہ ہوں بلکہ ایک کا ہونا اور دوسری کا نہ ہونا ضروری ہے جیسے وجود و عدم، اثبات و نفی۔
 (۲) دونوں چیزوں کا ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہ ہو لیکن یہ ممکن ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں تیسری کوئی چیز ہو۔ جیسے سیاہی اور سفیدی۔ ایک چیز سیاہ بھی ہو اور سفید بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ سیاہ بھی نہ ہو اور سفید بھی نہ ہو، سرخ یا زرد ہو۔
 (۳) یہ ممکن نہ ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں لیکن دونوں کا جمع ہونا ممکن ہو۔ جیسے یہ ممکن نہیں کہ قیامت کے دن حشر کے بعد کوئی شخص سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سعید بھی ہو اور شقی بھی۔ عارضی مدت کے لئے دوزخ

میں چلا جائے یہ اس کی شقاوت ہو پھر رہائی پا کر جنت میں داخل ہو جائے یہ اس کی سعادت ہو (مترجم)
آیت میں یہی تیسری قسم مراد ہے یعنی کچھ لوگ خالص سعید ہوں گے کچھ خالص شقی اور کچھ سعید و شقی کا مجموعہ ایسا کوئی نہ ہو گا کہ سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو۔

بعض علماء نے کہا مَا شَاءَ سے مراد ہے مَنْ شَاءَ اور مَنْ شَاءَ سے مراد ہیں گناہ گار مؤمن۔
بعض اہل تفسیر نے کہا کہ حساب کے لئے میدانِ حشر میں کھڑے ہونے کا وقت یاد دنیا میں عالم برزخ میں رہنے کا وقت مستثنیٰ ہے۔ اہل سعادت کا دوامی جنتی ہونا اور اہل شقاوت کا دوامی دوزخی ہونا حساب و کتاب کے بعد ہو گا۔ اللہ نے حساب کا پورا وقت یاد دنیا میں رہنے کا وقت یا برزخ میں رہنے کا وقت، سکونتِ جنت و دوزخ کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ ان اوقات میں آدمی نہ جنت میں ہو گا نہ دوزخ میں اس تفسیر پر ممکن ہے بلکہ احتمال ہے کہ حسبِ قول بیضاوی خلود سے استثناء ہو یعنی ان اوقات کے علاوہ جنتی کا جنت میں اور دوزخی کا دوزخ میں خلود دوام ہو گا۔

بعض علماء نے کہا استثناء کا رجوع لَہُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَ شَهِيْقٌ کی طرف ہے یعنی جنتی مدت اور جن اوقات میں اللہ کو منظور ہو گا ان کا زفير و شہيق نہ ہو گا۔

سیوطی نے البدور السافرہ میں لکھا ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظِ اِلَّا کو لَيْسَ کے معنی میں قرار دیا جائے۔ استثناء کے لئے نہ قرار دیا جائے یعنی اِلَّا کے معنی اس جگہ علاوہ اور سوا کے ہیں جیسے عربی میں بولا جاتا ہے لَكَ عَلَيَّ اَلْفٌ دِرْهَمٍ اِلَّا اَلْاَلْفَانِ الْقَدِيْمَانِ تیرے مجھ پر ہزار درہم ہیں علاوہ سابق کے دو ہزار کے یعنی کل تین ہزار ہیں آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہو گا کہ وہ وہاں اتنی مدت رہیں گے جتنی مدت دنیا کے آسمان و زمین باقی تھے علاوہ اس زیادہ غیر متناہی مدت کے جتنا اللہ ان کو وہاں رکھنا چاہے گا مراد یہ ہے کہ ہمیشہ وہاں رہیں گے لیکن اس بیچ دارِ اَسْلُوْبِ عبارت کا فائدہ کیا ہے اور بیچ میں مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْاَرْضُ ذکر کرنے کا نتیجہ کیا ہے اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ پہلے طویل مدت کو ذہن نشین کرنے کے لئے مدتِ بقائے سماء و ارض کو ذکر کیا جس سے لوگ واقف تھے پھر اس کے بعد غیر متناہی اور اَنْ گنت مدت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ غیر متناہی مدت کا طول سمجھ میں آجائے۔

بعض علماء نے کہا اِلَّا بمعنی واو (اور) ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کو کوئی دلیل نہ ملے اور نہ ظالموں کو تم پر کوئی حجت حاصل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے اور جب تک اللہ چاہے گا یعنی ہمیشہ رہیں گے۔ فراء نے کہا یہ استثناء تو ہے مگر ایسا استثناء ہے کہ اس کا فعلی ظہور بھی نہیں ہو گا، اگر تمہارا ارادہ پختہ طور پر کسی کو مارنے کا ہو مگر تم اس طرح کہو خدا کی قسم میں تجھے ضرور ماروں گا مگر اس وقت جب کہ نہ مارنا میری نظر میں بہرہ ہو (تو نہیں ماروں گا) اس صورت میں مطلب اس طرح ہو گا کہ وہ وہاں اس وقت تک رہیں گے جب تک اللہ چاہے گا جب اللہ اس کے خلاف چاہے گا تو وہ نکال لئے جائیں گے یعنی اگر اللہ چاہے گا تو ان کو رہائی دے دے گا، لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گا۔

قنادہ نے کہا (ہمیں نہیں معلوم) اللہ ہی اس استثناء کے مطلب سے واقف ہے۔

۱۔ اس فقیر کی نظر میں آیت کے مطلب میں کوئی ابہام نہیں بلکہ اس طرزِ بیان میں خاص قدرت ہے اور کوتاہ نظر لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہونے والے شبہ کا جواب بھی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ آیت میں بعض احوالِ آخرت کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ مؤمنوں کے لئے دوامی جنت اور کافروں کے لئے دوامی دوزخ کی صراحت کی ہے اور یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ سماوات و ارض سے مراد جنت و دوزخ کے آسمان و زمین ہیں اور چونکہ یہ اُخروی آسمان و زمین لازوال ہیں اور جنت و دوزخ کے اندر سکونت کو بقائے سماوات و ارض کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اس لئے جنت و دوزخ کی سکونت بھی دوامی (بقیہ اگلے صفحے پر)

إِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ ⑩ بے شک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر اس کو کر سکتا ہے۔ (یعنی اس کا اختیار کلی اور ہمہ گیر ارادہ اور محیط کل مشیت آزاد ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اہل جنت کو جنت اور اہل نار کو دوزخ کی سکونت دوامی دینے کے بعد بے اختیار ہو گیا ہو کہ کسی کو اس کے مسکن سے باہر نہ نکال سکے لیکن نکالے گا نہیں۔ بقول فراء یہ استثناء صحیح ہے لیکن اس کا فعلی ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا وَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ط اور لیکن جو خوش نصیب ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جب آپ کے رب کی مشیت ہوگی (تو نکل سکیں گے اگرچہ کبھی نہیں نکلیں گے) استثناء کے متعلق علماء کے مختلف اقوال اس آیت میں بھی وہی ہیں جو گزشتہ آیت کی تفسیر میں بیان کر دیئے گئے۔

میرے نزدیک اس جگہ پسندیدہ قول یہ ہے کہ بعض اوقات میں اہل جنت کو اس درجہ پر فائز کر دیا جائے گا۔ جو جنت سے بھی اعلیٰ ہوگا یعنی اللہ کے دیدار میں استغراق اور بارگاہِ قدس سے ناقابلِ بیان اتصال۔ اہل تفسیر نے آیت وَجُوهٌ يُّؤَمِّنُونَ نَاصِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاصِرَةٌ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاصِرَةٌ میں اِلَىٰ رَبِّهَا کو نَاصِرَةٌ سے پہلے ذکر کرنا مفید حصر ہے (اپنے رب ہی کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) یعنی اللہ کے دیدار میں اتنا غرق ہوں گے کہ کسی دوسری چیز کی طرف نگاہ بھی نہیں اٹھائیں گے۔ حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت اپنے عیش میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور اُن پر نمودار ہو گا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اوپر اُن کو جھانکتا دکھائی دے گا اور خطاب فرمائے گا اے اہل جنت تم پر سلام ہو۔ آیت سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ کا یہی مطلب ہے غرض اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف۔ اللہ کی جانب دیکھنے کے وقت وہ کسی اور نعمت کی طرف التفات بھی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ حجاب کر لے گا اور اس کی چمک و برکت اہل جنت کی گردن میں رہ جائے گی رواہ ابن ماجہ و ابن ابی الدنیا و دارقطنی۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات جلد سوئم میں یعقوبؑ کی یوسفؑ کے ساتھ دلاویزی کی حقیقت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے جو اسم جس شخص کا مبدع تعین (مرکز ظہور) ہوتا ہے اس اسم کا ظہور (کسی جسم کے اندر) اس شخص کی جنت ہوتا ہے اور اس اسم کا ظہور تجلی درختوں، نہروں، شان دار محلات اور حور و غلمان کی شکل میں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور پانی شیریں ہے اور وہاں میدان ہیں اور اس کے پودے یہی ہیں یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جنت کے پودے ہیں۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا بھی یہ درخت اور نہریں چمکدار روشن زجاجی اجسام (جیسے عینک کے آئینے) کی شکل اختیار کر لیں گے اور اللہ کے بے کیف دیدار کے حصول کا ذریعہ ہو جائیں گے انہیں کے ذریعے سے اللہ کا دیدار حاصل ہو جائے گا مگر یہ رؤیت ہر کیفیت سے پاک ہوگی پھر اپنی اصلی (شجرہ یا نہری) شکل کی طرف لوٹ آئیں گے اور مؤمن پھر انہیں سے (اسی شجرہ یا نہری شکل میں) تفریح کرے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے گا ہم نے اس مقام کی مزید توضیح سورہ قیامتہ کی آیت رؤیت کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْذُوذٍ ⑪ وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔ یعنی اللہ کا وصال اور دیدار ایک ایسا عطیہ خداوندی ہوگا

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ہوگی۔ لیکن اس صراحت کے بعد کیا خدا مجبور ہو گیا کیا وہ مشیت سے معطل ہو گیا۔ کیا اس کا کوئی اختیار نہیں رہا یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس کو زائل کرنے کے لئے مشیت کا استثناء کر لیا جس کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ نے جنتیوں کے جنت اور دوزخیوں کے لئے دوزخ کو دوامی کر دی لیکن وہ مجبور نہیں ہو گیا اس کی مشیت اس کے خلاف بھی کار فرما ہو سکتی ہے یعنی یہ دوامی حکم اس نے اپنی مشیت سے جاری کیا ہے اور اس حکم کے اجراء کے بعد اس کی مشیت و اختیار کی صفت سلب نہیں ہو گئی وہ جب چاہے مذکورہ صراحت کے خلاف بھی اپنے اختیار کو استعمال کر سکتا ہے مگر چونکہ اس نے وعدہ کر لیا ہے اور سزا و جزا دوامی ہونے کی صراحت کر دی ہے اس لئے باوجود اختیارِ کامل اور مشیتِ تامہ کے اس حکم کو منسوخ نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم (مترجم)

جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ یوں تو جنت کی ہر نعمت غیر منقطع اور لازوال ہوگی لیکن اللہ کا وجود اصل اور حقیقی ہے اور دوسری چیزوں کا وجود ظلی ہے اللہ کے وجود سے وابستہ (بلکہ اس کا پر تو۔ مترجم) پس بذاتہ اور خود بخود موجود صرف اللہ ہے باقی ہر چیز مالک اور معدوم الاصل ہے جیسے مانگے کپڑے اپنے نہیں ہوتے مالک کے ہوتے ہیں۔ پس اللہ جو اہل جنت کو اپنا بے کیف و صل عنایت کرے گا اور بے حجاب دیدار دکھائے گا وہی اصل، حقیقی اور غیر منقطع عطا ہوگی، باقی دوسری نعمتیں واصل ذات کے مقابلے میں ذیلی، ظلی اور اصلاً معدوم ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن زید نے کہا اہل جنت کے لئے تو اللہ نے اپنی غیر منقطع عطا کا ذکر کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ دوزخیوں کے لئے کیا چاہے گا کیا کبھی ان کا عذاب منقطع کرنا چاہے گا یا ان کا عذاب بھی لازوال ہوگا بلکہ دوزخیوں کے حق میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْذِبُ الْمُنَافِقِينَ مَا يَعْذِبُونَ اِلَّا كَمَا يَعْذِبُ اَبَاؤَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَلَئِن كَانُوا لَمْ يَكُونُوا لِيَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝۱۹

سو (اے مخاطب) جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اس کے بارے میں ذرا شبہ نہ کرنا یہ لوگ بھی اسی طرح بلادلیل کے غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگ ان سے پہلے عبادت کرتے تھے۔ یعنی تمام لوگوں کی سزا و جزا کی جو تفصیل ہم نے بیان کر دی اس کے بعد آپ شک میں نہ رہیں کہ مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ سراسر گمراہی ہے اور اسی عذاب کا مستحق بنانے دینے والی ہے جس عذاب کے مستحق ان کے اسلاف اپنی مشرکانہ عبادت کی وجہ سے ہوئے یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے بیان کے بعد آپ کو شک نہ کرنا چاہئے کہ ان مشرکوں کے معبود نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، ان کے معبود بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کے مشرک اسلاف کے۔ (اول مطلب پر مِمَّا يَعْذِبُ میں ما مصدریہ ہوگا اور دوسرے مطلب پر موصولہ مترجم)۔

اِلَّا كَمَا يَعْذِبُ النَّاسَ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّسْوًىٰ سَازِجًا مُّسْوًىٰ يَتَّبِعُونَ النَّارَ تَطْفِئُهَا بِالنَّارِ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ السَّافِلِيْنَ

تھی (ما مصدریہ) کیا یہ بھی انہیں کی پوجا کرتے ہیں جن کی ان کے اسلاف کرتے تھے (ما موصولہ) اور یہ آپ کو پہلے معلوم ہی ہو چکا کہ ان کے اسلاف کا نتیجہ کیا ہوا۔ پس جو نتیجہ ان کا ہو وہی ان کا ہوگا اسباب ایک جیسے ہیں تو نتائج بھی ایک ہی طرح کے ہوں گے۔

نَصِيبُهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ السَّافِلِيْنَ

مراد ہے اس مطلب پر تاخیر عذاب کی وجہ کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے جو ان کے عذاب کو مؤخر کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے رزق کا حصہ پورا کر رہے ہیں۔ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ رِزْقٌ مِّنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ السَّافِلِيْنَ (باب تَفْخِيْلٍ) ہے جس کا معنی ہے ادا کرنا، خواہ پورا پورا ہو یا کمی کے ساتھ۔

وَقِيَّتُهُ حَقُّهُ فِي الَّذِي نَدَبْتَهُ بِرَبِّهِ ۗ اِنَّ رَبَّهُ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ

پورا حق دینا اس لئے تاکید کے لئے غیر منقوص فرمایا کہ ان کے حصے کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ فَاخْتَلَفَ فِيْهِ ۗ

اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی (یعنی توریت) پھر اس میں اختلاف کیا گیا کسی نے اس کو مانا تصدیق کی کسی نے نہ مانا تکذیب کی۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا پیام ہے کہ قرآن کی تصدیق و تکذیب کوئی نئی بات نہیں، موسیٰ کو جو توریت دی گئی تھی اس کو ماننے نہ ماننے میں ایسے ہی اختلاف ہو گیا تھا۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِّىٰ بَيْنَهُمْ

اور اگر ایک بات آپ کے رب کی طرف سے نہ ہو چکی ہو تو ان کا قطعی فیصلہ دنیا میں ہی ہو چکا ہوتا یعنی اگر قیامت تک مہلت دینے کا اللہ کا (ازلی) حکم نہ ہو گیا ہوتا تو حق

پرست اور باطل پرست کا فیصلہ یہیں ہو چکا تھا حق پرست کو بچایا جاتا اور باطل پرست پر عذاب آجاتا۔
 اور وہ (یعنی کفار مکہ) قرآن (یا عذاب) کی طرف سے شک میں مبتلا ہیں جو

وَإِنَّهُمْ لَكُفْرًا مِّنْهُ مُرِيبٌ ۝۱۱

ان کو متردّد بنائے ہوئے ہے۔

وَأَنَّ كَلِمَاتٍ كُتِبَ عَلَيْهِنَّ رَبُّكَ أَعْمَالَهُنَّ
 ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔

ان حرف تحقیق ہے نافع ابن کثیر اور ابو بکر کے نزدیک ان، منقّفہ ہے (اصل میں اِنَّ تھا) کَلِمَاتٍ میں تین مضاف الیہ کے بجائے آئی ہے یعنی اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک خواہ مؤمن ہو یا کافر۔ کَلِمَاتٍ اصل میں لَمَنْ مَا تَهَانُونَ کو میم سے بدل دیا۔ تین میم جمع ہو گئے اول میم کو حذف کر دیا پھر ایک میم کا دوسرے میم میں اوغام کر دیا تا زیادہ ہے۔ بعض نے کہا اصل میں کَلِمَاتٍ لَمَمَّتْ کا مصدر لَمَّتْ ہے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔

صاحب ایجاز نے لکھا ہے کہ یہ لَمَّتْ ظرفیہ ہے اور کلام میں کچھ اختصار ہے اصل کلام اس طرح تھا وَإِنْ كَلِمَاتٍ لَمَّتْ بِعَثُوا
 لیو قینہم جب ہر شخص کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اللہ اس کے اعمال کا ضرور بدلہ دے گا۔
 جو کچھ وہ کرتے ہیں یا کرتے تھے اللہ اس سے پورا واقف ہے کوئی پوشیدہ عمل بھی

إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝۱۲

اس سے مخفی نہیں ہے۔ خیر ہو یا شر (ہر چیز سے وہ باخبر ہے)۔
 پس جو حکم آپ کو دیا گیا ہے آپ بھی اس پر قائم رہیں اور وہ

فَأَسْتَفْتِمُ كَمَا أَمَرْتُ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ

لوگ بھی جو آپ کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔
 جب اللہ نے مؤمنوں اور کافروں یعنی توحید و نبوت کو ماننے اور نہ ماننے والوں کا ذکر پہلے کر دیا اور سزا و جزا کے وعدے اور وعید کی بھی وضاحت کر دی تو اب استقامت کا حکم دیا رسول اللہ ﷺ کو بھی اور دوسرے اہل ایمان کو بھی۔ استقامت کا لفظ اپنے اندر عموم رکھتا ہے ہر طرح کی استقامت کو شامل ہے۔

(۱) عقائد کی استقامت، یعنی اللہ کی ذات کو تمام صفات کمالیہ کا جامع سمجھنا (صفات خداوندی کا انکار نہ کرنا) مگر اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ بھی نہ قرار دینا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق کی صفت کی طرح نہیں ہے۔ اس کی صفات کامل ہیں) اور نہ بندوں کو بالکل مجبور سمجھ لینا نہ کامل مختار (یعنی انسان کو درود یوار اور چرند و پرند کی طرح بے اختیار بھی نہ سمجھنا اور نہ قادر مطلق بے لگام مختار کہ جیسا چاہے کر سکے اور جب چاہے جاسکے بلکہ درمیانی سیدھی راہ پر ہی چلنا)۔

(۲) اعمال کی استقامت یعنی وحی اور شریعت کو پورا پورا بیان کر دینا نہ اس میں زیادتی کرنا نہ کمی۔
 (۳) عبادات اور معاملات کو ان کے حقوق کے موافق ادا کرنا نہ ان میں (جذبہ خیر کے زیر اثر) زیادتی کرنا نہ پانچ وقت کی جگہ چھ وقت کی نماز فرض قرار دے دی جائے نہ کمی کرنا کہ چار رکعت فرض کی جگہ تین رکعتیں مقرر کر لی جائیں)۔
 حضرت سفیان بن عبد اللہ تقنی کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اسلام کے متعلق مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کہو اور استقامت رکھو، رواہ مسلم۔ (یعنی سیدھی

دیکھئے کہ آپ کے بعد میں کسی سے پوچھنے کا محتاج نہ رہوں فرمایا اَمْسَتْ بِاللَّهِ کہو اور استقامت رکھو، رواہ مسلم۔ (یعنی سیدھی چال چلو اور اس پر قائم رہو) لفظ استقامت تمام امور کو حاوی ہے۔
 حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا، استقامت سے مراد یہ ہے کہ اوامر و نواہی پر قائم ہو جائے اور لومڑی کی طرح (راہ مستقیم سے ادھر ادھر نہ مڑے)۔
 استقامت بہت ہی سخت حکم ہے (یعنی اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہے) اس لئے صوفیاء کا قول ہے کہ استقامت کا مرتبہ کرامت سے اونچا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری نبوت کی مدت میں اس آیت

سے زیادہ سخت آپ ﷺ پر کوئی اور آیت نازل نہ ہوئی اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا، میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول سے معلوم ہو رہا ہے کہ سورہ ہود نے جو رسول اللہ ﷺ کو بوڑھا کر دیا اس سے مراد پوری سورت نہیں بلکہ اس سورت کی یہی آیت ہے جس میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ حضور ﷺ کو فطر تا اور تخلیقاً استقامت کے حامل تھے مگر آپ پر ایمان لانے والے اور آپ کا اتباع کرنے والی ساری امت تو ایسی نہ تھی اور امت پر آپ بڑے مہربان تھے اسی فکر نے آپ کو بوڑھا کر دیا کہ امت کے لئے استقامت سخت دشوار ہے اس کا کیا ہوگا۔

بظاہر فرمان نبوی ﷺ سُوْدَتُ هُوْدٍ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ہود میں گزشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان کی ہلاکتوں کا بیان کیا گیا ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس امت کے ظالموں کو بھی دنیا اور آخرت میں ایسے ہی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اس اندیشے نے حضور ﷺ کو بوڑھا کر دیا۔

اور حدودِ شرع سے تجاوز نہ کرو۔ کہ اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۳﴾

بعض علماء نے کہا طغیان نہ کرنے سے مراد ہے غلو کرنا یعنی اوامر و نواہی کو ان کی مقررہ حدود سے آگے بڑھانا۔ حضرت

ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین آسان ہے اس میں جو شدت اختیار کرے گا (آخر تھک جائے گا، قوت جسمانی جو اب دے دے گی اور) دینی شدت اس کو مغلوب کر دے گی۔ لہذا تم سیدھی اور درمیانی چال چلو اور کامیابی کی لوگوں کو بشارت دو، سختی کر کے مایوس نہ بناؤ اور رفتارِ صبح و شام اور کچھ سیرِ شب سے مدد حاصل کرو۔ رواہ البخاری والنسائی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بوڑھا کر دینے والا بابرِ استقامت تھا (کہ لوگ احکام میں استقامت نہیں رکھ سکیں گے)

اور ظالموں کی طرف نہ جھکو کہ اس میلان کی وجہ

وَلَا تَزُكُّوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَاَنْتُمْ

سے تم کو بھی آگ لگ جائے گی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کون سے مراد ہے محبت اور دل کا جھکاؤ یعنی دل سے مائل نہ ہو۔ ابو العالیہ نے کہا ظالموں کے اعمال کو پسند نہ کرو۔ سدی نے کہا ظالموں کے معاملہ میں چشم پوشی اور مددِ اہنت نہ کرو۔ عکرمہ نے کہا ظالموں کا کہنا نہ مانو۔ بیضاوی نے لکھا ہے ادنیٰ جھکاؤ بھی ظالموں کی طرف نہ کرو۔ کون کا معنی ہے ادنیٰ میلان۔ مثلاً ظالموں کا کلچر اور طور طریقہ اختیار کرنا ان کا ذکر تعظیم کے ساتھ کرنا۔ یہ ادنیٰ میلان ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے جب ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ کا نتیجہ دوزخ ہے تو سمجھو کہ خود ظلم کرنے اور ظلم میں منہمک رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ظلم سے بازداشت کرنے کا بلخ ترین اسلوب بیان ہے روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ امام نے یہ آیت پڑھی، یہ شخص سن کر بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا اور بے ہوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو بولا یہ سزا تو ظالم کی طرف مائل ہونے والے کی ہے ظالم کا کیا ہوگا۔ (اس تصور نے مجھے بے ہوش کر دیا)

حسن بصریؒ کا قول منقول ہے کہ اللہ نے دین کو دو ڈولا کے درمیان کر دیا ہے ایک تَفَعُّوْا اور دوسرا اَلَا تَرٰكُفُوْا (خود بھی حد سے تجاوز نہ کرو، اور ظالم کی طرف مائل بھی نہ ہو)۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ عالم ہے جو ظالم کی ملاقات کو جاتا ہے۔ حضرت اوس بن کعبؓ نے فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے قوت پہچاننے کے لئے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ ظالم اپنا ہی نقصان کرتا ہے دوسرا کہ نہیں کرتا حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سنا کر فرمایا کیوں نہیں ظالم ظلم سے تو چڑیاں بھی اپنے آشیانے میں بھکی جاتی ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں مذکور ہیں بیضاوی نے لکھا ہے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے ساتھ مؤمنوں کو اس آیت میں خطاب کی غرض یہ ہے کہ استقامت یعنی عدل پر ثابت قدم رہیں (افراط و تفریط کی طرف مائل نہ ہوں) افراط یا تفریط کی طرف جھکاؤ سے اپنے اوپر ظلم ہو یا دوسرے پر وہ تو فی نفسہ ظلم ہے (خواہ اس کی زد کسی پر پڑے یا نہ پڑے)

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿۱۱۷﴾
 گار نہ ہوگا۔ پھر تمہاری مدد (کیس سے بھی) نہیں کی جائے گی۔
 اولیاء یعنی مدگار۔ جو عذاب کو دفع کر سکیں۔ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ یعنی پھر اللہ تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ تم کو عذاب دینے کا
 محکم آزی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ثُمَّ اسْتِجَادَ کے لئے ہے یعنی اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہونی بہت بعید ناممکن ہے یا کسی طرف سے
 بھی تمہاری مدد ممکن نہیں جس کو اللہ عذاب دینا طے کر لے اس کی مدد کون کر سکتا ہے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا کہ حضرت
 ابوالیسر (بقول بغوی ان کا نام عمرو بن عریہ انصاری تھا) نے فرمایا ایک عورت کچھ چھوڑنے خریدنے میرے پاس آئی۔ میں نے
 کہا گھر کے اندر اس سے اچھے چھوڑے ہیں (تم میرے ساتھ چل کر دیکھ لو) وہ میرے ساتھ اندر چلی گئی اندر پہنچ کر میں نے
 اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا بوسہ لے لیا (کرنے کو تو ایسا کر گزرا) پھر مجھے اپنے کئے پر پچھتاوا ہوا اور حضرت ابو بکرؓ کی
 خدمت میں آکر واقعہ عرض کر دیا، آپ نے فرمایا توبہ کرو اور اس کو ظاہر نہ کرو میں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا اور ان سے تذکرہ کیا
 انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ توبہ کرو اور ظاہر نہ کرو، آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ
 عرض کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے گیا ہوا ہے تو نے اس کی غیبت میں اس کی بیوی کے
 ساتھ ایسی حرکت کی، اندازہ ہوتا تھا کہ حضورؐ نے میرے دوزخی ہونے کا خیال کر لیا پھر آپ نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور آیت
 ذیل نازل ہوئی۔

آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرِسْلًا مِّنَ اللَّيْلِ

سروں پر۔ اور رات کے کچھ حصوں میں۔ جو دن کے قریب ہوں۔

صحابہ نے عرض کیا کہ یہ آیت کیا آپ کے لئے مخصوص ہے یا سب لوگوں کے لئے ہے فرمایا سب لوگوں کے لئے
 ہے۔ صاحب لباب النقول نے لکھا ہے حضرت ابوالیسر کی روایت کی طرح حضرت ابوامامہؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت بریدہؓ
 وغیرہم کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔

دن کے دونوں کناروں سے مراد ہے صبح اور شام۔ زَلْفَاتِنَ اللَّيْلِ رات کا ایک ٹکڑا یا چند ساعات جو دن سے متصل
 ہوں (یعنی پچھلی رات یا شروع رات) زَلْفَةٌ زَلْفَةٌ کی جمع ہے۔ اَزْلَفَهُ اس کو قریب کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک دن کے دونوں کناروں سے فجر اور مغرب کی نمازیں اور زَلْفَاتُ سے عشاء کی نماز مراد
 ہے۔ حسن نے کہا دن کے دونوں کناروں سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں اور زَلْفَةٌ سے مراد مغرب و عشاء ہیں۔ حسن
 بصری کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر و عصر کی اور مغرب و عشاء کی نمازیں بوقت ضرورت ایک ہی شمار کی جانی
 ہیں، اسی بنا پر امام مالک و امام شافعی و امام احمدؒ کا قول ہے کہ اگر عصر کے آخر وقت میں کوئی کافر مسلمان ہو جائے یا حائضہ پاک
 ہو جائے یا لڑکا بالغ ہو جائے تو اس پر ظہر و عصر دونوں نمازیں واجب ہو جائیں گی اور عشاء کے آخر وقت میں صورت مذکورہ اگر
 پیدا ہو جائے تو مغرب اور عشاء دونوں کا وجوب ہو گا امام ابو حنیفہؒ کا قول جمہور ائمہ کے قول کے خلاف ہے آپ کے نزدیک
 صرف عصر اور عشاء کی نماز واجب ہوگی آیت إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا بَاقِيًا تَوَقُّوتًا کی تشریح میں سورہ
 نساء میں ہم نے امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت دوسری
 نماز کے وقت سے جدا ہے اس لئے امام صاحبؒ کے نزدیک سفر، یا بیماری یا بارش کے عذر کی وجہ سے بھی ظہر و عصر اور مغرب و
 عشاء کو ملا کر ایک وقت میں پڑھنا درست نہیں اور بغیر عذر کے تو دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز
 نہیں۔

امام مالکؒ و امام احمدؒ کے نزدیک سفر کی حالت میں دو نمازوں کو جمع کرنا درست ہے، امام مالک اور امام احمد بارش کی وجہ سے
 صرف مغرب و عشاء کو ایک وقت میں ادا کرنا جائز کہتے ہیں اور امام شافعی بارش کی وجہ سے صرف ظہر و عصر کو ملا کر پڑھنا درست

قرار دیتے ہیں اور امام احمد کے نزدیک بیماری کی وجہ سے بھی دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔

جمہور نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت حمہ بنت محسن کا واقعہ پیش کیا ہے، حمہ استحاضہ کی مریض تھیں (استحاضہ یعنی پیرا کا مرض جس ہر وقت خون جاری رہتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان کو دو نمازوں کو جمع کرنے کا حکم دے دیا تھا اور فرمایا تھا ظہر میں تاخیر اور عصر میں عجلت (یعنی اول وقت ادا کر لیا کرو۔ پھر غسل کر کے دونوں نمازیں (ترتیب کے ساتھ) جمع کر لیا کرو۔ رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سفر کی حالت میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ یحییٰ بن یحییٰ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ملا کر پڑھا کرتے۔ یحییٰ بن یحییٰ نے حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال سے پہلے سفر کرتے تھے تو ظہر (آغاز عصر تک مؤخر کر دیا کرتے تھے پھر اتر کر دونوں کو ملا کر ادا کرتے تھے اور زوال کے بعد سفر کرتے تھے تو ظہر پڑھا کر سوار ہوتے تھے مسلم میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ میں نے عرض کیا حضور ﷺ نے ایسا کیوں کیا فرمایا تاکہ امت کو دشوار نہ رہے امام ابو حنیفہؒ نے ان تمام احادیث کے جواب میں فرمایا کہ ان احادیث میں ملا کر پڑھنے سے مراد ہے جمع صوری یعنی ظہر کو آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو شروع وقت میں مغرب کو دیر کر کے آخر وقت میں پڑھنا اور عشاء کو جلدی کر کے آغاز وقت میں ادا کرنا اس طرح حضور ﷺ نے ہر نماز اسی کے وقت میں ادا کی لیکن ایک میں تاخیر اور دوسری میں عجلت کرنے کی وجہ سے دونوں نمازیں ملی ہوئی بیک وقت نظر آنے لگیں اور حقیقت میں ہر نماز اپنے وقت میں ہوئی۔ حضرت حمہؓ والی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور اسی معنی پر وہ حدیث محمول ہے جو یحییٰ بن یحییٰ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آئی ہے کہ مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے رسول اللہ ﷺ نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھیں (یعنی ایک میں تاخیر کی اور دوسری میں عجلت) مسلم کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کی غرض کیا تھی فرمایا امت کو دشواری میں نہ رکھنا۔ طبرانی کی روایت ہے بغیر کسی وجہ کے مدینہ میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کا مقصد کیا تھا فرمایا امت کے لئے سہولت پیدا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جمع صوری (یعنی اول نماز کو آخر وقت میں اور دوسری کو اول وقت میں پڑھنا) ہی مراد ہے بلا وجہ دونوں نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا تو بالاجماع درست نہیں۔ صحیح بخاری میں عمرو بن دینار کی روایت سے تو صریحاً یہی مضمون آیا ہے، الفاظ اس طرح ہیں میں نے کہا ابو الشعثاء میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے ظہر کے وقت میں تاخیر اور عصر کی نماز میں عجلت کی ہوگی اور مغرب کو آخر وقت میں اور عشاء کو شروع وقت میں ادا کیا ہوگا۔ ابو الشعثاء نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

..... ایک سوال ❁

جمع تاخیر کو تو جمع صوری قرار دیا جاسکتا ہے (یعنی ظہر کو اتنا مؤخر کرنا کہ عصر سے مل جائے اور مغرب کو اتنا مؤخر کرنا کہ عشاء سے متصل ہو جائے) لیکن بعض روایات میں تو جمع تقدیم کی شکل آئی ہے جس کو جمع صوری قرار ہی نہیں دیا جاسکتا (یعنی عصر کو وقت سے پہلے ظہر کے وقت میں ادا کیا اور عشاء کو اس کا وقت آنے سے پہلے مغرب کے وقت میں پڑھا) چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس کو امام احمد اور بیہقی و دارقطنی نے حسین بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عباس اور عکرمہ و کریب از ابن عباسؓ کے سلسلہ سے نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا فرود گاہ پر زوال آفتاب ہو جاتا تو سوار ہونے سے پہلے حضور ﷺ ظہر و عصر کو جمع کر لیا کرتے اور فرود گاہ پر (قیام کی حالت میں) زوال نہ ہوتا تھا تو (بغیر ظہر پڑھے) روانہ

ہو جاتے تھے پھر جب عصر کا وقت آجاتا تھا تو اتر کر ظہر اور عصر کو ملا کر پڑھتے تھے (اسی طرح) فرودگاہ پر مغرب کے وقت ہوتے تھے تو مغرب و عشاء (کو مغرب کے وقت) پڑھ لیتے تھے اور (مغرب کے وقت) فرودگاہ پر نہیں پہنچتے تھے تو سوار رہ کر چلتے رہتے تھے یہاں تک کہ جب عشاء کا وقت آجاتا تھا تو اتر کر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے تھے رہی حضرت انسؓ والی روایت تو اسماعیلی و بیہقی نے اسحاق بن راہویہ کے حوالے سے اس کے الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے تھے اور آفتاب ڈھل جاتا تھا تو ظہر و عصر کو ملا کر پڑھ لیتے تھے پھر کوچ کرتے تھے۔ نووی نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے۔ اور حضرت معاذؓ والی حدیث کو امام احمد، ابوداؤد ترمذی، ابن حبان، حاکم، دارقطنی اور بیہقی نے بحوالہ قتیبہ ازلیث ازیزید بن حبیب از ابوالطفیل از معاذ بن جبل ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ غزوہ تبوک میں اگر روانگی سے پہلے زوال ہو جاتا تو حضور ﷺ ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت میں جمع کر کے پڑھتے اور اگر زوال سے پہلے روانہ ہو جاتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے یہاں تک کہ عصر کے لئے اترتے تھے (تو ظہر بھی شروع میں پڑھتے تھے پھر عصر پڑھتے تھے) مغرب کے متعلق بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔

ہم کہتے حسین بن عبد اللہ کی روایت سے جو حدیث آپ نے بیان کی ہے وہ روایت ضعیف ہے۔ حسین ضعیف ہے ابن معین کا یہی تبصرہ ہے اور نسائی نے اس کو متروک کہا ہے۔ رہی حضرت انسؓ والی حدیث تو اس کی اسناد کو نووی نے صحیح کہا ہے۔ لیکن ذہبی نے بیان کیا ہے کہ ابوداؤد نے اسحاق بن راہویہ کی تردید کی ہے مگر اس روایت کی متابعت وہ روایت بھی ہے جس کو حاکم نے الاربعین میں بیان کیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں جب روانہ ہونے سے پہلے زوال ہو جاتا تو ظہر و عصر پڑھ کر سوار ہوتے۔ یہ زیادتی اگرچہ غریب ہے مگر صحیح ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے اور روانگی سے پہلے زوال آفتاب ہو جاتا تو ظہر و عصر کو یکجا (ظہر کے وقت میں) پڑھ لیتے تھے اور اگر زوال سے پہلے روانہ ہو جاتے تو شروع عصر میں دونوں کو جمع کر کے پڑھ لیتے اور مغرب اور عشاء میں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مگر طبرانی نے کہا یعقوب بن محمد زہری اس روایت میں منفرد ہیں۔

حضرت معاذؓ والی مذکورہ بالا حدیث کے متعلق ترمذی نے کہا اس کی روایت میں قتیبہ منفرد ہے اور معروف وہ ہے جو مسلم نے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے کہا یہ حدیث منکر ہے جمع تقدیم کے متعلق کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ ابوسعید بن یونس نے کہا یہ حدیث سوائے قتیبہ کے کسی نے نہیں بیان کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے بیان میں غلطی ہے ابو حاتم نے اس کو معطل کہا ہے حاکم نے بھی اس پر لمبی جرح کی ہے بخاری اور ابن حزم کے نزدیک بھی قتیبہ مجروح ہے سفر کی حالت میں دو نمازوں کو اول نماز کے وقت میں جمع کرنے کے سلسلے میں ایک اور حدیث بھی آئی ہے جس کو دارقطنی نے اپنی سند سے بواسطہ اہل بیت بیان کیا ہے مگر اس سند میں بھی غیر معروف راوی ہیں۔ اس میں ایک راوی منظر قابوسی بھی ہے جو ضعیف ہے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے استدلال میں حضرت ابن مسعودؓ کی وہ روایت پیش کی ہے کہ جو صحیحین میں مذکور ہے حضرت عبد اللہؓ نے فرمایا میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز غیر وقت میں پڑھی ہو سوائے مزدلفہ کے۔ مزدلفہ میں تو حضور ﷺ نے مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا اور دوسرے دن فجر کی نماز تڑکے سے وقت سے پہلے پڑھی تھی۔ شاید حضرت ابن مسعودؓ کی مراد یہ ہے کہ معمولاً فجر کی نماز جس وقت پڑھتے تھے اس سے پہلے مزدلفہ میں پڑھ لی تھی۔ عرفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ چونکہ مشہور ہے اسی لئے شاید حضرت ابن مسعودؓ نے عرفہ کا ذکر نہیں کیا (صرف مزدلفہ کا ذکر کیا)۔

لَيْلَةُ التَّعْرِينِ والی (جب کہ پچھلی رات کو ایک جگہ سفر میں حضور ﷺ نے پڑاؤ کیا تھا اور بلال کو جاگتے رہنے اور فجر کے لئے بیدار کرنے کا حکم دے کر خود سو گئے تھے اور صحابہؓ بھی سو گئے اور اتفاقاً بلال بھی سو گئے اور سب کی نماز قضا ہو گئی تو حضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سونے کی حالت میں (نماز قضا ہونے میں) کوئی قصور نہیں قصور تو اس بات میں ہے کہ بیداری کی حالت میں نماز میں اتنی تاخیر کر دی جائے کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔ امام ابو حنیفہؒ؟

نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ
یعنی نیکیوں کی وجہ سے برائیاں ساقط کر دی جاتی ہیں۔ طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیکی پرانی بدی کا جس طرح خوبی کے ساتھ پیچھا کرتی اور تیزی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے اتنی پہنچ والی اور کوئی خبر میں نے نہیں دیکھی۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔

امام احمد ناقل ہیں کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، فرمایا جب تو کوئی گناہ کرے تو اس کے پیچھے نیکی بھی ضرور کرنا۔ نیکی بدی کو مٹا دے گی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا نیکیوں میں سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (کا اقرار) بھی ہے۔ فرمایا وہ سب نیکیوں سے افضل ہے۔ حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ کسی شخص نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا، اس پر اللہ نے آیت وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ نَازِلًا فرمائی۔ اس شخص نے عرض کیا، کیا یہ تمہا میرے لئے ہے، فرمایا میری تمام امت کے لئے۔ دوسری روایت میں ہے میری امت میں سے جو بھی اس پر عمل کرے اس کے لئے (یہی حکم) ہے، رواہ البخاری و مسلم۔

مسلم کی روایت میں اس کے بعد اتنا اور بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا اللہ تیری پردہ پوشی کرتا اگر تو اپنا جرم چھپا لیتا۔ حاکم و بیہقی نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں اور جمعہ کی نماز جمعہ تک اور رمضان کے روزے رمضان تک درمیانی گناہوں کو ساقط کر دینے والے ہیں۔ جبکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچا رہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر دریا ہو اور وہ اس میں روز پانچ بار غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائے گا صحابہ نے عرض کیا کچھ نہیں رہے گا پس یہی حالت پانچ نمازوں کی ہے اللہ ان سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور دل گناہوں کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہما

ذَلِكَ يَوْمَئِذٍ سَعْدٌ لِّمَنْ أَسْرَمَ
یعنی اس سے بعد والا حکم یا قرآن

ذِكْرِي لِلَّذِينَ كَرِهُوا
نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے۔

وَأَصْبِرْ
اور اے محمد آپ طاعت پر قائم رہیں یا جو دکھ آپ کو پہنچتا ہے اس پر آپ صبر کریں۔ بعض نے کہا نماز پر پابند رہیں، جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔

فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ
بلاشبہ نیکی کرنے والوں کا ثواب اللہ ضائع نہیں کرے گا۔ ضمیر (یعنی اجرہمہ) کی جگہ اسم ظاہر (یعنی المحسنین) سے کلام حامل دلیل ہو گیا کہ چونکہ وہ نیکو کار ہیں اس لئے اللہ ان کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ صلوٰۃ اور صبر ہم زاد ہیں اور اخلاص نیت نہ ہو تو دونوں ناقابل اعتبار ہیں۔

فَأُولَٰئِكَ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ قَبِلَهُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ

جو امتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو دوسروں کو ملک میں بگاڑ پیدا کرنے (یعنی شرک و کفر) سے منع کرتے بقیۃ (وہ شے جس کو باقی رکھا جائے یا وہ شے جو باقی رہے) سے مراد ہے عقل و خرد اور فضیلت۔ جو چیزیں آدمی باقی رکھتا ہے۔ یا جو باقی رہنا چاہئے ان میں عقل و دانش ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے (جسمانی طاقت و صحت اور مال وغیرہ کا درجہ دانش و عقل سے کم ہے) اگر کسی میں کوئی اچھی بات اور بھلائی ہو تو اس کو ذوق بقیۃ کہا جاتا ہے اور اگر کوئی برگزیدہ اور اعلیٰ طبقے میں سے ہو تو کہا جاتا ہے ہُوَ مِنْ بَقِيَّةِ الْقَوْمِ ایک اور کہاوت ہے فِي الزَّوَايَا خَفَايَا وَفِي الرِّجَالِ بَقَايَا یعنی گوشوں میں کچھ چھپی چیزیں ہوتی ہیں اور آدمیوں میں کچھ اعلیٰ اشخاص ہوتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بقیۃ سے طاعت مراد ہے۔ آیت بَقِيَّةٍ

اللہ خیر لکم اور الباقیات الصالحات خیر میں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ بعض نے کہا بقیہ سے مراد ہے خیر باقی یعنی اچھی خصلت، یہ بھی ممکن ہے کہ بقیہ مصدر ہو جیسے بقیہ۔ قاموس میں ہے۔ بقی بقی (فتح) اور بقاء اور بقا اور بقیہ اس صورت میں اول بقیہ کا معنی ہوا اپنے اوپر رحم کرنے والے اور اپنی جانوں کو عذاب سے محفوظ رکھنے والے۔

إِلَّا قَلِيلًا مِّنْ أَجْنِبِنَا مِنْهُمْ
لوگوں کے جو انبیاء کے تابع تھے اور لوگوں کو زمین میں تباہی پھیلانے سے روکتے تھے۔

وَاتَّبَعُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أَتَوْا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۱۴﴾
لوگ نافرمان تھے اور جس ناز و نعمت میں تھے اس کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہو گئے۔

الَّذِينَ ظَلَمُوا سے مراد ہیں وہ لوگ جنہوں نے بُرائی سے بازداشت نہیں کی۔ یعنی خواہشاتِ عیش میں پڑے رہے آرام و عیش کی تلاش میں سرگرم رہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے روگرداں ہو گئے۔ مقاتل بن حبان نے مَا أَتَوْا کا ترجمہ کیا ہے وہ چیزیں جن کی گردش میں ان کو منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ فراء نے کہا جن چیزوں کے وہ خوگر ہو گئے تھے۔ بحر میں سے مراد ہیں کافر۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ﴿۱۵﴾
اور آپ کا رب ہر گز ایسا نہیں کہ ظلم کے ساتھ بستیوں کو تباہ کر دے جب کہ بستیوں والے مسلم ہوں۔

لِيُهْلِكَ میں لام تاکید نفی کے لئے ہے اور اَنْ مصدر یہ محذوف ہے یعنی ظلم کے ساتھ بستیوں کو تباہ کر دینا اللہ کی عادت نہیں۔ اَهْلُهَا یعنی ان بستیوں کے باشندے۔ مُصْلِحُونَ سے مراد ہیں مسلمان۔ مراد یہ ہے کہ اللہ ظالم نہیں۔ بعض کے نزدیک ظلم سے مراد ہے شرک یعنی بستی والوں کے شرک کی وجہ سے اللہ ان کو تباہ اور ہلاک نہیں کرتا بشرطیکہ ان کے آپس کے تعلقات میں بے انصافی نہ ہو اور وہ باہم حق تلفیاں نہ کرتے ہوں (حاصل مقصد یہ ہے کہ شرک سے تباہی نہیں آتی بکثرت مشرک آباد اور دنیوی لحاظ سے مرقہ الحال اور کثیر النسل ہوتے ہیں تباہی کی جڑ یہ ہے کہ لوگ باہم حق تلفیاں کرنے لگیں کسی کی آبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہو، خیانت، بے ایمانی، ڈاکہ، چوری، زنا، امر دہرستی، ناپ تول میں کمی بیشی اور معاملات میں کھوٹ، اور باہم بغض و عناد پیدا ہو جائے ایسی بستیوں کو اللہ تباہ کر دیتا ہے، مترجم)۔

طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت جریر بن عبد اللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے (مصلحون کی تشریح میں) فرمایا باہم انصاف کرتے ہوں (تو اللہ ان کو ہلاک نہیں کرتا) شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ بڑی رحمت والا ہے اپنے حقوق سے درگزر فرمادیتا ہے۔ اگر اللہ کے اور بندوں کے حقوق میں کہیں ٹکراؤ ہوتا (کہ بندوں کے حقوق ادا کرنے سے اللہ کا حق فوت ہوتا ہو اور حق اللہ کی ادائیگی سے بندوں کی حق تلفی ہوتی ہو) تو فقہاء نے حقوق العباد کی ادائیگی کو قابل ترجیح قرار دیا ہے، ایک مشہور مقولہ ہے کہ حکومت شرک کے ساتھ تو باقی رہ جاتی ہے ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً
اور اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک گروہ بنا دیتا، یعنی سب کو نیکو کار مسلمان بنا دیتا (اگرچہ اس نے سب کو نیک مسلمان ہو جانے کا حکم دیا ہے) آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی مشیت الگ چیز ہے اور علم جد احتیثیت رکھتا ہے اور دونوں ایک نہیں ہیں اللہ نے ہر شخص کو مؤمن بنانے کا وعدہ نہیں کیا ہے اگر وہ چاہتا تو اس کی مشیت کے مطابق ضرور ہو جاتا۔

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿۱۶﴾
اور لوگ ہمیشہ حق سے اختلاف کرتے رہیں گے اور طرح طرح سے باطل کی طرف مائل ہوتے رہیں گے۔ کوئی یہودی رہے گا، کوئی عیسائی، کوئی آتش پرست، کوئی بت پرست، کوئی جبری، کوئی قدری، کوئی رافضی، کوئی خارجی وغیرہ (جبریہ فرقہ انسان کو بالکل بے اختیار قرار دیتا ہے اس کے نزدیک پتھر اور انسان میں کوئی فرق نہیں غیر

اختیاری تکوین کی طرح عملاً بھی آدمی پتھر کی طرح غیر مختار ہے۔ قدر یہ انسان کو اپنے افعال کا خالق و مختار جانتا ہے اور اختیارِ کامل کا حامل قرار دیتا ہے۔

إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ
سوائے ان کے جن پر آپ کا رب رحم کرے یعنی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اپنی مہربانی سے راہِ مستقیم کی ہدایت کر دے یہ لوگ تو صحیح عقائد اور اوامرِ الہیہ کی تعمیل پر متفق رہیں گے باقی گمراہ گروہ اور اشخاص اختلاف کرتے ہی رہیں گے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں کچھ خطوط ترچھے اور کھینچے اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف بٹارا رہا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ۔

وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ
اور اسی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی رحمت کے لئے ہی ان کی پیدائش کی ہے۔ اس مطلب پر ذلک سے اشارہ رحمت کی طرف ہو گا اور هَهُمْ ضمیر مَنْ رَحِمَ کی طرف راجع ہو گی۔ حسن اور عطاء نے کہا ذلک سے اشارہ اختلاف کی طرف ہے اور هَهُمْ ضمیر اختلاف کرنے والوں کی طرف راجع ہے۔ یعنی اختلاف ہی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اشہب نے کہا میں نے مالک سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا، مالک نے فرمایا، اللہ نے ان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق جہنم میں چلا جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے کہ اللہ نے ایک فریق کو رحمت کے لئے اور دوسرے فریق کو عذاب کے لئے پیدا کیا ہے۔ فراء نے کہا اللہ نے اہل رحمت کو رحمت کے لئے اور اہل اختلاف کو اختلاف کے لئے پیدا کیا۔ فراء کے نزدیک ذلک سے اشارہ رحمت اور اختلاف دونوں کی طرف ہے اور ضمیر کا مرجع اہل رحمت و اہل اختلاف دونوں ہیں۔ گویا النَّاسُ ضمیر کا مرجع ہے اس کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ
اور آپ کے رب کی بات پوری ہو گئی۔ کلمہ سے مراد ہے حکم یا وہ قول جو فرشتوں سے فرمایا تھا۔

لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۹﴾
کہ میں جہنم کو (نافرمان) اور جنات اور انسانوں سے سب سے ضرور بھر دوں گا۔

وَكَلَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نَشِئْتُمْ بِهِ فُؤَادَكَ
اور ہم پیغمبروں کے قصے میں سے یہ سارے مذکورہ قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں۔
وَكَلَّا لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۱۹﴾
انبیاء اور اقوامِ پارینہ کے احوال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے یقین میں استحکام اور ادائے رسالت کے لئے دل میں قوت اور ایذائے کفار کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہو۔

وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ
اور اس دنیا میں آپ کے پاس حق آگیا (حسن و قیادہ)۔ دوسرے اہل تفسیر نے کہا ہذہ سے مراد ہے سورت۔ ظاہر ہے کہ انباء الرسل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بیان کردہ قصص و اخبار میں جو بات حق تھی وہ آپ کے پاس آگئی۔

وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۰﴾
اور وہ چیز آگئی جو اہل ایمان کے لئے نصیحت اور یادداشت ہے، یہ رسل و اقوام کے احوال کے بیان کے فوائد کا اظہار ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَيْنَا مَا نَتَّبِعُكُمْ إِنَّا عَمِلُونَ ﴿۱۲۱﴾
اور جو لوگ نہیں مانتے ان سے آپ کہہ دیجئے کہ آپ لوگ اپنی جگہ جو چاہو کئے جاؤ ہم اپنی جگہ اپنی قدرت کے موافق کر رہے

ہیں۔ مکانت سے مراد ہے حالتِ قدرت اور وہ رخ جس پر وہ چل رہے ہیں اس کلام میں تمہید اور نتیجہ بد کی کافروں کے لئے دھمکی ہے۔

اور (ہم پر مصائب آنے کا) تم انتظار کرتے رہو۔
ہم بھی (تم پر اس عذاب کے آنے کے) منتظر ہیں۔ (جو تم جیسے لوگوں پر گزشتہ زمانوں میں
اِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۳۱﴾
آچکا ہے۔)

اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں کا اور زمین کا وہ علم جو بندوں کے
وَاللّٰهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
علم میں نہیں ہے۔ اس سے کوئی مخفی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے اس لئے وہی تمہارے اعمال سے بھی واقف ہے۔
وَالِیْهِ یُرْجَعُ الْاُمُورُ كُلُّهَا
اور (بندوں کے) تمام امور کارِ جوع اسی کی طرف ہے آپ کے امور کا بھی اور
ان کے امور کا بھی، وہی آپ کا ان سے انتقام لے گا، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسی اس کی مرضی ہوتی ہے حکم دیتا ہے۔
فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ
پس تم اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔ عبادت کا حکم توکل کے
حکم سے پہلے دینے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ توکل کی افادیت اس وقت ہے جب عبادت کے ساتھ ہو (تہا عبادت
بغیر توکل کے مغرور بنا سکتی ہے۔ اور تہا توکل بغیر عبادت کے اندھا توکل ہے جو اعمال کو غیر مکلف قرار دے دیتا ہے۔
مترجم)

اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو آپ کا رب اس سے غافل
وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۳۲﴾
نہیں ہے۔

بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ تورات کا خاتمہ جس آیت پر ہوا ہے اسی پر سورہ ہود کا خاتمہ ہوا۔
حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا آگیا فرمایا مجھے سورہ ہود
اور الواقعہ اور المرسلات اور عَمَّ یَتَسَالُونَ اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ رواہ الترمذی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا
ہے۔ بغوی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت سعیدؓ کی
روایت سے بھی بیان کیا ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے
سورہ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کر دیا۔
ابو یعلیٰ نے ضعیف سند سے حضرت انسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت عمرانؓ کی روایت سے یہ الفاظ نقل
کئے ہیں، مجھے سورہ ہود اور اس کی ساتھ والی مفصلات نے بوڑھا کر دیا۔

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے مجھے سورہ ہود نے اور اس کی ساتھ
والیوں نے یعنی الواقعہ اور القاعدہ اور الحاقہ اور اذا الشمس کورت اور سائل سائل نے بوڑھا کر دیا۔
طبرانی نے الکبیر میں حضرت عقبہ بن عامرؓ اور حضرت ابو جیفہؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے۔
مجھے سورہ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بوڑھا کر دیا۔ طبرانی میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت سہیل بن سعدؓ کی روایت سے
انتازند آیا ہے الواقعہ، الحاقہ اور اذا الشمس کورت نے، ابن عساکر نے بروایت محمد بن علی مرسل نقل کیا ہے مجھے سورہ ہود اور اس
کی ساتھ والیوں نے اور ان واقعات نے جو مجھ سے پہلے دوسری امتوں کو پیش آئے بوڑھا کر دیا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا جلد آگیا۔ فرمایا مجھے سورہ ہود اور
اس کی ساتھ والی الواقعہ اور عَمَّ یَتَسَالُونَ اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ (ازالہ الخفاء)۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں، ابو عمر ان جوئی کے حوالہ سے مرسل بیان کیا کہ مجھے سورہ ہود نے اور اس کی ساتھ والیوں نے اور روز قیامت کے ذکر نے اور گزشتہ امتوں کے قصوں نے بوڑھا کر دیا۔ احادیث مذکورہ سے صراحت معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بڑھاپا روز قیامت کے تذکرے اور گزشتہ امتوں پر ہونے والے عذاب کے ذکر سے آیا۔ امر بالاستقامت کو بڑھاپا آنے میں دخل نہیں ورنہ صرف سورہ ہود کا ذکر کیا جاتا۔ (کیونکہ استقامت کا حکم صرف اسی سورت میں ہے) دوسری ساتھ والی سورتوں کا ذکر نہ کیا جاتا۔

۶ وَاللَّهُ اعْلَمُ ۝

سورہ ہود کی تفسیر بحمد اللہ ختم ہوئی اس کے بعد سورہ یوسف کی تفسیر آرہی ہے۔

(۱۶ ذیقعدہ ۱۲۰۱ھ) الحمد للہ سورہ ہود کی تفسیر کا ترجمہ مع تشریحی اضافات کے ۷ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔



۶ سورہ یوسف

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۱۱ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الَّذِي تِلْكَ آيَاتِ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ①
الذی۔ یہ آیتیں ہیں ایک کتاب واضح کی۔ تِلْكَ سے آیات قرآن کی طرف اشارہ ہے اور الْكِتَابِ کی طرف آیات کی اضافت بتقدیر میں ہے۔ (کتاب سے یعنی کتاب کی آیات) اور الْكِتَابِ سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی یہ آیات اس قرآن کی جس کا اعجاز ظاہر ہے یا جس کے مضامین حلال و حرام حدود اور احکام واضح ہیں۔ قتادہ نے کہا واللہ اس کی برکت، ہدایت اور رشد آگینی ہے۔ زجاج نے کہا یہ حق کو باطل سے اور حرام کو حلال سے واضح کرنے والا ہے (اس قول پر مبین متعدی ہوگا اور قتادہ کے قول پر لازم ہوگا)۔

بعض علماء کے نزدیک تِلْكَ سے آیات سورہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور الْكِتَابِ سے مراد سورہ ہے یعنی یہ سورہ کی آیات ہیں جو اس پر غور کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے (مخلوق کا کلام نہیں ہے)۔

یابہ مراد ہے کہ یہودیوں پر (ان کے سوال کا جواب) واضح کر دینے والا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ علماء یہود نے مشرکوں سے کہا تھا کہ محمد ﷺ سے دریافت کرو اولاد یعقوب شام چھوڑ کر مصر کیوں آگئی ہے اور یوسف کا کیا واقعہ ہوا تھا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ صاحب باب النقول الباب نزول نے اس شان نزول کا ذکر نہیں کیا۔

ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا۔ قرآن اس میں جنس ہے اس کا اطلاق پوری کتاب پر بھی ہوتا ہے اور ہر جز پر بھی اگرچہ غلبہ استعمال کی وجہ سے پورے قرآن کا نام اس کو قرار دے دیا گیا ہے لہذا قرآن کا حمل الکتاب پر ہو سکتا ہے خواہ الکتاب سے مراد سورت ہی لی جائے (کیونکہ اجزاء کتاب کو بھی قرآن کہا جاسکتا ہے)۔

عَرَبِيًّا كَالْفِظِ حَالٌ هُوَ اَوْ قُرْآنًا اس کی تمہید۔ یا قرآن موصوف ہے (جب کہ قرآن کو بمعنی اسم مفعول کے لیا جائے) اور عَرَبِيًّا صفت ہے۔

عَرَبِيًّا کہنے سے مراد یہ ہے کہ قرآن تمہاری زبان میں نازل کیا گیا ہے۔
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ⑤ تاکہ تم سمجھو یعنی قرآن کے معانی کو سمجھو اور فہم و دانش سے کام لے کر اس کے لطائف اور لفظی و معنوی خوبیاں جان لو۔

حاکم وغیرہ نے بیان کیا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے فرمایا رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا اور آپ ﷺ نے ایک زمانہ تک لوگوں کو بڑھ کر سنایا تو صحابہ نے (ایک روز) عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ ہم کو کوئی قصہ سناتے تو بہتر ہوتا اس پر آیت اللہ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ الخ نازل ہوئی ابن ابی حاتم نے اس روایت میں اتنا اور زائد نقل کیا ہے کہ اس کے بعد صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر حضور ﷺ ہم کو نصیحت فرماتے اور یاد دہانی کرتے (تو ہمارے لئے مفید ہوتا) اس پر آیت اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ الخ نازل ہوئی۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ (یا حضرت ابن مسعودؓ) نے فرمایا کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کوئی قصہ بیان فرمائیے تو نازل ہوا۔

فَمَنْ نَقَضَ وَعْدَكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ ہم تم سے بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔ القصص یا مصدر ہے اس وقت مفعول مطلق ہوگا بہترین بیان نادر ترین اسلوب کے ساتھ۔ یعنی ہم گزشتہ اُمم اور پارینہ اقوام کے قصے بہترین اسلوب کے ساتھ بیان کرتے ہیں یا القصص سے مراد ہے قصہ اس وقت مفعول یہ ہوگا یعنی قصہ یوسف بیان کرتے ہیں جو بہترین قصہ ہے اس قصہ میں عجائبات قدرت ہیں عبرتیں اور حکمتیں ہیں، وقائق اور فوائد ہیں جو دین و دنیا کے حالات کو درست کرنے والے ہیں۔ بادشاہوں اور رعایا کی مسرتیں اور علماء کے خصائل ہیں، عورتوں کی مکاری کا اظہار ہے، دشمنوں کی ایذا پر صبر کرنے کا بیان ہے، قابو پانے کے بعد بھی دشمنوں سے درگزر کرنے کی تعلیم ہے اس صورت میں قصص بروزن فعل بمعنی اسم مفعول کے ہوگا جسے نقض بمعنی منقوض اور سلب بمعنی مسلوب کے آتا ہے۔ قصص اثرہ اس کے نقش قدم پر چلا اس کی پیروی کی قصہ بیان کرنے والا واقعات کو صحیح بیان کرتا ہے جیسی خبر ہوتی ہے اسی کے موافق اظہار کرتا ہے (گویا اپنے بیان میں گزرے ہوئے واقعہ کا اتباع کرتا ہے)

خالد بن معدان نے کہا سورہ یوسف اور سورہ مریم مزے لے لے کر اہل جنت جنت میں پڑھیں گے۔ ابن عطاء نے کہا ہر غم رسیدہ سورہ یوسف سن کر کچھ چین پاتا ہے۔

۱۔ خالد بن عرفطہ کا بیان ہے میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ خاندان عبدالقیس کے ایک آدمی کو پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تو فلاں شخص ہے خاندان عبدالقیس کا، اس شخص نے جواب دیا جی ہاں، آپ نے اس کو اپنی بچی سے ماں اس شخص نے کہا امیر المؤمنین میں نے کیا کیا ہے۔ فرمایا بیٹھ جا۔ وہ بیٹھ گیا، آپ نے اس کو تین بار یہ آیات سنائیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہا اَوْحَيْنَا لَكَ هَذَا الْقُرْآنَ ﴿۳﴾
اس قرآن کو وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس بھیجنے کے سبب سے ما اوحینا مراد ہے وحی کرتا یعنی ما مصدری ہے اور قرآن سے مراد سورت یوسف ہے

وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۴﴾
اگرچہ آپ اس سے پہلے ناواقف تھے، یعنی وحی کرنے سے پہلے آپ اس قصہ سے یا ان تمام قصص یا احکام و شرائع سے ناواقف تھے جن کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے سے دی گئی ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ
جبکہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا اِحْسَنَ الْقِصَصِ کو مفعول بہ قرار دیا جائے تو اِذْ قَالَ يُوسُفُ اس سے بدل اشتمال ہو گا۔ یا پوں کہا جائے۔ اذکر فعل محذوف ہے اور اِذْ قَالَ اس کا مفعول فیہ ہے۔ (اس وقت کو یاد کرو جب یوسف نے کہا تھا) یوسف بمعبر الی لفظ ہے اسی لئے یہ لفظ غیر منصرف ہے آپ کے باپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم تھے اور یہ سب بزرگ پیغمبر تھے) امام احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کریم بن کریم بن کریم بن کریم، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم تھے۔

يَأْتِي أُنَى رَأَيْتُ أَحَدًا عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
ستارے اور چاند سورج دیکھے۔

رَأَيْتُ (اس جگہ) رویا (خواب سے مشتق ہے۔ رؤیت (دیکھنا) سے ماخوذ نہیں ہیں کیونکہ آگے آیت میں لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ اور هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَاكَ آیا ہے۔

سعید بن منصور نے سنن میں اور بزار و ابو یعلیٰ نے اپنی اپنی مسندوں میں اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابوالشیخ و ابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں اور عقیلی و ابن حبان نے ضعفاء میں، اور حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم و بیہقی نے دلائل النبوة میں حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو بشرط مسلم صحیح بھی قرار دیا ہے کہ ایک یہودی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا (بیہقی نے اس یہودی کا نام بستان لکھا ہے) محمد ﷺ ان ستاروں کے متعلق وضاحت کرو۔ جو یوسف نے خواب میں دیکھے تھے۔ حضور ﷺ خاموش رہے اور جبرائیل نے نازل ہو کر آپ کو اطلاع دی، تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں تھے بتا دوں گا تو کیا تو مان لے گا، یہودی نے جواب دیا جی ہاں فرمایا (گیارہ ستارے) جبرئیل الطارق، الذبالب، قالبس، عمودان، النلقین، المصیح، الفروح، الفرغ، وثائب اور ذوالکفین تھے۔ ان کو اور سورج و چاند کو یوسف نے دیکھا تھا کہ اوپر سے اتر کر ان

(گزشتہ سے پیوستہ) الرَّحِيمِ. اَلرَّتْلِكَ اَلِتُّ الْكِتَابَ الْمُبِينِ - اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا نَّاعْرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ اور ہر مرتبہ سچی سے مارا، اس شخص نے عرض کیا امیر المؤمنین میرا قصور کیا ہے۔ فرمایا تجھے دانیال (پیغمبر) کی کتاب پسند ہے۔ اس شخص نے کہا پھر آپ مجھے کچھ حکم دیں، میں اس کی تعمیل کروں گا، فرمایا جا کر کونلے اور اونی کپڑے کے ٹکڑے سے رگڑ کر اس کو مٹا دے آئندہ پھر اس کو نہ خود پڑھنا نہ کسی کو پڑھانا حضرت عمر نے فرمایا میں اہل کتاب سے ان کی کتاب کی ایک نقل چمڑے میں رکھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے عرض کیا یہ کتاب کی نقل ہے ہم نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے اس کو حاصل کیا ہے یہ سنتے ہی حضور ﷺ کے دونوں رخسار (غصہ سے) سرخ ہو گئے پھر نداء دی گئی الصَّلُوةُ جَامِعَةٌ انصَارَ كُنْزٌ لِّكَ، رسول اللہ ﷺ کو غصہ آگیا (کوئی خاص بات ہے) مسلح ہو جاؤ یہ کہہ کر انصار نے رسول اللہ ﷺ کے منبر کو (حفاظت کے لئے) چاروں طرف سے گھیر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگو مجھے کلمات جامعہ و خاتمہ عطا کر دیئے گئے ہیں میرے لئے سب کا خلاصہ کر دیا گیا (یعنی تمام گزشتہ آسمانی کتابوں کا یہ مختصر خلاصہ جامعہ ہے) میں تمہارے پاس ان کلمات کو روشن صاف ستھری شکل میں لے آیا تم تردّد نہ کرو اور حیرانی میں پڑے ہوئے لوگوں کے تردّد سے فریب نہ کھاؤ میں نے یہ سن کر کھڑے ہو کر عرض کیا میں دل سے پسند کرتا ہوں اللہ کے رب ہونے کو اور اسلام کے دین ہونے کو اور آپ کے رسول ہونے کو پھر حضور ﷺ منبر سے اتر آئے۔ ابراہیم خعی نے اسی طرح روایت کی ہے (ازالۃ الخفاء)

سب نے یوسفؑ کو سجدہ کیا۔ یہودی بولا، بے شک خدا کی قسم ان کے یہی نام تھے۔

سَأْتِيَهُمْ لِيُسْجِدُوا لِي ﴿۱۲﴾
 میں نے ان کو دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ سجدہ کرنا زوی العقول کی خصوصیت ہے اس لئے ستاروں کے بے عقل ہونے کے باوجود ان کو صاحب عقل قرار دے کر بصیغہ زوی العقول ان کی تعبیر کی اور زوی العقول ہی کی ضمیر ان کی طرف راجع ہے۔ تعبیر کے لحاظ سے گیارہ ستاروں سے گیارہ بھائی مراد تھے ستاروں کی طرح وہ بھی سرچشمہ انوار تھے اور سورج سے اشارہ باپ کی طرف اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔

سدی نے کہا حضرت یوسفؑ کی ماں راحیل کا تو انتقال ہو چکا تھا اس لئے چاند سے اشارہ آپ کی حالہ کی طرف تھا۔ ابن جریج نے کہا شمس مؤنث (مستعمل) ہے اور قمر مذکر ہے اس لئے شمس سے ماں کی طرف اور قمر سے باپ کی طرف اشارہ تھا۔ مگر یہ قول غلط ہے شمس کی تانیث اور قمر کی مذکیر تو عربی لغت میں ہے (واقعہ میں نہ سورج مؤنث ہے اور نہ چاند مذکر) سورج چاند سے زیادہ روشن ہے اس لئے سورج سے باپ اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب جمعہ کی رات میں جو شب قدر بھی تھی دیکھا تھا یہ قول بعض علماء کا ہے (جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ مترجم)

بَابُ نَعْمَانِ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ فِي تَعْبِيرِ حُجْرَةَ يَوْسُفَ بْنِ مَرْيَمَ
 قَالَ يَبْنِي لَا تَقْضُصُ رُءْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ

بَابُ نَعْمَانِ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ فِي تَعْبِيرِ حُجْرَةَ يَوْسُفَ بْنِ مَرْيَمَ
 باپ نے کہا بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔
 بُنِيَ تَصْغِيرَ كَاصِيغَةٍ هِيَ كَمِ عَمْرٍ هُوَ نِي كِي وَجْهٍ سِي يَابُوجَ اِنْتِهَائِي پيار کے تصغير کا صيغہ استعمال کیا۔ بغوی نے لکھا ہے۔ یوسفؑ اس وقت بارہ سال کے تھے۔

رُؤْيَا يَنْبِيءٍ يَنْبِيءٍ جَيْسِي كَيْسِي اسْتِغْرَاقِي كِي حَالَتِي مِي كِجْهٍ دِيكْهِنَا، مَعْمُولِي دِيكْهِنِي كُورُؤْيَتِي تَا كِي سَا تْه كِي تِي هِي اُور نِيئِدِي (وغيره) مِي دِيكْهِنِي كُورُؤْيَا بَالْفِ مَقْصُورَه كَمَا جَاتَا يَ۔

بیضاوی نے لکھا ہے قوت خیالیہ سے اتر کر اگر کوئی صورت حس مشترک میں چھپ جاتی ہے تو اس کو رؤیا کہا جاتا ہے۔ نفس ناطقہ اور عالم ملکوت میں (تجرد ذاتی کی) مناسبت ہے اس لئے نفس کو جب انتظام بدن سے (نیند وغیرہ میں) کسی قدر فرصت ملتی ہے تو اس کا رخ عالم ملکوت کی طرف ہو جاتا ہے (اور چونکہ عالم ملکوت میں تمام غیر مادی حقائق و معانی کی غیر مادی صورتیں موجود ہیں اس لئے نفس کو ہاں سے کچھ غیر مادی معانی کو غیر مادی صورتوں میں حاصل کرتا ہے) اور واپس لوٹ کر قوت خیالیہ کے سامنے رکھتا ہے) پھر قوت خیالیہ ان کو مناسب مادی شکلیں پہنا کر حس مشترک کے سامنے لاتی ہے اس طرح غیر محسوس حقائق محسوس ہو جاتے ہیں اور یہ سچا خواب ہوتا ہے۔ اب اگر غیر مادی اور مادی صورتوں میں گہری مناسبت ہوتی ہے کہ دونوں میں سوائے کلی اور جزئی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا (غیر مادی صورت کلی اور مادی شکل جزئی) تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور گہری مناسبت نہیں ہوتی تو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں قوت متخیلہ سے جو صورتیں اتر کر حس مشترک میں چھپتی ہیں نفس ان کا مطالعہ اسی وقت کرتا ہے جب نیند یا استغراق کی حالت میں اس کو مطالعہ محسوسات (اور بیرونی انتظامات) سے فرصت ملتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں دو غلط اور ایک صحیح اور صحیح بھی کبھی مختلف عوارض کی وجہ سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ غلطی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے اور کبھی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

(۱) بیداری میں دیکھی ہوئی صورتیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں یا قوت خیالیہ از خود ان کو اختراع کر لیتی ہے واقعہ میں ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس خواب کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

(۲) انسان کے بدن کے اندر شیطان ان تمام مقامات میں تیر جاتا ہے جہاں جہاں خون دوڑتا ہے اس لئے بعض وقت قوت خیالیہ میں کوئی ہیبت آفریں ڈراؤنی شکل یا تفریح آگیں صورت ڈال دیتا ہے ایسے خواب کو بد خواب یا ظلم یا تخويف الشيطان کہا جاتا ہے۔

تُحِبُّ كَالْفِظِ آيَا هِيَ (یعنی جس سے تم محبت کرتے ہو جو تمہارا دوست ہو) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ خواب پرندہ کی ٹانگ پر رہتا ہے جب تک اس کی تعبیر نہ دے دی جائے جب تم اس کی تعبیر دے وہ تو وہ گر پڑتا ہے اور خواب دوست یا صاحبِ رائے (و عقل و فہم) کے سوا اور کسی سے نہ بیان کرو۔

میرے نزدیک اس حدیث میں طائر سے مراد ہے قضاء و قدر یعنی جو آدمی کے لئے مقدر کیا جا چکا ہے آیت مبارکہ ہے وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ یعنی ہر انسان کے گلے سے اس کا مقدر (عمل وغیرہ) ہم نے باندھ دیا ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ مؤمن کا خواب اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے فیصلے اور تقدیر پر مبنی ہوتا ہے جب تک اس کو بیان کر کے تعبیر نہ لے لی جائے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا مقدر کیا گیا ہے۔ جب تعبیر دینے والا الہام کے زیر اثر یا عقل، قوت، فہم اور وہی ملکہ استنباط کی وجہ سے تعبیر دے دیتا ہے تو خواب گر پڑتا ہے یعنی ظاہر ہو جاتا ہے اور خواب کا مقصدی واضح ہو جاتا ہے اور خواب سوائے دانشمند یا حبیب اور صاحبِ مودت کے اور کسی سے نہ بیان کرو۔ حبیب اور صاحبِ مودت سے مراد ہے مرد صالح جو اللہ سے اور مؤمنوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کے صالح ہونے کی وجہ سے اللہ کو اور مؤمنوں کو بھی اس سے محبت و مودت ہوتی ہے۔ مَنْ تُحِبُّ كَالْفِظِ کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس سے تم کو محبت ہو یعنی وہ مرد صالح ہو کیونکہ مؤمن کو مرد صالح سے ہی محبت ہوتی ہے حاصل یہ کہ دانش مند تو دانش و عقل کی روشنی میں صحیح تعبیر دے گا اور حبیب (یعنی اللہ اور مؤمنوں کا محب و محبوب) الہام کے زیر اثر درست تعبیر دے گا ان دونوں کی تعبیر میں غلطی واقع نہیں ہوگی۔

خواب کے اقسام مذکورہ احادیث سے مستفاد ہیں ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت عوف بن مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین (قسم کے) ہوتے ہیں۔

(۱) آدمی کو رنجیدہ کرنے کے لئے شیطان کی طرف سے تحریف۔

(۲) بیداری میں آدمی بعض باتیں کرتا یا ان کا ارادہ کرتا ہے پھر خواب میں انہی کو دیکھ لیتا ہے (یعنی حدیث نفس)۔

(۳) نبوت کے چھالیس اجزاء میں سے ایک جزء۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین ہیں، اللہ کی طرف سے ڈراواں اگر کوئی خوش کن خواب دیکھے اور بیان کرنے کو دل چاہے تو بیان کر دے اور اگر ناپسندیدہ خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے بلکہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ میں (خواب میں) طوق دیکھنے کو بُرا سمجھتا ہوں (یہ مصائب اودنیوی مشاغل میں پھنساؤ ہے) (مترجم) اور بیڑی کو (خواب میں دیکھنا) پسند کرتا ہوں بیڑی (کی تعبیر) دین کی پابندی ہے)

مسلم نے حضرت ابو قتادہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور بُرا خواب شیطان کی طرف سے ہے جو شخص بُرا ناگوار خواب دیکھے وہ بائیں جانب تھوک دے اور شیطان سے اللہ کی پناہ کا خواستگار ہو اور کسی سے بیان نہ کرے خواب سے اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور سوائے اس کی جس سے اس کو محبت ہو اور کسی سے بیان نہ کرے۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ابوداؤد نے سنن میں اور ترمذی نے جامع میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے اگر کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد بائیں طرف تین بار تھکا دے اور اللہ کی پناہ مانگے خواب سے اس کو ضرر نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ خواب اگر شیطان کی طرف سے تحریف اور وسوسہ ہو تو اللہ کی پناہ مانگنے سے اس کا اثر زائل ہو جائے اور اگر عالم مثال کی عکاسی اور صورت کشی ہو تو یہ صورت کشی کبھی قضاء معلق کی ہوتی ہے (کہ اگر اس کا شرعی تدارک و تلافی نہ ہو تو اس کا وقوع ہو جائے گا اور تدارک ہو جائے تو وقوع نہ ہوگا) اللہ کی پناہ گیری قضاء معلق کو بھی رد کر دیتی ہے (کیونکہ دعا اور تعویذ سے اس کا تدارک ہو جاتا ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے جو برے خواب بیان کرنے کی ممانعت اور اٹھ کر نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی

ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعبیر سے خواہ مخواہ رنج ہوگا اس لئے مناسب یہ ہے کہ نماز کی طرف رجوع کرے اور اللہ سے اس کو دفع کرنے کی دعا کرے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابن حبان و حاکم نے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء (معلق) کو سوائے دعا کے اور کوئی چیز رد نہیں کرتی بڑے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی (بلکہ رنجیدگی اور غم سے بچانے کے لئے ہے) رسول اللہ ﷺ نے خود احد کی جنگ سے پہلے اس کے متعلق فرمایا تھا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی اور یہ مصیبت ہے اور میں نے گائے کو ذبح ہوتے دیکھا یہ بھی مصیبت ہے۔ آیت **وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ سوره آل عمران** کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کر دی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے خواب میں اپنے منبر پر بنی امیہ کو چڑھے دیکھا اور حضور کو یہ امر ناگوار گزرا، مگر آپ نے یہ خواب بیان کر دیا سورہ قدر کی تفسیر میں ہم نے یہ حدیث ذکر کر دی ہے۔

جس روز امام حسینؑ کو شہید کیا گیا اسی روز حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو شہید ہوتے خواب میں دیکھ لیا اور آپ نے اس خواب کو بیان بھی کر دیا۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

میں کہتا ہوں بڑے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت ممکن ہے اس وجہ سے بھی ہو کہ دشمن اس کو سن کر خوش نہ ہوں اور اچھے خواب کو سونے دانشمند یا حبیب کے اور کسی سے بیان کرنے کی ممانعت کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ کہیں اس کو سن کر دشمن حسد نہ کرنے لگیں اسی لئے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرما دیا تھا۔
فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا
پس وہ تیرے خلاف بڑی سازش کریں گے۔ یعنی حسد کی وجہ سے وہ تجھے ہلاک

کرنے کی کوئی سازش کریں گے۔

کونئی شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے سازش کو
إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ⑤
انسان کی نظر میں پسندیدہ بنا کر فریب پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اور تیرا رب (جس نے یہ خواب دکھایا جس سے تیری بزرگی اور برتری ظاہر ہو
وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ
رہی ہے اسی طرح وہ) تجھے (نبوت، حکومت اور دوسرے بڑے کاموں کے لئے) منتخب کر لے گا۔

اجتباء (باب افعال) **جَبَبْتُ السَّيِّئِي** (میں نے اس چیز کو اپنے لئے منتخب کر لیا) (چھانٹ لیا) سے ماخوذ ہے **جَبَبْتُ**
الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ میں نے حوض میں پانی جمع کر لیا۔

اور تجھے خوابوں کی تعبیر سکھا دے گا۔ خواب اگر سچا ہو تو حدیث ملک
وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
(الہام ملکوٹی) ہوتا ہے اور جھوٹا ہو تو حدیث شیطان (تخويف شیطانی) ہوتا ہے تعبیر نتیجہ خواب ہوتی ہے اور تعبیر کار جوع

خواب کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس کو تاویل کہتے ہیں (اول بوٹا، تاویل بلوٹا) یا یہ محاورہ (یعنی تعبیر کو تاویل کہنا) تاویل کلام اللہ اور تاویل اقوال انبیاء سے ماخوذ ہے یعنی اللہ اور انبیاء کے کلام کی باریکیاں اور اسرار بیان کرنا اور ان کی تفسیر کرنا۔

اور تجھ پر اور آل یعقوب پر پورا پورا احسان کرے گا۔
وَيَنْتَعِمَنَّكَ عَلَيْكَ وَعَلَى آلِ يَعْقُوبَ
نعمت سے مراد ہے نبوت اور آل یعقوب سے مراد ہے اسراہیلی انبیاء۔ بعض کے نزدیک حضرت یعقوبؑ کے صلیبی بیٹے

مراد ہیں کیونکہ آپ کے سب بیٹے پیغمبر ہوئے تھے (یہ قول ضعیف ہے) حضرت یعقوبؑ یہ بات ستاروں کے لفظ سے سمجھ گئے۔
ستارے بھی روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کی روشنی سے آپ نے نبوت کی روشنی پر استدلال کیا۔

جیسے اس سے پہلے اس نے تیرے
كَمَا آتَتْهَا عَلَى أَبِيكَ مِنْ قَبْلِ إِبْرَاهِيمَ وَاسْحَقَ
دونوں داداؤں ابراہیمؑ و اسحقؑ کو اپنی بھرپور نعمت عطا کی تھی (یعنی نبوت عطا کی تھی) **أَبُو يٰس** (دو باپ) سے مراد ہے دادا اور پر

یقیناً تیرا رب خوب واقف ہے کہ کون انتخاب اور فضیلت کا مستحق ہے۔
 ۱۱
 إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ
 حَكِيمٌ ۶

بڑی حکمت والا ہے جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی کرتا ہے۔
 لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِّلَّذِينَ يَدِينُونَ ۷
 ان کے (بھلائی) بھائیوں کے قصے میں (توحید کی بکثرت نشانیاں) اللہ کی قدرت و حکمت کی دلیل ہیں۔
 حضرت یعقوبؑ کے ماموں کی بیٹی لیان بنت لیان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے اور دینہ نام کی ایک بیٹی تھی سب سے بڑا
 روبیل تھا، دوسرا شمعون، تیسرا لادی، چوتھا یہودا، پانچواں ریان، چھٹا۔ شحر اور چار بیٹے زلفہ اور بلہمہ دو باندیوں کے بطن سے تھے
 دان، تفتالی، جاو، آشر، کذا، قال البغوی۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیان کے مرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے اس کی بہن
 راحیل سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس طرح کل بارہ بیٹے ہو گئے۔
 بیضاوی نے لکھا ہے کہ شریعت اسرائیل میں ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح درست تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے نکاح
 میں ایک ہی زمانے میں دو بہنیں (لیان اور راحیل) تھیں۔
 آيَةُ لِّلَّذِينَ يَدِينُونَ ۷ کی تشریح میں بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت
 کیا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کنعان سے مصر کو اولادِ یعقوب کے منتقل ہونے کی وجہ دریافت کی تھی حضور ﷺ نے یہ قصہ
 بیان فرمادیا، تو یہودیوں نے اس بیان کو توریت کے بیان کے موافق پایا، بعض کے نزدیک سائلین سے مراد (صرف) یہودی ہی
 نہیں بلکہ جو بھی سوال کرے اس کے لئے اس قصہ میں توحید و نبوت کی نشانیاں ہیں۔ بعض کے نزدیک آیات سے مراد ہیں
 نصیحتیں اور عبرتیں اور سائلین سے مراد ہیں عبرت حاصل کرنے والے اس قصہ میں برادرانِ یوسف کے حسد اور حسد کے مال
 بد اور ان کی ذلت کا بیان ہے۔ حضرت یوسفؑ کے خواب اور اس کی تعبیر کے ظہور کی تفصیل ہے، حضرت یوسفؑ کی عفت اور صبر
 عن الشهوات کا اظہار ہے، غلامی پر اور قید خانہ کے مصائب پر صبر رکھنے اور مالِ کار حکومت و اقتدار حاصل ہونے کی توضیح ہے۔
 حضرت یعقوبؑ کے غم و اندوہ اور بالآخر حصولِ مسرت اور شادمانی کی تصریح ہے (یہ سب اللہ کی قدرت و حکمت کی نشانیاں اور
 رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں)

إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا
 دوسرے سے کہا کہ اس میں شک نہیں یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔ أَخُوهُ سے مراد ہے
 حضرت یوسفؑ کا حقیقی بھائی۔
 وَنَحْنُ عَصَبَةٌ ۸

باوجود یہ کہ ہماری دس کی جماعت ہے۔ فراء نے کہا عصبہ دس اور دس سے اوپر کی جماعت کو کہتے
 ہیں۔ بعض نے کہا ایک سے دس تک عصبہ ہے۔ بعض نے تین سے دس تک کی جماعت کو عصبہ کہا ہے، بعض نے دس سے
 چالیس تک اور مجاہد نے دس سے پندرہ تک کی جماعت کو عصبہ قرار دیا ہے۔ قاموس میں ہے عصبہ مردوں اور گھوڑوں اور
 پرندوں کی دس سے چالیس تک کی جماعت۔ عصابہ بھی اسی طرح ہے جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ عصابہ دس سے چالیس
 تک کی انسانوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ عصابہ کی طرح عصبہ کی جمع عصب ہے (گویا عصابہ اور عصبہ اسم جمع ہے) اس کا واحد
 اس لفظ سے نہیں آتا جیسے نفر اور ربط (اسم جمع ہے اور اس کا مفرد نہیں آتا) بعض نے کہا عصبہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو باہم
 متفق اور آپس میں تعاون کرنے والی ہو۔ اس صورت میں نَحْنُ عَصَبَةٌ کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری جماعت متفق الرائے اور آپس
 میں تعاون کرنے والی ہے۔ (پھر بھی باپ کو محبت یوسفؑ اور اس کے بھائی سے زیادہ ہے)۔

إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۹
 واقعی ہمارے باپ کھلی ہوئی غلطی میں پڑے ہیں۔ ضلل سے مراد دینی
 گمراہی نہیں ہے ورنہ ایسا لفظ کہنے سے سب کافر ہو جاتے بلکہ مراد یہ ہے کہ باپ کا یہ عمل عقل کے خلاف ہے ان کی یہ رائے غلط

ہے ہم ان کے جانوروں کو چرانے امورِ معاش کا انتظار کرنے اور دنیوی کاروبار کی درستی میں کام آسکتے ہیں یوسف اور اس کا بھائی اس سے قاصر ہیں اس لئے ہم سے محبت زیادہ ہونی چاہئے یوسف اور اس کے بھائی کو ہم سے زیادہ چاہنا کھلی ہوئی غلطی ہے جس میں باپ مبتلا ہے۔

یوسف کو مار ڈالو... وہب نے کہا یہ بات شمعون نے کہی تھی، کعب نے کہا دانی نے کہی تھی، مقاتل نے کہا روبیل نے کہی تھی، بہر حال قائل ایک ہی تھا، دوسرے اس رائے سے متفق تھے اس لئے کہنے کی نسبت سب کی طرف کر دی گئی۔ ہاں جو لوگ اس قول سے متفق نہیں ہیں تو وہ قائل نہیں قرار دیئے جائیں گے مگر اکثر افراد جماعت کیونکہ اس سے متفق تھے اس لئے پوری جماعت کی طرف نسبت مجاز کر دی گئی۔

یا اس کو کہیں دور گنم نام جگہ ڈال اَرْضًا گنم نام آبادی سے الگ زمین تھی۔

تاکہ تمہارے باپ کی خالص توجہ تمہاری طرف ہو جائے۔ یوسف کی طرف سے توجہ ہٹ جائے۔ محض تمہاری طرف رخ ہو جائے۔

اور اس کے بعد (یعنی یوسف کے بعد یا یوسف کے قتل سے فراغت کے بعد یا کہیں پھینک دینے کے بعد) تم صالح لوگ ہو جانا، یعنی اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لینا وہ معاف کر دے گا۔ یا یہ مطلب اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک ٹھاک ہو کر رہنا کوئی عذر پیش کر دینا۔ باپ مان جائیں گے اور تمہارے معاملات باپ سے درست ہو جائیں گے مؤخر الذکر مطلب مقاتل نے بیان کیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے دنیوی امور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ تمہارا کام بن جائے گا باپ کی توجہ تمہاری طرف کامل طور پر ہو جائے گی۔

ان میں سے کہنے والے نے کہا۔ قتادہ نے کہا یہ کہنے والا روبیل تھا بغوی نے کہا یہ یہود تھا اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

یوسف کو قتل نہ کرو۔ قتل گناہ کبیرہ ہے۔ اور گہرے کنوئیں کے گڑھے میں ڈال دو۔

غیابہ گڑھا۔ اصل لغت میں غیاب اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں داخل ہونے والی چیز بالکل چھپ جائے، غائب ہو جائے۔ گہرے گڑھے میں بھی جو چیز داخل ہو جاتی ہے وہ نظر سے چھپ جاتی ہے اسی لئے گہرے گڑھے کو غیابت کہا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جس کنوئیں کی مَن نہ ہو وہ جب ہے۔ جب قطع کرنا۔ بے مَن کا کنواں بھی گویا کٹا ہوا ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے جب کنواں یا گہرا کنواں جس میں پانی بہت ہو۔ اور دور اندر کی طرف ہو۔ یا وہ کنواں جو کسی اچھے یا سرسبز مقام میں ہو، یا بے مَن کا کنواں جو قدرتی ہو آدمیوں کا کھودا ہوا نہ ہو۔

کہ کوئی راہ گیر اس کو پالے (اور لے جائے) التقاط پالینا کسی چیز کا اس جگہ مل جانا کہ ملنے کا خیال بھی نہ ہو۔

اگر تم (میرے مشورے پر) عمل کرنے والے ہو تو کرو یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم صرف اتنی بات پر اکتفا کر سکتے ہو کہ باپ کو یوسف سے علیحدہ کر دو تو اسی پر اکتفا کرو۔ (قتل نہ کرو)

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ برادرانِ یوسف کی یہ حرکت مختلف جرائم کی حامل تھی۔ قطع رحم، باپ کی نافرمانی، بے گناہ بچے پر ظلم اور بے رحمی، امانت میں خیانت، وعدہ شکنی اور دروغ بانی۔ اللہ نے ان کے تمام جرائم کو معاف فرمادیا تاکہ کوئی اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اللہ نے ان کے تمام جرائم کو معاف فرمادیئے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کو باپ سے بہت زیادہ محبت تھی اور اسی شدتِ محبت نے ان کو رشک و حسد تک پہنچا دیا۔ اور انہوں نے کوشش کی کہ باپ کی توجہ ان کی طرف خالص ہو جائے۔

بعض اہل علم نے کہا بردران یوسف نے قتل کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو جرم قتل سے محفوظ رکھا اگر وہ ایسا کر گزرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔

یہ تمام واقعات اس زمانے کے ہیں جب ان حضرات میں سے کوئی نبوت سے سرفراز نہیں ہوا تھا ابو عمر و بن علاء کا یہی قول ہے جو لوگ انباء یعقوب (یعنی بردران یوسف) کے پیغمبر ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک نبوت سے پہلے انبیاء سے صدور معصیت ناممکن نہیں ہے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ بردران یوسف پیغمبر نہیں تھے اور قرآن مجید میں انبیاء کے ذیل میں اسباط یعقوب کا ذکر آیا ہے ان سے مراد اسرائیلی انبیاء ہیں۔ جو حضرت یعقوب کی نسل سے پیدا ہوئے (بیٹے مراد نہیں) غرض سازش کر کے جب انہوں نے یوسف کو باپ سے جدا کر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو۔

کہا اب آپ یوسف پر ہمارا اعتماد کیوں نہیں کرتے، یعنی یوسفؑ

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمِنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ

کے معاملے میں آپ کو ہم سے اندیشہ کیوں ہے۔

اور بلا شک و شبہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں، حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو یوسفؑ سے حسد کرتے پایا تو بدگمان ہو گئے اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے بیٹوں نے یہ بات کہی اور یوسفؑ کی خیر خواہی کا اظہار کیا۔ مقاتل نے کہا کلام کی ترتیب میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل ترتیب اس طرح ہے۔ اَرْسَلَهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعُ وَيَلْعَبُ بِالْخِ بَابِ نِ اس کے جواب میں کہا اِنِّي لَيَحْزُنُنِي الْخِ اس پر بیٹوں نے کہا مَا لَكَ لَا تَأْمِنَّا بِالْخِ۔ نَصْحُ كَامَعْنَى هِيَ خَيْرٌ خَوَاهِي يَابْهَلَانِي كَرْنَا اور شفقت کرنا، یعنی ہم تو اس کے بھی خواہ ہیں اس کی حفاظت کریں گے اور حفاظت کے ساتھ واپس لے آئیں گے۔

اَرْسَلَهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعُ وَيَلْعَبُ

(باب فتح) سر بلندی (یعنی کثرتِ نوا کہ) مراد یہ ہے کہ جنگل میں جا کر وہ خوب پھل کھائے، تفریح کرے، کھیلے، دوڑ لگائے، شکار کرے، تیر اندازی کرے۔

اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے اس کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

وَأَنَا لَهُ لِحَافُونَ ﴿١٣﴾

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَضَاهَبُوا بِهِ

(یعنی اس کی جدائی سے میرے دل کو دکھ ہوگا اور مجھے صبر نہ آئے گا) حزن سے اس جگہ مراد ہے وہ قلبی دکھ جو محبت کو محبوب کے فراق سے پیدا ہوتا ہے۔

اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم تو اس کی

وَإِخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ ﴿١٤﴾

طرف سے غافل ہو جاؤ گے اور بھیڑیا اس کو کھا جائے گا..... اس جنگل میں بھیڑیے بہت ہوتے تھے، اس لئے حضرت یعقوبؑ نے یہ اندیشہ ظاہر فرمایا اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُونَ فرمانے کا منشاء یہ تھا کہ مجھے تمہاری کسی سازش کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم تو کھانے کھیلنے اور سیر و تفریح میں مشغول ہو گے، یوسفؑ کی حفاظت نہ کر سکو گے کوئی بھیڑیا آکر اس کو کھا جائے گا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت یعقوبؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ کسی بھیڑیے نے یوسفؑ پر حملہ کیا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد آپ کو یوسفؑ کے معاملہ میں اندیشہ رہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ روایت غلط ہے، انبیاء کے خواب کا تحقیق ہونا لازم ہے اگر حضرت یعقوبؑ نے ایسا خواب دیکھا ہوتا تو ایسا واقع ہو جانا ضروری تھا کوئی احتیاط اس کو نہیں روک سکتی تھی (اس فقیر کی نظر میں حضرت مفسر کا دلیل مذکورہ سے خواب دیکھنے کی روایت کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ ممکن ہے خواب دیکھا ہو لیکن تعبیر میں غلطی کی ہو۔ بھیڑیے کے حملے کی تعبیر یہ ہے کہ کوئی دشمن یوسفؑ پر حملہ کرے گا چنانچہ ایسا ہو گیا بھائیوں نے بھیڑیے کا کام کیا۔ مترجم)

الذئب میں الف لام جنسی ہے کوئی بھیڑیا۔

قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخٰسِرُونَ ﴿١٥﴾

بیٹوں نے کہا (ہماری دس کی جماعت ہے سب یوسف سے غافل ہو جائیں یہ ممکن نہیں) ہماری دس کی جماعت ہوتے ہوئے کوئی بھیڑ یا یوسف کو کھا جائے تو ہم بالکل ہی گئے گزرے ہوئے۔

ان کی مراد یہ تھی کہ اگر ہم دس ہونے کے باوجود اپنے آدمی کی حفاظت نہ کر سکیں تو پھر ہمارے جانوروں کی جس کو ہم جنگل میں چراتے ہیں کیسے حفاظت ہو سکتی ہے۔ ہم بد نصیب ہوں گے اگر حفاظت نہ کر سکیں یا لَخَاسِرُونَ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہماری جماعت بھی نگرانی نہ کر سکی تو ہم مستحق ہیں کہ نامر اور بنے کی ہم کو بد عادی جائے۔

حضرت یوسف کو بھائیوں کے ساتھ نہ چھوڑنے کی دو وجہیں حضرت یعقوب نے بیان فرمائی تھیں جدائی کا غم اور اندیشہ ہلاکت۔ بیٹوں نے دوسری وجہ کو دور کرنے کے لئے تو حفاظت کی یقین دہانی کر دی اور غم دور کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا بلکہ یوسف سے یعقوب کی اتنی محبت کہ ایک دن کی جدائی بھی گوارا نہ ہو۔ بیٹوں کے حسد کا سبب بھی اس لئے اول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوا فِي غَيْبَتِ الْجُبِّ
کنویں کے گہرے گڑھے میں ڈالنے کا انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ (تو پھر جو چاہا کیا، کنویں میں ڈال دیا) شرط کا جواب محذوف ہے، جس کی تشریح مترجم نے بین القوسین کر دی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اس شرط کی جزا اگلی آیت وَأَوْحَيْنَا الخ ہے وَأَوْحَيْنَا فِي وَاوْزَانِدْ، جیسے آیت فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَا دَيْنَاهُ فِي وَاوْزَانِدْ جَزَا ہے اور اس میں وَاوْزَانِدْ ہے۔

بغوی نے وہب وغیرہ کے بیان سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ باپ کے سامنے بھائیوں نے یوسف کو نہایت عزت کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر لیا اپنے اوپر سوار کر لیا لیکن آبادی سے باہر نکل کر ان کو پھینک دیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ ایک مارتا تھا تو یوسف دوسرے سے فریاد کرتے تھے مگر وہ بھی مارتا تھا تو تیسرے کی پناہ ڈھونڈتے تھے، پر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ سبھوں نے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ حضرت یوسف چیخ رہے تھے اور باپ کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے ابا دیکھئے ان باندی بچوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آخر یہودانے دیکھا کہ یہ لوگ یوسف کو قتل ہی کر ڈالیں گے تو بولا قتل نہ کرنے کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس لئے قتل نہیں کر سکتے غرض اس طرح ایک کنویں پر غیر معروف راستے سے لے گئے کنویں کا منہ تنگ تھا مگر اندر بہت وسیع تھا حضرت یعقوب کے مکان سے بر قول مقاتل یہ کنواں تین فرسخ دور تھا۔ کعب نے کہا مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ قتادہ نے کہا بیت المقدس کا کنواں تھا۔ حضرت یوسف کی عمر اس وقت بارہ یا اٹھارہ برس تھی جب کنویں میں آپ کو لٹکانے لگے تو آپ نے کنویں کا کنارہ پکڑ لیا مگر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور کڑتے اتار لیا حضرت یوسف نے کہا بھائیو! کرتے تو دے دو میں کنویں کے اندر اس کو پہن کر سردی وغیرہ سے بچاؤ کر لوں گا۔ بھائیوں نے کہا سورج اور چاند ستاروں کو پکارو ہی تیرا دل بہلائیں گے، آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آخر آپ کو کنویں میں ڈال ہی دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا جب ڈول آدھے کنویں تک پہنچا تو سی چھوڑ دی تاکہ یوسف گر کر مر جائیں لیکن کنویں میں پانی تھا، آپ پانی میں گر پڑے، وہاں ایک پتھر نظر آیا آپ اس پر کھڑے ہو گئے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یوسف کو روتا ہوا کنویں میں ڈال دیا گیا پھر اوپر سے آواز دی، یوسف سمجھے کہ بھائیوں کے دل میں کچھ رحم آگیا۔ اس لئے آپ نے آواز دی، بھائیوں نے اوپر سے پتھر برسانا چاہا تاکہ پتھر مار کر ہلاک کر دیں۔ مگر یہودانے روک دیا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے ایک طویل بیان کے ذیل میں لکھا ہے کہ خاندان یعقوب کی سکونت شام میں تھی، حضرت یعقوب کی نظر میں ہر وقت یوسف اور بنیامین سمائے ہوئے تھے اس پر دوسرے بھائیوں کو جلن پیدا ہوئی وہ یوسف کو آبادی کے باہر صحرا میں لے گئے۔ اس روایت میں ہے کہ یوسف کو ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا، نصف

کنویں تک ڈول پہنچا تو رسی ہاتھ سے چھوڑ دی، تاکہ یوسف گر کر مر جائیں، کنویں میں پانی تھا یوسف پانی میں گر گئے پھر ایک پتھر پر کھڑے ہو گئے اور روتے رہے، فوراً جبرئیل وحی لے کر آئے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ ۝ اور ہم نے یوسف کے پاس وحی بھیجی (تاکہ اس کو اطمینان ہو جائے) بظاہر یہ وحی وحی نبوت نہ تھی۔ بلکہ اس کی صورت اس وحی کی سی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی والدہ کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی الہام) وحی رسالت و تبلیغ تو بعد کو آئی بھی جس کا بیان آیت، وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا میں کیا گیا ہے، لیکن ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے مجاہد کا قول بیان کیا کہ أَوْحَيْنَا إِلَيْهِ میں وحی نبوت مراد ہے، جب آپ کنویں میں تھے تو وحی نبوت آتی تھی۔ کہ تو ان کو ان کی اس حرکت پر (آئندہ) آگاہ کرے گا (اور وہ پشیمان اور ذلیل ہوں گے۔ مترجم)

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ اور وہ جانتے بھی نہ تھے کہ ہم نے یوسف کے پاس وحی بھیجی ہے اور اس کو اطلاع دے دی ہے۔ اور اس کے دل کو اطمینان دے دیا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک (یہ جملہ وحی کا جز ہے) مطلب یہ ہے کہ جس روز تم ان کو ان کی اس حرکت پر آگاہ کرو گے تو اس وقت ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ تو ہی یوسف ہے۔ یوسف کے مرتبے کی رفعت، زمانہ کا طول اور جسمانی تغیرات ان کو پہچاننے بھی نہ دیں گے، چنانچہ آیت میں آیا ہے حِينَ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ جب برادران یوسف، یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا مگر وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہود یوسف کو کھانا پہنچا دیتا تھا۔ آپ تین روز وہاں رہے اور یہ پیام (جو آیت میں مذکور ہے) وحی کے ذریعے سے ان کے پاس پہنچا۔ اللہ نے ان کا دل بہلانے اور کنویں سے نکلنے کی بشارت دینے کے لئے جبرئیل کو ان کے پاس بھیج دیا۔

امام احمد نے الزہد میں اور ابن عبدالحکم نے فتوح مصر میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حسن بصری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی۔ بعض نے کہا جو ان ہونے کے قریب تھے آپ کے پاس جوانی سے پہلے وحی آگئی تھی جیسے حضرت سحیٰ اور حضرت عیسیٰ کے پاس آئی تھی۔

قصہ یوسف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو آپ کے کپڑے اُتار لئے گئے تھے۔ حضرت جبرئیل نے جنت سے لا کر ایک ریشمی کُرتہ آپ کو پہنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیم سے وہ کُرتہ حضرت اسحاق کو پہنچا تھا اور حضرت اسحاق سے حضرت یعقوب کو حضرت یعقوب نے اس کا تعویذ بنا کر حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ حضرت جبرئیل نے وہی کُرتہ کھول کر حضرت یوسف کو پہنا دیا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے بعد برادران یوسف نے ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے یوسف کے کُرتے کو اس کے خون سے رنگین کر لیا۔

وَجَاءَ وَآبَاهُمُ عِشَاءً يَبْكُونَ ۝ اور شام کو اندھیرا پڑے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ اہل معانی نے لکھا ہے کہ اندھیرے میں عشاء کے وقت آنے کی مصلحت یہ تھی کہ جھوٹ بولنے کا جرأت آفریں موقع ہاتھ آجائے، چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے ان کی چیخ پکار سنی تو باہر نکل آئے اور فرمایا لڑکو! کیا ہو گیا۔ کیا بکریوں پر کوئی افتاد پڑ گئی۔ کہنے لگے نہیں! حضرت یعقوب نے پوچھا یوسف کہاں ہے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ۝

بولے ابا! ہم آپس میں دوڑ لگانے گئے تھے اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے (ہمارے پیچھے) بھیڑیے نے اس کو کھالیا، آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا، خواہ ہم سچ کہہ رہے ہوں (کیونکہ آپ کو یوسفؑ سے انتہائی محبت ہے اور ہم لوگوں سے بدگمانی ہے، یوسفؑ کی محبت ہی آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں ہونے دے گی۔ مزید یہ کہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے ہم اس بیان میں سچے بھی ہوں تب بھی آپ یقین کرنے والے نہیں)۔

بعض نے کہا وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے آپ یقین کرنے والے نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے پاس اپنی سچائی کی کوئی دلیل نہیں اس لئے آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ اگرچہ ہم عند اللہ سچے ہیں۔

نَسْتَبِقُ (جمع متکلم باب افعال) باب تفاعل کے معنی میں ہے یعنی باہم دوڑ میں ہم مقابلہ کرنے گئے تھے۔ بعض نے کہا تیر اندازی میں مقابلہ کرنا مراد ہے۔ باب افعال اور تفاعل مشارکت کے لئے آتا ہے جیسے اتصال و تاقصیل تیر اندازی میں مقابلہ کرنا۔ متاع سے مراد ہیں کپڑے۔

وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ
اور یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لائے۔

کذب کا معنی ہے جھوٹ موٹ کا یا جھوٹا، کذب مصدر بھی ہو سکتا، جھوٹ، خون کو جھوٹ مبالغہ قرار دیا۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حسن بصریؒ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ کی خبر سن کر چیخ پڑے اور یوسفؑ کا قمیص جب پیش کیا گیا تو الٹ پلٹ کر اس کو دیکھنے لگے مگر قمیص میں شگاف کہیں نظر نہ آیا، یہ دیکھ کر فرمایا لڑکوں! واللہ بھیڑیا بھی کیسا ہوشیار تھا، میرے بیٹے، کو تو کھا گیا اور کرتے کو سالم چھوڑ دیا۔ حضرت یعقوبؑ جب بیٹوں کا جھوٹ سمجھ گئے تھے تو

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا
کہا (بھیڑیے نے یوسفؑ کو نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے لئے اپنے دل میں ایک بات بنالی ہے۔ سَوَّلَتْ لَكُمْ یعنی تمہارے نفسوں نے ایک بہت بڑے امر کو تمہاری نظر میں آسان اور حقیر بنا کر دکھایا ہے (مطلب یہ کہ یوسفؑ کی گمشدگی یا قتل کو تم نے اتنا آسان قرار دے لیا کہ اس کے لئے اتنی غلط عذر تراشی کر لی)

سَوَّلَتْ: السؤل سے ماخوذ ہے سؤل کا معنی ہے لٹک جانا ڈھیلا ہو جانا۔ قاموس میں ہے اسؤل وہ شخص جس کے زیریں جسم میں ڈھیلا پن ہو اور سؤلہ پیٹ وغیرہ کے لٹک آنے کو کہتے ہیں۔ بعض کا قول ہے اس جگہ سَوَّلَتْ کا معنی ہے سجا کر دکھایا (یعنی برے کام کو اچھا کام بنا کر پیش کیا) کذافی القاموس۔ سؤل له الشيطان شیطان نے اس کو بہکا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سؤل کا معنی ہے حاجت اور غرض جس کو حاصل کرنے کی نفس کو حرص ہوتی ہے اور تسویل کا معنی برے کو اچھے کی شکل میں پیش کرنا۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ
سوآب میں صبر ہی کروں گا، جس میں کسی شکایت کی آمیزش نہ ہوگی، بغوی نے لکھا ہے صبر جمیل (اچھا صبر) یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق سے کوئی شکوہ نہ ہوگا اور جزع فزع نہ ہوگی۔ ابن جریر نے حبان بن حمیہ کی روایت سے

مرسلًا بیان کیا ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں کوئی شکوہ نہ ہو۔ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ⑩
یعنی یوسفؑ کے مرنے کی جو خبر تم بیان کر رہے ہو میں اس مصیبت پر صبر کرنے اور اس دکھ کو اٹھانے میں اللہ ہی سے مدد کا خواستگار ہوں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قصہ یوسفؑ کے ذیل میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ برادران یوسفؑ ایک بھیڑیے کو پکڑ لائے اور کہنے لگے اس نے یوسفؑ کو کھلایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس سے پوچھا کہ تو نے میرے جگر پارے کو کھلایا ہے۔ بھیڑیے کو اللہ نے گویائی عطا فرمادی، اس نے جواب دیا خدا کی قسم میں نے تو آپ کے بیٹے کو دیکھا بھی نہیں! حضرت یعقوبؑ نے پوچھا پھر کنعان کی اس سرزمین میں تو کیسے آیا۔ بھیڑیے نے کہا بھائی بندوں سے ملنے آیا تھا۔ کہ یہ پکڑ لائے۔ الحاصل یوسفؑ

تین روز کنویں میں رہے کہ

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ

ایک قافلہ ادھر آگزرایہ لوگ مدین سے مصر کو جا رہے تھے غلط راستے پر پڑ گئے تھے، تو

کنویں کے قریب اتر پڑے، کنواں چرواہوں اور راہ گیروں کے لئے آبادی سے دور تھا اس کا پانی شور تھا جب حضرت یوسفؑ کو اس میں ڈالا گیا تو اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔

فَأَسَاؤًا وَّارِدَهُمْ

(جب کنویں کے پاس اترے) تو ایک ہر اول کو (کنویں سے پانی لینے کے لئے) بھیجا۔

یہ شخص مدین کا باشندہ تھا جس کا نام مالک بن دعر تھا۔ وَاوَدَّ اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ کے آگے پانی کی تلاش میں بطور ہر اول جاتا ہے۔

فَادَلَى دَلْوَةً

اس نے جا کر اپنا ڈول کنویں میں لٹکایا۔

ادلی الدلو کنویں میں ڈول ڈالنا۔ ادلیت الدلو میں نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ دلوت الدلو میں نے کنویں سے ڈول نکالا۔ حضرت یوسفؑ رسی پکڑ کر لٹک گئے اور اوپر آگئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک حسین ترین لڑکا برآمد ہوا، تعجب میں پڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوسفؑ کو سارے انسانوں کے حسن کا آدھا حصہ دیا گیا تھا۔ رواہ ابن ابی شیبہ و احمد و ابو یعلیٰ و الحاکم عن النس۔

بنغوی نے لکھا ہے یوسفؑ میں یہ حسن ان کی دادی حضرت سارہ کا منتقل ہو کر آیا تھا، حضرت سارہ کو کل حسن کا چھٹا حصہ اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یوسفؑ اور ان کی والدہ کے حصے میں دو تہائی حسن آگیا تھا۔ مالک بن دعر نے جب یوسفؑ کو دیکھا تو

قَالَ لَيْسَ بَشَرِي

بولا اے لوگو تم کو بشارت ہو یا فرطِ مسرت میں اس نے بشارت کو پکارا۔ بعض علماء نے کہا بشری اس کے ساتھی کا نام تھا مدد کرنے کے لئے مالک نے بشری کو پکارا تھا۔

یہ تو لڑکا ہے۔ مجاہد نے اپنے باپ کا قول بیان کیا کہ جب یوسفؑ کنویں سے نکال لئے گئے تو کنواں رونے لگا۔

وَاسْتُرُوهُ

اور انہوں نے یوسفؑ کو چھپائے رکھا۔ یعنی مالک اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے قافلے والوں سے یوسفؑ کو چھپا لیا۔ تاکہ وہ شرکت کے دعویدار نہ بن جائیں۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یوسفؑ کے معاملے کو ان لوگوں نے چھپا لیا اور دوسرے لوگوں سے کہا کنویں پر رہنے والوں نے ہم کو یہ لڑکا دیا ہے تاکہ ان کی طرف سے مصر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیں۔ بعض علماء نے کہا کہ بردار ان یوسفؑ نے یوسفؑ کی بات قافلہ والوں سے پوشیدہ رکھی (اور یوسفؑ کو بھائی نہیں بتایا) بات یہ ہوئی کہ یہود اور یوسفؑ کا کھانا لاتا تھا ایک روز جو کھانا لایا اور یوسفؑ کو کنویں میں نہ پایا تو بھائیوں کو جا کر اطلاع دی بھائی ڈھونڈنے نکلے تلاش کرتے کرتے مالک کے پاس یوسفؑ دستیاب ہوئے، انہوں نے قافلے والوں سے اصل بات چھپالی اور یوسفؑ کو اپنا بھائی ظاہر کرنے کے بجائے کہنے لگے یہ ہمارا بھگا ہوا غلام ہے، کہا جاتا ہے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی ڈرا دھمکا دیا تھا۔ بھائیوں کے ڈر سے یوسفؑ بھی کچھ نہ بولے خاموش رہے۔

بِضَاعَةٍ

یعنی یوسفؑ کو بطور مال تجارت چھپائے رکھا۔ بضاعت بضع سے مشتق ہے۔ بضع تجارتی مال کو کہتے ہیں۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾

اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس سے ان کی کوئی

پوشیدہ بات بھی مخفی نہیں تھی یا برادر ان یوسفؑ اپنے باپ اور بھائی سے جو سلوک کر رہے تھے اللہ اس سے واقف تھا۔

انہوں نے یعنی برادر ان یوسفؑ نے یوسفؑ کو حقیر

وَشَرُّوهُ بِشَمَنِ بَخْسٍ دَرَّاهُمْ مَعْدُودَةً

قیمت یعنی گنتی کے چند درہموں میں بیچ ڈالا۔ بعض اہل علم نے شروہ کا ترجمہ اشترو کیا ہے، یعنی قافلے والوں نے یوسفؑ کو

بہت کم قیمت یعنی چند درہموں میں خرید لیا۔ ضحاک، مقاتل اور سدی نے بختسپ کا ترجمہ کیا ہے حرام کیونکہ آزاد انسان کی قیمت حرام ہے بختسپ کا لغوی معنی ہے کم کرنا، گھٹانا۔ مال حرام کی برکت گھٹ جاتی ہے اس لئے حرام کو بختسپ کہا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے بختسپ کا ترجمہ کیا کھوٹے عکرمہ اور شعبی نے ترجمہ کیا قلیل تھوڑے۔ کیونکہ اگر اوقیہ کے برابر درہم ہوتے تو وزن سے بکتے اور خریدے جاتے تھے اور اوقیہ سے کم کا تبادلہ گنتی سے ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور قتادہؓ نے فرمایا بیس درہم کو فروخت کر دیا۔ ہر بھائی کے حصے میں دو درہم آئے۔ عکرمہ نے کہا چالیس درہم کو بیچا۔ اور مجاہد نے بائیس درہم کی صراحت کی۔

اور وہ (برادرانِ یوسف یا خریدار) یوسفؑ کی طرف سے بے رغبت تھے۔ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ یوسفؑ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک کتنا بڑا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے فیہ کی ضمیر کو ثمن کی طرف لوٹایا ہے، یعنی یوسفؑ کی قیمت کی ان کو رغبت نہ تھی۔ ان کا مقصد حصول قیمت نہ تھا بلکہ یوسفؑ کو دور پھینک دینا تھا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ کانوا کی ضمیر اگر قافلے والوں کی طرف راجع کی جائے تو دو صورتیں ہیں قافلہ والوں نے بے رغبتی سے خریدا تھا یوسفؑ کی طرف راغب نہ تھے کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھاگا ہوا غلام ہے اور اگر قافلہ والوں کو بائع قرار دیا جائے (کیونکہ مصر میں لے جا کر انہوں نے حضرت کو فروخت کر دیا تھا) تو یہ مطلب ہو گا کہ چونکہ انہوں نے مفت میں یوسفؑ کو پالیا تھا ان کو آپ کی قدر نہ تھی اور اندیشہ تھا کہ کوئی دعویٰ نہ پیدا ہو جائے اس لئے جلدی فروخت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مالک اور اس کے ساتھی حضرت یوسفؑ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ بھائیوں نے پھر بھی پہچانہ چھوڑا، پیچھے ہو لئے اور خریداروں سے کہنے لگے مضبوطی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنا کہیں بھاگ نہ جائے۔ مالک آپ کو لے کر مصر پہنچا اور فروخت کے لئے پیش کیا قطفیر نے آپ کو خرید لیا، یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا نام اظفیر بتلایا ہے یہ بادشاہ کا نائب اور شاہی خزانہ کا سب سے بڑا آفیسر تھا اس کا خطاب عزیز تھا اس زمانہ میں مصر اور اطراف مصر کا بادشاہ ریمان بن ولید بن ثروان عملی تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے یہ بادشاہ اپنی موت سے پہلے حضرت یوسفؑ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا اور مذہب یوسفی کا پابند بن گیا تھا اور آپ کی زندگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب یوسفؑ مصر میں داخل ہوئے تو قطفیر نے مالک بن دعر سے مل کر حضرت یوسفؑ کو بیس دینار یا ایک جوڑے جوتے اور دو سفید کپڑوں کے عوض خرید لیا۔ وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ قافلہ یوسفؑ کو لے کر مصر کے بازار میں پہنچا اور فروخت کے لئے آپ کو پیش کیا تو لوگوں نے بڑھ چڑھ کر قیمت لگائی یہاں تک کہ آپ کے وزن کے برابر سونا اور اتنی ہی چاندی اور اتنے وزن کا ریشمی کپڑا اور اتنا ہی مشک آپ کی قیمت قرار پائی آپ کی عمر ۳۳ سال تھی اور وزن چار سو رطل تھا آخر اس قیمت پر قطفیر نے آپ کو مالک سے خرید لیا۔ اور مصر کے جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اس نے

وَ قَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لَا مِرَاتٍ

اپنی بیوی را عیمل یا زلیخا سے کہا۔

اگر بھی مثنوی اس کو خاطر سے رکھنا۔ مثنوی ٹھہرنے کی جگہ اس جگہ مراد مرتبہ ہے۔ قتادہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ بعض نے کہا مثنوی سے مراد غذا، لباس اور مکان۔ عسلی ان ینفعنا امید ہے یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یعنی اگر ہم اس کو فروخت کریں تو نفع مل جائے اگر نہ فروخت کریں تو ہمارے مال جائیداد اور دوسرے کاموں کا انتظام کرے۔

اَوْ نَتَّخِذَ اَوْلَادًا (بیٹا بنانا ہو تو) ہم اس کو بیٹا بنالیں گے (کیونکہ اس کے اندر ہم کو ہوشیاری کی علامات دکھائی دے رہی ہیں) عزیز مصر لا ولد اور ناقابل تولید تھا۔ اور (جس طرح ہم نے یوسفؑ کو قتل سے بچلایا کنویں سے نکلوایا) وَ كَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ اور عزیز کو اس پر مہربان بنایا) اسی طرح ہم نے اس کو ملک مصر میں جماؤ عطا کیا (اور مصر کی ساری پیداوار کا اس کو حاکم اعلیٰ بنا دیا۔

وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ط

(تاکہ وہ وہاں انصاف کے ساتھ حکومت کرے) اور تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر سکھادیں، یعنی یوسف کو بچانے اور حکومت عطا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرے اور عدل کے ساتھ انتظام خلق کرے اور اللہ کی کتابوں کی صحیح تعلیم دے اور اللہ کے احکام جاری کرے (اس مطلب پر تاویل احادیث سے مراد ہوگی، کتب الہیہ کی تعلیم اور اللہ کے احکام کا اجراء) کیا اس سے خوابوں کی تعبیر مراد ہے اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ یوسف کو ان خوابوں کی تعبیر سکھادیں جو آئندہ ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے یوسف ان کے لئے تیار ہو جائیں اور پہلے سے انتظام کر لیں (جیسے قحط کے سات سال بادشاہ نے خواب میں سات دبلی گایوں کی شکل میں دیکھے تھے اور حضرت یوسف کو اللہ نے ان کی تعبیر بتادی تھی پھر آپ نے کال پڑنے سے برسوں پہلے غذا کا اسٹاک کرنا شروع کر دیا تھا اور جب کال پڑا تو آندوختہ گلہ ملک میں تقسیم کیا اور اس طرح قحط پر قابو پایا) بعض علماء کے نزدیک وَلِنُعَلِّمَهُ كَاعِطْفِ فَعَلٍ مَحْذُوفٍ پر نہیں ہے بلکہ واوڑا آند ہے۔

وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔ اَمْرِهِ کی ضمیر لفظ اللہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا، یا یوسف کی طرف ضمیر لوٹ رہی ہے یعنی یوسف کے بھائی یوسف کے متعلق کچھ اور چاہتے تھے اور اللہ کچھ اور چاہتا تھا اور ہو او ہی جو اللہ چاہتا تھا۔

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝۲۱ لیکن اکثر لوگ اللہ کی حکمت کی باریکیوں کو نہیں جانتے اور اس کی مخفی مہربانیوں سے ناواقف ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ وَلَهَا بَلَدٌ كَثِيرٌ مِّنْهُم مَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ اور جب یوسف اپنی بھرپور جوانی اور قوت کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو حکم اور علم عطا کیا۔

اَشُدُّ انہتائی جوانی اور قوت۔ مجاہد نے کہا ۳۳ سال کی عمر، سیدی نے کہا ۳۰ سال کی عمر یہی سن وقوف ہے۔ ضحاک نے کہا ۲۰ سال، کلبی نے کہا اشد کی عمر ۱۸ سے ۲۰ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ امام مالک سے اشد کا ترجمہ پوچھا گیا تو فرمایا سمجھو اور دانش۔ حکم سے مراد ہے نبوت۔ بعض نے کہا درستی قول۔ علم سے مراد ہے دینی سمجھ یا خواب کی تعبیر کا علم۔ بعض اہل علم نے کہا حکیم اور عالم کے درمیان فرق یہ ہے کہ عالم تو جاننے والے کو کہتے ہیں اور حکیم وہ ہوتا ہے جو علم کے تقاضے کی مطابقت عمل بھی کرے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝۲۲ اور اسی طرح نیکو کاروں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول میں محسنین، کا ترجمہ مؤمنین آیا ہے، دوسرے قول میں آیا ہے کہ محسنین سے مراد ہیں ہدایت یافتہ لوگ، ضحاک نے کہا مصائب پر صبر کرنے والے، بیضاوی نے لکھا ہے آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ نے یوسف کو یہ جزا ان کے حسن عمل اور عنقوان جوانی میں متقی رہنے کی دی تھی۔

وَسَاوَدَتْهُ الْاَيْتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ

اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھے اس عورت نے اپنا مطلب ان سے حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلا یا اور دروازے بند کر دیئے۔

رَاوَدَتْ كَامَصْدَرٍ مُرَاوَدَتْ ہے اور اس کا مجرور اذیرود آتا ہے رود مادہ ہے رود کا معنی ہے کسی چیز کی طلب میں آنا جانا اسی سے رائد بنا ہے۔ (قافلہ یا لشکر سے پہلے پانی اور گھاس کی تلاش میں جانے والا ہر اول) بعض نے کہا آہستگی کے ساتھ کسی چیز کے طلب کرنے کو رود کہتے ہیں، روید (کچھ ڈھیل دو) اسی سے بنا ہے یہاں مراد یہ ہے کہ زلیخا نے تدبیر اور بہانے سے یوسف سے اپنے مطلب کی درخواست کی۔ زلیخا عزیز کی بیوی تھی۔ دروازے سات تھے تغلیق خوب مضبوط یا بکثرت دروازے بند کر دیئے باب تفعیل تکثیر یا مبالغہ کے لئے آیا ہے۔

اور کہا آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں۔

وَقَالَتْ هَيْت لَكَ ط

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ہیت لکّ ہی پڑھایا تھا۔ کسائی نے کہا یہ اہل حوران کا محاورہ تھا جو حجاز میں مستعمل ہو گیا تھا۔ کسائی کا یہ قول ابو عبیدہ نے نقل کیا ہے اس کا معنی ہے۔ ”آ“۔ عکرمہ نے بھی کہا کہ حورانی محاورہ میں اس کا معنی ”آ“ ہے۔ مجاہد نے کہا یہ عربی لفظ ہے کسی چیز کی ترغیب دینے کے لئے بولا جاتا ہے گویا یہ اسم بمعنی فعل ہے اور آئین کی طرح مبنی بر فتح ہے اس کا نہ ثنیہ آتا ہے نہ جمع۔ کذا قال ابو عبیدہ۔

قاموس میں ہے ہیت، ہیت، ہیت تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے اس کا معنی ہے ”آ“ کبھی ہا کو مکسور بھی بولا جاتا ہے۔

یوسف نے (اس وقت زلیخا سے) کہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (اس بُری حرکت سے)۔
 قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ
 بلاشبہ وہ میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔ اِنَّہ میں ضمیر شان ہے۔ یعنی بات یہ ہے کہ میرے آقا قطفیر نے میری خاطر مدارات اور پرداخت اچھی طرح کی اس نے تجھ سے بھی کہا تھا کہ اس کی خاطر اچھی طرح کرنا ایسے محسن کا بدلہ یہ تو نہیں کہ میں اس کی خیانت کروں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنَّہ کی ضمیر قطفیر کی طرف راجع ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی طرف ضمیر راجع ہے، یعنی اللہ بلاشبہ میرا خالق ہے اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنا دیا، قطفیر کے دل کو مجھ پر مہربان کر دیا۔ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔

اِنَّہ لَا يُفْضِحُ الظَّالِمُونَ ۝۱۳
 حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح یاب نہیں ہوتے۔ بھلائی کا بدلہ برائی سے دینے والے ظالم ہیں۔ بعض نے کہا الظالمون سے مراد ہیں زنا کرنے والے۔ زنا کرنے والے اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور اس شخص پر بھی ظلم کرتے ہیں جس کی بیوی سے زنا کرتے ہیں۔

سدی اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ عزیز کی بیوی نے یوسف کو جب پھسلانا چاہا تو اس کی تدبیر یہ کی کہ یوسف کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی، کہنے لگی یوسف تمہارے بال کیسے حسین ہیں، آپ نے جواب دیا (مرنے کے بعد) سب سے پہلے یہی میرے بدن سے منتشر ہوں گے۔ زلیخا نے آپ کی آنکھوں کی تعریف کی تو فرمایا چہرے پر بہہ کر یہ سب سے پہلے آئیں گی۔ چہرے کی تعریف سن کر فرمایا اس کو مٹی کھالے گی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ زلیخا نے کہا ریشمین بستر بچھا ہوا ہے اٹھو اور میرا مقصد پورا کرو، آپ نے فرمایا اگر میں ایسا کروں گا تو جنت کے اندر میرا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔ غرض اسی طرح زلیخا آپ کو راغب کرتی رہی آپ بھی جوان تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح جوانی کے تقاضے رکھتے تھے، خوب صورت عورت کو دیکھ کر آپ کو بھی طبعی میلان ہو گیا، اسی طبعی میلان کو اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا
 عورت نے تو بلاشبہ یوسف کو مقصد بنالیا تھا یوسف بھی اس کا ارادہ کر ہی چکے تھے، یعنی زلیخا کی جانب یوسف کے دل میں فطری اور طبعی میلان پیدا ہو گیا مگر آپ نے اس کو اپنے عزم سے روکا اور بازداشت کی عزم اور ارادے کے ساتھ طبعی میلان کو روکنے پر۔ لفظ ”معاذ اللہ“ دلالت کر رہا ہے، مراد یہ ہے کہ آپ کا ارادہ اختیاری نہ تھا میلان طبعی تھا جس کا سدانہ ہونے دینا انسان کے اختیار سے خارج ہے اور اس پر آدمی مکلف بھی نہیں ہے بلکہ میلان طبعی کو عزم کے ساتھ روکنے والا مستحق ستائش ہے فرشتوں پر انسان کی برتری صرف اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے فطری میلان گناہ سے خالی ہیں اور آدمی طبعی میلان نفس کو عزم سے روکتا ہے۔

شیخ ابو المنصور ماتریدی نے فرمایا ارادہ یوسف در حقیقت ایک خود آمدہ خیال تھا جو بے اختیار دل میں آگیا تھا اور یہ قابل گرفت نہیں خود رو خیال اور غیر ارادی خطور قلبی ناقابل مواخذہ ہیں اگر آپ کا ارادہ ہمارے ارادے کی طرح ہوتا تو اللہ آپ کی تعریف نہ کرتا۔ اور آپ کی متعلق اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ نہ فرماتا۔

بعض اہل حقائق نے کہا ارادہ دو قسم کا ہوتا ہے (۱) ارادہ محکم، یعنی عزم راسخ اور غیر متزلزل دل پسندی۔ عزیز کی بیوی کا

ارادہ اسی طرح کا تھا یہ ارادہ قابل مواخذہ ہے (۲) عارضی ارادہ اور دل میں خیال کا گزر جانا اور غیر ارادی تصور۔ اس قسم کا ارادہ حضرت یوسفؑ کا تھا اور یہ ناقابل مواخذہ ہے اور ظہورِ قوی و فعلی سے پہلے اس کی پکڑ نہ ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کی بات اپنے دل میں کر لیتا ہے تو کئے بغیر میں اس کی نیکی لکھ لیتا ہوں اور جب وہ نیکی کر بھی لیتا ہے تو اس جیسی دس نیکیاں اس کے لئے لکھ دیتا ہوں اگر میرا بندہ کوئی بدی کرنے کی بات دل میں کرتا ہے تو جب تک اس کا عملی اظہار نہ کرے میں معاف کر دیتا ہوں اور جب عملاً وہ کر ہی لیتا ہے تو میں اتنی ہی بدی (اس کے نامہ اعمال میں) لکھ دیتا ہوں۔ رواہ ابوعبید بن جریج اور جامع ترمذی میں حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں، جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرتا نہیں تو میں اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں پھر اگر وہ عملاً نیکی کر بھی لیتا ہے تو میں اس کے لئے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اگر کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے اور بدی عملاً نہیں کرتا تو میں اس کے لئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ بدی کر گزرتا ہے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا (اور اس قول کی نسبت سعید بن جبیرؓ جیسے متقدمین کی طرف کی) کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا گمبند کھول لیا تھا اور بیٹھ گئے تھے جیسے مرد (وقت حاجت) بیٹھتے ہیں یا اپنا پانچامہ کھول لیا تھا اور کپڑے سمیٹ رہے تھے، هَمَّ بِهَا كَايِي مَعْنَى هِيَ۔ اس قسم کی غلط توجیہات کلامِ الہی کی رفتار کے خلاف ہیں، اللہ نے فرمایا ہے۔ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ۔ ظاہر ہے کہ سوء سے مراد صغیرہ گناہ ہے جس سے دور رکھنے کی اللہ نے صراحت فرمائی ہے اور قائل مذکور نے جو تفصیل کی اس سے گناہ صغیرہ کا مرتکب ہو جانا ثابت ہوتا ہے اگر حضرت یوسفؑ سے صغیرہ گناہ کا صدور ہوگا تو اللہ ان کی توبہ و استغفار کا تذکرہ فرماتا، جیسے حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت داؤد اور حضرت یونس کی توبہ و استغفار کا ذکر فرمایا ہے، حالانکہ ان بزرگوں سے غیر ارادی خطا ہوئی ہے (گناہ کا قصد و ارادہ نہ تھا اجتہادی غلطی تھی) اور یوسفؑ کی توبہ و استغفار کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ حضرت یوسفؑ نے اپنی بے گناہی کی صراحت فرمائی اور فرمایا هِيَ رَاوَدْتْنِي عَنْ نَفْسِي اور فرمایا ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنْتٰی لَمْ اَخْنَهُ بِالْغَيْبِ اور فرمایا اِنَّهُ مِنْ يَتِّقِي وَيَصْبِرُ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ نے بھی آپ کے متعلق فرمایا اِنَّهُ مِنْ عِبَادِ قَا الْمُخْلِصِيْنَ۔

اگر نہ دیکھ لیتے وہ اپنے رب کی دلیل کو۔ شرط کا جواب محذوف ہے یعنی اگر نہ
 كَوْلَا اَنْ رَا بْرَهَانَ رَبِّهٖ ط
 دیکھ لیتے برہانِ رب کو تو جماع کر لیتے۔ بعض کے نزدیک کَوْلَا کا جواب مقدم ہے اور شرط مؤخر ہے۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ یوسفؑ زلیخا کا ارادہ کر ہی چکے تھے اگر برہانِ رب کو نہ دیکھ لیتے یعنی ارادہ نہ کیا تھا قریب تھا کہ ارادہ کر لیتے۔ مگر کَوْلَا کا جواب پہلے آجانا قانونِ نحو کے خلاف ہے لَوْلَا حروفِ شرط میں سے ہے اس لئے حرفِ شرط پر جواب کا تقدیم ناجائز ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ کَوْلَا کا جواب شرط کے بعد محذوف ہو۔ اور جواب اسی مضمون کا جو پہلے ذکر کر دیا گیا چونکہ هَمَّ بِهَا فرمادیا تھا اس لئے کَوْلَا کا دوبارہ جواب ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح کا محاورہ عرب استعمال کرتے ہیں کہا جاتا ہے قَتَلْتَهُ لَوْلَا اَخَفَ اللّٰهُ فِيْ اِسْرِ كَوْفَلٍ هٰذَا كَمَا خَفَ اللّٰهُ فِيْ اِسْرِ كَوْفَلٍ۔

برہان کیا تھی اور یوسفؑ نے کیا دیکھ پایا تھا اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، حضرت جعفر صادق نے فرمایا برہان وہ نبوت تھی جو اللہ نے یوسفؑ کے سینہ میں ودیعت کر دی تھی، یہ نورِ نبوت اس عمل سے مانع ہو گیا جو اللہ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ قنادہ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی صورت دیکھ لی تھی، حضرت یعقوبؑ فرما رہے تھے۔ یوسفؑ نادانوں کا جیسا عمل کر رہا ہے۔ تیرا نام توبہ زمرہ انبیاء لکھا ہوا ہے۔ حسن اور سعید بن جبیرؓ اور مجاہد اور عکرمہ اور ضحاک نے کہا آپ نے چھت میں ایک شگاف دیکھا جس کے اندر حضرت یعقوبؑ (افسوس کے ساتھ) اپنی انگلی دانت سے کاٹتے نظر آئے۔

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ مجسم ہو کر سامنے آگئے اور اپنا ہاتھ یوسفؑ کے سینہ پر مارا جس سے یوسفؑ کا جوش ہیجان جاتا رہا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے محمد بن سیرین کا قول نقل کیا ہے کہ

حضرت یعقوب دانت سے انگلی کاٹتے کھڑے نظر آئے جو فرما رہے تھے یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ تیرا نام تو انبیاء میں شامل ہے اور تو نادانوں جیسا کام کر رہا ہے۔

سدی نے کہا یوسف کو (عیسیٰ) نداء آئی، یوسف! توجہ تک اس پر نہیں پڑا ہے تیری حالت اس پرندے کی سی ہے جو ہوا میں اڑ رہا ہو اور اس کو کوئی پکڑ نہ سکتا ہو اور جب تو اس پر پڑ جائے گا تو تیری حالت اس پرندے کی طرح ہو جائے گی جو مر کر زمین پر گر گیا ہو کہ کسی چیز کو دفع نہ کر سکتا ہو، قبل از وقوع تیری حالت اس سرکش بیل کی طرح ہے جو کسی کے قابو میں نہ آسکتا ہو اور وقوع کے بعد تیری حالت اس بیل کی طرح ہو جائے گی جو مردہ پڑا ہو اور اس کے سینگوں کی جڑوں میں چیونٹیاں گھس رہی ہوں اور وہ کسی کو دفع نہ کر سکتا ہے۔

ابن جریر نے قاسم بن ابی بزہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف کو نداء آئی اے یعقوب کے بیٹے اس پرندے کی طرح نہ ہو جا جس کے پراچھے خاصے موجود ہیں لیکن زنا کے بعد سب پر گر جائیں گے۔

حضرت یوسف نے ندا کی کوئی پرولہ نہیں کی پھر اوپر کو سر اٹھایا تو حضرت یعقوب کی شکل نظر آئی جو دانت سے انگلی کاٹ رہے تھے یہ دیکھ کر آپ پر خوف طاری ہو گیا اور باپ سے شرمناک اٹھ کھڑے ہوئے، مجاہد کا ایک قول بحوالہ ابن عباس ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت جبریل نیچے اترے اور دانت سے اپنی انگلی کاٹتے نظر آئے جو کہہ رہے تھے یوسف نادانوں جیسا کام کر رہے ہو، تمہارا نام تو اللہ کے نزدیک انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت جبریل نے اپنا پر حضرت یوسف کے بدن سے لگا دیا جس کی وجہ سے سارا جوش انگلیوں کے پوروں سے نکل گیا۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا یوسف نے جب ارادہ کیا اور چھت کی طرف سر اٹھایا تو کسی دیوار پر لکھا ہوا دیکھا لا تَقْرَبُوا الزَّيْنَةَ إِنَّهَا كَانَتْ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا زَنَا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ بے حیائی کا کام ہے اور بررار استہ ہے۔ عطفیہ نے حضرت ابن عباس کا قول برہان رب کے متعلق نقل کیا ہے کہ حضرت یوسف نے فرشتے کی صورت دیکھ لی تھی۔

حضرت علی (زین العابدین) بن امام حسین کا قول منقول ہے کہ وہاں گھر کے اندر ایک بت تھا عورت اس پر پردہ ڈالنے کے لئے گئی، حضرت یوسف نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا اس نے جواب دیا مجھے شرم آئی کہ یہ مجھے اس گناہ میں مبتلا دیکھے گا حضرت نے فرمایا تم کو تو ایسی چیز سے شرم آئی جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے پھر مجھے تو بدرجہ اولیٰ اپنے رب سے شرمانا چاہئے۔ (جو دانا بیانا ہے) یہ کہہ کر آپ بھاگ نکلے۔

كُنَّا لَكَ لِنَصْرَفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحِشَاءَ
چھوٹے بڑے گناہ کو پھیر دیں (گناہ کا رخ ان کی طرف سے موڑ دیں) السُّوءَ چھوٹا گناہ الفَحِشَاءُ بڑا گناہ یعنی زنا۔

بلاشبہ وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا یعنی ان بندوں میں سے
اِنَّكَ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۳﴾
تھا جن کو نبوت کے لئے چن لیا گیا تھا اور اللہ نے اپنے لئے ان کو خالص کر لیا تھا اور ایک قرأت میں الْمُخْلَصِينَ بکسر لام بصیغہ اسم فاعل آیا ہے۔ یعنی یوسف ان بندوں میں شامل تھا جو اللہ کے لئے خالص طور پر عبادت اور طاعت کرتے ہیں۔

اور دونوں (یوسف و زلیخا) دروازے کو دوڑے یوسف آگے اور زلیخا پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے جب یوسف باہر نکلنے کے لئے بھاگے تو زلیخا ان کو روکنے کے لئے پیچھے سے دوڑی اور پیچھے سے کرتہ پکڑ کر کھینچا۔ الباب سے مراد ہے آخری دروازہ جہاں سے بالکل گھر سے باہر آسکتے تھے۔ یوسف جب بھاگے تھے تو دروازوں کے قفل ٹوٹ ٹوٹ کر خود گر رہے تھے آخری دروازہ پر نیچے تو زلیخا نے کرتہ پکڑ کر کھینچا۔

اور عورت نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے چیر دیا۔ قَدْ لَمْبَانِي فِي مِثْقَلِ ذَرَّةٍ مِنْ حَبِّ كَلْبٍ
میں کاٹ لیا پھاڑنا۔

وَأَلْفِيَا سَيِّدًا لَّكَ الْبَابُ
اور دروازہ کے بعد دونوں نے عورت کے شوہر کو پایا (جو آ رہا تھا) بغوی نے لکھا ہے کہ زلیخا کے چچا کے بیٹے کے ساتھ قطفیر کو بیٹھایا۔ بعض نے کہا آتا پایا جو اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ زلیخا یہ دیکھ کر ڈر گئی۔

قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۵﴾

شوہر کی نظر میں اپنے کو پاک دامن ظاہر کرنے اور جذبہ انتقام کے زیر اثر یوسف کے خلاف اس کو بھڑکانے کے لئے عورت نے کہا جس شخص نے آپ کی بیوی سے بڑے کام کا ارادہ کیا ہو آپ کی بیوی پر بڑی نیت کی ہو اس کی سزا اس کے سوا نہیں کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے یا دکھ کا عذاب دیا جائے یعنی کوڑے مارے جائیں۔

يُوسُفُ قَالَ هِيَ رَأَوْدَتْنِي عَنْ نَفْسِي
یوسف نے کہا اسی نے مجھے پھسلا دیا تھا۔ یعنی یہی مجھ سے بدکاری کی طلب گار تھی۔ چونکہ عورت نے جھوٹ باندھا تھا اور شوہر کو ترغیب دی تھی کہ یوسف کو سزائے تازیانہ دی جائے یا قید میں ڈال دیا جائے۔ اس لئے بطور مدافعت حضرت نے یہ راز فاش کیا۔ اگر زلیخا ایسا نہ کرتی تو آپ بھی پردہ دری نہ کرتے۔

وَشَهِدَ شَاهِدًا مِّنْ أَهْلِهَا
اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے شہادت دی۔ بعض نے کہا یہ زلیخا کا چچا کا بیٹا تھا۔ بعض نے کہا ماموں کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا شیر خوار بچہ تھا جس کو اللہ نے گویا کر دیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بیان بھی آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا چار بچے بچپن میں بولے (۱) بنت فرعون کے بال بنانے والی خادمہ کا بچہ (۲) شاہد یوسف (۳) جرج والی بچہ (۴) عیسیٰ بن مریم۔ محمد بن محمد سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے حاکم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے اور شرطی شیخین کے موافق قرار دیا ہے لیکن طبری کو اس حدیث کی صحت کی اطلاع نہیں ملی۔ انہوں نے اس کی تردید میں وہ حدیث پیش کی ہے جو حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا اپنے کے اندر تین بچوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی عیسیٰ بن مریم اور جرج والی بچہ اور ایک بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی ایک خوبصورت سوار ادھر سے گزرا عورت نے کہا اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح کر دے۔ بچہ بولا مجھے اس کی طرح نہ کرنا اگر اس مؤخر الذکر بچے کو بھی مذکورہ الصدر چار بچوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پالنے میں بولنے والے پانچ بچے ہو جائیں گے۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی کی حالت میں بولنے والے اس سے زیادہ بچے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ اصحاب الاخدود (یوسف ذونو اس شاہ یمن اور اس کے ساتھی جنہوں نے ایک بڑا گڑھا کھدوا کر آگ سے بھرا کر اہل ایمان کو اس میں ڈلوایا تھا اور شیر خوار بچے کو جب اس کی مؤمنہ ماں کی گود سے چھین کر آگ میں ڈالا تو ماں بے تاب ہو گئی اور قریب تھا کہ کلمہ کفر زبان پر لے آئے کہ بچے نے ماں کو آگ کے اندر سے آواز دی، ماں یہ پھولوں کا چمن ہے تو بھی چلی آ۔ مترجم) کے قصے میں بھی آتا ہے کہ ایک شیر خوار بچہ بولا تھا۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی میں بولنے والے گیارہ بچے ہوئے جن کو میں نے ان اشعار میں جمع کر دیا ہے۔

ويحيى وعيسى والخليل و مریم
و طفل لذي الاخدود و يرويه مسلم
التي يقال لها تنزني ولا تتكلم
وفي زمن الهادي المبارك يختم

تكلّم في المهد النبيّ محمّد
ومبري جريح ثمّ شاهد يوسف
و طفل عليه مبريا لأمه
وماشطة في عهد فرعون طفلها

إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَذِبِينَ ﴿۲۶﴾

اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو زلیخا سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے۔ کرتہ کا آگے سے پھٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ یوسف

نے دست درازی کی تھی اور زلیخا نے آگے سے اس کا کرتہ اس کو دفع کرنے کے لئے پکڑا جس سے کرتہ چر گیا۔ یا یہ کہ زلیخا کے پیچھے یوسف دوڑا اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کرتے کے دامن میں الجھ کر گرا، اور کرتا گریباں پھٹ گیا۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ فَكَذَّابٌ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۷﴾

اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت نے جھوٹ کہا اور یوسف سچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے اس کو پکڑنے دوڑی اور کرتہ پکڑ کر کھینچ لیا جس کی وجہ سے کرتہ پھٹ گیا۔

حقیقت میں یہ شہادت نہ تھی (بلکہ سچ جھوٹ معلوم کرنے کی ایک تدبیر تھی) مگر مفہوم شہادت کو چونکہ یہ قول ادا کر رہا تھا اس لئے اس کو شہادت قرار دیا۔

پس جب اس نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (تو سمجھ گیا کہ یوسف پاک دامن اور سچا ہے اور بیوی مکار قصور وار ہے) بولا بلاشبہ (بدی یا یہ کام یا تیرا یہ قول مآجزاء من آراد باہلک الخ) تم عورتوں کی مکاری کی وجہ سے ہے۔ خطاب بصیغہ جمع زلیخا اور اس جیسی عورتوں کو ہے یا تمام عورتوں کو۔

فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِ كُنَّ ط

یقیناً تم عورتوں کا مکر بڑا ہے۔ عورتوں کا ظاہر تو کمزور نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سچی ہیں (بھولی بھالی صورت پر کون جھوٹا ہونے کا احتمال کر سکتا ہے) لیکن ان کا باطن ٹیڑھا اور گندا ہے ان کی تخلیق آدم کی (ٹیڑھی) پسلی سے ہوئی ہے ان کی عقلوں میں کمزوری اور دینداری میں نقصان ہے ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو مکر کا جال لے کر مردوں کے سامنے سے آتا ہے اور شیطان تو پھر چھپ کر چوری سے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ ﴿۱۸﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں یہ سچی حضور ﷺ نے فرمایا تم عورتوں میں سے کسی ایک سے بھی زیادہ کوئی ناقص العقل والدین شخص دانشمند مرد کی عقل و دانش کو زائل کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا قول ہے شیطان سے زیادہ مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ نے شیطان کے مکر کو تو ضعیف فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا اور عورتوں کے متعلق فرمایا ہے إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ تمہارا مکر بڑا ہے۔

اے یوسف اس قصہ سے درگزر کرو۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ کہیں یہ واقعہ پھیل نہ جائے۔

يُوسُفُ أَعْرَضَ عَنْ هَذَا كَيْدِهِ

پھیل نہ جائے۔

وَاسْتَغْفِرُ لِدُنْيَاكَ إِنَّكَ كُنْتَ مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿۱۹﴾

اور (اے زلیخا) تو اپنے گناہ کی معافی طلب کر یقیناً تو ہی قصور وار ہے۔ یعنی قصور وار لوگوں میں سے ہے۔ الخاطئين: خطا سے اسم فاعل جمع مذکر ہے خطا کا معنی ہے قصد آگناہ کیا۔ الخاطئين مذکر کا صیغہ ہے بظاہر مؤنث کا صیغہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ زلیخا عورتوں میں سے تھی مگر یہاں صرف خطاوار عورتوں کی جماعت مراد نہیں ہے بلکہ مرد خطاوار ہو یا عورت سب کی جماعت مراد ہے اور مذکر کو مؤنث پر تغليب دے کر مذکر کا صیغہ استعمال کیا ہے، جیسے دوسری آیت ہے وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ وَإِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ۔ عزیز بردبار آدمی تھا غیرت کم تھی اسی لئے زبانی سرزنش پر اکتفا کی۔

اور شہر میں عورتوں نے کہا نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ اور شہر میں پھیلا اور یوسف کے واقعہ کی عورتوں کو اطلاع ہوئی تو عورتوں نے کہا، مقاتل نے کہا کہ کہنے والی پانچ عورتیں تھیں۔ کشیدان کی بیوی، منصرم آبدار خانہ کی بیوی، مہتمم باور چیخانہ کی بیوی، جیلر کی بیوی اور منصرم اصطلیل کی بیوی۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ

عزیز کی بیوی اپنے (کنعانی) غلام کو پھسلانے اور بہکانے لگی۔

أَمْرَاتُ الْعَزِيزِ تَرَاوَدُّ فَتْنَهَا

اس کے نفس کی طرف سے۔ یعنی اس سے وصال کی طلب گار ہو گئی۔

عَنْ نَفْسِهِ

اس غلام کا عشق اس کے دل میں گھر کر گیا ہے۔ یعنی یوسف عزیز کی بیوی کے دل کے

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا

غلاف کو پھاڑ کر اس کے دل کے اندر کھس گیا۔ مطلب یہ کہ یوسف کی محبت زلیخا کے دل میں رچ گئی۔ سدی نے کہا شغاف دل کے اوپر کی باریک جھلی۔

کلبی نے شَغَفَ کا ترجمہ کیا حَجَبَ یعنی زلیخا کے دل پر یوسف کی محبت چھا گئی، محبت نے عقل پر پردہ ڈال دیا کہ سوائے یوسف کے اور کسی بات کو سمجھنے کا اس کو ہوش نہیں رہا۔

إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۴۰﴾ ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ سیدھے اور صحیح راستے سے بھٹک گئی ہے، پاک دامنی کو چھوڑ دیا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ (دعوت کا پیام دے کر) کسی کو بھیجا۔ مکر سے مراد ہے خفیہ بات مکر بھی مکار چھپاتا ہے اور غیبت بھی پس پشت چھپا کر کی جاتی ہے۔

ابن اسحاق نے کہا مکر سے مکر ہی مراد ہے عورتوں نے زلیخا کے متعلق یہ بات اس لئے کہی تھی کہ زلیخا ان کو بلوا کر یوسف کا نظارہ کرادے کیونکہ یوسف کے حسن و جمال کا تذکرہ زلیخا ان سے کرتی تھی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ زلیخا نے اپنا راز ان سے کہہ دیا تھا اور ان سے چھپانے کی تاکید کر دی تھی مگر وعدہ اخفاء کرنے کے بعد انہوں نے راز فاش کر دیا اسی لئے اس کو مکر کہا۔ اَرْسَلَتْ کا مفعول محذوف ہے یعنی اَرْسَلَتْ رَسُولًا اِیْکَ قاصد بھیجا۔

وہب نے کہا زلیخا نے کھانے پر چالیس عورتوں کو بلوایا تھا جن میں یہ غیبت کرنے والی عورتیں بھی تھیں، جنہوں نے زلیخا کو غلام سے محبت کرنے کی عار دلانی تھی۔

وَاعْتَدَاتُ لَهِنَّ مَتَكًا اور ان کے واسطے مسند (تکیہ) لگا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، حسن بصریؓ، قتادہ اور مجاہد نے مَتَكًا کا ترجمہ طعام کیا ہے کھانے والے کھانے بیٹھتے ہیں تو تکیہ مسند لگاتے ہیں اس لئے مجازًا مَتَكًا کا ترجمہ ہو گیا طعام۔ اِتَّكَأْنَا عِنْدَ فُلَانٍ ہم نے فلاں شخص کے پاس کھانا کھایا تکیہ لگا کر کھانے کی عادت چونکہ عیش پسندوں کی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اُلُتْ ہاتھ سے کھانے اور تکیہ لگا کر کھانے کی ممانعت فرمادی۔ رواہ ابن ابی شیبہ فی المصنّف عن جابر بعض لوگوں نے کہ مَتَكًا وہ کھانا ہے جو کاٹ کر کھلایا جائے گویا کاٹنے والا چھری سے اُس پر دباؤ ڈالتا ہے حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا قول ہے کہ وہ ترنج تھا۔ بعض علماء نے کہا حبشی زبان میں مَتَكًا ترنج کو کہتے ہیں ہیں۔ عکرمہ اور ابو زید انصاری نے کہا جو چیز چھری سے کاٹی جائے عرب اس کو متک کہتے ہیں متک اور تک کا لغوی معنی ہے کاٹنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ عزیز کی بیوی نے ایک کمرہ میں طرح طرح کے پھل اور کھانے سجا کر رکھوائے اور تکیے بھی لگا دیئے اور عورتوں کو بلوایا۔

وَ اَنْتِ كَلٌّ وَاِحْدَاةٌ مِّنْهُنَّ سَبْكِيْنَا اور ان میں سے ہر عورت کو ایک چھری (کاٹنے کے لئے دے دی ان عورتوں کا قاعدہ تھا کہ گوشت چھری سے کاٹ کر کھاتی تھیں۔

وَقَالَتْ اخْرِجِي عَلَيهِنَّ اور (یوسف سے) کہا ان عورتوں کے سامنے سے نکلو۔

زلیخا نے یوسف کو ایک اور جگہ بٹھادیا تھا وہاں سے آپ عورتوں کے سامنے برآمد ہوئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حُسن میں یوسف کی دوسرے لوگوں پر برتری ایسی تھی جیسی ستاروں پر چودھویں رات کے چاند کی ابن جریر حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا (یعنی شب معراج میں) میں نے دیکھا کہ یوسف چودھویں کے چاند کی طرح تھے۔

ابو الشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحاق بن عبد اللہ ابی فروہ کا قول بیان کیا ہے یوسف مصر کے گلی کو چوں سے گزرتے تو دیواریں آپ کے چہرے کی چمک سے جگمگاتیں جیسے سورج کی دھوپ جب دیواروں پر پڑ رہی ہو تو اس کے عکس سے پانی جگمگاتا ہے۔

فَلَمَّا رَايْنَهُ اَكْبَرْنَهُ ابو العالیہ نے کہا عورتیں آپ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں، مبہوت ہو گئیں۔ بعض

ہوتے، آدمی کو چاہئے کہ عافیت کا طلبگار ہو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرے۔ ترمذی نے حضرت معاذ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا الہی میں تجھ سے صبر کی درخواست کرتا ہوں (کہ مجھے مصائب پر صبر عطا کر) فرمایا تو مصیبت کا طلبگار ہو عافیت کی دعا کر۔ طبرانی نے حضرت عباس کا قول نقل کیا ہے حضرت عباس کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کی دعا میں اللہ سے کروں فرمایا اپنے رب سے عافیت کی دعا کرو۔ کچھ مدت کے بعد میں پھر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیے جو میں اللہ سے مانگوں، فرمایا چچا اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی طلب کرو۔

اور اگر تو ان کی

وَالَا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْحَابِ الْبَيْتِ وَأَكْنَ مِنَ الْجَهْلِيْنَ ۝۳۱

مکاری کا رخ میری طرف سے نہیں پھیر دے گا (اور مجھے عصمت پر ثابت قدم نہیں رکھے گا) تو میں ان کی (خواہش کو قبول کرنے کی) طرف جھک جاؤں گا اور (ارتکابِ گناہ کی وجہ سے) نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی طبعی میلان مجھ پر غالب آجائے گا، صَبُوَّةٌ خواہش نفس کی طرف جھکاؤ۔ بے حیائی کا کام کرنا نادانوں کا کام ہے، دانش مند برا کام نہیں کرتا جاہلوں سے مراد ہیں وہ جاننے والے جو جاننے کے باوجود علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، ایسے لوگ جاہلوں کے حکم میں ہیں بلغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مؤمن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔

پس اللہ نے یوسف کی دعا قبول کر لی۔ یوسف نے کہا تھا وَالَا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ يَهْدِي لِقَلْبِهَا مَا يَشَاءُ لِي لَأَكْفُرَنَّ ۝۳۲

پس اس کی طرف سے ان عورتوں

فَصْرِفْ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۳۳

کے مکر کو پلٹ دیا (عصمت پر یوسف کو ثابت قدم رکھا کہ انہوں نے لذت آگیاں گناہ پر قید خانہ کو ترجیح دی) بلاشبہ وہ اہل التجا کی دعاؤں کو (سننے والا اور) ان کے احوال و مصالح کو) بخوبی جاننے والا ہے۔

پھر مختلف نشانیاں دیکھنے

ثُمَّ بَدَأَ الِھَمَّ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآیَاتِ لِيَسْجُدْنَكَ حَتَّىٰ حِیْنَ ۝۳۴

کے بعد ان لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت کے لئے قید میں رکھیں۔

لہم یعنی عزیز اور اس کے ساتھیوں کی پھر یہ رائے ہوئی۔ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآیَاتِ یعنی یوسف کی پاک دامنی اور برأت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد۔ بچہ کا کلام اور قمیص کا پیچھے سے پھٹنا اور عورتوں کا ہاتھ کو کاٹنا اور یوسف کا ان سے باعصمت رہنا، جب انہوں نے دیکھ لیا تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ مدت کے لئے یوسف کو قید کر دیا جائے، زلیخا کا شوہر زن پرست تھا، شوہر کی لگام زلیخا کے ہاتھ میں تھی وہ جس طرف چاہتی موڑ دیتی، اس نے شوہر کو باز پچہ بنا رکھا تھا اس کو خیال تھا کہ یوسف قید کی سختی سے تنگ ہو کر میرا ہو جائے گا۔ پھر راز فاش ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگوں سے شرمندہ بھی ہو گی اور بدنامی کا دھبہ دھونا چاہتی ہو گی اس لئے اس نے یوسف کو قید کر دینا ہی مناسب سمجھا جب دیدار اور وصال سے وہ محروم ہو گئی تو سماعِ احوال پر ہی اس کو قناعت کرنی پڑی۔ مجبور اس نے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا دنیا سے کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اس کو ورغلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا اب یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگوں سے جا کر اپنی بے گناہی ظاہر کروں یا اس کو آپ قید کر دیں کہ لوگوں میں یہ چرچے ختم ہو جائیں اور لوگ اسی کو مجرم قرار دے دیں۔

بلغوی نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ یوسف سے تین لغزشیں ہوئیں جن کی پاداش ان کو اٹھانی پڑی۔

(۱) انہوں نے اس عورت (کی طرف بڑھنے) کا ارادہ کیا تو قید بھگتی پڑی۔

(۲) انہوں نے اللہ کے سوا اپنے ساتھی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو چند سال (مزید) قید میں رہنا پڑا۔

(۳) انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم بلاشبہ چور ہو تو بھائیوں نے کہا اگر اس نے (بنیامین نے) چوری کی تو تعجب نہیں

کیونکہ اس کے بھائی یوسف نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ط
اور یوسف کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور بھی داخل ہوئے تھے ان کو بھی قید کر دیا گیا تھا یہ دونوں ریمان بن ولید بن ثروان شاہ مصر کے غلام تھے ایک باروچی یعنی منصرم باورچی خانہ تھا اور دوسرا ساقی یعنی منصرم آبدار خانہ۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو بھی قید کر دیا تھا۔ اور اتفاقاً ان کی قید بھی یوسف ہی کے ساتھ ہوئی تھی ”مع“ کے لفظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور بادشاہ کو زہر دینے کے لئے شاہی باورچی کو مالی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اقرار کے بعد ساقی نے تو سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور باورچی نے رشوت لے کر کھانے میں زہر ملا دیا کھانا بادشاہ کے سامنے آیا تو ساقی نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ کھانا زہر آمیز ہے اس کو نہ کھائیے باورچی نے (ضد میں آکر) کہا حضور پانی میں زہر ملا ہوا ہے اس کو نہ پیجئے۔ بادشاہ نے ساقی کو حکم دیا، یہ پانی تجھے پینا ہو گا ساقی نے پی لیا اس کو کوئی ضرر نہ پہنچا اور باورچی کو حکم دیا یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ اس کو کھانا تو اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کھانا کسی جانور کے سامنے ڈلوادیا۔ جانور نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو جیل خانہ بھیج دینے کا حکم دے دیا (باورچی کو زہر دینے کی کوشش کی وجہ سے اور ساقی کو راز دار ہونے کی وجہ سے) یوسف جیل خانے میں پہنچے تو ان کے علم کی شہرت ہو گئی۔ آپ نے خود بھی اعلان کر دیا کہ میں خواب کی تعبیر دینا جانتا ہوں۔ غرض ساتھ داخل ہونے والے دونوں قیدیوں نے مشورہ کیا ہم اس عبرانی غلام کے دعوے کی جانچ کرنا چاہتے ہیں، چلو تجربہ کریں خواب تو انہوں نے کوئی دیکھا نہ تھا جھوٹ موٹ خواب بنا کر تجربہ کرنا چاہا۔ حضرت ابن مسعود نے یہ فرمایا۔ بعض علماء نے کہا انہوں نے واقعی خواب دیکھے تھے، حضرت یوسف نے ان کو عمکین پا کر وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا ہم دونوں بادشاہ کے مصاحب تھے۔ ہم نے خواب دیکھے ہیں جن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یوسف نے کہا جو کچھ دیکھا ہے بیان کر دو تو

قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَيْتِي أَعْصِرُ خَمْرًا ط
ایک نے یعنی ساقی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں (انگور نچوڑ رہا ہوں اور ان کو) نچوڑ کر شراب بنا رہا ہوں، انگور سے شراب بنتی ہے انگور مال کار شراب ہو جاتے ہیں اس لئے انگور کی جگہ لفظ خمر ذکر کیا، خمر سے مراد انگور ہیں۔ فلاں شخص کھانا پکاتا ہے یعنی وہ چیز پکاتا ہے جو پک کر کھانا بن جاتی ہے۔ بعض نے کہا اہل عمان کے محاورہ میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں۔ تفصیلی خواب اس نے اس طرح بیان کیا، میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں درخت انگور کی جڑ کے پاس ہوں درخت میں تین خوشے لگے ہیں، میرے ہاتھ میں بادشاہ کا پیالہ ہے میں نے وہ انگور نچوڑ کر پیالے میں عرق بھر اور بادشاہ کو پلایا۔ بادشاہ نے اس کو پی لیا۔

وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَيْتِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خَبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ط
اور دوسرے نے یعنی باورچی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے (اوپر سے) چھپٹ کر ان میں سے کھا رہے ہیں۔ اس نے خواب کی تفصیل اس طرح بیان کی تھی کہ میں نے دیکھا میرے سر پر تین ٹوکریاں ہیں جن میں روٹیاں اور طرح طرح کے کھانے ہیں اور شکاری پرندے ان کو نوچ کر لئے جا رہے ہیں۔

نَبَأُ مَنَا بِتَأْوِيلِهِ، إِنَّكَ نَزَّيْتُكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ⑤
آپ ہم کو ہر ایک کے خواب کی تعبیر بتا دیجئے۔ ہمارے خیال میں آپ صحیح تعبیر دینے والوں میں سے ہیں یا آپ اہل علم میں سے ہیں، اس صورت میں احسان سے مراد ہو گا علم اور اول ترجمہ پر محسن سے مراد ہو گا اچھی تعبیر دینے والا۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیجئے اور صحیح تعبیر بتا دیجئے۔

ضحاک بن مزاحم سے پوچھا گیا کہ آیت ”إِنَّكَ نَزَّيْتُكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ“ میں کس احسان کا اظہار ہے، یوسف نے کہا بھلائی کرتے تھے۔ ضحاک نے جواب دیا کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو آپ اس کی عیادت اور نگہداشت کرتے تھے۔ اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اس کو کشادہ جگہ دے دیتے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ چیز فراہم کر دیتے اور ان تمام باتوں کے باوجود

عبادت کی بہت زیادہ کوشش کرتے اور راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ مصیبت میں مبتلا ہیں، غمگین ہیں، ہر قسم کا سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ آپ ان کو تسلی دینے لگے، فرمایا لوگو پریشان نہ ہو، صبر کرو اللہ اجر دے گا۔ قیدیوں نے کہا نوجوان اللہ تجھے برکت عطا فرمائے تیرا چہرہ کیسا حسین ہے، اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں اور باتیں کتنی پیاری ہیں، تیرے ساتھ رہنے سے ہم کو برکت حاصل ہوگی۔ تیرا کیا نام ہے تو کون ہے۔ آپ نے کہا میں یوسف بن یعقوب صلی اللہ بن اسحق ذیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں (اس روایت میں اسحق کا خطاب ذیح اللہ قرار دیا گیا ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک ذیح اللہ حضرت اسمعیل کا لقب تھا۔ احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور قرآنی آیات بھی شہادت دے رہی ہیں کہ حضرت اسمعیل کو ذیح کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو خواب میں دیا گیا تھا۔ مترجم)

جیلر نے کہا نوجوان اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تجھے آزاد کر دیتا (مگر میرا اختیار نہیں ہے) پھر بھی میں تیرا حق مصاحبت اچھی طرح ادا کروں گا تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں سے تو جہاں رہنا پسند کرے رہ سکتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ دونوں (خواب دیکھنے والے) جوانوں نے یوسف کو دیکھ کر کہا، یوسف! ہم کو تو اسی وقت سے تم سے محبت ہو گئی تھی جب ہم نے تم کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا، میں تم کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھ سے محبت نہ کرنا، خدا کی قسم جس نے بھی مجھ سے محبت کی اس کی محبت سے مجھ پر مصیبت ہی آئی۔ میری پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی، پھر میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنویں میں ڈالا گیا پھر عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو مجھے قید ہونا پڑا۔ غرض جب دونوں قیدیوں نے اپنا اپنا خواب یوسف سے بیان کیا تو حضرت کو تعبیر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا کیونکہ ایک کی تعبیر تکلیف دہ تھی اس پر مصیبت آنے والی تھی اس لئے آپ نے تعبیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور بعض دوسرے معجزے ظاہر کرنے اور توحید کی دعوت دینے لگے اور

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَأَ نَكْمَا بِنْتَا وَبِلَهُ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا

یوسف نے کہا جو کھانا تمہارے کھانے کے لئے (تمہارے گھروں سے یا جیل خانہ کے مطبخ سے) آتا ہے وہ آنے نہیں پاتا اس کے آنے سے پہلے ہی میں اس کی حقیقت اور کیفیت تم کو بتا دیا کرتا ہوں۔ بعض کا قول ہے کہ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ سے مراد ہے خواب میں کھانے کا آنا اور تَاوِيلُهُ سے مراد ہے بیداری میں اس کی تعبیر دینا اور قَبْلُ أَنْ يَأْتِيَكُمَا سے مراد ہے خواب میں نظر آنے والے واقعہ کا بیداری میں ظہور پذیر ہونا۔ یعنی خواب میں تمہارے کھانے کے لئے آتا ہوا جو کھانا تم کو نظر آتا ہے خارج میں ایسا واقعہ ہونے سے پہلے میں اس کی تعبیر اور تشریح تم کو بتا دیتا ہوں۔

(اکثر علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے گھروں سے جو کھانا کھانے کے لئے تمہارے پاس آتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی مقدار، رنگ، قسم، وقت اور دوسری کیفیت بتا دیتا ہوں گویا آپ کا یہ معجزہ حضرت عیسیٰ کے معجزے کی طرح تھا، حضرت عیسیٰ نے بھی فرمایا تھا وَأَنْبِئِكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدْخُرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ کہنے لگے یہ کام تو عیسیٰ خبریں بتانے والوں اور کانہوں کا ہے تم کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا۔ حضرت نے فرمایا، میں کاہن نہیں ہوں بلکہ ذٰلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ط

یہ بتا دینا اس علم کی وجہ سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے یعنی میرے رب نے قطعی، یقینی وحی کے ذریعے سے مجھے یہ باتیں بتادی ہیں یہ علم عطا فرمایا ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ جو خواب تم دونوں نے مجھ سے بیان کئے ان کی تعبیر میں تمہارے

گھروں سے مقررہ کھانا آنے سے پہلے بتادوں گا اور یہ تعبیر الہام اور وحی کے ذریعے سے اللہ نے مجھے بتادی ہے نہ اس کا تعلق نجوم سے ہے اور نہ کہانت سے۔

بیضاوی نے لکھا ہے دونوں قیدیوں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حضرت یوسفؑ نے ان کو توحید کی صراطِ مستقیم اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہی۔ انبیاء اور انبیاء کے جانشینوں کی ہدایت و دعوت کا طریقہ ہی یہ ہے، آپ نے پہلے کچھ غیبی اطلاع بطورِ معجزہ دی تاکہ دعوتِ توحید اور تعبیر خواب کی سچائی ان کے دلوں میں جم جائے۔

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۷﴾

جو لوگ اللہ کو واحد نہیں مانتے اور آخرت کا انکار خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں ان کا دین تو میں نے قطعاً اختیار ہی نہیں کیا ہے۔ یہ مذکورہ جملہ کی علت ہے یعنی میرے رب نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے کیونکہ میں نے کافروں کا دین اختیار ہی نہیں کیا ہے۔

اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی اختیار کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہی تَرَكَتُ سے الگ مستقل کلام ہو۔ جو دعوت کی تمہید اور خانوادہ نبوت سے اپنے کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے فرمایا ہوتا کہ وہ دونوں قیدی رغبت سے سنیں اور آپ کے بیان کا اعتبار کریں۔ اسی جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی جگہ کسی عالم کے مرتبے سے لوگ واقف نہ ہوں اور وہ اپنی دعوت پھیلائی چاہے تو اگر وہ اپنے اوصاف کسی قدر بیان کر دے تاکہ اس کی بات کی وقعت پیدا ہو جائے تو ناجائز نہیں اس تدبیر سے لوگوں کو اس کے علم سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ یہ بات خود ستائی کے ذیل میں نہیں آتی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے انبیاء کو تو تحدیثِ نعمت کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا ہے وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

جن اولیاء نے اپنے مراتبِ قرب اور مدارجِ فوز کا کسی قدر ذکر کیا ہے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی یا حضرت شیخ عالم سید الاولیاء محی الدین عبدالقادر جیلانی۔ فسوس بعض لوگ نادانی یا حسد کی وجہ سے ان پر طعن کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بات خود ستائی میں داخل نہیں (بلکہ تحدیثِ نعمت ہے)۔

ہمارے (گروہ انبیاء) کے لئے جائز اور ممکن نہیں کہ

مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ عَظِيمٍ

اللہ کے ساتھ (اس کی ذات و صفات میں) کسی چیز کو شریک کریں۔ کیونکہ توحید ہماری فطرت ہے اور اللہ نے شرک سے ہماری حفاظت کی ہے۔

ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۱۸﴾

یہ (نعمتِ توحید و علم) ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ (ہم پر براہِ راست وحی کے ذریعے سے اور دوسرے لوگوں پر ہماری بعثت و رسالت کے ذریعے سے اور توفیقِ ثبات ادا کرنے کے سبب سے) لیکن اکثر لوگ (یعنی امتِ دعوت) اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے اور متنبہ نہیں ہوتے کتراتے ہیں۔

یہ مطلب ہے کہ یہ (توحید و علم) اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے جو ہم پر بھی ہے اور دوسرے لوگوں پر بھی۔ کہ اس نے روشن دلائل اور کھلی نشانیاں قائم کر دیں مگر اکثر لوگ ان آیاتِ قدرت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور اللہ کی قائم کردہ نشانیوں سے استدلال نہیں کرتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس نعمت کی کوئی قدر ہی نہیں اور وہ کافرِ نعمت ہیں شکر گزار نہیں ہیں۔ آئندہ آیت میں حضرت نے جیل خانہ والوں کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا۔

يٰصَاحِبِ السِّجْنِ اءَا رَبَّابٌ مُّنتَفِرٍ قُوْنَ خَيْرًا اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۹﴾

اے جیل کے ساتھیو! کیا متعدد و متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ مُتَفَرِّقُوْنَ مختلف، متعدد جو عاجز اور ممکن ہونے میں ایک جیسے ہیں (سب عاجز اور سب ممکن، معدوم الاصل، فنا پذیر ہیں) خواہ سونے چاندی لوہے پتھر وغیرہ کی مورتیاں

ہوں یا ملائکہ جن انسان وغیرہ ہوں۔ الواحد اپنی ذات و صفات میں اکیلا، بے ہمتا، بے مثال، نہ اس کی ذات و صفات میں کوئی اس جیسا ہے نہ افعال میں۔ القہار سب پر غالب جس کا کوئی مقابل اور مقادیم نہیں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَأَبَاءُكُمْ

تم لوگ خدا کو چھوڑ کر چند بے حقیقت ناموں کی ہی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔

اسماء سے مراد ہے وہ چیز جو الوہیت کے معنی سے خالی ہیں۔ سَمَّيْتُمْ کا دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی جن کا نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے اللہ اور رب رکھ چھوڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ایسے اسماء کی پوجا کرتے ہو جن کا کوئی واقعی وجود نہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ بتوں میں حلول کئے ہوئے ہیں یا مجرّد اور (مادی دنیا سے) الگ ہیں۔

مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ
اللہ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی یعنی ان کے وجود یا ان کے مستحق الوہیت ہونے کی کوئی دلیل کہیں موجود نہیں۔ جب کہ اللہ کی ہستی اور اس کے استحقاق الوہیت کے بکثرت دلائل و براہین موجود ہیں اور اللہ نے اپنے انبیاء اور پیغمبروں پر آیات توحید و معبودیت نازل کر دی ہیں۔

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ
اور حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو، یعنی عبادت کرنے کا حکم تو صرف اللہ کے لئے ہے وہ واجب الوجود بالذات ہے ہر چیز کا خالق اور موجد (عدم سے وجود میں لانے والا) ہے وہی منعم، مالک، ہر چیز پر غالب اور نفع و ضرر پہنچانے والا ہے اس کے سوا نہ کوئی مالک اور قاہر ہے نہ کسی کے ہاتھ میں حقیقت کسی کا نفع و ضرر ہے لہذا وہی بالذات مستحق عبادت ہے اگر کسی دوسرے کی پوجا جائز ہوتی تو اسی کے حکم سے اس کا جواز ہو سکتا تھا مگر اس نے پیغمبروں کی زبانی حکم دے دیا ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيُّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾
یہی (توحید کا) سیدھا (ثابت شدہ) طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یہی ثابت شدہ دین ہے دلائل اور براہین اسی کو ثابت کر رہے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے اور جہالت میں بھٹکے پھرتے ہیں۔

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ کا یہ بیان ترتیبی دعوت توحید اور تدریجی اظہار ثبوت ہے اول آپ نے قیدیوں کو مخاطب کر کے توحید اللہ کی تعدد آیات پر برتری ظاہر فرمائی پھر دلیل کے ساتھ بیان کیا کہ جن کو تم اللہ کہتے ہو اور جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ معبود ہونے کے مستحق نہیں کیونکہ استحقاق عبادت یا ذاتی ہو گا یا بالغیر اور اللہ کے سوا کسی اور کو نہ معبودیت کا استحقاق بالذات ہے نہ خدا کا عطا کردہ اس کی آپ نے پُر زور صراحت کر دی کہ دین مستقیم اور واقعی حق بات یہی ہے، یہی تقاضہ عقل و علم ہے اس کے سوا ہر بات فہم و دانش کے خلاف ہے۔ اس سے آگے آپ نے خواب کی تعبیر دی اور فرمایا

يُصَابِحِي السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمْ فَسَيُقْتَلُ وَآخَرُكُمْ فَيُصَلَّبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ سَرَائِسِهِ

اے جیل خانہ کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک (یعنی ساتی) تو اپنے آقا (یعنی بادشاہ) کو شراب پلانے گا اور دوسرے (یعنی باورچی) کو صلیب دی جائے گی اور پرندے اس کے سر کو (نوح نوح کر) کھائیں گے۔ انگور کے تین خوشوں سے تین روز کی طرف اشارہ ہے یعنی جیل خانہ کے اندر تین روز رہے گا، تین روز کے بعد بادشاہ اس کو طلب کرے گا اور سابق عہد پر دوبارہ مقرر کر دے گا اور تین ٹوکریوں سے بھی تین دن کی طرف اشارہ ہے یعنی باورچی جیل خانہ میں تین روز رہے گا۔ تین روز کے بعد جیل خانہ سے نکلوا کر اس کو صلیب پر چڑھا دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں اس تعبیر کا قرینہ شاید یہ ہو کہ باورچی نے کھانے میں واقعی زہر ملا دیا تھا اور ساتی بے قصور تھا (اس لئے بادشاہ کا صحیح فیصلہ یہی ہو سکتا تھا کہ باورچی کو صلیب دے دے اور ساتی کو رہا کر کے سابق عہدے پر فائز کر دے)۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت یوسفؑ کا بیان سن کر دونوں قیدی کہنے لگے ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا

تھا، محض دل لگی کر رہے تھے اس پر حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

قُضِيَ الْأَمْرَ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ﴿٢١﴾

یعنی جس بات کو تم دریافت کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا۔ تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ قضائے خداوندی ویسی ہی ہو چکی ہے جیسا میں نے بیان کر دیا تم دونوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اور جس شخص کے

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ ذ

رہا ہو جانے کا یوسفؑ کو یقین تھا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا۔ اور کہہ دینا کہ جیل خانہ کے اندر ایک غلام قیدی ہے جس کو بلا تصور ظلم سے قید کر دیا گیا ہے اور اس کے احوال اس طرح ہیں۔

ظن کا فاعل اگر یوسفؑ کو قرار دیا جائے تو ظن کا معنی یقین ہو گا کیونکہ ساقی کے رہا ہونے کا آپ کو یقین تھا آپ کا قول قُضِيَ الْأَمْرَ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ اس پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظن کی ضمیر ساقی کی طرف لوٹ رہی ہے اس وقت ظن کا معنی ہو گا غالب گمان یعنی یوسفؑ نے اس شخص سے جس کو اپنی رہائی کا غالب گمان ہو گیا تھا کہا

فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ

پھر اس کو شیطان نے اپنے آقا کا ذکر یعنی آقا کے سامنے یوسفؑ کا تذکرہ کرنا بھلا دیا۔ رب سے مراد ہے بادشاہ، حضرت ابن عباسؓ اور اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے (انساء میں ہضمیر اور ربہ میں ہضمیر یوسفؑ کی طرف راجع ہے یعنی) یوسفؑ کو شیطان نے اللہ کی یاد بھلا دی کہ انہوں نے مخلوق سے مدد کی خواہش کی، اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے

مصیبت دور کرنے کی درخواست کی اور یوسفؑ کی یہ غفلت شیطان کی اثر اندازی سے پیدا ہوئی (ان کے مقام کا تقاضہ تھا کہ وہ کسی شخص سے سفارش کی بھی تمنا نہ کرتے مقام نبوت و معرفت غیر اللہ سے ظاہری اور مجازی مدد لینے سے بھی انکار کرتا ہے۔ مترجم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم کرے اگر وہ ایک انسان سے اذکرنی عند ربک نہ کہتے تو جیل کے اندر اتنی طویل مدت نہ رہنا پڑتا، رواہ ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابن مردويه

پس وہ جیل خانہ میں چند سال رہے۔ قنادہ نے کہا بضع کا

فَكَذَّبَ فِي السِّجْنِ بِبُضْعٍ سِنِينَ ﴿٢٢﴾

اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے۔ بضع کا معنی ہے کاٹنا۔ مجاہد نے تین سے سات تک کی مدت بیان کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے یوسفؑ قید خانہ میں سات سال رہے۔ کلبی نے کہا پانچ برس پہلے رہ چکے تھے اور مزید سات برس اذکرنی عند ربک کہنے کے بعد رہے، کل بارہ سال رہے۔

میں کہتا ہوں آیت ”دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانٍ“ بتا رہی ہے کہ ساقی اور باورچی آپ کے ساتھ ہی قید ہوئے تھے اور جب وہ دونوں قید خانہ میں تین روز رہے تو یوسفؑ کا ان سے پہلے قید خانہ میں پانچ سال رہنا کیسے ہو سکتا ہے (شاید حضرت مفسر

قدس سرہ نے غور نہیں فرمایا کہ باورچی اور ساقی کی کل مدت قید تین روز نہیں ہوئی بلکہ عرض خواب اور تعبیر کے بعد تین روز سے ممکن ہے کہ عرض خواب سے پہلے پانچ سال قید میں گزر گئے ہوں فوراً جیل خانہ میں داخل ہوتے ہی تو دعوتی تقریریں اور تبلیغ ایمانی اور عام قیدیوں سے موائست اور ہر ایک کی خدمت اور اخلاق کریمہ کا اظہار ممکن نہیں جیسا کہ حضرت مفسر نے سابق

روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے نہ داخل ہوتے ہی عرض خواب کا امکان ہے اس لئے کلبی کا قول ضعیف روایت کی بنا پر خواہ ضعیف ہو مگر روایت کے خلاف نہیں۔ مترجم)

مالک بن دینار نے کہا جب یوسفؑ نے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو (اللہ کی طرف سے) کہا گیا یوسفؑ مجھے چھوڑ کر تو نے دوسرے کو اپنا وکیل (ذمہ دار) بنالیا اب میں ضرور تیری قید طویل کر دوں گا، حضرت یوسفؑ رونے لگے اور عرض کیا میرے رب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر فراموشی طاری کر دی اور میں نے بے سمجھے ایک بات کہہ دی

آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

حسن بصریؒ نے کہا حضرت جبریلؑ قید خانہ کے اندر حضرت یوسفؑ کے پاس آئے آپ نے ان کو پہچان لیا اور فرمایا کیا

اِخَا الْمُنْذِرِينَ (اللہ کے عذاب سے ہلاک ہو جانے سے ڈرانے والوں کے سردار) میں آپ کو آج ان گناہ گاروں میں کیسے دیکھ رہا ہوں، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے پاک باپ دادا کے پاک بیٹے اللہ رب العالمین نے تم کو سلام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کیا تم کو شرم نہیں آئی کہ (میرے ہوتے) تم نے آدمیوں سے سفارش کی خواستگاری کی۔ تم ہے اپنی عزت کی میں تم کو مزید چند سال جیل خانہ میں رکھوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا اللہ اس حالت میں مجھ سے راضی ہوگا۔ حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا ہاں، حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو پھر مجھے قید میں رہنے کی پروا نہیں۔

کعب کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسفؑ سے کہا اللہ فرماتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا حضرت نے جواب دیا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے کنویں کی تکلیف سے کس نے نجات دی یوسفؑ نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے خواب کی تعبیر کس نے سکھائی۔ یوسفؑ نے کہا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے چھوٹے بڑے گناہ کا رخ کس نے تیری طرف سے پھیر دیا، یوسفؑ نے کہا اللہ نے جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے پھر تو نے اپنے جیسے آدمی سے کیسے سفارش کی درخواست کی۔

آئندہ وہ حدیث آئے گی جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک بات یوسفؑ سے نہ ہو جاتی کہ اللہ کے سوا دوسرے سے انہوں نے ازالہ مصیبت کی درخواست کی تو قید خانہ میں مزید رہنا نہ پڑتا۔

غرض جب سات سال گزرے اور حضرت یوسفؑ کی کشائش کا وقت قریب آ گیا تو مصر کے شاہ اعظم یعنی ریمان بن ولید نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے وہ دہشت زدہ ہو گیا اس نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں دریا سے برآمد ہوئیں اور ان کے پیچھے سات گائیں اور دریا سے نکلیں جو نہایت ڈبلی تھیں، پھر ڈبلی گائیں موٹی گائیوں کو نگل گئیں اور موٹی گائیں ڈبلی گائیوں کے پیٹ میں گھس گئیں ان کا کوئی نشان بھی نہیں رہا۔ پھر (غلہ کی) سات سبز بالیاں دیکھیں جن میں دانہ پڑ چکا تھا اور سات خشک بالیاں دیکھیں جو کاٹنے کے قابل ہو گئی تھیں خشک بالیاں سبز بالیوں سے لپٹیں اور ان پر غالب آ گئیں یہاں تک کہ ان کی سبزی بالکل جاتی رہی۔ بادشاہ نے جادو گروں کو، کاہنوں کو، اہل دانش و فہم کو اور خواب کی تعبیر دینے والوں کو جمع کیا اور ان سے اپنا خواب بیان کیا، یہی تذکرہ آیات ذیل میں اللہ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُذُبَاتٍ خُضِرٌ وَأَخْرَبٌ يَبْسُطُ
يَأْكُلُهَا الْمَلَائِكَةُ فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿۳۱﴾

اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات ڈبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور خشک بالیں ہیں اے درباری سردار! اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں کچھ دقیق جواب دو۔

عِجَافٌ: عِجَافٌ کی جمع نہیں ہے عِجَافٌ کی جمع عِجَافٌ آتی ہے لیکن سِمَانٌ کی لفظی اور وزنی مناسبت کی وجہ سے لفظ عِجَافٌ ذکر کیا۔

تعبیر کا معنی ہے مثالی صورتوں سے ان معانی کی طرف انتقال جن کی عالم مثال (عالم اشباح) میں یہی شکلیں ہیں۔ تعبیر عبور سے بنا ہے جس کا معنی ہے گزر جانا، عَبْرَتِ الرَّؤْيَا عِبْرَةُ الرَّؤْيَا تعبیراً سے زیادہ ثابت ہے۔

وَتَالُوْا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعُلَمَاءِ ﴿۳۲﴾
پریشان خیالات ہیں اور ایسے خوابوں کی تعبیر سے واقف نہیں، اضغاث أحلام گڑبڑ جھوٹے خواب۔ اضغاث: ضغث کی جمع ہے۔ ضغث کا معنی ہے گھاس وغیرہ کا گڈا، مجازاً جھوٹا خواب مراد لیا گیا ہے۔ حلم خواب۔ اس کا فعل باب نصر سے آتا ہے۔ چونکہ خواب میں مختلف چیزیں جمع تھیں اس لئے اضغاث کو بصیغہ جمع ذکر کیا، بتأویل الاحلام میں أحلام سے

مراد ہیں جھوٹے خواب۔ یعنی ان خوابوں کی ہماری پاس کوئی تعبیر نہیں، تعبیر تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔ تعبیر نہ جاننے کا دوسرا عذر انہوں نے پیش کیا (اول عذر اَضْعَاثِ اَحْلَامِ كَالْفِظِ كَمَا كَرَّاهُوا لِي لِيَاكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهِمْ يَوْمَ رَبِّهِمْ)۔
 وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمْ مَا وَاذَكُرْ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنْبِئُكُمْ بِتَاوِيلِهِ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۷۵﴾
 دونوں قیدیوں میں سے جس شخص نے (قید اور الزام قتل سے رہائی پائی تھی اور ایک مدت کے بعد یوسفؑ کی یاد اس کو ہوئی اس نے کہا میں اس کی تعبیر تم کو بتاؤں گا مجھے جیل خانہ میں یوسفؑ کے پاس بھیج دو۔ یعنی ساتی نے کہا جس کو یوسفؑ کی اور آپ کے قول اذکرنتی عند ربک کی یاد مدت کے بعد ہوئی۔ امتد معنی جماعت اس جگہ مراد مجموعہ ایام یعنی ایک طویل مدت سات برس کا زمانہ۔

بعوی نے لکھا ہے کہ ساتی نے بادشاہ کے سامنے دوزانوں ہو کر کہا جیل خانہ میں ایک آدمی ہے جو خواب کی تعبیر دیا کرتا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے دیجئے۔ بادشاہ نے اس کو یوسفؑ کے پاس بھیج دیا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قید خانہ شہر کے اندر نہیں تھا۔ جب ساتی یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

اے یوسفؑ! اے بڑے سچے (آدمی) ساتی نے یوسفؑ اس لئے کہا کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھی کے بارے میں آپ کی سچی تعبیر کا تجربہ کر چکا تھا اور آپ کی صداقت کو جان چکا تھا۔

اَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خَضِيٍّ وَّاٰخِرَ لَيْسَتِ
 آپ ہم لوگوں کو اس خواب کا (جواب) یعنی تعبیر دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات بالیں خشک ہیں اور خشک بالوں نے زپٹ کر ہری بالوں کو بھی خشک کر دیا مطلب یہ کہ یہ خواب بادشاہ نے دیکھا ہے اور آپ کے پاس بھیجا ہے اس کی تعبیر دیجئے۔

تاکہ میں ان لوگوں کے (یعنی بادشاہ اور اہل دربار) کے
 لَعَلِّي اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۶﴾
 پاس لوٹ کر جاؤں (اور خواب کی تعبیر بتا دوں) تاکہ ان کو علم ہو جائے۔

اس شخص نے لعلی شاید کلمہ شک کا استعمال کیا اور قطعی یقین کا لفظ نہیں کہا کیوں کہ خواب ہی ایسا تھا کہ لوگ اس کی تعبیر سے عاجز ہو گئے تھے اور بادشاہ دہشت زدہ ہو گیا تھا گویا بڑا خوفناک خواب تھا نتیجہ پر پہنچنے کا یقین نہ تھا۔ لعلہم یعلمون کا مطلب یہ ہے کہ خواب کی تعبیر سن کر شاید لوگوں کو آپ کا مرتبہ معلوم ہو جائے اور وہ آپ کے کمال علمی کے متعارف ہو جائیں۔ اس جگہ بھی لعلی کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کو اس بات میں ترود تھا کہ لوگ مانیں گے بھی یا نہیں۔ اہل فضل کے فضائل کو دیکھ کر بھی متنبہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ حضرت یوسفؑ کے کمالات اور طہارت و عفت کو دیکھ کر بھی عزیز مصر نے آپ کی فضیلت کا اعتراف نہیں کیا اور جیل میں ڈال دیا۔

یوسفؑ نے کہا سات موٹی گائیں اور سبز بالیں تو آرزانی اور کثرت پیداوار کے سات سال ہیں اور سات دبلی
 قَالَ
 گائیں اور خشک بالیں قحط کے سات برس ہیں۔

تَرْسَعُونَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَابَّاهُ
 تم سات سال متواتر غلہ بونا۔ داب معمول، عادت۔ بعض علماء کے نزدیک
 داب سے مراد ہے انتہائی محنت اور کوشش۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا یہ جملہ اگرچہ خبر یہ ہے مگر مقصد حکم دینا ہے (امر بصورت خبر بھی کبھی آتا ہے)۔

پھر جو (فصل) کاٹو اس کو بالیوں میں ہی رہنے دینا (تاکہ گھن نہ لگ جائے)
 فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوْهُ فِي سُنْبُلَيْهٖ
 مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے (اس کو بالیوں سے نکال لینا) یعنی

پیداوار کے سات سالوں میں جتنا غلہ کھانے میں صرف ہو وہ نکال لینا۔
 اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۷﴾

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ مِائَاتٌ أَدْبَارًا كُنَّ مِثْلَ قَدَامَتُمْ لَهَا

پھر اس کے بعد سات برس بہت سخت آئیں گے کہ جو تم نے ان کے لئے پہلے سے جمع کر رکھا ہو گا اس کو کھا جائیں گے یعنی ان سالوں میں لوگ پچھلا اندوختہ کھا جائیں گے خواب کے ساتھ تعبیر کو مطابق بنانے کے لئے کھانے کی نسبت قحط کے سالوں کی طرف کی، ورنہ کھانے والے لوگ ہوتے ہیں سال نہیں کھایا کرتے۔

الْأَقْلِيلَ لِأَنَّهَا تُحْصِنُونَ ﴿۳۸﴾ مگر تھوڑا سا حصہ (کھانے سے محفوظ رکھا) جو بیج کے لئے تو بچا رکھو گے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿۳۹﴾ پھر اس سال کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اس میں لوگ پھلوں کے عرق نچوڑیں گے اور شرابیں بنائیں گے۔

يُغَاثُ، غَيْثٌ سے مشتق ہے غَيْثٌ کا معنی بارش ہوگی یا غَوْتٌ سے مشتق ہے غَوْتٌ فریادری یعنی لوگوں کی واویلا اور فریاد قبول کی جائے گی) اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ مترجم (يَعْصِرُونَ وہ نچوڑیں گے یعنی انگور زیتون طرح طرح کے پھل اور رتل (سر سوں اور دوسرے روغن دانہ سے) نچوڑیں گے مطلب یہ کہ سر سبزی پیداوار اور آسائش کا سال ہوگا۔ ابو عبیدہ نے تَعْصِرُونَ بصیغۃ خطاب بضم صاد پڑھا ہے اس کا مصدر عصر ہے جس کا معنی ہے نجات پانا یعنی تم تکلیف اور کال سے نجات پا لو گے۔

حضرت یوسفؑ نے اول سات موٹی اور دہلی گایوں اور سات سبز اور سات خشک بالیوں کی مراد بیان کی اور دہلی گایوں کے موٹی گایوں کو کھا جانے اور خشک بالیوں کے سبز بالوں سے لپٹ کر ان کو بھی خشک کر دینے کا تعبیری مطلب بیان کیا پھر کال کے ختم ہونے اور آرزانی کا سال آنے کی بشارت دی (بشارت کا تعلق اگرچہ خواب کی تعبیر سے نہ تھا مگر آپ نے بشارت اس لئے دی) کہ قحط کے سالوں کی تعداد پیداوار کے سالوں سے نہ بڑھ جائے۔ (اور اس طرح تعبیر میں غلطی ہو جائے کیونکہ دہلی گایوں اور خشک بالوں کی تعداد بھی سات ہی تھی اگر پندرہواں سال بھی قحط کا ہوتا تو سات سے ایک عدد بڑھ جاتا) بیضاوی نے لکھا ہے شاید آپ کو پیداوار اور آرزانی کا سال آنے کی اطلاع وحی سے ہو گئی ہو یا اپنی فراست ایمانی سے سمجھ لیا ہو کہ اللہ کی دستور اور ضابطہ یہی ہے کہ تنگی کے بعد فراخی عطا فرماتا ہے اور اس لئے کال کے بعد پیداوار کا سال ضرور آئے گا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّي نُبِيٌّ اور بادشاہ نے کہا میرے پاس اس کو لاؤ یعنی ساقی خواب کی تعبیر لے کر جب بادشاہ کے پاس پہنچا اور وہ سمجھ گیا کہ تعبیر یقیناً صحیح ہے اور ایسا ضرور ہو گا اور اس بات سے اس نے یوسفؑ کی بزرگی کا اندازہ کر لیا تو آپ کو بلوایا۔

فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ پس جب بادشاہ کا قاصد یوسفؑ کے پاس پہنچا اور اس نے کہا بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے تو حضرت نے اس وقت تک اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا جب تک آپ پر سے بد چلنی کی تہمت دور نہ ہو جائے اور سب لوگ آپ کی پاک دامنی کا اقرار نہ کر لیں۔

قَالَ ارْجِعْ اِلَى رَبِّكَ فَسَلَّهُ مَا بِالنَّسْوَةِ الَّتِي قَطَعْنَ آيِدِي بِصَبْحٍ کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا کیا حال ہے کچھ تم کو بھی پتہ ہے کیا واقعہ ہوا تھا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو اپنے اوپر سے تہمت کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً اگر پیشوا اور مقتدا ہو (تو اس کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ لگائی گئی تہمت سے اپنی برأت ثابت کرے۔ آپ نے عزیز کی بیوی کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ایسا محض ادب اور احترام کے پیش نظر کیا ورنہ اصل مجرم تو وہی تھی۔ اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں نیز ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس خواب کی تعبیر لینے آدمی پہنچا (اور انہوں نے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک جیل خانے سے باہر نہ آجاتا ایسا نہ کرتا۔ اور ان کے صبر اور کرم پر مجھے (اس لئے بھی) تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس رہائی کا حکم لے کر آدمی پہنچا اور انہوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور اپنا عذر بیان کر دیا اگر (میں ان کی جگہ) ہوتا تو فوراً دروازے کی طرف دوڑ پڑتا۔ اگر ایک بات یوسف کے منہ سے نہ نکل جاتی تو وہ قید خانہ میں مزید سالوں کے لئے نہ رہتے انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں سے مصیبت دور کرنے کی خواہش کی۔

عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی تفسیروں میں عکرمہ کی روایت سے مرسل نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یوسف اور ان کے کرم و صبر پر تعجب ہے اللہ ان کو بخشے، جب ان سے موٹی اور دہلی گایوں کی تعبیر پوچھی گئی (تو انہوں نے بغیر شرط پیش کئے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک قید سے باہر نکلنے کی شرط نہ کر لیتا تعبیر نہ بتاتا اور مجھے تعجب ہے کہ جب قاصد بادشاہ کا پیام طلب لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور اتنی مدت مجھے جیل خانہ کے اندر رہنا پڑتا جتنی مدت وہ رہے تو میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا اور آگے آگے دروازے پر پہنچ جاتا اور عذر معذرت کا طلب گار نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ صاحبِ حلم اور بڑے بردبار تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصر آئی ہے۔

فائدہ :- رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف کے حال پر تعجب کیا اور فرمایا میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا۔ حقیقت میں یہ قول آپ کے کمالِ نزول پر دلالت کر رہا ہے۔ (بہت پیغمبروں کو بلکہ سبھی کو کمالِ عروج تو حاصل تھا مگر کمالِ نزول کے مرتبے پر فائز کم ہی پیغمبر ہوئے ہیں جن میں سے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ مترجم) کمالِ نزول پر ہی دین کی عمومی اشاعت و قبول اور تاثیر و تکمیل (اور متبعین کی کثرت) موقوف ہے، حضرت مجددِ قدس سرہ نے اس بحث کی پوری تفسیح اپنے مکتوبات میں کی ہے یہ اتنا بار یک نکتہ ہے کہ اکثر کالمین کی رسائی و فہم سے بھی خارج ہے ناقصوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے جب کہ انہوں نے مجھ سے
 اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِيْهِمْ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾
 کہا تھا کہ اپنی مالکہ کا کہاں مان لو یا مجھے اپنی طرف بہکا کر مائل کرنا چاہا تھا۔ اس جملہ میں ان عورتوں کے مکر کی بڑائی کا اظہار کیا ہے اور علمِ الہی کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور عورتوں کی تمہت سے اپنی پاک دامن کی اظہار کیا ہے اور عورتوں کو ان کی مکاری پر انجام بد کی دھمکی بھی دی ہے یہ سارا مضمون اس ایک فقرہ سے مترجم ہو رہا ہے یوسف کے پاس سے جواب لے کر قاصد بادشاہ کے پاس پہنچا اور بادشاہ نے ان عورتوں کو اور عزیز کی بیوی کو بلوایا اور

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ
 کہا تمہارا کیا واقعہ ہے جواب دو۔ خطب اس امر کو کہتے ہیں جس کا خطاب کیا جاسکے۔ یعنی صاحبِ واقعہ سے پوچھا جاسکے۔ بادشاہ نے سب عورتوں سے خطاب کیا، اس سے مراد یا تو صرف عزیز کی بیوی سے خطاب کرنا تھا یا سب عورتیں مخاطب تھیں کیونکہ سب نے یوسف کو مکر کے ساتھ اپنی طرف مائل کرنا چاہا سب نے زلیخا کا کہانے کا مشورہ دیا تھا۔

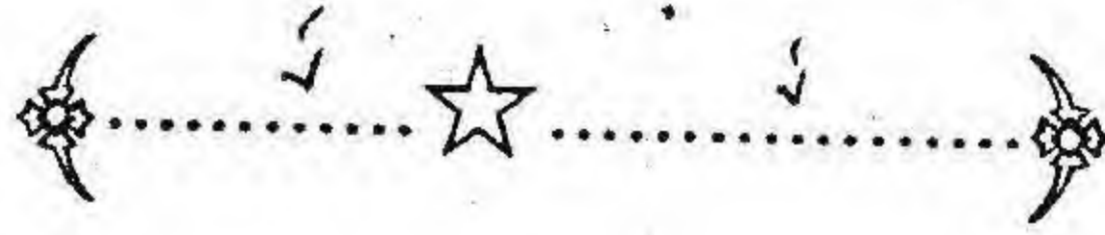
اِذْ سَاوَدَّتْ يُّوسُفَ عَنْ نَّفْسِهِ
 جب کہ یوسف کو تم نے پھسلا یا تھا یعنی تم میں سے کسی نے یوسف کو اپنی طرف مائل ہوتے پایا جب کہ تم نے ان کو بہکانے کی سازش کی تھی۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ
 انہوں نے کہا پاکی ہے اللہ کے لئے اور تعجب ہے کہ اللہ نے یوسف کو کیسا پاک دامن پیدا کیا ہے۔
 مَا عَلِمْنَا عَلَيْهٖ مِنْ سُوْءٍ ط
 ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی۔ سُوْء سے مراد ہے گناہ اور خیانت۔ کہا گیا ہے کہ ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو سخت سُست کہا یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ عزیز کی بیوی کو جب اندیشہ ہوا کہ یہ عورتیں میرے خلاف شہادت دیں گی تو اس نے خود اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور

قَالَتْ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ اِنَّ حَصْحَصَ الْحَقِّ اَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾
 عزیز کی بیوی نے کہا اب تو حق بات سب پر ظاہر ہو ہی گئی میں نے ہی اپنے مطلب کے لئے ان کو
 پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ ہی سچے ہیں۔ حَصْحَصُ ظاہر ہو گیا، حَصْحَصُ الشَّعْرُ بال گر گئے اور جلد ظاہر ہو گئی۔ یا حَصْحَصُ کا
 معنی ہے ثابت ہو گیا، ٹھہر گیا، حَصْحَصُ البعير اونٹ اپنی جگہ جم کر بیٹھ گیا۔ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی وہ اس بات میں سچے
 ہیں کہ میں نے ان کو پھسلایا تھا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخْنُهٗ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخٰٓئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾
 یہ باتیں یعنی قاصد کو جواب دے دینا اس کے ساتھ نہ جانا میں نے اس لئے کہیں کہ اس کو (یعنی عزیز کو) یقین کے ساتھ معلوم
 ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی غیر موجودگی میں (اس کی آبرو میں) کوئی خیانت نہیں کی اور یہ بھی (معلوم ہو جائے) کہ
 اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

بِالْغَيْبِ پس پشت جب کہ میں اس کے اور وہ میرے سامنے موجود نہ تھا۔ یا غیب سے مراد ہے پوشیدہ مقام، بند
 کمروں کے اندر۔ لَا يَهْدِيْ تافذ نہیں کرتا، درست نہیں ہونے دیتا بلکہ حق کو ظاہر کرتا ہے خواہ کچھ مدت کے بعد ہی ہو۔ یا یہ
 مطلب ہے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو ان کے مکر کے سبب ہدایت نہیں کرتا۔ الْخٰٓئِنِيْنَ اصل میں لَا يَهْدِيْ کا مفعول تھا
 مگر اس کی جگہ کَيْد کو مفعول قرار دینے سے کلام میں زور آ گیا۔ اس میں زلیخا کی خیانت کاری پر طنز اور اپنی امانت کا قوت کے
 ساتھ اظہار ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا۔



تیرھواں پارہ شروع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَمَا اَبْرئِ نَفْسِیْ اور میں (بذات خود) اپنے نفس کو پاک نہیں قرار دیتا۔ اس کلام میں تشبیہ ہے اس امر پر کہ اس سے میری مراد اپنی پاکیزگی کا اظہار اور بر خود غرور نہیں بلکہ اللہ کے انعام کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا اور عصمت کی توفیق دی اور بادشاہ کو میرا پیرو بنایا۔ ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب یوسفؑ نے کہا میرے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی آبرو میں اس کی غیر موجودگی میں کوئی دست درازی نہیں کی تو جبرئیلؑ نے کہا (کیا اس وقت بھی آپ نے خیانت نہ کی تھی) جب گناہ کا ارادہ کیا تھا اس پر یوسفؑ نے کہا وَمَا اَبْرئِ نَفْسِیْ بیضاوی نے حدیث حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً نقل کی ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَا تَمَارَاةٌ بِالْشَّرِّ

کیونکہ نفس تو (از خود) بڑی ہی بات بتاتا ہے۔ نفس سے مراد ہے نفس حیوانی جو عناصر اربعہ (مادیہ) سے پیدا ہوتا ہے عالم امر کے لطائف میں سے قلب اور روح ہے قلب اور روح کا حامل یہی نفس ہے۔ چونکہ اس نفس کا تولیدی مرکز عناصر اربعہ مادیہ ہیں اس لئے اس کا باطن میلان (حیوانی) خواہشات اور اخلاق رذیلہ کی جانب ہے غضب اور غرور عنصر نار کا مقتضی ہے۔ کینگی اور دناوت کا اقتضاء زمین کا ہے نیرنگی اور صبر کا فقدان پانی کی خصوصیت ہے دل لگی اور لہو و لعب ہوا کا خاص کرشمہ ہے۔

سوائے اس کے جس پر میرا رحم کرے۔

اَلَا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط
مَا رَحِمَ میں مَا بمعنی مَنْ ہے جیسے آیت مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ میں مَا بمعنی مَنْ ہے۔ یعنی جس پر میرا رحم کرے اور اس کو بچالے تو وہ نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اس کا مقابلہ کرتا ہے اسی جہاں نفس کی وجہ سے اس کو ملائکہ پر برتری حاصل ہو جاتی ہے۔

یا وقت رَحْمَةٍ رَتِّیْ مراد ہے اس وقت ما مصدریہ ہو گا یعنی جس وقت انسان اللہ کی رحمت کو پالیتا ہے خواہ اللہ کی طرف سے براہ راست انتخاب کی وجہ سے یا انبیاء کی پیروی کے ذریعے سے تو اللہ کی طرف سے پاکیزگی عطا ہونے کی وجہ سے اس کا نفس پاک ہو جاتا ہے فرمایا ہے فَلَا تَزْكُوا اَنْفُسَكُمْ تَمَّ اَنْفُسِیْ کُوْا کُوْا نَهْ قَرَار دُو۔ دوسری آیت ہے بَلِ اللّٰهُ یُزْکِیْ مَنْ یَّشَاءُ بَلْکَ اللّٰهُ جَس کُو چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے ایسا نفس اللہ کی رضامندی پر راضی ہو جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کو خطاب ہوتا ہے اَلِیْ رَبِّکِ رَاْضِیَةً مَّرْضِیَةً فَاَدْخَلْیْ فِیْ عِبَادِیْ اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ تو اللہ سے خوش اللہ تجھ سے خوش اور میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا۔ اس حالت میں اللہ نفس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور نیکیوں اور بھلائیوں میں تمام لطائف امر کا امام بنا دیتا ہے اور جن صفات کی تجلی کو عالم امر کے خالص لطائف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان صفات کی تجلی کا حامل یہ نفس ہو جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اَلَا مَا رَحِمَ میں استثناء منقطع ہے الا کا معنی ہے لکن یعنی نفس بدی کا راستہ بتاتا ہے لیکن میرے رب کی رحمت بدی کو اس کی طرف سے پھر دیتی ہے اور بدی کو نیکی سے بدل دیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں آیتیں زینجا کا مقولہ ہیں اور مَنْ رَحِمَ سے مراد ہیں حضرت یوسفؑ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس قول پر آیات کا مطلب اس طرح ہو گا زینجا نے کہا میں نے یوسفؑ کی بے گناہی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس لئے کہا کہ یوسفؑ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی خیانت نہیں کی، یعنی اس کے غیر حاضر ہونے کی حالت میں بھی اس پر دروغ تراشی نہیں کی اور جب مجھ سے اس کے

متعلق پوچھا گیا میں نے سچی بات ہی کہہ دی اور میں خیانت سے اپنے نفس کو بالکل پاک نہیں کہتی کیونکہ اتنی خیانت میں نے ضرور کی کہ اس کو مہم کیا اور عزیز سے کہا ماجز آء من اراد باہلک سوء الا ان یسجن۔ پھر میں نے ہی اس کو قید بھی کر لیا۔ گویا اس قول سے اس نے اپنی پچھلی حرکت کا عذر پیش کرنا چاہا اور کہا نفس تو برائی کاراستہ بتانے والا ہے سوائے ان لوگوں کے جن پر میرا برحم کرے جیسے یوسف اور اس کی طرح دوسرے لوگ کہ اللہ نے اپنی رحمت سے اس کو گناہ سے بچالیا۔

ان رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۷﴾ بے شک میرا رب بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ نفس کے ارادے اور تصورات کے بخشنے والا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے، گناہ سے محفوظ رکھتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جو گناہگار اس سے معافی طلب کرے اس کو معاف کر دیتا ہے اور طالبِ رحم و مغفرت پر رحم کرتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اَتْتَوْنِي بِهٖ اَسْتَخْلِصُكَ لِنَفْسِي ﴿۵۸﴾ اور بادشاہ نے اہل دربار سے کہا ان کو میرے پاس لے آؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا۔

جب یوسف کی بے گناہی بادشاہ پر ظاہر ہو گئی اور آپ کے علم و امانت کا مرتبہ بھی اس کو معلوم ہو گیا تو اس نے یوسف کو طلب کیا اور کہا میں براہِ راست اپنے لئے ان کو رکھنا چاہتا ہوں (یعنی عزیز مصر یا کسی اور کی ماتحتی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ مترجم) حسب الحکم قاصد آپ کے پاس پہنچا اور کہا چلئے بادشاہ نے طلب کیا۔ عبدالحکم نے فتوح مصر میں بطریق کلبی بوساطت ابو صالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ قاصد نے یوسف کے پاس پہنچ کر گزارش کی اب قید خانہ کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیجئے اور بادشاہ کے پاس چلئے ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید عمی کی روایت سے بیان کیا کہ یوسف نے جب عزیز مصر کو دیکھا تو دعا کی الہی میں تجھ سے اس کی خیر کے بجائے تیری خیر کا طلب گار ہوں۔ اور اس کے شر سے تیرے غلبہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ بغوی کا بیان ہے آپ کھڑے ہو گے اور قیدیوں کے لئے دعا کی اے اللہ! نیکوں کے دلوں کو ان پر مہربان کر دے اور (شہر و ملک کی) خبریں ان پر پوشیدہ نہ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شہر کی خبروں سے وہاں کے قیدی بہت زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازہ پر یہ بات لکھ دی یہ زندوں کا قبرستان ہے، غموں کا گھر ہے، دوستوں کی آزمائش اور دشمنوں کی خوشی کا مقام ہے، پھر آپ نے قید خانہ کا میل کچیل دھویا، بدن صاف پاک کیا اور خوبصورت کپڑے پہن کر بادشاہ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے۔

وہب نے بیان کیا جب شاہی دروازے پر پہنچے تو فرمایا میرا رب میرے لئے کافی ہے دنیا سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ میرا رب میرے لئے کافی ہے، اپنی مخلوق سے بے احتیاج کر دینے والا ہے اس کی پناہ لینے والا غالب رہتا ہے اس کی شاہی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کے سامنے پہنچے تو دعا کی اے اللہ میں اس کی خیر کی بجائے تیری خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے اور دوسروں کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں، بادشاہ نے جب آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اس کو عربی میں سلام کیا بادشاہ نے کہا یہ کیا زبان ہے، فرمایا میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے، پھر آپ نے بادشاہ کو عبرانی زبان میں دعا دی، بادشاہ نے پوچھا یہ کونسی زبان ہے فرمایا یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ بادشاہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھا اگرچہ ستر زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا جس زبان میں بات کرتا تھا آپ اسی زبان میں جواب دیتے تھے، مگر عبرانی اور عربی مزید جانتے تھے جن سے بادشاہ واقف نہ تھا۔ حضرت یوسف کی اس وقت عمر تیس سال کی تھی اس نوجوانی میں آپ کے یہ کمالات دیکھ کر متحیر ہو گیا اور اپنے قریب بٹھایا۔

فَلَمَّا كَلَمَتْهُ قَالَتْ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ ﴿۵۹﴾ جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہیں بغوی نے لکھا ہے بادشاہ نے حضرت نے یوسف سے کہا میں اپنا خواب آپ کے منہ سے اپنے سامنے سنا چاہتا ہوں فرمایا بہت اچھا سینے۔ اے بادشاہ! آپ نے خواب میں دیکھا سات سفید رنگ کی خوبصورت گائیں نیل میں سے برآمد ہوئیں اور ساحل نیل سے نکل کر آپ کے سامنے آئیں ان کے تھن دودھ سے بھرے

ہوئے تھے اس کے بعد نیل کی کچھڑ سے سات دہلی گائیں برآمد ہوئیں جو بھوک تھیں ان کے پیٹ لگے ہوئے تھے ان کے پاس نہ دودھ تھا نہ تھن، ان کی داڑھیں تھیں اور کیلے (جیسے نوکیلے دانت) تھے، اور کتوں کے بچوں کی طرح بچے تھے اور درندوں کی ناک کی طرح ان کی ناکیں تھیں، درندوں کی طرح انہوں نے موٹی گایوں کو چیر پھاڑ ڈالا، کھال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، گوشت کھالیا، ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور میٹگنی کو چوس لیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر تعجب ہی کر رہے تھے کہ ایک ہی جڑ سے اناج کی سات سبز بالیں اور سات سیاہ (خشک) بالیں نمودار ہوئیں جڑ کے سوتے سب کے کچھڑ اور پانی کے اندر تھے آپ یہ تماشا دیکھ ہی رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے کہ جب جڑ ایک ہے اور سوتے سب کے پانی میں ہیں تو یہ سبز خوشہ دار اور وہ سوکھی سیاہ بالیں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔ یکا یک ایک ہوا چلی جس کی وجہ سے خشک بالیوں کے پتے جھڑ کر سبز خوشہ دار بالیوں پر گرے اور سبز بالیوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر سیاہ ہو گئیں یہ خواب دیکھ کر آپ بیدار ہو گئے اور دہشت زدہ ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا خدا کی قسم یہ خواب اگرچہ عجیب تھا مگر اس کی تعجب آفرینی اس بیان سے زیادہ نہیں جو میں نے آپ سے سنا۔ اے سچے انسان اب اس خواب کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان پیداوار کے سالوں میں آپ کاشت بہت زیادہ کرائیں اور پیدا شدہ غلہ کو مع ان کے درختوں اور بالیوں کے ذخیرہ کر لیں تاکہ (قحط کے سالوں میں) درخت اور بالیں (یعنی سب کا بھوسہ) جانوروں کی خوراک بن جائے اور لوگوں کو آپ یہ بھی حکم دے دیں کہ وہ اپنے غلہ کا پانچواں حصہ اٹھا کر الگ رکھ دیا کریں (اور اس طرح ہر سال کی پیداوار کا پانچواں حصہ ان کے پاس جمع ہو جائے) جو غلہ آپ اٹھا کر لیں گے وہ تو مصر اور اطراف مصر کے لئے کافی ہو جائے گا اور جب دور کے اطراف سے لوگ آپ کے پاس غلہ کی طلب میں آئیں گے تو آپ کے پاس ان سے وصول کیا ہو اور وہ اتنا جمع ہو جائے گا کہ آپ سے پہلے مصر کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس جمع نہ ہو اور بادشاہ نے کہا اس کام کی سرانجام دہی کون کرے گا کون غلہ جمع کرے گا کون فروخت کرے گا یہ دھندا میری طرف سے کون کرے گا۔

یوسف نے کہا مجھے ملک (مصر) کی پیداوار
 قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا ۝۵۰
 اور مال پر مقرر کر دو میں اس کام کی بخوبی نگہداشت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔ حضرت یوسف نے اپنی امانت داری اور کارگزاری کا خود اظہار کیا اور خود عمدہ طلب کیا تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے احکام مخلوق میں جاری کر سکیں، حق کو قائم کریں اور عدل کو دنیا میں پھیلانیں۔ اسی کام کے لئے انبیاء آتے ہیں اور ان کی بعثت کی غرض یہی ہوتی ہے آپ کو معلوم تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس کام کو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا پس آپ نے عمدہ حکومت کی طلب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کی تھی جاہ و اقتدار کی طلب نہ تھی، خلفاء راشدین کی خلافت کا مقصد بھی یہی تھا اور حضرت علیؑ کا حضرت معاویہؓ سے جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا، کیوں کہ آپ اس کام کے زیادہ اہل تھے۔ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آپ کو اپنے نفس پر زیادہ قابو تھا اور احکام الہی کو جاری کرنے کی صلاحیت آپ میں حضرت معاویہؓ سے زیادہ تھی۔

بیضاوی نے کہا طلب عمدہ کی شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ بادشاہ مجھے کوئی کام سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپ نے عمدہ کی تعین کردی اور ایسے کام کی ذمہ داری طلب کی جس کا فائدہ عمومی تھا اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکتے تھے۔

اس آیت سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی ذات پر اطمینان اور بھروسہ ہو تو حکومت کا کوئی عمدہ اور قضاء کی طلب جائز ہے اور اپنی اہلیت کار کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ بادشاہ کافر ہو یا ظالم اس کی طرف سے کسی کام پر مأمور ہونا (بشرطیکہ وہ کام افادیت عامہ رکھتا ہو اور جاہ طلبی کا داعیہ نہ ہو) جائز ہے، ظالموں اور فاسقوں کی طرف سے ہمارے محترم اسلاف محکمہ قضاء کی خدمت اسی غرض سے قبول کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حاکم یوسفؑ نہ تھے صرف مشیر تھے) بادشاہ آپ سے مشورہ لے کر خود حکم جاری کرتا تھا اور آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا تھا، گویا اجراء احکام میں آپ کا تابع تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول

اللہ ﷻ نے فرمایا اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ اِجْعَلْنِي عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو بادشاہ ان کو فوراً حاکم بنا دیتا مگر اس لفظ کو کہنے کی وجہ سے بادشاہ نے وہ سال ٹال دیا اس مدت میں یوسف بادشاہ کے پاس اس کے گھر میں رہتے رہے۔

بغوی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جس روز حضرت یوسف نے درخواست حکومت کی تھی اس دن سے جب ایک سال کی مدت گزر گئی تو بادشاہ نے آپ کو بلا کر تاج پہنایا اور شاہی تلوار باندھی اور جوہر سے جڑا ہوا تخت آپ کے لئے بچھو لیا اور تخت کے گرد ریشمی پردہ لٹکا دیا تخت میں ہاتھ لبا اور دس ہاتھ چوڑا تھا اس پر دس بستر بچھے ہوئے تھے اور ساتھ باریک پردے تھے پھر تاج پہن کر آپ کو برآمد ہونے کا حکم دیا، آپ سر پر تاج رکھے برآمد ہوئے برف کی طرح آپ کا رنگ گورا اور چاند کی طرح روشن تھا، بدن کی صفائی کی وجہ سے چہرے کا رنگ (یعنی عکس) بدن پر نظر آتا تھا آپ اس شان کے ساتھ جا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ تمام حکام آپ کے فرماں بردار ہو گئے بادشاہ مصر کی پوری حکومت آپ کو سپرد کر کے اپنے گھر میں چلا گیا۔ بادشاہ نے قطفیر کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور یوسف کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ یہ قول ابن اسحاق کا ہے۔

ابن زید کا بیان ہے کہ ریان شاہ مصر کے پاس خزانے بہت تھے تمام خزانے اس نے یوسف کے تصرف میں دے دیئے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اہل روایت نے ذکر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں قطفیر کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے اس کی بیوی زلیخا سے یوسف کا نکاح کر دیا۔ نکاح کے بعد یوسف زلیخا کے پاس پہنچے تو ان سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں زلیخا نے جواب دیا۔ اے صدیق! مجھے آپ ملامت نہ کریں آپ کو معلوم ہے کہ میں خوبصورتی میں ایک ہی عورت تھی اور یہ بھی جانتے ہی ہیں کہ حکومت اور دنیا کے لحاظ سے میں کتنے عیش میں تھی اور میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا اور آپ کے حسن و صورت کی جو حالت تھی وہ بھی خداداد تھی اس لئے آپ کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اہل روایت کا خیال ہے کہ یوسف نے زلیخا کو دو شیرہ پایا اور زلیخا کے بطن سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے افرائیم اور میثا۔ غرض مصر کی حکومت یوسف کے لئے مستقل ہو گئی آپ وہیں مقیم ہو گئے، مرد اور عورت سب آپ کو پسند کرتے تھے آیت ذیل اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَكُنَّا لَكَ مَكْنًا لِيُؤَسِّفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُونَ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ
عجیب طور سے یوسف کو اس سر زمین میں جماد عطا کر دیا کہ وہاں جس جگہ چاہیں رہیں۔ یعنی بادشاہ کی مجلس میں جس طرح ہم نے یوسف کو جگہ دی اسی طرح سر زمین مصر میں ہر جگہ اس کو رہنے کا اختیار دیا وہ جہاں چاہتا رہتا تھا۔

نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾
ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نعمت عطا کرتے ہیں اور نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

”رحمت“ سے مراد ہے نعمت اور ”اجر“ سے مراد ہے فوراً یا کچھ مدت کے بعد نکلنے والا اچھا نتیجہ۔ الْمُحْسِنِينَ سے حضرت ابن عباس اور وہب کے نزدیک صبر کرنے والے مراد ہیں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا، حضرت یوسف برابر بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، آخر بادشاہ مسلمان ہو ہی گیا اور بہت سے لوگ بھی مشرف باسلام ہو گئے اس طرح حضرت یوسف کو دنیوی اجر مل گیا۔

وَلَا جِرَ الْآخِرَةَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٥٧﴾
اور بلاشبہ ثواب آخرت دنیوی اجر سے ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور نافرمانی سے بچتے رہے۔

جب حضرت یوسف اطمینان کے ساتھ حکومت پر جم گئے تو انہوں نے غلہ جمع کرنے کی تدبیر کی بڑی بڑی حفاظت گاہیں اور غلہ رکھنے کے گھر بنوائے اور قحط سالی کے لئے وہاں غلہ جمع کیا اور معمول کے مطابق بقدر ضرورت خرچ بھی کیا یہاں تک کہ پیداوار کی کثرت کے سال گزر گئے اور قحط سالی کا دور آ گیا اور ایسا ہولناک قحط پڑا جس کی نظیر کبھی سننے میں آئی تھی نہ دیکھنے میں۔

روایت میں ہے کہ حضرت یوسف نے بادشاہ اور بادشاہ کے مصاحبین کے لئے ہر روز صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا مقرر کیا تھا قحط سالی کے دور میں سب سے پہلے آدھی رات کے وقت بادشاہ ہی کو بھوک نے ستلایا اور وہ بھوک بھوک کہہ کر چلا

اٹھا، حضرت یوسفؑ نے فرمایا یہ کال کا زمانہ ہے۔ کال کے اول سال پبلک کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا اور لوگ یوسفؑ سے غلہ خریدنے لگے، حضرت نے نقد روپیہ لے کر غلہ دے دیا اور اس طرح مصر کا ہر سکہ اور درہم و دینار آپ کے پاس آ گیا، دوسرے سال زیور اور جوہر لے کر اناج فروخت کیا، تیسرے سال چوپائے اور مویشی دے کر لوگوں نے غلہ لیا، چوتھے سال غلام اور باندیاں دے کر غلہ حاصل کیا، پانچویں سال جائیدادیں، زمینیں اور گھر بھی غلے کے عوض بیچ ڈالے، چھٹے سال بچے فروخت کر دیئے اور ساتویں سال خود اپنی جانوں کا بیعنامہ کر دیا، یہاں تک کہ نقد جس، زیور، جانور، باندی غلام سب کچھ یوسفؑ کا ہو گیا، اہل مصر کی کوئی چیز نہیں رہی اور آخر میں اولاد بھی اپنی نہیں رہی، بلکہ ہر شخص یوسفؑ کا غلام ہو گیا۔

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہو تو شاید شریعت یوسفی میں جائز ہو کہ کوئی شخص اپنی جان و اولاد کو فروخت کر دے، چور کو غلام بنا لینا تو آپ کی شریعت میں جائز ہی تھا۔ بعض علماء نے فتویٰ بھی دیا ہے کہ کال کی وجہ سے روٹی کے لئے آدمی اپنی جان اور اپنی اولاد کو بھی فروخت کر سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

غرض یہ حالت دیکھ کر رعایا بول اٹھی کہ ایسا عالی قدر مالک کل بادشاہ اور کوئی نہیں ہو جو ساری رعایا کے جان مال اور اولاد کا مالک ہو گیا ہو۔ یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا اب آپ کی کیا رائے ہے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے وہی میری رائے ہے۔ ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ حضرت نے فرمایا تو میں اللہ کو اور آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تمام اہل مصر کو میں نے آزاد کر دیا، ان کی ساری املاک (زر و جوہر، مویشی، جانور) ان کو واپس کرتا ہوں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت کال کے زمانے میں خود بھی بھوکے رہتے تھے، لوگوں نے کہا سارا غلہ ملک مصر کا تو آپ کے قبضے میں ہے اور آپ بھوکے رہتے ہیں، فرمایا میرا پیٹ بھرا ہو گا تو اندیشہ ہے کہ میں بھوکے کو بھول جاؤنگا، بادشاہ کے باورچیوں کو بھی آپ نے حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے لئے صرف دوپہر کو ہی کھانا تیار کریں، کہیں پیٹ بھرنے کے بعد بادشاہ بھوکوں کو بھول نہ جائے۔ اسی بنا پر بادشاہ ناشتہ دوپہر کو کرتے ہیں (کہ صبح سے دوپہر تک بھوکے رہیں اور بھوکوں کو بھولنے نہ پائیں)۔

اہل مصر کے علاوہ چاروں طرف سے لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس غلہ لینے آتے تھے مگر آپ کسی کو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو بار شتر سے زیادہ اناج نہیں دیتے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب لوگوں کو پہنچ جائے لوگوں کے آپ کے پاس ٹھٹ لگے رہتے تھے اور آپ سب کو دیتے تھے۔ کنعان اور شام کے باشندے بھی قحط میں مبتلا ہو گئے، عمومی کال سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کے اہل و عیال مقام غرما علاقہ فلسطین سرحد شام میں رہتے تھے ان لوگوں کی زندگی صحرائی زندگی تھی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے، حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر بھیجا اور فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا بادشاہ مرد صالح ہے لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا ہے۔ تم بھی تیار ہو جاؤ اور مصر جا کر غلہ لاؤ آپ نے یوسفؑ کے بھائی بینا مین کو اپنے پاس روک لیا اور دوسرے بیٹوں کو روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ ﴿۵۸﴾

اور یوسفؑ کے بھائی آئے اور یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ نہ پہچان سکے۔ یعنی دس بھائی یوسفؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد نے فرمایا حضرت یوسفؑ نے پہلی ہی نظر میں بھائیوں کو پہچان لیا، حسن نے کہا اول نظر میں نہیں پہچانا جب انہوں نے اپنا تعارف کر لیا تو پہچانا۔

حضرت ابن عباسؓ سے بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کی یہ وجہ بیان کی کہ کنویں میں ڈالنے اور اب سامنے آنے کے درمیان چالیس برس کی مدت گزر گئی تھی۔ طول زمانہ شناخت سے مانع ہوا۔ عطا نے کہا حضرت یوسفؑ اس وقت شاہانہ تاج پہنے شاہی تخت پر رونق افروز تھے اس لئے بھائی نہ پہچان سکے۔ بعض نے کہا اس وقت آپ شاہی ریشمی لباس پہنے تھے اور گردن میں سونے کا ہار تھا۔

میں کہتا ہوں اس قول کی بنیاد اس مسئلہ پر ہو سکتی ہے کہ شریعت یوسفی میں مرد کے لئے سونا اور ریشمی لباس کا پہننا

درست تھا۔

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو دیکھا تو انہوں نے عبرانی زبان میں کلام کیا آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ تم کون لوگ ہو اور تمہارا کیا کام ہے میں تم کو نہیں جانتا، بھائیوں نے کہا ہم ملک شام کے چرواہے ہیں، قحط کی تکلیف میں مبتلا ہو کر آپ کے پاس غلہ لینے آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا شاید آپ لوگ ہمارے ملک میں یہاں کے احوال کی جستجو میں آئے ہیں، کہنے لگے خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں سب ایک باپ کی اولاد ہیں ہمارا باپ پیر صادق ہے اس کو اللہ کے پیغمبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ لوگ کتنے ہیں بولے ہم بارہ بھائی تھے، ہمارا ایک بھائی جاتا رہا وہ ہم سب میں چھوٹا تھا، جنگل کو گیا تھا وہاں مر گیا۔ باپ کی نظر میں وہ سب سے پیارا تھا، آپ نے پوچھا یہاں تم کتنے ہو، بولے دس ہیں فرمایا ایک اور کہاں ہے بولے باپ کے پاس رہ گیا ہے جب سے اس کا ماں جلایا بھائی مر ہے باپ کو اسی سے تسکین خاطر ہوتی ہے، فرمایا کون جانے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ بھی ہے یا نہیں، کہنے لگے بادشاہ سلامت ہم تو اجنبی ملک میں ہیں یہاں تو ہم کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ آخر حضرت یوسفؑ نے ہر ایک کو ان کی تعداد کے مطابق ایک ایک اونٹ غلے کا دے دیا اور سب کا سامان سفر درست کر دیا۔ جہاز سامان سفر کو کہتے ہیں۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِاٰخِرِ لَكُمْ مِمَّنْ اٰبِيكُمْ ۙ
سفر درست کر دیا تو یوسفؑ نے ان سے کہا (اب کی مرتبہ) اپنے علاقے بھائی کو میرے پاس لے کر آنا، اگر تم سچے ہو۔ اگر تم اپنے بھائی کو لے آؤ گے تو ایک بار شتر میں تم کو اور دوں گا اور تمہاری عزت بڑھاؤں گا۔

اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْ اُوْفِي الْكَيْلِ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹
دیتا ہوں (کسی کو کم نہیں دیتا) اور میں بہترین میزان ہوں، مجاہد نے کہا یعنی تمہاری مہمانی اچھی طرح کرتا ہوں۔
فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝۶۰
نہ آئے تو میرے پاس نہ آنا تم کو ایک باپ غلہ بھی میرے پاس سے نہیں ملے گا اور میرے ملک میں بھی داخل نہ ہونا۔
لَا تَقْرَبُوْنَ يٰۤاٰنْحٰسِيْنَ كَا صِيغَةٍ يٰۤاٰنْحٰسِيْنَ ۙ
لا تَقْرَبُوْنَ یا انھی کا صیغہ ہے یا انھی ہے جس کا عطف جزا پر ہے (میرے پاس نہ آنا، یا قریب بھی نہ آؤ گے)۔

قَالُوْا سَنُرٰوِدُ عَنْهُ اٰبَاكَ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ۝۶۱
بولے اس کی طرف سے باپ کو پھسلانے کی ہم کوئی تدبیر ضرور کریں گے اور (جو کچھ آپ نے حکم دیا اس کی) بلاشبہ تعمیل کریں گے۔ یعنی اس کی جدائی کا ہم باپ کو ضرور ہو گا مگر ہم کوئی چال چلیں گے اور باپ کے پاس سے لانے کی کوئی تدبیر کریں گے اور اس کی طرف سے باپ کو پھسلائیں گے، حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو اپنے میں سے کسی بھائی کو میرے پاس بطور ضمانت چھوڑ جاؤ تاکہ اس کو لاسکو، یہ سن کر بھائیوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی قرعہ میں شمعوں کا نام نکل آیا، شمعوں وہی شخص تھا جس کی یوسفؑ کے متعلق سب بھائیوں سے زیادہ اچھی رائے تھی (اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو) چنانچہ شمعوں کو یوسفؑ کے پاس چھوڑ دیا، باقی سب چلے گئے۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهٖ اجْعَلُوْا بِضَاعَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَا اِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اٰهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يُرْجَعُوْنَ ۝۶۲
اور یوسفؑ نے اپنے (غلہ ناپنے والے) خادموں سے کہا ان کا سرمایہ (یعنی غلہ کی قیمت جو انہوں نے دی ہے) انہیں کے سامان میں رکھ دو تاکہ گھر لوٹ کر جب وہ (لوٹا یا ہوا) سرمایہ دیکھیں گے تو واپسی کا حق پہچان کر امید ہے لوٹ آئیں گے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ ان کا سرمایہ جو انہوں نے غلہ کی قیمت میں دیا تھا جوتے اور کھالیں تھیں۔ بعض نے کہا کہ آٹھ بورے کسی قسم کے ستوتھے۔ اول قول حسب رائے بغوی زیادہ سچ ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یوسفؑ نے تکمیل احسان اور اتمام نوازش کے جذبہ کے زیر اثر بھائیوں کا سامان واپس رکھوا دیا تھا کہ وہ جانیں کہ بادشاہ کی ہم پر بڑی عنایت ہے کہ اس نے سامان بھی واپس کر دیا اور اسی خیال کے تحت دوبارہ مصر کو لوٹ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسفؑ نے باپ اور بھائیوں سے غلہ کی قیمت وصول کرنا اچھا نہ سمجھا اور ایسی حالت میں کہ باپ

بھائی محتاج تھے، قیمت لینے کو کمینہ پن خیال کیا۔ کلبی نے کہا یوسفؑ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں باپ کے پاس اور روپیہ نہ ہو اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ لوٹ کر نہ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسفؑ کو معلوم تھا کہ یہ امانت دار لوگ ہیں ان کی دیانت ان کو آمادہ کرے گی کہ یہ سرمایہ لوٹا کر لائیں یہ اس پونجی کو اپنے لئے حلال نہ سمجھیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا
 نے ہماری بڑی مہمانی کی اور ایسی عزت کی کہ اگر نسل یعقوبؑ کا بھی کوئی آدمی ہوتا تو ہماری اتنی عزت نہ کرتا، حضرت یعقوبؑ نے یہ بات سن کر فرمایا جب تم شاہ مصر کے پاس لوٹ کر جاؤ تو اس سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ آپ نے جو ہمارے ساتھ احسان کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کے لئے دعا کرتے ہیں اللہ آپ پر رحمت نازل فرمائے۔ پھر فرمایا شمعون کہاں ہے۔ بیٹوں نے جواب دیا اس کو شاہ مصر نے بطور ضمانت اپنے پاس روک لیا ہے اس کے بعد پورا قصہ بیان کر دیا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس کو یہ بات بتائی ہی کیوں۔ بیٹوں نے جواب دیا اس نے ہم سے عبرانی زبان میں گفتگو کی اور کہا تم جاسوس ہو اور پورا قصہ بیان کر کے کہا۔
 يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنَّا جَعَلْنَا لَكُمُ الْكَيْلَ
 ہم کو غلہ دینے کی ممانعت کر دی گئی ہے یعنی اگر ہم بنیامین کو لے کر نہ جائیں گے تو آئندہ ہم کو غلہ نہیں ملے گا۔ کیل (ناپ۔ پیمانہ) سے مراد ہے غلہ۔ کذا قال الحسن۔ بعض اہل تفسیر نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ شاہ مصر نے ہم میں سے ہر ایک کے نام بنام تو غلہ دے دیا اور بنیامین کے نام کا غلہ نہیں دیا۔

فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتَلُ وَإِنَّا لَنَحْفِظُوكَ ۖ
 لہذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تاکہ ہم کو غلہ مل جائے (اور کوئی مانع نہ رہے یا یہ مطلب ہے کہ اس کے حصہ کا غلہ بھی مل جائے) اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔ کوئی تکلیف اور دکھ نہ ہونے دیں گے۔

قَالَ هَلْ أَمْنَكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمَنْتُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ ۖ قَالَ اللَّهُ خَيْرٌ حَفِظْنَاكَ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ۖ
 (یعقوبؑ نے) کہا کیا میں اس کے بارے میں تمہارا ویسا ہی اعتبار کروں جیسا اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے کیا تھا (تم کیا حفاظت کرو گے) اللہ ہی سب سے بڑھ کر محافظ ہے اور وہی سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے امید ہے کہ اللہ اس کی حفاظت کرے گا اور مجھ پر رحم فرمائے گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ
 اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنا سرمایہ (یعنی وہ سرمایہ جو غلہ کی قیمت میں انہوں نے شاہ مصر کو دیا تھا) اس کے اندر پایا جو ان کو واپس کر دیا گیا تھا۔
 قَالُوا يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنَّا جَعَلْنَا لَكُمُ الْكَيْلَ
 کہنے لگے ابا (لیجئے) اور ہم کو کیا چاہیے..... یعنی اس سے بڑھ کر اور کیا احسان و کرم ہو گا کہ شاہ مصر نے ہماری مہمان نوازی کی، خاطر و مدارات کی اچھی طرح سے رکھا پھر غلہ ہمارے ہاتھ فروخت کیا اور پھر ہماری دی ہوئی قیمت بھی ہم کو لوٹا دی۔

یایہ مطلب ہے کہ اس سے بڑھ کر ہم بھلائی کے طالب نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ کے احسان کے متعلق کلام کرنے میں ہم اور کیا چیز طلب کریں یا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے بیان میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے ہماری سچائی کی دلیل آپ کے سامنے آگئی، یا یہ مطلب ہے کہ ہم مزید سرمایہ آپ سے طلب نہیں کرتے۔

هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا
 یہ ہمارا سرمایہ موجود ہے جو ہم کو لوٹا دیا گیا ہے۔
 وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفِظُ أَخَانًا وَنَزِدُكَ كَيْلًا بَعِيدًا
 اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بار شتر غلہ زیادہ لائیں گے..... نمیر کا عطف فعل محذوف پر ہے، یعنی ہمارا یہ سامان واپس کر دیا گیا تاکہ ہم اس سے قوت حاصل کریں اور گھر والوں کے لئے رسد خریدنے کے واسطے بادشاہ کے پاس لوٹ کر جائیں اور وہاں سے غلہ لائیں۔ اس صورت میں ما نبعی میں ما استفہامیہ ہو گا۔

مَارَ، يَمِيرُ مِيرًا (مجرد) اِمْتَارَ، يَمْتَارُ، اِمْتِيَارًا (ثلاثي مزید باب افعال) دوسرے شہر سے غلہ لے کر آیا۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ اس کا عطف مانبعی پر ہو اور مانافیہ ہو یعنی ہم اور کسی چیز کے طلبگار نہیں اور گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے۔
حفظ آخانا یعنی آمدورفت میں ہر خطرہ سے اس کی حفاظت کریں گے نَزَادًا كَيْلَ بَعِيرٍ یعنی اس کے حصہ کا ایک
بار شتر غلہ ہم مزید حاصل کریں گے فی کس ایک اونٹ غلہ ملتا تھا۔

یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے گھر والوں کے لئے کافی نہیں۔ یا یہ (مزید) غلہ
آسان ہے بادشاہ سخی ہے اس کو کوئی دشواری نہیں نہ اس سے ملنے میں دشواری ہے۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ لَنَأْتِيَنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ
(یعقوب نے) کہا اس کو اس وقت تک ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک اللہ کی قسم کھا کر مجھے پکا وعدہ نہ دو گے
کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے۔

مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ یعنی ایسا عہد جس کو اللہ کی قسم کھا کر پختہ کیا گیا ہو یا اس پر اللہ کو گواہ بنایا گیا ہو۔
إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ کا مطلب مجاہد نے بیان کیا مگر یہ کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ قتادہ نے کہا مگر یہ کہ تم بے بس اور
مغلوب ہو جاؤ اور تم میں حفاظت کی طاقت ہی نہ رہے۔

یہ استثناء مفرغ ہے یعنی ہر حال میں تم اس کی حفاظت کرو گے ہاں اگر ایسی حالت ہو جائے کہ تم بے بس ہو جاؤ یا یہ
مطلب ہے کہ اس کو واپس لانے سے کسی وجہ سے تم باز نہ رہو گے مگر یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ۔

پس جب انہوں نے باپ کو مضبوط عہد دے دیا، کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا اللہ، رب محمد
کی قسم۔ غرض یہ کہ انہوں نے جب انتہائی کوشش کی اور قسمیں کھالیں اور بنیامین کو بھیجے بغیر حضرت یعقوب کو کوئی چارہ نہ رہا تو
قَالَ اللَّهُ عَلَيَّ مَا نَقُولُ وَكَيْلٌ ﴿۳۶﴾ (یعقوب نے) کہا جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ (یا نگر) ہے۔ کعب
نے کہا جب حضرت یعقوب نے قاللہ خیر حافظہ، کہا تو اللہ نے فرمایا اپنی عزت کی قسم تو نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں دونوں
کو لوٹا کر تیرے پاس پہنچا دوں گا۔

وَقَالَ يَبْنَى لَاتَدْخُلُوا مِنِّي بَابٍ وَاحِدٍ وَاَدْخُلُوا مِنِ ابْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ
(بیٹے جب حضرت یعقوب کے پاس سے جانے لگے تو) یعقوب نے کہا میرے بیٹو! شہر کے ایک دروازے سے یعنی ساتھ ساتھ
داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازہ سے گھسنا۔ حضرت یعقوب کے بیٹے بڑے حسین و جمیل، سرد قامت، گل رخسار، صحت مند اور
طاقت ور جوان تھا اور شاہ مصر کے نزدیک ان کی عزت زباں زد خلاق تھی اس وجہ سے حضرت یعقوب کو خیال ہوا کہ کہیں

(اجتماعی ہیئت میں داخل ہوتے دیکھ کر) کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ حدیث میں آیا ہے نظر حق ہے۔ نظر لکنے کے متعلق جو احادیث
آئی ہیں۔ سورہ نون کی وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُزِلُّوكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ الخ کی تفسیر میں ہم نے
ذکر کر دی ہیں۔

پہلی مرتبہ روانگی کے وقت حضرت یعقوب نے بیٹوں کو یہ نصیحت نہیں کی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت ان سے
کوئی مصر میں واقف نہ تھا پھر بنیامین بھی ان کے ساتھ نہ تھا اور اس مرتبہ (کوئی بیٹا پاس نہیں رہا تھا) بنیامین بھی روانہ ہو رہا تھا۔
ابراہیم نخعی نے کہا کہ یوسف کے سامنے جد اجداجانا مقصود تھا۔ اول تشریح زیادہ صحیح ہے۔

وَمَا أَعْنِي عَنْكُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ
اور میں اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی بات کو بھی اس کے مقابلہ میں
دفع نہیں کر سکتا۔ یعنی جو ہونے والی چیز ہے وہ ہو کر رہے گی اللہ کا جو حکم ہو چکا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت عائشہ کی روایت
ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احتیاط تقدیر سے نہیں بچائی۔ رواہ الحاکم امام احمد نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے اور
بزاز نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

لَنْ أُرْسِلَهُ إِلَّا بِاللَّهِ
حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے۔ اللہ کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چلتا۔ جو حکم خدا ہو چکا ہے وہ برابر تم

کو پہنچے گا اس کے مقابلہ میں کوئی چیز تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس سے آگے حضرت یعقوب نے اللہ ہی پر اپنے اعتماد و توکل کا اظہار کیا اور فرمایا

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ، وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۷۶﴾

اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ

کرنے والوں کو توکل کرنا چاہئے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةٌ فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ

اور جب وہ (مصر پہنچ کر شہر کے اندر) اس طور پر داخل ہوئے جس طرح باپ

نے ان کو حکم دیا تھا تو یہ (داخلہ) اس چیز کو بالکل دفع نہ کر سکتا تھا جو اللہ کی طرف سے آنے والی تھی مگر یعقوب کے دل میں

خواہش تھی جس کو انہوں نے پورا کر لیا (اور ہمارے سکھادینے کی وجہ سے وہ تھے بلاشبہ جاننے والے، اسی لئے انہوں نے وَمَا

أَغْنَى عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ کہہ دیا تھا لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے) روایت میں آیا ہے کہ شہر کے چار دروازے

تھے چاروں دروازوں سے یہ لوگ داخل ہوئے تھے۔ ماکان يُغْنِي یعنی دفع نہیں کر سکتا۔ مِنَ اللَّهِ: اللہ کے طے شدہ فیصلے سے

کچھ بھی۔ چنانچہ بنیامین پکڑے گئے اور حضرت یعقوب پر دوہری مصیبت پڑ گئی۔ حَاجَةٌ یعنی یہ فقط یعقوب کا ارمان تھا فقط

شفقت پدرانہ تھی کہ کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے۔ قضاہا یعنی اپنی خواہش کو یعقوب نے ظاہر کر دیا اور بیٹوں کو نصیحت کر دی۔

وَلَئِنَّ لَنَا لَأَوْعِلُمْ لِمَا عَلَّمْنَاهُ اور وہ بلاشبہ جاننے والے تھے ہمارے سکھادینے کی وجہ سے۔ تعلیم دینے

سے مراد ہے وحی کے ذریعہ سے واقف بنانا عقلی دلائل بتانا۔

مَا عَلَّمْنَا (میں اگر ما موصولہ ہو تو اس) سے مراد ہوگا مَا أَعْنَى عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ کہنایا ما مصدریہ ہوگا

اور مَا عَلَّمْنَا کا معنی ہوگا ہمارا سکھانا، تعلیم دینا۔ بعض نے کہا ذُو عِلْمٍ سے مراد ہے باکمل یعنی جو علم ہم نے یعقوب کو عطا کیا تھا اس

پر وہ عامل بھی تھے۔ سفیان کا قول ہے جو عالم علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں ہے۔ بعض نے کہا ذُو عِلْمٍ سے مراد ہے

نگہداشت رکھنے والا۔

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یعقوب

وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۷۸﴾

کی بات کو، یا تقدیر کو نہیں جانتے اور اس سے واقف نہیں کہ تدبیر تقدیر کو دفع نہیں کر سکتی۔ یا اس بات سے ناواقف ہیں کہ اللہ

اپنے دوستوں کو الہام کر دیتا ہے۔

اور جب بردار ان یوسف۔ یوسف کے پاس پہنچے۔ تو کہا آپ نے جو بھائی کو لانے کا

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ

حکم دیا تھا ہم اس کو لے آئے حضرت یوسف نے کہا تم نے بہت اچھا کیا، ٹھیک کیا اور تم کو عنقریب اس کا اچھا بدلہ ملے گا پھر آپ

نے ان کو عزت اور آرام کے ساتھ ٹھہرایا اور ان کی مہمانی کی اور دسترخوان بچھوایا اور حکم دیا کہ آئے سامنے دو دو بیٹھیں (یعنی دو دو

شریک ہو جائیں حکم کی تعمیل کی گئی اور دو دو بیٹھ گئے) بنیامین تمہارے گئے اور روپڑے اور کہنے لگے اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو

مجھے اپنے ساتھ بٹھالیتا حضرت یوسف نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے میں اس کو اپنے ساتھ بٹھالیتا ہوں، چنانچہ آپ نے

بنیامین کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھلایا۔ پھر رات ہوئی تو آپ نے بستر کرانے کا حکم دے دیا اور فرمایا دو دو بھائی ایک بستر پر

ساتھ سو جائیں۔ بنیامین اس وقت بھی تمہارے گئے تو حضرت نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سو جائے گا۔ سوتے میں

بنیامین کو یوسف چمٹا لیتے تھے اور ان کی خوشبو سونگھتے تھے صبح تک یوں ہی کرتے رہے۔ روئیل کہنے لگا (بھائیو) ہم نے تو کبھی ایسا

واقعہ دیکھا نہیں (کہاں بادشاہ مصر اور کہاں ہم اور ہم پر بادشاہ کی یہ مہربانی اور بنیامین پر یہ خصوصی عنایت) صبح کو حضرت یوسف

نے بھائیوں سے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ (یہ شخص اکیلا ہے) اس کا کوئی دوسرا رفیق نہیں ہے اس لئے اس کو میں اپنے ساتھ اپنے

گھر میں رکھوں گا۔ اس کے بعد آپ نے ایک مکان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور کھانا جاری کر دیا۔

اور اپنے ساتھ اپنے بھائی بنیامین کو جمع کر لیا۔ اور اپنے ہی ساتھ اس کو ٹھہرایا۔ جب محفل

أَوْسَى إِلَيْهِ أَخَاهُ

چھٹ گئی اور تنہائی کا وقت آیا تو بنیامین سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے بنیامین نے کہا، بنیامین، یوسف نے پوچھا بنیامین کا کیا معنی بنیامین نے کہا مردہ کا بیٹا (وضع حمل کی حالت میں بنیامین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا) حضرت یوسف نے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے مرحوم بھائی کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں، بنیامین نے کہا بادشاہ کی طرح بھائی کس کو نصیب ہے، لیکن آپ یعقوب اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں یوسف یہ سن کر رو دیئے اور کھڑے ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور

قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ ۖ كَمَا فِي حَقِيقَتِ فِي تَمَّارِ ابْهَائِي هُوَ لِي يَوْسُفُ هُوَ۔

اب تم ان کی ان حرکات سے رنجیدہ نہ ہو جو ہمارے ساتھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کر دیا جو اطلاع میں نے تم کو دی ہے اس کی خبر ان کو نہ دینا۔ اس کے بعد آپ نے ہر بھائی کو ایک ایک بار شتر غلہ دے دیا اور بنیامین کو بھی اس کے نام کا ایک اونٹ بھراناج دے دیا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ۖ كَرْتِيَارِ كَر دِيَا تُو پَانِي پِنِي كَا كُورِ اِلِي بِنِيَامِينِ كِي سَامَانِ مِي رُكْهَ دِيَا۔ لِي عِنِي خَادِمُوں كُو حَكْمِ دِيَا كِي كُورِ ابْنِيَامِينِ كِي سَامَانِ مِي چھپا دو۔ خادموں نے چھپا دیا۔

سِقَايَةَ اور صُوعِ دُونُوں سِي مَرَادِ اِيكِي هِي چيزِ هِي۔ سِقَايَةَ پَانِي پِنِي كَا بَرْتَنِ جِسْ مِي بَادِشَاهِ پَانِي پِي تَا تَهَا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ برتن زبرد کا تھا ابن اسحاق نے کہا چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا سونے کا تھا۔ عکرمہ نے کہا چاندی کا تھا مگر مَرَصِحِ تَهَا غَلِي كِي احترامِ مِي حضرت یوسف نے اس کو غلہ ناپنے کا پیانا مقرر کر دیا تھا اور اس میں آپ پانی بھی پیتے تھے۔ سدی نے کہا بھائی کے سامان میں وہ پیانا پوشیدہ کر دیا اور بھائی کو بتایا بھی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہ ہوا۔ کعب نے کہا جب حضرت یوسف نے بنیامین سے کہا میں تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا اب تو میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا تم واقف ہو کہ میری وجہ سے باپ پر کیسا غم پڑا تھا اب اگر میں تم کو روک لوں گا تو ان کا غم اور بڑھ جائے گا اور جب تک میں تم کو بدنام کر کے مشہور نہ کر دوں اور کسی نازیبا فعل کی تمہاری طرف نسبت نہ کر دوں اور ناروا حرکت کا مرتکب نہ قرار دے دوں اس وقت تک میں تم کو روک بھی نہیں سکتا (روکنے کا کوئی قانون نہیں اور جھوٹی وجہ جنس قائم کرنے میں تمہاری بدنامی ہوگی) بنیامین نے کہا کچھ بھی ہو مجھے پروا نہیں جو بات آپ چاہیں کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسف نے کہا تو میں اپنا ناپ تمہارے سامان میں پوشیدہ کرانے دیتا ہوں پھر تمہارے اوپر چوری کا الزام قائم کروں گا، تاکہ تم کو چھوڑ دینے (اور روانہ کر دینے) کے بعد پھر تم کو لوٹ لینا میرے لئے ممکن ہو سکے۔ بنیامین نے کہا آپ جو چاہے کریں۔

ثُمَّ آذَانَ مُؤَدِّنٍ أَيَّتُهَا الْعَيْرُ انْكُم لَسْرِقُونَ ۖ قَافِلِي وَالُو تَمَّ يَقِينَا چورِ هُو۔

مؤدِّنٍ منادی۔ لفظ تَمَّ بتا رہا ہے کہ قافلے والوں کی روانگی سے کچھ وقت کے بعد اعلا پنچی نے اعلان کیا تھا (کیونکہ تَمَّ فعل دویم کی تاخیر اور کچھ مدت پہلے فعل سے پیچھے آنے کو ظاہر کرتا ہے جَاءَ زَيْدٌ تَمَّ بَكْرٌ زَيْدٌ آیا کچھ مدت کے بعد بکر آیا۔ مترجم) اور واقعہ بھی اسی طرح ہوا تھا، قافلہ روانہ ہو گیا اور حضرت یوسف نے اتنی تاخیر کی کہ قافلہ ایک منزل پہنچ گیا یا گھروں کی آبادی سے نکل گیا پھر ان کے پیچھے آدمی دوڑا جس نے پیچھے سے پہنچ کر ندا دی۔ الْعَيْرُ لدے ہوئے اونٹ، مجازاً امراد اونٹوں والے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا یا خیل اللہ ارکبوا الی اللہ کے سوار و سوار ہو جاؤ۔ رواہ ابو داؤد من حدیث سمرۃ بن جندب (گھوڑوں کو خیل کہتے ہیں مگر حدیث میں گھوڑوں کے سوار مراد ہیں) آمدورفت رکھنے کی وجہ سے اونٹوں کو عیر کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا عیر جمع ہے عیر کی۔ سَقَفٌ کی طرح۔ عین پر ضمہ تھا پھر یاء کی مناسبت کی وجہ سے کسرہ دے دیا گیا اور عیر کا معنی ہے گدھا مجازاً امراد ہوتا ہے گدھوں والا قافلہ پھر اس لفظ کے استعمال میں مزید توسیع کر لی گئی اور پھر قافلہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ مجاہد نے کہا وہ قافلہ گدھے سواروں ہی کا تھا۔ فراء نے کہا وہ اونٹ والے تھے (برادران یوسف چور نہ تھے پھر ان کو چور کیوں کہا اور

چوری کی تہمت ان پر کیوں لگائی۔ اس سوال کے جواب میں) کہا جاسکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے حکم کے بغیر منادی نے یہ لفظ از خود کہہ دیا تھا یا یہ کہ حضرت یوسفؑ نے حکم دیا تھا اور بے ساختہ یہ لفظ ان کی زبان سے نکل گیا تھا یا یوں کہا جائے کہ واقعی وہ چور تھے حضرت یوسفؑ کو انہوں نے چر لیا تھا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اللہ ہی نے ایسا کہنے کا حکم دیا تھا اور اس سے کسی بات کی وجہ نہیں دریافت کی جاسکتی لَا يُسْئَلُ عَمَّا فَعَلَ وَهُمْ يُسْأَلُونَ اس میں حکمت حضرت یعقوبؑ کا امتحان تھا آئندہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ ﴿۴۱﴾
 قَالُوا نَفَقْدُ صُيُوعَ الْمَلِكِ
 قائلے والے تلاش کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کیا چیز کم ہو گئی (تم کس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو) فَقَدُ کسی چیز کا کھوجانا کہ یہ بھی معلوم نہ ہو وہ کہاں گئی اور کہاں ہے۔
 تلاش کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا پانی پینے کا کٹورا ہم کو نہیں ملتا ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں اور تمہارے سوا ہمارا خیال کسی اور پر نہیں ہے۔

اور جو شخص اس کو لا کر حاضر کرے گا اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں..... یعنی بطور مزدوری اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں ذمہ دار ہوں اس کو مزدوری دوں گا (مزدوری سے مراد ہے اجرت، معاوضہ، انعام۔ مترجم) اس آیت سے مزدوری اور کفالت اور کام سے پہلے مزدوری مقرر کر دینے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْتُمْ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سِرِّقِيْنَ ﴿۴۲﴾
 بولے خدا کی قسم تم یہ یقیناً جانتے ہو کہ ہم اس سر زمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں۔ یہ لوگ دو مرتبہ مصر آئے تھے اس لئے اہل مصر ان کی امانت داری سے واقف ہو چکے تھے جو سرمایہ ان کے سامان میں بندھ کر ان کے ساتھ چلا گیا تھا وہ بھی انہوں نے واپس لا کر دے دیا تھا اور اپنے جانوروں کے منہ پر انہوں نے جالیاں بھی چڑھادی تھیں کہ کسی کی کھیتی باڑی پر منہ نہ ڈال دیں یہ تمام باتیں ان کی امانت داری پر دلالت کرتی تھیں اور لوگ ان باتوں سے واقف تھے، اسی لئے اہل مصر کے علم کو ان لوگوں نے اپنی شہادت میں پیش کیا۔

قَالُوا فَمَا جَزَاءُكَ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾
 تم لوگ بے گناہی کے دعویٰ میں جھوٹے ہو تو چور یا چوری کی سزا تمہارے نزدیک کیا ہونی چاہئے۔
 قَالُوا جَزَاءُهَا مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهَا كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
 انہوں نے جواب دیا اس چور کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں پیمانہ نکلے تو سامان والا ہی اس کا عوض ہے (یعنی اسی کو غلام بنا لیا جائے) اور ہم ظالموں یعنی چوروں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کی شریعت میں چور کی یہی سزا تھی کہ جب چوری ثابت ہو جائے تو چور کو صاحب مال کے سپرد کر دیا جائے اور وہ چور کو اپنا غلام بنا لے۔ اس پر منادی نے کہا اچھا تو تمہارے سامان کی تلاشی لی جائے گی۔
 روایت میں آیا ہے کہ سرکاری آدمی ان سب کو لوٹا کر لے گئے اور حضرت یوسفؑ نے سامان کی تفتیش کا حکم دیا۔

فَبَدَّ اَبَاوَعِيْنَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاۤءِ اٰخِيْهِ
 پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے (دوسرے) بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی، یعنی بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے ایک ایک کر کے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اور انہیں کی تلاشی سے آغاز کیا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ قنادہ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کے سامان کو کھولتے اور اس کے تھیلے کے اندر دیکھتے تھے تو تہمت لگانے کے گناہ کے خوف سے استغفر اللہ کہتے تھے (کیونکہ جانتے تھے کہ میں تلاشی غلط لے رہا ہوں یہ شخص چور نہیں ہے) جب سب کی تلاشی ہو چکی اور صرف بنیامین رہ گیا تو خود ہی بولے میرے خیال میں اس نے نہیں لیا ہے (اس کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں) بھائیوں نے کہا خدا کی قسم جب تک اس کی بھی تلاشی نہ لی جائے گی ہم نہیں چھوڑیں

گے، اس سے آپ کے دل کو بھی پورا اطمینان ہو جائے گا اور ہمارے دلوں کو بھی۔

لَمْ اسْتَخْرِجْهَا مِنْ وِعَاءِ آخِيهِ
آخر (بنیامین کا سامان کھولا اور) اپنے بھائی بنیامین کے تھیلے سے
پیمانہ برآمد کر لیا۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکائے اور بنیامین کی طرف رخ کر کے کہنے لگے تو نے یہ کیا حرکت
کی ہمارے منہ کالے کر دیئے ہم کو رسوا کر دیا تو نے یہ لیا کب اے اولادِ ارحیل! تمہارے ہاتھوں ہمیشہ ہم پر مصیبت ہی آئی
ہے، بنیامین نے کہا، اولادِ ارحیل کو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑے ہیں تم نے ہی میرے بھائی کو لے جا کر جنگل میں
ہلاک کیا (رہا یہ معاملہ تو) یہ پیمانہ اسی نے میرے سامان میں رکھا جس نے تمہارے سامانوں میں تمہارا سرمایہ رکھا تھا۔ غرض
(بنیامین) غلامی میں پکڑ لیا۔ گیا اسی آدمی (یعنی تلاشی لینے والے) نے بنیامین کی گردن پکڑ کر یوسف کے روبرو پیش کر دیا جیسے
چوروں کو لے جایا جاتا تھا۔

كذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَٰ
ایسی تدبیر ہم نے یوسف کی خاطر کی تھی۔ کہ ہم نے یہ تدبیر اس کو سکھائی اور
وحی بھیجی اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ منادی نے جو انکم لَسَارِقُونَ کہا تھا وہ کلام از خود نہ تھا بلکہ حضرت یوسف کے حکم
سے تھا اور آپ کا حکم بھی وحی پر مبنی تھا اس لئے گناہ نہیں تھا۔

بغوی نے لکھا ہے اس جگہ کید سے مراد ہے کید کا بدلہ یعنی جس طرح برادرانِ یوسف نے یوسف کے ساتھ پہلے
فریب کیا تھا اسی طرح اس وقت ہم نے ان کے ساتھ کیا۔ حضرت یعقوب نے تو حضرت یوسف سے پہلے ہی فرما دیا تھا فیکید
لَكَ كَيْدًا کہ وہ تم سے فریب کریں گے۔ پس جب انہوں نے فریب کیا تو ان کے معاملہ میں یوسف کے لئے ہم نے بھی
ویسا ہی کیا۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مخلوق کی طرف سے کید کا معنی ہے سازش فریب اور اللہ کی طرف سے کید کا معنی ہے
تج (مخفی) تدبیر۔

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ
(ہم نے یہ تدبیر اس لئے کی) کہ یوسف بادشاہ (مصر) کے
مذہب (اور قانون) کے اعتبار سے اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے (اور اپنے پاس روک نہیں سکتے تھے) بادشاہ کے قانون و مذہب
میں تو چور کو مارا جاتا تھا اور چوری کے مال سے دو گنا جرمانہ کیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس نے اس جگہ دین کا ترجمہ کیا سلطان، عملداری اور قدادہ نے کہا حکم اور قانون۔
إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ
ہاں اللہ کو منظور ہوتا تو وہ اس حکم کو بادشاہ کا حکم کر سکتا تھا (استثناء منقطع ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا
حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک چور کی سزا کیا ہونی چاہئے تو اللہ نے ان سے کہلوادیا کہ
چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو مالک مال کا غلام بن جانا ہوگا اس طرح ممشیتِ الہی حضرت یوسف کا مقصد حاصل ہو گیا۔
نَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأُوهُ
(علم عطا فرما کر) ہم جس کو چاہتے اونچے درجے عنایت کرتے ہیں۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٢٤﴾
اور ہر جاننے والے سے اوپر دوسرا جاننے والا ہے یعنی ہر ذی علم
مخلوق سے زیادہ اللہ علیم ہے۔ علیم کا معنی ہے بہت زیادہ علم رکھنے والا (مراد اللہ) یا ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق
ہے۔ خواہ یہ فوقیت علمی بعض لحاظ سے ہو جیسے حضرت خضر کو بعض اعتبار سے حضرت موسیٰ پر علمی فوقیت حاصل تھی (اگرچہ
حضرت موسیٰ نبی مرسل ہونے کی وجہ سے صاحبِ شریعت تھے اور حضرت خضر پر علمی برتری رکھتے تھے مگر بعض کائناتی
واقعات کا انکشاف حضرت خضر کو تھا حضرت موسیٰ کو نہ تھا) اسی بناء پر حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا موسیٰ جو علم مجھے
اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے تم ناواقف ہو اور جو علم تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت
خضر و موسیٰ کے طویل قصہ کے ذیل میں نقل کی ہے۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تم اپنی دنیا کے کاموں کو خود ہی
مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے دوسرے سے برتر ہے ورنہ تسلسل
علمی لازم آئے گا (اگر علم کی انتہا اللہ کی ذات پر نہ مانی جائے اور یوحی مخلوق میں باہم علمی برتری اور کامل برتری کا سلسلہ قائم کیا

جائے تو یہ برتری کہیں جا کر نہیں ٹھیرے گی۔ علمی تسلسل کا یہی معنی ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر عالم کے اوپر دوسرا عالم ہے اور یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہوتا ہے پس اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔

قَالَوَا اِنْ كَيْسَرٌ فَقَدْ سَرَقَ اَخْرَجَهُ مِنْ قَبْلِ ۷
 کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یعنی یوسفؑ نے بھی چوری کی تھی جو اس کا ماں جایا تھا۔ سعید بن جبیرؒ اور قتادہ نے کہا حضرت یوسفؑ کے نانا کا ایک بت تھا وہ اس کی پوجا کرتا تھا حضرت یوسفؑ نے خفیہ طور پر اس کو لے لیا اور توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ نانا اس کی پوجا نہ کر سکے۔ کذا اخرج ابن مردويه عن ابن عباسؓ مرفوعاً۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سعید جبیرؒ کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے بیان کیا ایک روز ایک سائل آیا حضرت یوسفؑ دسترخوان سے (چھپا کر) کچھ کھانا اٹھا لیتے تھے اور فقیروں کو دے دیتے تھے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں حضرت یوسفؑ سخی گھرانے کے ایک فرد تھے اور فقیروں کو دینے پر حضرت یعقوبؑ راضی تھے اس لئے یہ چوری نہ تھی بھائیوں نے یوسفؑ کی جلن کی وجہ سے اس کو چوری کہا۔

محمد بن اسحاق نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا تو آپ اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس رہنے لگے پھوپھی کو آپ سے بڑی محبت تھی اور پھوپھی نے ہی آپ کو پرورش کیا جب آپ بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ کو آپ سے حد سے زیادہ محبت ہو گئی اور آپ نے اپنی بہن سے کہا بہن اب تم یوسفؑ کو مجھے دے دو۔ خدا کی قسم یوسفؑ کا ایک ساعت بھی میری نظر سے غائب ہونا میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے، بہن نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں اس کو چھوڑنے والا نہیں۔ بہن نے کہا اچھا تو چند روز کے لئے میرے پاس رہنے دو شاید چند روز کے بعد اللہ مجھے اس کی طرف سے صبر عطا کر دے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات مان لی حضرت اسحاق کی کمر کا ایک پٹکا تھا اور بطور وراثت بڑی اولاد کو ملتا تھا حضرت یعقوبؑ کی بہن آپ سے بڑی تھیں اس لئے وہ پٹکا بہن کو ملا تھا اور اس کے پاس تھا۔ بہن نے یہی پٹکا حضرت یوسفؑ کی کمر سے کپڑوں کے اندر لپیٹ دیا، پھر خود ہی کہا حضرت اسحاق کا پٹکا گم ہو گیا ہے، گھر والوں کی تلاشی لی جائے گی، چنانچہ سب کی تلاشی لی گئی تو حضرت یوسفؑ کے پاس برآمد ہو گیا، حضرت یعقوبؑ کی بہن نے کہا کہ اب تو یہ میری سپردگی میں رہے گا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس نے اگر ایسا کیا ہے تو تمہاری ہی سپردگی میں رہے گا (حضرت اسحاق کی شریعت میں چور کا مالک مال والا ہو جاتا تھا) غرض اس تدبیر سے حضرت یعقوبؑ کی بہن نے حضرت یوسفؑ کو مرتے دم تک اپنے پاس روک رکھا۔ یہی بات آپ کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کہی اِنْ كَيْسَرٌ فَقَدْ سَرَقَ اَخْرَجَهُ مِنْ قَبْلِ ط

فَاَسْرَهَا يَوْسُفُ فِي نَفْسِهِ وَاَمَّا يَبِيهَا لَهْمٌ
 گویا سنی ان سنی کر دی اور ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ میں نے تمہاری یہ بات سن لی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جو بات دل میں چھپالی تھی اور بھائیوں سے نہیں کہی تھی وہ بات وہی تھی جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے یعنی

قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا ۷
 یوسفؑ نے کہا یعنی دل میں کہا کہ اس چوری کے درجہ میں تو تم اور بھی برے ہو۔ یعنی یوسفؑ نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے تو اپنے بھائی کو چرایا تو تم یوسفؑ سے زیادہ برے ہو یا یہ مطلب ہے کہ تم نے چوری کی نسبت یوسفؑ کی طرف کی اس سے زیادہ بری تو تمہاری حرکت ہے۔

وَاللَّهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ۷
 اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اس سے بخوبی اللہ واقف ہے۔ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ تم بیان کر رہے ہو وہ غلط ہے۔

جب حضرت یوسفؑ نے بنیامین پر قبضہ کر لیا تو بھائی غضب ناک ہو گئے۔ اولاد یعقوب کو غصہ آتا تھا تو ان کے غصہ کو برداشت کرنے کی تاب کسی میں نہیں رہتی تھی۔ روئیل کی تو یہ حالت تھی کہ اس کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہری نہیں

رہتی تھی جب وہ غصہ سے چیختا تھا تو حاملہ عورتوں کے حمل و حشمت کی وجہ سے گر جاتے تھے لیکن یہ بھی ان کی خصوصیت تھی کہ غصہ کی حالت میں اگر نسل یعقوب میں سے کوئی شخص ان کو ہاتھ سے چھو دیتا تھا تو غصہ فرو ہو جاتا تھا۔ بعض روایت میں آیا ہے کہ یہ خصوصیت اور حالت شمعون کی تھی۔

غرض سب بھائی یوسف کے پاس پہنچے روئیل نے کہا تو ہمارے بھائی کو واپس دو ورنہ میں ایسی چیخ ماروں گا کہ مصر کی ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا غصہ سے روئیل کے بدن کے بال کھڑے ہو گئے اور کپڑوں سے باہر نکل آئے حضرت یوسف کا ایک چھوٹا بچہ تھا آپ نے بچہ سے فرمایا روئیل کے برابر جا کر اس کو ہاتھ سے چھو دو، دوسری روایت میں آیا ہے آپ نے بچے سے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ بچے نے جا کر روئیل کو ہاتھ لگا دیا۔ بچے کا ہاتھ لگانا تھا کہ روئیل کا غصہ جاتا رہا، کہنے لگا یہاں یعقوب کے تخم کا کوئی تخم ضرور موجود ہے۔ حضرت یوسف نے فرمایا (یعقوب کے تخم کا تخم کیا) یعقوب کا بیٹا موجود ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ روئیل کو دوبار غصہ آیا تو حضرت یوسف نے اس کے ایک ٹھوکری اور گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرادیا اور فرمایا عبرانیو! تم گمان کرتے ہو کہ تم سے زیادہ طاقتور دنیا میں کوئی اور نہیں ہے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور بھائی سمجھ گئے کہ بنیامین کو کسی طرح چھڑا نہیں سکتے تو عاجزی کرنے لگے اور نرم پڑ گئے اور

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَكَ أبا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ، إِنْ أَنْزَلْتَكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝۴۸

کہنے لگے اے عزیز اس کا بوڑھا باپ ہے (جو اس سے بڑی محبت کرتا ہے اس کا بھائی تو مر چکا ہے یہی باپ کے دل کا بہلاوا ہے مہربانی کیجئے) اور ہم میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے ہم جانتے ہیں کہ آپ بھلائی کرنے والوں میں سے ہیں (بھلائی اور مہربانی کرنے کی آپ کی عادت ہی ہے آپ اپنے اخلاق کو نہ بدلیں آپ نے ہم پر کرم کیا ہے ہم کو پورا پورا غلہ دیا اچھی طرح مہمان رکھا، ہمارا سرمایہ بھی ہم کو لوٹا دیا پس یہ بھی کرم کیجئے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی اور کو پکڑ لیجئے۔

یوسف نے کہا جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے اس کی جگہ دوسرے کو پکڑ لیں اس نا انصافی سے اللہ کی پناہ (ایسا نہیں کر سکتے مجرم کی جگہ دوسرے کو پکڑنا تو تمہارے فتوے کے لحاظ سے بھی ظلم ہے)

حضرت نے مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ فرمایا مَنْ سَرَقَ نہیں فرمایا کیونکہ بنیامین نے چوری نہیں کی تھی، اس کے سامان میں شاہی پیمانہ ملا تھا۔

اِنَّ اِذَا الظَّالِمُونَ ۝۴۹ اگر ہم ایسا کریں گے تو تمہارے ہی قانون اور فتوے کی رو سے اس وقت ہم ظالم ہوں گے۔ حضرت یوسف کے کلام کا مفہوم اور مقصد یہ تھا کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ جس کے سامان میں پیمانہ برآمد ہو اس کو پکڑ لیا جائے ہم اللہ کی رضامندی کے لئے ایسا کریں گے اس کے خلاف کریں گے تو ظلم ہو گا اور ہم ظالم قرار پائیں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْسَوْا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۝۵۰ جب بھائی کی طرف سے نا امید ہو گئے تو الگ جا کر باہم مشورہ کیا۔ ابو عبیدہ نے ترجمہ کیا جب انہوں نے یقین کر لیا کہ بنیامین کی واپسی نہیں ہو سکتی۔

نجیاً بمعنی جمع ہے اگرچہ لفظ مفرد ہے یعنی الگ جا کر ایک نے دوسرے سے مشورہ کیا اور سب مشورہ کرنے لگے۔

بڑے نے کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا عمر میں بڑا ہونا مراد نہیں، بلکہ علم و فضل میں بڑا ہونا مراد ہے، اور یہ یہود تھا، کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ، سدی اور ضحاک کے نزدیک عمر میں بڑا مراد ہے یہ روئیل تھا، اسی نے حضرت یوسف کو قتل کرنے سے بھائیوں کو روکا تھا، مجاہد نے کہا وہ شمعون تھا بھائیوں کا سفر میں وہی سردار تھا۔

الْمُتَعَلِّمُونَ اِنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْتَقًا مِّنَ اللّٰهِ ۝۵۱ باپ نے تم سے اللہ کی قسم کے ساتھ مضبوط عہد لے لیا تھا۔

اور یوسف کے معاملہ میں بھی جو تم تصور کر چکے ہو کیا تم اس سے

وَمِنْ قَبْلِ مَا فَرَطْتُمْ فِي يُوسُفَ ۝۵۲

تا واقف ہو۔ مَافَرَطْتُمْ میں مازیاہ ہے یا مصدری یا صولہ۔ بیضاوی کے نزدیک مَافَرَطْتُمْ رفع میں نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کو متبدا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ مِنْ قَبْلِ اس وقت خبر ہوگا تو قَبْلِ کا مضاف الیہ مذکور ہونا ضروری ہے۔

فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِیَٰٓأَبِیؕ

اس لئے میں اس سر زمین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تا وقتیکہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے۔

بِاللَّهِ حَكْمٌ دَعَىٰ دَعَىٰ یعنی یعقوب کی معرفت اللہ مجھے یہاں سے جانے اور بھائی کو چھوڑ جانے کا حکم بھیج دے یا میرے بھائی کو رہا کرنے کا حکم دے دے یا بھائی کو چھڑانے کے لئے اہل مصر سے لڑنے کا حکم دے دے۔

وَهُوَ خَيْرُ الْحَكِيمِينَ ﴿۱۰﴾ اور وہ سب حاکموں سے اعلیٰ اور بالا ہے اس کا حکم غلط نہیں ہوتا۔

إِرْجِعُوا إِلَىٰٓ أٰبِیْکُمْ فَقُولُوا یٰٓاَبَانَا اِنَّ اَبْنٰکَ سَرَقَ ؕ

کہہ دو آبا آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کی۔ یعنی بظاہر امر ہم نے اس کے سامان سے چوری کا مال برآمد ہوتے دیکھا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے چوری کی)

اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو مشاہدہ سے ہم کو معلوم ہوا۔ یعنی ہم جو کہہ رہے ہیں کہ اس نے چوری کی اس وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو یقین ہو چکا اور ہم نے خود دیکھ لیا کہ بادشاہ کا پیمانہ اس کے تھیلے سے برآمد ہوا۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہم نے کوئی شہادت کبھی بغیر ذاتی علم کے نہیں دی اس لئے ہماری طرف سے شہادت نہیں ہے (ہم کو حقیقت کا کیا علم ہمارے سامنے تو اس نے چرایا نہیں۔ مترجم) بلکہ آپ کے بیٹے کی حرکت کی اطلاع ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ حضرت یعقوب نے ان سے فرمایا عزیز مصر کو تو معلوم نہ تھا کہ چور کو چوری کی سزا میں غلام بنا لیا جاتا ہے یہ بات اس کو تمہارے قول سے معلوم ہوئی اس کے جواب میں بیٹوں نے کہا ہم نے تو عزیز مصر سے وہی بات کہی جو ہم کو (اپنے مذہب سے) معلوم تھی۔ حضرت یعقوب اور آپ کی اولاد کا چور کے متعلق شرعی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِیْنَ ﴿۱۱﴾ اور غیب کی باتوں کے تو ہم حافظ تھے نہیں (یابہ ترجمہ ہے کہ باطنی احوال کے تو ہم نگران تھے نہیں) حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے تو نگران تھے نہیں، ممکن ہے رات کو اس کے سامان میں پیمانہ چھپا دیا گیا ہو (اور واقع میں اس نے نہ چرایا ہو) مجاہد اور قتادہ نے یوں مطلب بیان کیا کہ جب قسم کھا کر ہم نے عہد کیا تھا تو ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا آئندہ چوری کرے گا (اور پکڑا جائے گا) اور آپ پر ویسی ہی پتلا پڑے گی، جیسی یوسف کی پڑی تھی ہم نے جو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا تو انہی چیزوں سے کیا تھا جن سے حفاظت ممکن تھی۔

وَسَعَلَ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا

مراد ہے مصر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مصر کا وہ گاؤں مراد ہے جہاں منادی نے آکر روکا تھا اور اسی جگہ سے ان کو مصر واپس لوٹا پڑا تھا۔

وَالْعِیْرَ الَّتِیْ اَقْبَلْنَا فِیْهَا

اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں اس سے بھی آپ دریافت کر لیں۔ حضرت یعقوب کے ہم وطن کچھ کنعانی باشندے بھی اسی قافلے میں آئے تھے ابن اسحاق نے کہا جو بھائی مصر میں رُک گیا تھا وہ جانتا تھا کہ یوسف کے سابق واقعہ کی وجہ سے میں اور میرے بھائی باپ کی نظر میں مہم ہیں اس لئے اس نے بھائیوں سے کہا کہ باپ سے یہ بات کہنا۔

وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۲﴾ اور ہم بلا شک و شبہ یقیناً سچے ہیں۔

بقول بغوی ایک شبہ

حضرت یوسف نے باپ کو اپنی موجودگی کی اطلاع نہیں دی بلکہ اپنے بھائی بنیامین کو بھی ہمیشہ کے لئے روک لیا اور باپ

سے جدا کر دیا حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ میری جدائی میں باپ کا کیا حال ہو اور بنیامین کے چھوٹے سے کیا حال ہوگا، آپ کے اس کردار سے تو قطعاً حرم، عقوق اور سنگ دلی کا مظاہرہ ہو رہا ہے آپ نے ایسا کیوں کیا۔

حضرت مفسر کی صراحت کے موافق شبہ کا ازالہ

لوگوں نے اس کردار اور سلوک پر بہت لے دے کی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے قلبی تقاضوں کے خلاف یہ سب کچھ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا۔ اللہ کو یعقوب کا پے در پے کڑا امتحان لینا تھا تاکہ ان کے درجات میں ترقی کی جائے اور اسلاف کی صف میں ان کو شامل کر دیا جائے (حضرت ابراہیم کا بھی تو بار بار بہت سخت امتحان لیا گیا ہے یہاں تک کہ بیٹے کو خود زنج کر دینے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے پہلے بے آب و گیاہ، ویران ریگستان میں شیر خوار بچہ اور اس کی ماں کو ڈال دینے کا حکم ہو چکا تھا مگر یہ تمام امتحان درجات نبوت تھے جس میں حضرت ابراہیم پورے اترے اس سے کم درجے کا امتحان حضرت یعقوب کا لیا گیا اور فقط بیٹوں کو باپ سے جدا کر دیا گیا۔ مترجم)

بعض نے کہا حضرت یوسف نے بھائیوں سے اپنا یوسف ہونا ظاہر نہیں کیا کیونکہ آپ کو اندیشہ تھا کہ بھائی کوئی اور سازش نہ کریں اور باپ کو جا کر اطلاع نہ دیں، باپ سے چھپالیں (آپ چاہتے تھے کہ اس تدبیر سے باپ مصر میں آجائیں اور آکر اپنی آنکھوں سے یوسف کی حالت دیکھیں۔ مترجم) اول جواب ہی صحیح ہے دوسرا جواب کچھ نہیں ہے۔

یہ فقیر مترجم کہتا ہے کہ حضرت یوسف کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج ان کو سجدہ کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی تھی جس کی ظہوری صورت اللہ نے یہ پیدا کر دی گویا جو کچھ ہو اس سب کا اہتمام اللہ نے ظہور واقعہ سے پہلے کر دیا تھا ترتیب ظہوری تو بعد کو ہوئی اس لئے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور حضرت مفسر قدس سرہ کا جواب ہی صحیح جواب ہے۔

غرض بڑے بھائی کو مصر میں چھوڑ کر دوسرے نو بھائی کنعان کو لوٹ آئے اور بڑے بھائی نے جو کچھ کہا تھا وہ باپ سے عرض کر دیا۔

قال یعقوب نے کہا۔ بات یوں نہیں جیسی تم نے بیان کی۔

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا
بلکہ تم نے خود اپنے دل سے اپنے لئے ایک بات بنالی ہے بادشاہ کو کب معلوم تھا کہ (شریعت اسرائیلی میں) چور کو پکڑ کر غلام بنالینے کا حکم ہے تم خود اس غرض کے لئے بھائی کو مصر لے گئے تاکہ تم کو کچھ فوری فائدہ مل جائے۔

فَصَبْرٌ جَبِيلٌ
سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (یعنی لوگوں سے شکایت نہ ہوگی)
عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَبِيلًا
اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا یعنی یوسف کو بنیامین کو اور جو بھائی مصر میں رہ گیا ہے ان کو سب کو۔

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۴۲)
(میرے اور ان کے احوال سے) وہی خوب واقف ہے (اور اپنے انتظام اور تدبیر میں) حکمت والا ہے۔ اس نے مجھے اس دکھ میں بھی کسی مصلحت ہی سے ڈال ہے۔ بنیامین کے قید اور غلام ہو جانے کی اطلاع جب حضرت یعقوب کو پہنچی تو اس وقت آپ کا غم و اندوہ آخری حد پر پہنچ گیا اور خیال کر لیا کہ ان بیٹوں کی سازش سے مجھے یہ پیہم دکھ پہنچے ہیں۔

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ
اور سب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

وَقَالَ يَا سَفَى عَلَى يَوْسُفَ
اور افسوس و حسرت سے کہنے لگے ہائے یوسف۔ اُسف کا معنی ہے انتہائی حزن و اندوہ۔ اُسف اصل میں اُسفٰی بیاء متکلم تھا۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے موقوفاً سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے امت محمدیہ کے کسی اور امت کو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ حضرت یعقوب پر

بھی پتاپڑی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ نہیں کہا بلکہ حسرت و افسوس کا اظہار کیا۔ بیہتی نے بھی یہ روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضعیف سند میں بوساطت حضرت ابن عباسؓ اس کو مرفوعاً بیان کیا گیا ہے۔ ثعلبی نے سعید بن جبیرؓ کے طریق سے اس کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔

اور روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ

وَ اَبْصَرَتْ عَیْنُہُ مِنَ الْحُزْنِ فَہُوَ كَظِیْمٌ ﴿۸۴﴾
غم سے جی ہی جی میں گھٹا کرتے۔

یعنی روتے روتے آنکھوں کی سیاہی جاتی رہی اور نابینا ہو گئے۔ مقاتل نے کہا چھ برس نابینا رہے۔ بعض اہل تفسیر نے تشریح کی کہ نگاہ کمزور ہو گئی (یعنی آنکھوں کے سفید ہونے سے مراد ہے نگاہ کا ضعف)

کظم سانس کا مخرج اخذ بکظمہ اس نے فلاں شخص کے سانس باہر آنے کے راستے کو پکڑ لیا۔ کظوم سانس رک جانا، سانس بند ہو جانا، مجازی معنی خاموش ہو جانا۔ کظیم بمعنی کاظم جس کا سانس رک گیا ہو، بند ہو گیا ہو۔ مطلب یہ کہ یعقوب اپنے غم و غصے کو ضبط کرنے والے تھے لوگوں سے کہتے نہ تھے۔ اسی سے ہے کظم البعیر اونٹ نے جگالی کرنی چھوڑ دی اور کھائی ہوئی غذا پیٹ میں روک لی۔

کظم السقاء بھرنے کے بعد مشک کا منہ باندھ دیا۔ کظیم کا معنی کبھی پُر بھرا ہوا بھی آتا ہے۔ بھری ہوئی مشک کا منہ باندھ دیا جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے بند کر دیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر معنی کے لحاظ سے کظیم بمعنی کظوم ہو سکتا ہے یعنی غم و غصہ سے بھرا ہوا۔

قادر نے کہا حضرت یعقوبؑ کے سینے میں غم گھومتا تھا مگر زبان سے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔ حسن نے کہا جس روز سے یوسفؑ باپ کی گود سے جدا ہوئے اس روز سے یوم ملاقات تک اسی ۸۰ سال گزر گئے اور اس مدت میں یعقوبؑ کا آنسو خشک نہیں ہوا باوجود یہ کہ آپ کے زمانے میں روئے زمین پر آپ سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی عزت نہ تھی اور اللہ کو آپ سے زیادہ پیارا کوئی نہ تھا۔

تنقیح مبحث

علماء تصوف اور اصحاب معرفت کہتے ہیں کہ فناء قلب کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ اللہ کے سوا کسی سے نہیں رہتا اور سوائے محبوب حقیقی کے کسی مخلوق کی محبت کی گنجائش ہی نہیں رہتی، حضرت یعقوبؑ تو جلیل القدر پیغمبر اور صاحب بصیرت مقرب ولی اللہ تھے، یوسفؑ کی محبت آپ کے دل میں کیسے سما گئی اور فراق یوسفؑ میں اتنے کیوں روئے کہ نور نظر جاتا رہا۔ اگر اس کی یہ توجیہ کی جائے کہ سارا عالم جلوہ گاہ الوہیت اور آئینہ حقیقت ہے یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کے دل کی وابستگی حقیقت سے دوسروں سے دل کا لگاؤ نہ ہونے کی کیا وجہ۔ اس کے علاوہ یہ کہ عالم کو جلوہ گاہ حقیقت سمجھ کر غیر اللہ سے دل کی وابستگی تو علم تصوف کی ابتداء یا توسط کا درجہ ہے، حضرت یعقوبؑ تو کاملین میں سے تھے معرفت کی آخری چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے ان کے دل کا یوسفؑ سے لگاؤ اور وابستگی کس طرح ممکن تھی۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تنقیح پر غور کرو۔

تنقیح :-

فناء کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ کسی دنیوی چیز سے نہیں رہتا آخرت سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی حالت اس سے جدا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ ملعون ہے، مگر اللہ کی یاد اور اللہ کی یاد پیدا کرنے والی چیزیں اور عالم اور طالب علم (ملعون نہیں ہے) یہ حدیث ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اور طبرانی سے صحیح سند سے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے بزار نے بھی حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

آخرت اللہ کو پسند ہے اور اس سے دل کا تعلق بھی پسند ہے ارشاد خداوندی ہے وَاذْكُرْ عِبَادَنَا اِبْرٰہِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَاٰدَمَ

يَعْقُوبَ اُولِي الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ ميرے خاص بندوں ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب کا ذکر کرو جو طاقت والے اور صاحبان بصیرت تھے۔ یعنی اللہ کی اطاعت میں قوی اور اللہ کی معرفت و بصیرت رکھنے والے تھے۔

اِنَّا اَخْلَصْنَا هُمْ بِخَالِصَةِ ذِكْرِي الدَّارِ ہم نے ان کو ایک خصلت خالص طور پر عطا کی تھی جس میں کوئی کدورت اور آمیزش نہ تھی یعنی دارِ آخرت کی یاد کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ مالک بن دینار نے فرمایا مراد یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی محبت اور یاد اُن کے دلوں سے نکال لی تھی اور آخرت کی محبت اور یاد کیلئے ان کو مخصوص کر دیا تھا ہر عمل و ترک عمل میں آخرت ہی ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ آخرت ہی کو دارِ مکان کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا مکان نہیں گزر گاہ ہے اور مکان صرف آخرت ہے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت اور آخرت کی یاد ہی اللہ کو پسند ہے اور آخرت کی ہر چیز قابل پسندیدگی اور مستحق ستائش ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ ایک سردار نے ایک مکان بنو لیا (مکان کے اندر) دسترخوان لگو لیا اور کھانے والوں کو بلانے کے لئے ایک بلانے والے کو بھیجا بلانے والے نے جا کر لوگوں کو کھانے کی دعوت دی داعی کی دعوت کو جس نے قبول کر لیا اس نے گھر کے اندر آ کر دسترخوان سے کھانا کھالیا۔ اور سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہیں کیا وہ گھر میں داخل نہ ہو اور نہ کھانا کھایا اور سردار اس سے ناراض ہو گیا۔ پس اللہ سردار ہے محمد داعی ہے اور گھر اسلام ہے اور دسترخوان جنت ہے رواہ الدارمی عن ربیعۃ الجرجسی۔

یہ معرفت کی وہ چوٹی ہے جس پر کالمین ہی کی رسائی ہے، عوام اور ابتدائی زینے پر قدم رکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے درمیانی درجہ والوں کی بھی وہاں تک پہنچ نہیں ہے۔ رابعہ بصری کو اگر معرفت کی یہ رفعت حاصل ہوتی تو وہ نہ کہتیں کہ میں جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں تاکہ جنت کے لالچ میں لوگ اللہ کی عبادت نہ کریں۔ خالص اللہ کے لئے اس کی عبادت کریں، کیا ان کو یہ آیت معلوم نہ تھی، اللہ تو فرماتا ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ یعنی جو شخص اللہ سے ملنے کا امیدوار ہے تو اللہ کی ملاقات کا وقت آخرت میں ضرور آنے والا ہے اور جنت اس کی ملاقات کا نام ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت کی مٹی پاکیزہ (خوشبودار) اور اس کا پانی شیریں ہے اور وہاں بڑے میدان ہیں (جہاں سرسبز درخت ہیں) اور اس کے درخت یہ (تتزیی کلمات) ہیں سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ رواہ الترمذی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہما صحیحین نے صحیحین میں اور حاکم و طبرانی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں تمہارے لئے ہر ایک لفظ کے بدلہ میں جنت کے اندر ایک درخت لگایا جائے گا۔

حضرت مجدد قدس سرہ نے فرمایا تتزیی معنی کا دنیوی لباس تو یہی (سبحان اللہ وغیرہ) حروف و الفاظ ہیں آخرت میں ان کا پیرایہ ظہور جنت کے پھل و درخت ہیں (دنیا میں ان کلمات کے ساتھ اور آخرت میں جنت کے ساتھ) محبت کا تعلق گویا تتزیی معنی سے وابستگی (کی شکل) ہے۔

حضرت مجدد نے فرمایا میں کہتا ہوں کہ ہر شخص کی جنت یہ ہے کہ اللہ کے اسماء و صفات میں سے جو اسم بھی اس شخص کے تعین اور تشخص کا مبداء ہے اس کا ظہور ہو جائے اور یہ ظہور اس شخص کے لئے درختوں، نہروں، شاندار مکانوں اور حوروں، غلمان کی شکل میں ہو گا اور چونکہ اللہ کے اسماء و صفات میں تفاوت ہے، کوئی صفت جامع ہے کوئی غیر جامع۔ کسی کا قرب ذات سے زیادہ ہے کسی کا کم پس جیسی صفت کسی کا مبداء تعین ہوگی ویسی جنت اس کے لئے ہوگی، جنتوں کے تفاوت اور اونچ نیچ کا فرق اسماء و صفات کے تفاوت کی وجہ سے ہو گا۔ لہ جنت کے بعض درخت بلوری اور آبیگی اجسام کی شکل و کیفیت کے بھی ہو جائیں گے۔

لے اللہ کی صفات متعدد ہیں رحمانیت میں بھی اس کی صفت ہے اور رحمن اور حیم اس کا وصفی نام ہے اسی طرح قدرت، علم ارادہ مشیت وغیرہ اس کی صفات ہیں اور قدیر، علیم، مرید وغیرہ اس کے نام ہیں اب جس شخص کی تعین ذات جس اسم کی پر تو اندازی سے ہوئی ہے ویسی ہی جنت اس کے لئے ہوگی کیونکہ جنت ایک شکل ہے صفت خداوندی کی۔ ان صفات میں بعض جامع ہیں اور بعض کا درجہ ذات کے قریب ہے جیسے صفت الوہیت یا قدرت یا علم پس جس شخص کا مبداء تعین یہ صفات ہوں گی اس کو ایسی جنت ملے گی جو جامع نعم اور ذات کی جلوہ پاشی کے قریب ہوگی۔ (مترجم)

پس ایسے ہی درخت اس حالت میں ذاتِ بے کیف کے دیدار کے ذرائع بن جائیں گے اور رؤیتِ ذاتِ بے کیف ہو جائے گی۔ پھر ان درختوں کی بلوریت ختم ہو جائے گی تو وہ آئینہ ذات بھی نہیں رہیں گے اور اس حالت میں رؤیت نہ ہوگی۔ چکا چوند کی یہ حالت اور درختوں کی بلوریت و عدمِ بلوریت ہمیشہ ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

ایک شبہ

تمام ممکنات (خواہ ان کا ظہور دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ مترجم) اپنی ذات کے لحاظ سے معدوم ہیں ناقص ہیں ہشر ہی ہشر ہیں، حسن ذاتی سے محروم ہیں ان میں جو حسن و جمال آیا ہے اور جس خیر و کمال کا ظہور ہو رہا ہے وہ واجب تعالیٰ کا عطیہ ہے اسی کا فیض ہے پھر دنیوی و اخروی چیزوں میں کیا فرق ہے اور کیوں دنیوی چیزوں سے دل کی وابستگی جرم ہے اور اخروی چیزوں سے دل کا لگاؤ قابل ستائش ہے۔

ازالہ

ہم کہتے ہیں تمام ممکنات اللہ کے اسماء و صفات کا مظہر ہیں اور اللہ کی صفات بھی بجائے خود اور بذات خود ممکن ہیں کیونکہ ذات کی محتاج ہیں (اور ہر محتاج کا ممکن ہونا ظاہر ہے) لیکن ذاتِ خداوندی کے لئے ان کا ثبوت لازم ہے (کیونکہ ذاتِ صفات سے خالی نہیں ہو سکتی اور بغیر صفات کے ذات کا نہ تحقق ہو سکتا ہے نہ تعقل) پس یہ واجب بالغیر ہو گئیں یعنی ذات کی وجہ سے یہ بھی واجب ہو گئیں لیکن صفاتِ الہی پر امکان اور وجود بالغیر کا اطلاق اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان کے حدوث کا وہم نہ ہو جائے اور ذات سے منفک ہو سکنے کا خیال نہ پیدا ہو جائے ورنہ واقعہ میں صفاتِ خداوندی ممکن ہیں اور چونکہ ذات سے ان کا انفکاک محال ہے اس لئے واجب بالغیر بھی ہیں، اہل معرفت کیلئے ان صفات کا انکشاف ہوتا ہے تو ان کے دورِ رخ نظر آتے ہیں ایک رخ ان کے امکانِ ذاتی کا ہوتا ہے جسکی وجہ سے ان میں عدم کا احتمال ہوتا ہے اور دوسرا رخ وجوب بالغیر کا ہے جو سر اسر وجود ہی وجود ہے۔ وجود کا رخ تو سر تاپا حسن و جمال اور خیر و کمال ہے اور عدم کا رخ بھی اگرچہ امکانِ ذاتی کی وجہ سے قبیح، شر، ناقص اور ہر کمال سے بے بہرہ ہے مگر وجود کے ساتھ ہر وقت ہم آغوش رہنے اور غیر متفک ہونے کی وجہ سے فی الجملہ حسن سے خالی نہیں ہے خواہ یہ حسن و جمال وہمی ہی ہو۔ پس صوفی کی نظر میں صفاتِ الہیہ کی جلوہ پاشی اور پرتو اندازی دو شکلوں میں دکھائی دیتی ہے دنیوی چیزوں میں تو اس کو صفات کا عدمی رخ (یعنی ذاتی امکان) پرتو انداز نظر آتا ہے اور آخرت کی چیزوں میں ان کا وجودی رخ (یعنی وجوب بالغیر کا رخ) عکس ریز دکھائی دیتا ہے اسی وجہ سے دنیوی اشیاء سے وابستگی اللہ کے نزدیک بری ہے اور اخروی چیزوں سے دل کی آویختگی اللہ کو پسند ہے ان سے محبت اللہ سے محبت ہے جو لوگ اللہ کی محبت میں کامل ہیں وہی دارِ آخرت سے بھی کامل محبت رکھتے ہیں۔ دنیوی اور اخروی اشیاء میں یہی فرق ہے اور ایک سے محبت کے عدم جواز اور دوسری سے محبت کے وجوب کی یہی علت ہے۔ تمہید مذکور کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حضرت مجددِ قدس سرہ نے مکتوبہٴ جلد سوم میں بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف کا

لے فقیر مترجم کی ناقص سمجھ میں حضرت محقق کی تشریح صفات نہیں آئی۔ خلاصہً تشبیح اور تشریح کا سنگ بنیاد یہ ہے۔ کہ صفاتِ الہیہ بالکل ذات کے علاوہ ہیں اور ممکن الذات ہیں۔ البتہ ان کا ثبوت ذات کے لئے واجب ہے اس لئے واجب بالغیر ہیں پس ان کا عدم ذاتی ہے اور وجوب و وجود عارضی یا لحوقی۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو پھر ان غلط گو مشائخہ فلاسفہ کے قول کو کیوں تسلیم نہ کیا جائے جو اس سارے عالم کو ممکن الذات محتاج الی الواجب اور قدیم بالغیر یعنی ازلی ابدی کہتے ہیں اور قائل ہیں کہ یہ علم اپنی ذات کے اعتبار سے واجب کا محتاج ہے اس کا عدم ذاتی ہے لیکن معلول کا تحلف علتِ تالیفہ سے نہیں ہوتا۔ اس لئے قدیم بالواجب ہے یعنی اس میں قدامت واجب کی وجہ سے آئی ہے پس یہ ساری کائنات قدیم بالنوع ہے اگرچہ ظہور شخصی اور تعیناتِ شخصیہ کے اعتبار سے اس میں تغیرات ہر وقت رونما ہوتے رہتے ہیں۔ رئیس الفلاسفہ شیخ ابن سینا نے بھی تو اس عالم کے متعلق وہی بات کہی ہے جو حضرت مفسر نے صفات کے متعلق فرمائی۔ شیخ بھی ہر مادہ کو قدیم بالغیر اور ممکن الذات کہتا ہے۔ خواہ مادہ عنصری ہو یا فلکی اور صورت جسمیہ کو طبیعتِ نوعیہ کہتا ہے جو قدیم ہے اگرچہ اس کے افراد حادث ہیں۔ افراد کا حدوث نوع کے حدوث کو مستلزم نہیں۔ اثباتِ ہیولی کے خاتمہ پر شیخ نے اشارات میں ایک مجمل جملہ لکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ ومن ہھنا ظہر ثلاث نکات۔ محقق طوسی اور امام رازی نے اس جملہ کی تشریح میں ایک نکتہ یہ بیان کیا کہ اس سے قدم عالم ثابت ہو جاتا ہے (لیکن یاد رکھو کہ یہ قدم ذاتی نہیں قدم بالغیر ہے۔ قدم ذاتی کا تو کوئی فلسفی قائل نہیں)۔

وجود اور آپ کا حسن و جمال اگرچہ اسی دار دنیا میں پیدا ہوا لیکن دوسری مخلوق کی طرح نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ موجوداتِ آخرت کی جنس میں سے تھا دنیوی اشیاء کا مرتبی تو صفات کا عدمی (ذاتی) رخ ہوتا ہے اور جنت اور اس کی موجودات کی تربیت صفات کا وجودی رخ کرتا ہے پس جس طرح اہل کمال کی قلبی وابستگی آخرت کی چیزوں سے درست ہے اسی طرح حضرت یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کی شیفتگی بھی نامناسب نہیں۔

حضرت مجدد کا یہ صحیح انکشاف اور واضح بصیرت ہے نظر اور کشف نے ہی آپ کو حسنِ یوسفؑ کی اس تنقیح تک پہنچایا ہے۔ اگر اس تحقیق کو مان لیا جائے تو دو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا شبہ

حضرت مجدد قدس سرہ نے ایک اور جگہ صراحت کی ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکناتِ ظلالِ اسماء و صفات (اسماء و صفات کے عکس اور پرتو) کے جولان گاہ اور مقاماتِ ظہور ہیں۔ نفسِ اسماء و صفات کے مظہر و جلوہ گاہ نہیں ہیں (یعنی انبیاء و ملائکہ کے علاوہ دوسری مخلوق پر براہِ راست صفات و اسماء کا پرتو نہیں پڑتا بلکہ ظلالِ صفات کا عکس پڑتا ہے) اور (جس طرح انبیاء و ملائکہ کا مبدع تعیناتِ اسماء و صفات ہیں اسی طرح ظلالِ صفات دوسری مخلوق کے تعین کا مبدع ہیں نفسِ صفات اس کے لئے مبدع تعین نہیں۔ لیکن اس جگہ فرمایا کہ تمام ممکنات (مجررہ ہوں یا ناؤیہ انبیاء ہوں یا اولیا خواص ہوں یا عوام) کے مبادی تعین اصلِ اسماء اور نفسِ صفات ہیں۔ یہ بیان میں تضاد اور اختلاف کیوں ہے۔ اور کیسے ممکن ہے کہ دنیوی اشیاء بھی جلوہ گاہِ صفات ہوں اور اخروی اشیاء بھی پرتو گاہِ اسماء لیکن اول الذکر کی طرف سے صفات کا عدمی اور امکانی رخ ہو اور مؤخر الذکر کی مظہریت صفات کے وجودی رخ کی ممنون کرم۔

ازالہ

انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکنات اگر ظلالِ صفات کی جولان گاہ اور مظاہر ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نفسِ صفات کے مظاہر اور جلوہ گاہ نہ ہوں کیونکہ ظل کا ظل اصل کا ظل ہوتا ہے، پس یہ ممکناتِ ظلالِ صفات کے ظل ہیں تو نفسِ صفات کے بھی ظل ہوں گے (اول ظلیت براہِ راست ہوگی اور دوسری ظلیت بالواسطہ) پس اسماء و صفات انبیاء اور ملائکہ پر جلوہ انداز ہوں گے بالواسطہ اور باقی ممکنات پر ان کی جلوہ پاشی ظلال کی وساطت سے ہوگی۔ اس کے بعد دنیوی اشیاء پر صفات کی جو جلوہ پاشی بواسطہ ظلال ہو رہی ہے اس جلوہ پاشی میں صفات کا عدمی رخ (یعنی ذاتی امکان) ملحوظ ہے۔ اور اخروی اشیاء پر جلوہ ریزی میں ان کا وجودی اور اضافی یعنی ذاتِ خداوندی کے لئے ثبوت و جوبی کا رخ معتبر ہے۔

دوسرا شبہ

کلام سابق سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمام مخلوق خواہ انبیاء ہوں یا عوام علاوہ حضرت یوسفؑ کے جلوہ گاہِ صفات اور جولان گاہِ اسماء ہیں لیکن صفات کا عدمی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے ذاتی امکانی عدمی رخ کی جلوہ گاہ تمام مخلوق ہے) اور حضرت یوسفؑ بھی صفاتِ خداوندی کا مظہر ہیں مگر اس میں صفات کا اضافی وجودی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے وجودی اور نسبت الی الذات کا پرتو حضرت یوسفؑ پر پڑا تھا اسی لئے آپ آخرت کی چیزوں کے ہم جنس ہو گئے تھے) اس سے حضرت یوسفؑ کی تمام انبیاء بلکہ سید الانبیاء پر فضیلت لازم آتی ہے۔

ازالہ

آخرت کی جنس سے تو تمام ہی انبیاء تھے حسنِ آخرت تو سب ہی کے اندر پوشیدہ تھا کہیں یوسفی لقب پا کر ظاہر ہو گیا کہیں ظاہر نہیں ہوا لقب کا مفہوم کوئی اہمیت نہیں رکھتا حق بات یہی ہے کہ تمام انبیاء صفات کے وجودی رخ کے اعتبار سے مظہر صفات ہیں۔ ان پر صفات کی نور پاشی ذاتی اعتبار سے نہیں بلکہ نسبت الی الہی کے اعتبار سے ہے۔ رہا حسنِ آخرت کا علاوہ یوسفؑ کے اوروں سے عدمِ ظہور تو اس کی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے ہم واقف نہیں بہر حال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ انبیاء کا مظہر

صفات ہونا دوسرے انسانوں کے مظہر صفات ہونے سے الگ نوعیت کا ہے عدمی رخ کے اعتبار سے نہیں بلکہ صفات کے وجودی رخ کے لحاظ سے ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے حضور ختم المرسلین ﷺ کے حسن کے متعلق لکھا ہے کہ محمد ﷺ کی تربیت کرنے والا اور آپ ﷺ کا مبدع تعین اللہ کا علم اجمالی ہے صفت علم اجمالی تمام صفات سے زیادہ ذات سے قریب رکھتی ہے۔ علم حضوری اور عالم و معلوم تو متحد الذات ہی ہوتے ہیں باقی صفات قدرت، ارادہ، کلام، سمع و بصر کا درجہ علم کے برابر نہیں ان صفات کی تفصیلات سے بھی علم اجمالی کا مرتبہ بلند اور ذات سے قریب ترین ہے۔ علم کا وہ حسن ذاتی ہے جو دوسری صفات کو حاصل نہیں۔ علم بہ نسبت دوسری صفات کے ذاتِ خداوندی کو زیادہ پسند ہے علم کا حسن و جمال بے کیف ہے۔ علم کا حسن و جمال اتنا لطیف ہے کہ ختم المرسلین میں جب یہ جلوہ پاش ہوا تو بصارت کے ضعف اور نارسائی کی وجہ سے حسن محمد ﷺ کو بھی اسی طرح آنکھیں نہیں پاسکتیں اور نہیں دیکھ سکتیں جیسے ذاتِ خداوندی کو دیکھنے اور پانے سے اس دنیا میں عاجز ہیں۔ آخرت میں آپ کا جمال باکمال نمودار ہوگا اور آنکھوں کو نظر آئے گا۔

یہ تسلیم ہے کہ یوسف کو ۲۱۳ حسن عطا کیا گیا تھا لیکن وہ اس دنیا میں تھا اور آخرت میں تو حسن محمدی ﷺ ہوگا (کسی پیغمبر کو وہ حسن حاصل نہ ہوگا) دیکھو رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا ہے میرے بھائی یوسف زیادہ شگفتہ رنگ کے تھے اور میں زیادہ سلیح ہوں اہل نظر کو صباحت و ملاحت کے درمیان ایسا فرق نظر آتا ہے جو چاند اور سورج یا چاندی اور سونے کے درمیان ہے، حسن یوسف پر فریفتہ حضرت یعقوب اور دوسرے انسان تھے اور حسن محمدی ﷺ سے محبت رکھنے والا یعقوب کا رب ہے۔ مٹی کس طرح خالق کائنات کی ہمسری کر سکتی ہے اس ساری تقریر سے واضح ہو گیا کہ فناء قلب کے بعد صوفی کو اللہ کے سوا کسی مخلوق سے دل بستگی نہیں رہتی اس کے دل میں ماسوا اللہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی محبت سے بھی صوفی کا دل خالی ہو جاتا ہے انبیاء کی محبت تو بعینہ اللہ کی محبت ہے۔ متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایماندار نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ مجھ سے اس کو محبت اپنے باپ، اولاد اور تمام لوگوں کی محبت سے زیادہ نہ ہو۔ یہ حدیث حضرت انس کی روایت سے آئی ہے حضرت انس کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی شیرینی ان خصائل کی وجہ سے پالے گا تین میں سے ایک یہ ہے کہ جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ان کے ماسوا سے زیادہ محبت ہو وہ حلاوتِ ایمان پالے گا۔

حضرت رابعہ بصری نے فرمایا تھا میرے دل کے اندر اللہ کی محبت اتنی بھر گئی ہے کہ محمد ﷺ کی محبت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ کا یہ کلام حالتِ سُکر کا ہے۔ حضرت مجدد نے بھی اپنی ابتدائی حالت میں غلبہ سُکر ہی کے زیر اثر فرمایا تھا میں اللہ سے محبت اس لئے کرتا ہوں کہ اس نے محمد کو پیدا کیا ہے۔ یہ کلام بھی حالتِ جذب کا ہے اگرچہ اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔

مسئلہ

یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ مصیبت پر رونا اور اظہارِ افسوس کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں نوحہ اور اس جیسی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو۔ منہ پیننا، گریبان پھاڑنا وغیرہ بھی نوحہ کی صف میں آتا ہے جو ناجائز ہے، ہاں غم و اندوہ اور افسوس و حسرت کا اظہار غیر اختیاری چیز ہے اور غیر اختیاری چیز سے بچنے کا آدمی مکلف نہیں۔ صحیحین میں حضرت انس کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم سگرات کی حالت میں تھے

۱۔ از مفر قدس سرہ

خوشہ چیں شد قسم بحال او
رقابت باخدائے خویش دارم

یوسف از شہء جمال او
دل از عشق محمد ریش دارم

حضور ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اور آپ (رورہے ہیں) فرمایا اے ابن عوف یہ دل کی رقت ہے۔ اس کے بعد ایک اور حالت ہوئی تو فرمایا آنکھ روتی ہے دل غمزہ ہے اور ہم زبان سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے ہمارا ب ناراض ہو اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔ صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک نواسے کی نزاع کی حالت بھی خرابا شروع ہو گیا تھا اسی حالت میں حضور ﷺ پہنچ گئے اور یہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حضرت سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا تو آپ نے فرمایا یہ دل کی رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دی ہے اللہ اپنے رحم دل بندوں پر بھی رحم فرماتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اللہ آنکھ سے رونے اور دل سے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے گویا رحم فرما دیتا ہے (یعنی معاف کر دیتا ہے) اس کی لفظ سے حضور ﷺ نے زبان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور میت کو عذاب دیا جاتا ہے اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے۔ اس حدیث کا یہ ترجمہ مشہور ہے لیکن اس فقیر کے نزدیک اگر بیکسائ اہلہ علیہ کا ترجمہ اس طرح کیا جائے تو بہتر ہے کہ میت پر عذاب ہوتا ہے باوجود یہ کہ اس کے گھر والے (اس کی اچھائیوں کا ذکر کر کے) اس پر روتے ہیں واللہ اعلم۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی ایسی پکار مچائے وہ ہم سے متعلق نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں بیزار ہوں اس شخص سے جو موٹن کرے، منہ پیٹے اور کپڑے پھاڑے۔

قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَنُوا تَدَّ كَرُّ يَوْسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا اَوْ تَكُونَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝۵۰

بیٹے کہنے لگے آپ تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بلب ہو جائیں یا مر ہی جائیں۔ حرضاً بیماری یا پیرانہ سالی کی وجہ سے ہلاکت کے قریب پہنچا ہوا شخص۔ حرض اصل میں مصدر ہے اس لئے نہ اس کی جمع آتی ہے نہ مؤنث کا صیغہ اس جگہ مصدر بمعنی صفت ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے حرض کا معنی ہے غم یا عشق یا پیرانہ سالی کی وجہ سے بدن کا یا مذہب کا یا عقل کا بگاڑ اور خرابی اور جس کے بدن یا مذہب یا عقل میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا جان بلب ہو اس کو بھی حرض کہا جاتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَنِيَّ وَحَزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ
يعقوب نے کہا میں تو بس اللہ ہی سے اپنے رنج و غم کا شکوہ کرتا ہوں۔ بت بہت سخت ترین غم جس کو ضبط کرنے کی تاب نہ رہے اور آدمی اس کو ظاہر کرنے اور پھیلانے پر مجبور ہو جائے (لغت میں بت کا معنی ہے پھیلانا) حسن بصری نے بت کا ترجمہ کیا ہے حال۔ مقصد یہ ہے کہ میں تم سے کسی سے شکایت نہیں کرتا اللہ ہی سے شکوہ کرتا ہوں تم مجھے چھوڑ دو مجھے شکایت سے نہ روکو۔

بعوی کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب کے پاس ان کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے کہا یعقوب میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بدن تباہ ہو گئی اور آپ فنا ہو چکے حالانکہ اپنے باپ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں، فرمایا یوسف کے غم میں جو اللہ نے مجھے مبتلا کر دیا اس سے میری قوت ٹوٹ گئی اور اسی نے مجھے فنا کر دیا۔

اللہ نے یعقوب کے پاس وحی بھیجی یعقوب تو میرا شکوہ میری مخلوق سے کرتا ہے۔ یعقوب نے کہا اے میرے رب مجھ سے خطا ہو گئی تو میری خطا معاف فرمادے، اللہ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا اس کے بعد حضرت یعقوب سے جب کیفیت اور حالت پوچھی جاتی تو فرماتے اِنَّمَا اَشْكُوْا اَبْنِيَّ وَحَزْنِيَّ اِلَى اللّٰهِ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب سے دریافت کیا گیا آپ کی نظر کیوں جاتی رہی اور کمر کیوں کمان ہو گئی۔ فرمایا یوسف پر روتے روتے میری نظر جاتی رہی اور یوسف کے

بھائی کے غم میں میری کمر کمان ہو گئی اس پر اللہ نے یعقوب کے پاس وحی بھیجی، تو میری شکایت کرتا ہے قسم ہے اپنی عزت کی جب تک تو مجھ سے دعا نہیں کرے گا میں تیرا یہ دکھ دور نہیں کروں گا اس وقت حضرت یعقوب نے کہا اِنَّمَا اَشْكُو بَنِي وَ حُزْنِي اِلَى اللّٰهِ اللّٰهُ نَعِي وَ حِي بِيحِي قَسَمٌ هِيَ اِنِّي عَزْتُ كِي اَب اَكْرُوهُ دُونُوں مَرُوهُ بِيحِي هُوئے هُوْتُو تُو تِيرُو لُو لُو اِن كُو زَنْدُو كُرُو تِيَا تَجْهُ سُو مِيرُو نَار اَضْكَو كِي وَ جُو يُو هُو كُو اِيك بَار تَم لُو كُو لُو نُو اِيك بَكْرِي ذَنْح كِي تَحِي اُو ر تَم هَارُو دُرُو اَزُو هُو اِيك مَسْكِين اَكْر كْهُر اهُو كِيَا مَكْر تَم نُو اِن كُو اِن مِيں سُو كُجْهُ كْهُنُو كُو نُو اِيك تَم اَم مَخْلُو ق مِيں مَجْهُ سَب سُو زِيَادُو هُو اِيك مَسْكِين هِيں اُو ر اِن كُو بَعْد مَسَا كِين۔ اَب تَم كْهُنَا تِيَار كُرُو اُو ر مَسْكِينُوں كِي دَعُو ت كُرُو۔ حَسْب هُدَا يَت حَضْرَت نُو كْهُنَا بَنُو اِيَا پْهُر فَرْمَا يَا جُو رُو زُو دَار هُو وُو اِن جُو رَات كُو يَعْقُو بُو كُو كْهُر وَا لُو لُو كُو پَاس كْهُنَا كْهُنَا۔

روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت یعقوب جب دن کا کھانا کھاتے تو ندا کر دیتے کہ جو شخص دن کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوب کے پاس آجائے اور جب شام کو افطار کرتے (یعنی رات کا کھانا کھاتے) تو ندا کر دیتے جو شخص شام کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوب کے پاس آجائے اس طرح صبح شام آپ مسکینوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا اللہ نے حضرت یعقوب کے پاس وحی بھیجی (اور فرمایا) کیا تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس وجہ سے تجھے سزا دی اور اسی برس یوسف کو تجھ سے الگ رکھا، حضرت یعقوب نے کہا میرے اللہ مجھے نہیں معلوم فرمایا وجہ یہ تھی کہ تو نے ایک مرتبہ ایک بکری کا بچہ بھونا اور پڑوسی سے کنجوسی کی خود کھالیا اور اس کو کچھ نہیں دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب کی مبتلاء مصیبت ہونے کا سبب یہ ہوا کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک بچھڑے کو اس کی ماں کے سامنے ذبح کیا اور وہ بیچاری چیختی رہی۔

وہب اور سدی وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیل جیل خانہ کے اندر حضرت یوسف کے پاس پہنچے اور پوچھا صدیق کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ حضرت یوسف نے فرمایا میں ایک پاک صورت دیکھ رہا ہوں اور پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا میں روح الامین ہوں، رب العالمین کا قاصد ہو حضرت یوسف نے فرمایا آپ تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ، مقررین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہیں اور یہ گناہگاروں کے داخل ہونے کی جگہ ہے یہاں آپ کے آنے کا کیا سبب ہے حضرت جبرئیل نے فرمایا یوسف کیا آپ واقف نہیں کہ انبیاء کی پاکی کی وجہ سے اللہ ناپاک گھروں کو پاک کر دیتا ہے اور جس زمین میں پیغمبر داخل ہوتے ہیں وہ ہر زمین سے زیادہ پاک ہو جاتی ہے۔ اے اطہر الطاہرین اور اے منتخب نیک بندوں کی اولاد آپ کی وجہ سے اللہ نے قید خانہ کو اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا۔ حضرت یوسف نے فرمایا آپ نے مجھے صدیق کے نام سے کیوں پکارا اور منتخب پاک لوگوں میں میرا شمار کیوں کیا، مجھے تو گناہگاروں کے مقام میں داخل کیا گیا ہے اور بد چلن لوگوں کے ناموں میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا اللہ نے آپ کا نام صدیقوں میں شامل کیا، مخلص منتخب بندوں میں آپ کا شمار کیا اور آپ کے صالح اسلاف کی فہرست میں آپ کو بھی داخل کر دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل کو فتنہ میں نہ پڑنے دیا اور اپنی مالکہ کے کہے کو نہیں مانا حضرت یوسف نے پوچھا روح الامین کیا آپ کو یعقوب کی بھی کوئی اطلاع ہے حضرت جبرئیل نے فرمایا جی ہاں اللہ نے ان کو صبر جمیل عطا فرمایا وہ آپ کے غم میں مبتلا ہوئے اور غم سے جی ہی جی میں گھٹتے رہے حضرت یوسف نے پوچھا ان کے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے حضرت جبرئیل نے فرمایا ان ستر عورتوں کے غم کے برابر جن کے بچے مر گئے ہوں حضرت یوسف نے فرمایا کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ میری ان سے ملاقات بھی کبھی ہو گی حضرت جبرئیل نے جواب دیا جی ہاں یہ سن کر حضرت یوسف کا دل خوش ہو گیا اور فرمایا جو کچھ مجھے پیش آیا اس کی مجھے کوئی پروا نہیں اگر میں یعقوب کو دیکھ لو۔

اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے یعنی اللہ کی حکمت و رحمت کو جتنا میں جانتا ہوں کہ وہ پکارنے والے کو نامراد نہیں چھوڑتا اور جو بے قراری کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے اس کو رو نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ از روئے الہام یوسف کے زندہ ہونے سے جو میں واقف ہوں تم واقف نہیں۔

وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۶﴾

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عزرائیلؑ حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کو گئے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا اے پاکیزہ خوشبو اور حسین صورت والے فرشتے کیا آپ نے میرے بچے کی روح قبض کی ہے حضرت عزرائیلؑ نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر حضرت یعقوبؑ کو کچھ سکون ہو گیا اور آپ کو یوسفؑ کے دیکھنے کی تمنا ہوئی۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یوسفؑ کا خواب سچا ہے میں اور تم سب آئندہ اس کو ضرور سجدہ کریں گے۔ سدی نے بیان کیا جب بیٹوں نے باپ کو بادشاہ کے حسن سلوک کی اطلاع دی تو آپ کو یوسفؑ کے زندہ ہونے کا خیال پیدا ہو گیا اور ملنے کی خواہش بھی اور فرمایا شاید وہ یوسفؑ ہو۔ ابن ابی حاتم نے نصر بن عربی کا بیان نقل کیا ہے نصر نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو ۲۴ سال حضرت یوسفؑ کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ہوئی آخر ایک روز موت کا فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، حضرت نے دریافت کیا آپ کون ہیں ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں تم کو یعقوبؑ کے معبود کی قسم دیتا ہوں مجھے بتاؤ کیا تم نے یوسفؑ کی جان قبض کر لی ملک الموت نے جواب دیا نہیں۔ یہ جواب سن کر حضرت نے فرمایا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُۤوسُفَ وَاَخِيْهِ وَاَلَا تَابِعْسُوْا مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يٰۤاَيُّسَسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾
میرے بیٹو! جاؤ یوسفؑ کی اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو، اللہ کی رحمت سے آس کافر لوگ توڑا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے تَحَسَّسُوْا کا ترجمہ کیا تلاش کرو، ڈھونڈو۔ لغت میں تَحَسَّسَ کا معنی ہے کسی کی سن گن، تلاش کرنا، روح سے مراد ہے رحمت۔ بعض کے نزدیک مراد ہے مصیبت سے نجات اور خدا کی عطا کردہ خوشی۔
الکافرون یعنی وہ لوگ جو اللہ کی ذات و صفات کو نہیں جانتے اور انکار کرتے ہیں۔ اللہ کو پہچاننے والا اس کی رحمت سے کبھی بے آس نہیں ہوتا۔

غرض سب بھائی کوٹ کر مصر کو گئے اور حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسْنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعٍ مُّزْجَجَةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ
وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے بڑی تکلیف پہنچی ہے اور ہم کچھ نکمی چیز لائے ہیں سو آپ پورا غلہ دے دیجئے اور ہم کو خیرات سمجھ کر دے دیجئے بے شک اللہ خیرات دینے والوں کو جزاء خیر دیتا ہے۔
الضُّرُّ بھوک کی شدت مُزْجَجَةٌ کا مراد ہے ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے کیا کھوٹے، ردی، نہ چلنے والے درہم۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ابو عبید اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ کی روایت میں آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے لیکن سعید بن منصور اور ابن المنذر اور ابو الشیخ نے کہا کہ عکرمہ نے اس کا ترجمہ کیا تھوڑے درہم۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ کی روایت ہے کہ عبد اللہ بن حارث نے کہا (بضاعت مزججة سے مراد ہے) صحرائی لوگوں کا مال یعنی اون اور گھی روایت میں گھی کی جگہ پنیر آیا ہے۔

ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ابو صالح کے حوالہ سے لکھا ہے حبة الخضر اء اور صنوبر کی لکڑی۔

ابن التَّجَار نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مقل کے ستوتھے۔ بعض علماء نے کہا کچے چمڑے اور جوتے تھے۔ اِزْجَاء (مصدر باب افعال۔ مُزْجَجَةٌ اسم مفعول مؤنث) کا اصل لغوی معنی ہے دھکا دینا اور ہنکانا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي سَحَابًا کہ اللہ بادل کو ہنکاتا ہے چلاتا ہے۔ ردی درہموں کو بھی مزججة اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کوئی ان کو لیتا نہیں ان کو پھینکا جاتا ہے اسی طرح اگر بیش قیمت سامان کے عوض تھوڑے درہم دیئے جائیں تو ان کو بھی نہیں لیا جاتا ردی کر دیئے جاتے ہیں یہی

حالت دوسری ردی چیزوں کی ہے کہ ان کو بطور قیمت کوئی شخص نہیں لیتا اگر بائع خود چشم پوشی کرے اور قبول کر لے تو دوسری بات ہے۔

فاوہ کنا یعنی ان قلیل یا کھوٹے درہموں میں غلہ ہم کو اتنا ہی پورا پورا دے دیجئے جتنا اس سے پہلے آپ نے کھرے درہموں میں دیا تھا۔ اور جو قیمت کم رہ جائے وہ بطور خیرات آپ چھوڑ دیجئے۔ اکثر مفسرین نے تصدق علینا کا تفسیری مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن ابن جریج اور ضحاک نے کہا کہ درخواست تصدق کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خیرات میں ہمارے بھائی کو واپس کر دیجئے۔ جزا دینے سے مراد ہے دنیا اور آخرت میں اچھا بدلہ دینا۔ اجزاء اور تصدق دونوں کا معنی ہے مہربانی کرنا حالت سفر میں صلوة کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (اللہ کی طرف سے) صدقہ (مہربانی) ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے تم اللہ کی مہربانی کو قبول کرو۔ رواہ البخاری۔ لیکن عرف شرع میں تصدق ایسی مہربانی کرنے کو کہتے ہیں جس کا مقصد ثواب کی طلب اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو اور یہ تصدق اسی شرعی عرف پر مبنی ہے۔

حسن بصری کا یہ قول کہ جب آپ نے ایک آدمی کو ان الفاظ میں دعا کرتے سنا لے اللہ مجھ پر صدقہ کر تو فرمایا اللہ تصدق نہیں کرتا تصدق تو وہ کرتا ہے جو ثواب کا طلب گار ہو تم یوں دعا کرو اللہ! مجھے عطا فرما مجھ پر مہربانی کر۔ حسن بصری نے جو اللہ کی طرف صدقہ دینے کی نسبت سے انکار کیا اور ممانعت فرمائی تو آپ کی مراد اس سے شرعی صدقہ و خیرات تھی جو طلب ثواب کے لئے ہوتی ہے (لغوی اعتبار سے اس کا معنی صحیح ہے لغت میں تصدق کا معنی ہے مہربانی کرنا پس اللہ سے مہربانی کی درخواست کرنا صحیح ہے)

ضحاک نے کہا بادشاہ سے برادر ابن یوسف نے یہ نہیں کہا اللہ آپ کو جزا دے گا کیونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ شاہ مصر مؤمن ہے یا نہیں (اور اللہ کی طرف سے آخرت میں جزاء خیر صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے) اصل میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شاہ مصر خیرات بھی دے گا یا نہیں۔

فائدہ ۴

سفیان بن عیینہ سے کسی نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے لئے بھی صدقہ حرام تھا فرمایا نہیں کیا تم نے آیت وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ نہیں سنی۔ کذا اخرج ابن جریر۔ میں کہتا ہوں سفیان نے اس آیت سے استدلال کیا کہ دوسرے پیغمبروں کے لئے صدقہ لینا جائز تھا۔ مگر یہ استدلال اس وقت صحیح ہو گا جب حضرت یوسف کے بھائیوں کا نبی ہونا ثابت ہو جائے۔

(یہ فقیر کہتا ہے کہ تصدق علینا کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر جن میں حضرت یعقوبؑ بھی شامل تھے کچھ صدقہ کیجئے حضرت یعقوبؑ علینا کی ضمیر سے مستثنیٰ نہیں۔ اس صورت میں سب بھائیوں کی نبوت ثابت ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت یعقوبؑ تو مسلم الثبوت نبی تھے۔ مترجم)

بھائیوں کا یہ دردناک کلام سن کر حضرت یوسف کے دل میں رقت آگئی آنسو ٹپک پڑے اور پوشیدہ راز ظاہر ہو گیا اس

لئے

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿۱۹﴾

کو یاد ہے جو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جبکہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا، یعنی جو ظلم تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کہ یوسف کو لے جا کر اس کے بھائی کو اکیلا کر دیا اور طرح طرح سے اس کو ذلیل کیا کہ وہ بے چارہ اپنی ذلت کو زبان پر بھی نہیں لاسکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ جو بڑا سلوک اور بے جا حرکت تم نے کی وہ بھی تم کو یاد ہے اس سے توبہ کرو۔ اذ انتم جاهلون کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اپنے فعل کی بُرائی سے تم ناواقف تھے یا اس کے نتیجے سے ناواقف تھے۔ حضرت یوسف کا مقصد تھا توبہ کی ترغیب دینا اور بھائیوں پر مہربانی کا اظہار کرنا، ڈانٹنا اور ملامت کرنا مقصود نہیں تھا۔ آیت لَا تَثْرِيْبَ

عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ میں صراحت ہے کہ ملامت کرنا مقصود نہ تھا۔ کلبی نے حضرت یوسفؑ کے اس قول کی یہ وجہ بیان کی کہ آپ کے بھائیوں سے جب مالک بن وعر کا یہ قول نقل کیا گیا کہ میں نے کنویں کے اندر ایک ایسا غلام پایا تھا جس کو اتنے درہم میں میں نے خرید لیا تو بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا اے بادشاہ ہم نے ہی وہ غلام بیچا تھا، حضرت یوسفؑ کو یہ بات سن کر غصہ آیا اور آپ نے سب بھائیوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا، شاہی آدمی ان کو قتل کرنے لے چلے یہودانے منہ پھیر کر دیکھا اور کہا یعقوب پر ہم میں سے ایک کے نہ ہونے کا اتنا غم پڑا اور اتاروئے کہ نظر جاتی رہی جب سب بیٹوں کے مارے جانے کی ان کو اطلاع ملے تو ان کا کیا حال ہوگا، پھر سب بھائیوں نے کہا اگر آپ ایسا ہی کر رہے ہیں تو ہمارے والد کو ہمارا یہ سامان بھیج دینا وہ فلاں مقام پر رہتے ہیں اس وقت حضرت یوسفؑ کو رحم آگیا اور آپ رونے لگے اور قول مذکور کہا۔

عبداللہ بن یزید بن ابی فروہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جب سنا کہ بنیامین کو روک لیا گیا تو ایک خط لکھ کر بیٹوں کے ہاتھ حضرت یوسفؑ کو بھیجوا لیا یہ بیٹوں کے تیسرے پھیرے کا ذکر ہے۔ یعقوب اسرائیل اللہ (عبداللہ) بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے شاہ مصر کے نام۔

حمد و ستائش کے بعد واضح ہو کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جو ہمیشہ سپرد مصائب رہے ہیں میرے دادا ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ نے اس آگ کو ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا، میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی گردن پر چھری رکھ دی گئی تاکہ ان کو ذبح کر دیا جائے مگر اللہ نے ان کا فدیہ (جنت سے مینڈھے کی شکل میں) بھیج دیا (اور ان کو محفوظ رکھا) اب رہا میں تو میرا ایک بیٹا تھا جو سب اولاد سے مجھے پیارا تھا اس کے بھائی اس کو جنگل کو لے گئے پھر شام کو اس کا خون آلودہ کرتے لاکر مجھے دے دیا اور کہا اس کو بھیڑے نے کھالیا۔ اس پر روتے روتے میری آنکھیں جاتی رہیں پھر میرا ایک بیٹا اور تھا جو مرحوم کا ماں جایا بھائی تھا میں اس کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لیتا تھا اب آپ نے اس کو روک لیا اور یہ خیال کیا کہ اس نے چوری کی ہے ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے نہ چور ہمارے ہاں پیدا ہوتا ہے اگر آپ میرے بیٹے کو مجھے واپس کر دیں تو بہتر ہے ورنہ آپ کو ایسی بد عادتوں کا کہ اس کا اثر آپ کی ساتویں نسل تک پڑے گا۔ حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو آنسوؤں کو روک نہ سکے اور سامنے آکر فرمایا هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ یعنی جب کہ تم کو معلوم نہ تھا کہ یوسفؑ آخر میں کس مرتبہ تک پہنچے گا اس وقت تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا کچھ معلوم بھی ہے۔ بعض لوگوں نے جاہلون کا ترجمہ کیا ہے قصور وار، گنہگار۔ حسن بصریؒ نے ترجمہ کیا جب کہ تم جوان تھے اور جوانی کی جہالت میں مبتلا تھے۔ اس وقت تم نے کیا کیا تھا۔

قَالَ لَوْ عَزَّازَكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ط
کہنے لگے کیا سچ سچ آپ ہی یوسفؑ ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے (کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں) ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت یوسفؑ پر دے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے پھر جب هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ ہٹا دیا اور نقاب اٹھا دیا اس وقت بھائیوں نے پہچان لیا۔

میں کہتا ہوں قصہ مذکورہ کا تفصیلی بیان ابن اسحاق کے اس قول سے انکار کر رہا ہے اور ہے بھی بعید از فہم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت آپ مسکرا دیئے مسکرانے سے موتیوں کے ہار کی طرح اگلے ذانت سامنے آگئے اور بھائیوں نے دیکھ کر ان کو یوسفؑ کے دانٹوں کی طرح قرار دیا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ بھائی یوسفؑ کو اس وقت تک نہ پہچان سکے جب تک آپ نے سر سے تاج نہ اتار دیا، آپ کے سر کے اوپر ایک جانب لہسن تھا جو موروثی تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بھی تھا حضرت اسحاقؑ کے بھی تھا اور (حضرت اسحاقؑ کی والدہ) حضرت سارہ کے بھی تھا، علامت کو پہچان کر بھائی بول اٹھے بلاشبہ آپ یوسفؑ ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ بھائیوں نے (یقین کے ساتھ نہیں بلکہ) یونہی گمان سے کہا تھا۔

قَالَ اَنَا يُوسُفُ وَ هَذَا أَخِي ذ
یوسفؑ نے کہا میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا ماں جایا بھائی ہے۔ بھائیوں نے تو

صرف آپ کو دریافت کیا تھا۔ مگر آپ نے اپنے مزید تعارف اور بھائی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے بھائی کا بھی ذکر کر دیا اور واضح کر دیا کہ اللہ نے جو احسان کیا وہ ہم دونوں پر کیا۔

قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ بِمَا شَبَّهَ اللَّهُ فِي هَمِّ دُونِ نَوْنِ كَرَمِ فَرَمَايَا كَمَا سَلَامَتِي وَأُورِ عَزْمِ كَمَا سَا تَهْ دُونِ نَوْنِ كَوَيْجَا كَرَمِيَا وَأُورِ مَلَا دِيَا۔
 إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۰﴾
 اور مصائب و طاعات پر صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر نہیں کھوتا۔

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے اور فرائض کرتا ہے اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے اور مصائب پر صبر کرتا ہے اور ادائے طاعات پر پابند کرتا ہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکے رکھتا ہے تو ایسے لوگوں کا اجر اللہ ضائع نہیں کرتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں، وہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔ بجائے أَجْرُهُمْ كَمَا لَفْظِ ذَكَرْ كَرَمًا تَارَهَا كَمَا نِيكُو كَارُو هِي كَمَا مَتَّقِي كَمَا هُوَ أُوْرٍ صَابِرٌ كَمَا هُوَ۔

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكْنَا بِاللَّهِ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَطِيئِينَ ﴿۹۱﴾
 ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم یقیناً خطاوار تھے۔ یعنی معذرت پیش کرتے ہوئے انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ جمال صورت اور کمال سیرت اور تمام دنیوی و اخروی فضائل کے لحاظ سے اللہ نے آپ کو ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے ہم خطاوار ہیں۔ خَطِيئِينَ قَصْدَ أَخْطَا كَرَمِيَا كَمَا نِيكُو كَارُو هِي كَمَا مَتَّقِي كَمَا هُوَ أُوْرٍ صَابِرٌ كَمَا هُوَ۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبٌ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ زَوْهًا وَرَحْمَةً الرَّحِيمِينَ ﴿۹۲﴾
 تم پر کوئی الزام نہیں (یعنی میں نے معاف کیا) اللہ تمہارا قصور معاف کرے وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ (امید ہے معاف کر دے گا)

تَثْرِيْبٌ: آنکھوں کی چربی چھیل دینا ثَرْبٌ آنکھوں پر چھائی ہوئی چربی، مجازاً کسی کو لعنت ملامت کرنا جس سے مجرم کی آبروریزی اور توہین ہو رہی ہو، مطلب یہ ہے کہ آج جبکہ میں تم لوگوں کو لعنت ملامت کر سکتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہتا تو پھر آئندہ کچھ برا بھلا کہنے کا تو احتمال ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کر دیا اللہ تم کو معاف کرے وہ آرحم الرَّاحِمِينَ ہے اور میں نادار محتاج ہوں جب میں نے معاف کر دیا تو اللہ توبے نیاز اور غفور ہے وہ ضرور معاف کر دے گا اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرمائے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے جب بھائیوں نے یوسف کو پہچان لیا تو کہا آپ صبح شام ہم کو کھانے پر بلواتے ہیں اور ہم سے جو آپ کے معاملے میں قصور ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ہم کو آپ سے شرم آتی ہے، حضرت یوسف نے کیسا کریمانہ جواب دیا، فرمایا، مصر والے مجھے گزشتہ نظر ہی سے دیکھتے تھے لوگ کہتے تھے سبحان اللہ ایک غلام جو بیس درہم میں بیچا گیا تھا، اللہ نے اس کو کہاں پہنچایا اب جو لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں غلام نہیں تھا تمہارا بھائی ہوں اور حضرت ابراہیم کا پوتا ہوں تو تمہاری وجہ سے مجھے عزت مل گئی اور مصر والوں کی آنکھوں میں میری عظمت پیدا ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت یوسف نے اپنا تعارف کر دیا تو پھر باپ کا حال پوچھا اور فرمایا میرے بعد میرے باپ کی کیا حالت ہوئی، بھائیوں نے بتایا کہ باپ کی آنکھیں روتے روتے جانی رہیں۔ حضرت یوسف نے اپنا گرتہ ان کو دیا اور باپ کو بلوایا اور فرمایا

رَاذِهِبُوا بِقَبِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا
 میرا یہ کرتے لے جا کر میرے باپ کے منہ پر ڈال دو (اس سے) وہ بینا ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ میرے پاس بینا ہو کر آجائیں گے۔ حسن نے کہا حضرت یوسف کو اللہ نے اطلاع دے دی ہوگی جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بینا ہو جائیں گے اللہ کی طرف سے اطلاع پانے کے بغیر وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا حضرت جبرئیل نے حضرت یوسف کو اللہ کی طرف سے حکم دیا تھا کہ

حضرت یعقوبؑ کو اپنا کرتہ بھیج دیجئے۔ یہ قمیص حضرت ابراہیمؑ کا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو کپڑے اتار لئے گئے تھے اس وجہ سے جبریلؑ نے جنت سے ایک ریشمی قمیص لا کر آپ کو پہنا دیا تھا یہ کرتہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت اسحاقؑ کو میراث میں ملا اور حضرت اسحاقؑ کے بعد حضرت یعقوبؑ کو پہنچا۔ یوسفؑ جب جوان ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ نے وہ کرتہ ایک ٹکلی میں سر بند کر کے بطور تعویذ حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تاکہ آپ کو نظر نہ لگے ہر وقت وہ یوسفؑ کے گلے میں رہتا تھا، جب آپ کو کرتہ اتار کر کنویں میں ڈالا گیا تو حضرت جبریلؑ نے آکر تعویذ کھول کر اس میں سے کرتہ نکال کر حضرت یوسفؑ کو پہنا دیا پھر حضرت یوسفؑ جب بھائیوں سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے تو حضرت جبریلؑ نے آکر کہا وہ قمیص بھیج دیجئے اس کے اندر جنت کی خوشبو ہے جس دکھی اور بیمار پر اس کو ڈالا جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا اس اطلاع کے بعد آپ نے وہ کرتہ اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا اور فرمایا اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں حضرت مجدد قدس سرہ کے کشف سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ حسن یوسفؑ دنیوی چیزوں سے نہ تھا بلکہ آپ کا حسن اور وجود جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کرتے کو جنت سے آیا ہوا مانیں بلکہ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کا پہنا ہوا تھا اور یوسفؑ تو خود جنت کی چیزوں کی جنس میں سے تھا (آپ کی ہستی اس عدی دنیا کی چیز ہی نہ تھی)۔

اور آپ (سب بھائی اور باپ) اپنے سب گھر والوں کو (عورتوں کو، بچوں کو، خادموں کو) میرے پاس لے آئیں۔

وَأَنْتَوْنِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹۳﴾

اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بوڑھا پے کی وجہ سے بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔

یعنی جب وہ قافلہ جس میں حضرت یوسفؑ کا قمیص تھا اور مصر سے کنعان جانے کے لئے چلا تھا شہر کی آبادی سے نکلا تو حضرت یعقوبؑ نے حاضرین سے کہا مجھے یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اگر تم سٹھیایا ہوانہ قرار دو تو میں کہتا ہوں کہ یوسفؑ کی ملاقات ہونے والی ہے۔ ریح یوسفؑ فرمایا ریح قمیص یوسفؑ نہیں فرمایا، اس سے مترشح ہو رہا ہے کہ جنت کی خوشبو یوسفؑ کی ہی خوشبو تھی، قمیص یوسفؑ کی نہ تھی۔

بعوی نے لکھا ہے بادِ صبا نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ بشارت دینے والے کے پہنچنے سے پہلے یوسفؑ کی خوشبو کو پہنچادے۔

مجاہد نے کہا تین روز کی مسافت سے یوسفؑ کی خوشبو یعقوبؑ کو پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں آٹھ رات کی مسافت کا ذکر آیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوا قمیص یوسفؑ کی خوشبو لے کر یعقوبؑ تک پہنچی جس سے آپ کو جنت کی خوشبو محسوس ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر سوائے قمیص کی خوشبو کے جنت کی اور کوئی خوشبو نہیں تھی اسی لئے آپ نے اِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ فَرَمَايُفِنْدُ کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے عقل میں نقصان آجانا اور "تفنيد" (باب تفعليل) کا معنی ہے کسی کو سٹھیایا ہوا قرار دینا۔ اس لئے "عجوز مفندہ" نہیں کہا جاتا کیونکہ عورت کا نقصان عقل ذاتی ہوتا ہے صرف بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ہوتا عورت ناقص العقل فطر تا ہوتی ہے۔

لولا کا جواب محذوف ہے یعنی اگر تم مجھے سٹھیایا ہوانہ سمجھو تو مجھے سچا جانویا میں کہتا ہوں کہ یوسفؑ کی ملاقات عنقریب ہوگی۔

قَالُوا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۴﴾ وہ کہنے لگے آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں۔ ضلال سے مراد یہ ہے کہ یوسفؑ کی محبت اس کی یاد کی کثرت اور امید وصال رکھنے کی وجہ سے آپ کی عقل صحیح راستہ سے ہٹ

گئی ہے اور آپ پرانی غلطی میں مبتلا ہیں۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ آتِيقًا عَلَيَّ وَجْهَهُ فَأَرْتَدَّ بِصَيْرٍ
(یوسف کے پاس سے) یعقوب کے پاس پہنچا تو کرتہ یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا جس سے فوراً یعقوب لوٹ کر بیٹا ہو گئے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قافلے کے پہنچنے سے پہلے بشارت دہندہ پہنچا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ یہود تھا۔ سدی کا بیان ہے یہود نے کہا جب میں خوفناک آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان کو اطلاع دی تھی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو اب میں یہ کرتہ لے کر جاؤں گا اور اطلاع دوں گا کہ یوسف زندہ ہیں جیسے ان کو غم دیا تھا ویسے ہی ان کو خوش بھی کروں گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کرتہ لے کر یہود اٹنگے سر دوڑتا ہوا نکل چلا صرف سات روٹیاں ساتھ لی تھیں وہ بھی پوری نہ کھا سکا اور اسی فرسخ کی مسافت طے کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ بعض نے کہا خوش خبری دینے والا مالک بن وعر تھا فَارْتَدَّ بِصَيْرٍ آتِيقًا یعنی یہ ہے کہ یعقوب دوبارہ بیٹا ہو گئے، کمزور سے طاقتور اور بڑھاپے کے بعد جوان ہو گئے۔

یَعْقُوبُ نَعَىٰ مَا كَانَتْ تَمُنُّ لَكَ
قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾
یعقوب نے کہا کیا میں نے تم لوگوں سے نہیں کہا کہ دیا تھا کہ اللہ کی جو باتیں میں جانتا ہوں تو نہیں جانتے۔ یعنی یوسف کے زندہ ہونے اور اس سے ملاقات ہونے کی اطلاع میں نے تم کو پہلے ہی دے دی تھی یا میں نے تم سے کہا دیا تھا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور مجھے یوسف کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

بغوی کا بیان ہے، روایت میں آیا ہے حضرت یعقوب نے پوچھا یوسف کس حال میں ہے بشارت دینے والے نے جواب دیا وہ مصر کے بادشاہ ہیں حضرت نے فرمایا بادشاہ ہے تو میں کیا کروں میں پوچھتا ہوں تم نے کس مذہب پر ان کو چھوڑا بشر نے کہا اسلام پر، فرمایا اب نعمت کامل ہو گئی۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كَانَتْ خَطِيئِينَ ﴿۹۷﴾
معاذ کر دینے کی اللہ سے دعا کر دیجئے کوئی شک نہیں کہ ہم خطاوار تھے یعنی ہم اپنی خطا کا اقرار کرتے ہیں آپ کے اور یوسف کے حق میں ہم نے جو قصور کیا اس کی معافی کی دعا اللہ سے کر دیجئے۔

قَالَ هَسُوْفَ اسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَبِّي ط إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾
یعقوب نے کہا میں اپنے رب سے تمہارے قصور کے معاف کر دینے کی ضرورت درخواست کروں گا وہی بلاشبہ بڑا غفور رحیم ہے (معاف فرمادے گا)۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے حضرت یعقوب نے سحر پر دعا کو موقوف رکھا کیونکہ ہر رات کو تہائی رات رہے ہمارا رب دنیوی آسمان پر خصوصی نزول بجلی فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اس کو عطا کروں اور کون ہے جو مجھ سے عفو گناہ کی درخواست کرے اور میں اسے معاف کروں۔ رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ فی صحیحہما۔ غرض جب مقررہ وقت آیا تو حضرت یعقوب سحر کو نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور نماز سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی، اے اللہ! مجھے جو بے صبری یوسف کے معاملے میں ہوئی تھی اس کو معاف فرمادے اور میرے بیٹوں نے جو بُرا سلوک میرے اور یوسف کے ساتھ کیا اس کو بھی بخش دے۔ اللہ نے وحی بھیجی تمہارا اور تمہارے لڑکوں کا قصور میں نے معاف کر دیا۔

عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ سَوَفَ اسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي سے یہ مراد ہے کہ شب جمعہ میں، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ وہب نے کہا کچھ اوپر بیس برس تک ہر شب جمعہ میں حضرت یعقوب لڑکوں کے لئے استغفار کرتے رہے۔ طاؤس نے کہا شب جمعہ کی سحر پر حضرت یعقوب نے دعا کو موقوف رکھا تھا اور اتفاق سے وہ رات ۱۰ محرم کی بھی پڑ گئی تھی۔ شعبی نے کہا سَوَفَ اسْتَغْفِرُ لَكُمْ کا یہ مطلب ہے کہ میں یوسف سے معاف کر دینے کو کہوں گا وہ معاف کر دیں گے تو پھر اللہ سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ اللہ اسی وقت معاف کرتا ہے جب مظلوم بھی اپنا حق معاف کر دے۔

بعض علماء نے کہا حضرت یعقوبؑ جاننا چاہتے تھے کہ بیٹوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے یا نہیں یا بات معلوم ہونے تک آپ نے دعا کو مؤخر کر دیا۔

نووی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ بشارت دینے والے قاصد کے ساتھ حضرت یوسفؑ نے دو سواوٹھیاں اور بکثرت سامان بھی بھیجا تھا۔ تاکہ حضرت تمام اہل و عیال و متعلقین کو لے کر مصر آجائیں چنانچہ آپ مصر جانے کو تیار ہو گئے اور زن و مرد بہتر اور مسروق کے بقول ۳۹۰ شخص روانہ ہو گئے جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسفؑ اور بادشاہ چار ہزار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے روانہ ہو گئے۔ مصر کے اور لوگ بھی حضرت یوسفؑ کی معیت میں استقبال میں شریک تھے، حضرت یعقوبؑ یہود پر سہارا دیئے پیدل آرہے تھے، سواروں اور دوسرے لوگوں کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا یہود کیا یہ فرعون مصر ہے، یہود نے جواب دیا نہیں ابابہ تو آپ کے صاحبزادے ہیں۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوْسَىٰ إِلَيْهِ أَبُو يَهُدَىٰ
تو انہوں نے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت یوسفؑ مصر سے روانہ ہو کر کسی خاص مقام تک پہنچ گئے اور وہاں کسی خیمہ یا محل میں اتر کر رک گئے تاکہ قافلہ وہاں پہنچ جائے تو اس کا استقبال کریں اور حضرت یعقوبؑ اپنے متعلقین کے ساتھ اسی مقام پر پہنچ کر حضرت یوسفؑ کے پاس (قصر یا خیمہ کے اندر) داخل ہوئے ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب یوسفؑ اور یعقوبؑ ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو حضرت یوسفؑ نے سلام کرنا چاہا لیکن حضرت جبریلؑ نے روک دیا اور فرمایا پہلے وہ سلام کریں پھر آپ کرنا۔

میں کہتا ہوں شاید یہ اس محبوبیت الہیہ کا اثر تھا جو حضرت یوسفؑ میں نمودار ہو گئی تھی آخر حضرت یعقوبؑ نے ہی ابتدائی سلام کیا اور کہا اے غموں کے دور کرنے والے تجھے سلامتی ہو۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ ماں باپ سے مراد ہیں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی خالہ لیا جس طرح دوسری آیت میں چچا کو اللہ نے باپ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا اَبَائِكَ اِبْرَاهِيمَ وَ اِسْمَاعِيلَ وَ اِسْحٰقَ اِی طرح اس آیت میں خالہ کو ماں قرار دیا ہے یا یہ وجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کے بعد لیا سے نکاح کر لیا تھا اور لیا ہی نے آپ کی پرورش کی تھی اور پرورش کرنے والی کو ماں کہا ہی جاتا ہے حضرت یوسفؑ کی ماں بنیامین کی ولادت کے وقت مر چکی تھیں۔

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ ماں زندہ تھیں اور ابویں سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر آئی تھیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اتر کر معانقہ کیا، ثوریؒ نے کہا ہر ایک دوسرے کے گلے سے ملا اور دونوں رونے لگے یوسفؑ نے کہا ابامیری وجہ سے آپ اتار دئے کہ آپ کی نظر جاتی رہی کیا آپ کو یقین نہ تھا کہ قیامت کے دن ہم دونوں ضرور ملیں گے حضرت یعقوبؑ نے فرمایا بیٹے یقین کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں تیرا مذہب نہ بدل گیا ہو اور پھر قیامت کے دن میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ حائل ہو جائے۔

وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرًا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۶۹﴾
اور کہلا چلو مصر کے اندر امن کے ساتھ اللہ نے چاہا تو

رہو۔

یعنی تم کو شہر کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے کی ضرورت نہیں۔ شاہی اجازت نامہ کے بغیر اس زمانہ میں کوئی مصر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ اب کال اور دوسری مصائب کا آپ لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں۔

..... ایک شبہ ❁

(انشاء اللہ کا تعلق اُدخلوا سے ہے اور اُدخلوا امر کا صیغہ ہے اور امر کے ساتھ مشیت کا تعلق بے معنی ہے۔ حکم مفید و خوب ہے اور اِن شکر کے لئے آتا ہے اور شکر و خوب کے منافی ہے۔ مترجم)

..... شبہ مذکورہ کا ازالہ ❁

اِنشاء اللہ کا تعلق باامن دخول سے ہے (مطلق دخول سے نہیں گویا امن کو مشروط بہ مشیت کیا گیا ہے۔ امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ انشاء اللہ۔ یعنی انشاء اللہ باامن رہو گے داخل ہو جاؤ۔ مترجم) جیسے دوسری آیت میں آیا ہے۔ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ بِعُضْ نِ كَمَا اِسْ جَلْه اِن (بمعنی شکر نہیں بلکہ اِذْ (ظرفیہ) کے معنی میں ہے جیسے آیت وَاَنْتُمْ اَلْعٰلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ مِثْلَ اِن (بمعنی اِذْ ہے۔ بعض نے کہا آیت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے انشاء اللہ کا تعلق سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ سے ہے یعنی میں انشاء اللہ تمہارے لئے اپنے رب سے استغفار کروں گا۔

اور یوسف نے اپنے ماں باپ کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔ رَفَعَ کا معنی ہے نیچے سے اوپر کو اٹھالینا۔

وَاٰخِرُ وَاٰلُ سُبْحٰنَہٗ اور سب (ماں باپ اور بھائی) یوسف کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔ سجدہ سے مراد زمین پر پیشانی رکھنا نہیں بلکہ تواضع سے جھک جانا مراد ہے (لیکن خَرُّوا کا لفظ تو زمین پر گر پڑنے کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے۔ خَرُّوا کا معنی تو جھکنا نہیں ہے۔ مترجم)

بعض نے کہا زمین پر پیشانی رکھنا ہی مراد ہے مگر یہ سجدہ عبادت نہ تھا سجدہ احترام و تعظیم تھا اور اس زمانہ میں احترام و تعظیم کا یہی طریقہ رائج تھا اور گزشتہ امتوں کے لئے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا جائز تھا۔ ہماری شریعت نے منسوخ کر دیا (اب کسی قسم کا سجدہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں کیا جاسکتا) حضرت ابن عباس کا قول اس آیت کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے وہ اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑے یوسف کے سامنے اوائے شکر کے طور پر۔ لہٰذا کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے (یوسف کی طرف راجع نہیں ہے) میں کہتا ہوں گویا حضرت ابن عباس کی تفسیر پر یوسف مسجود نہ تھے قبلہ سجود اور جہت سجدہ تھے اور یوسف کا قبلہ سجود ہونا اللہ کے حکم سے تھا جیسے ہمارے لئے کعبہ کو بحکم الہی قبلہ سجود بنا دیا گیا ہے۔ اور جیسے آدم کو فرشتوں کے لئے قبلہ سجود بنا دیا گیا تھا۔

بعض نے کہا لہٰذا (میں لام اجلیہ ہے اور ضمیر یوسف کی طرف ہی راجع ہے) یعنی یوسف کے مل جانے کی وجہ سے بطور شکر یہ وہ اللہ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ رَفَعَ کا لفظ اگرچہ خَرُّوا سے پہلے ذکر کیا گیا ہے لیکن مطلب یہ ہے کہ وہ سجدے میں گر پڑے اور پھر یوسف نے ماں باپ کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔

وَقَالَ يَا بَتِّ هٰذَا تَاوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ زَقَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا اور یوسف نے کہا بابا یہ میرے گزشتہ خواب کی تعبیر ہے میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ یعنی بچپن میں جو میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور چاند سورج کو اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھا اس کی تعبیر یہ نکلی۔ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْ اِذْ اَخْرَجْتَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدُوِّ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ تَنْزَعُ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اٰخُوْتِيْ اور خدا نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا کہ مجھے قید سے نکالا اور تم سب کو

جنگل سے یہاں لے آیا یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا باوجود یہ کہ کتوال شدید ترین قید خانہ تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے کرم ذاتی سے کام لے کر اس کا ذکر نہیں کیا تا کہ بھائیوں کو شرمندگی نہ ہو اس کے علاوہ جیل خانہ سے رہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی کیا کہ کنویں سے نکل کر تو غلام ہونا پڑا اور عورتوں کے پھندے میں گرفتار ہونے سے سابقہ پڑا اور قید خانہ سے نکل کر بادشاہ بنائے گئے (تو جیل خانہ سے نکالنا اللہ کا عظیم الشان احسان ہوا) البَدْو: صحرائی میدان جہاں چرواہے اور صحرائی لوگ اپنے جانوروں کو لے کر رہتے ہیں۔ نَزَعُ: یعنی ہمارے درمیان فساد ڈلوادیا۔ یہ لفظ نَزَعُ التَّرَابِضُ الدَّابَّةُ سے ماخوذ ہے ایڑ مار کر سوار نے گھوڑا اٹھایا اور چلایا۔

إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۱۱﴾
بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کرتا ہے یقیناً وہی بڑے علم اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس کی تدبیر لطیف ہے دشوار ترین امور میں بھی کار فرمائی اور نفوذ اسی کی مشیت کا ہے۔

بعوی نے لطیف کا ترجمہ کیا ہے صاحب لطف یعنی مہربانی۔ حقیقت میں لطیف اس محسن کو کہتے ہیں جو دوسروں تک نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا احسان پہنچا دے۔ هُوَ الْعَلِيمُ یعنی اپنی مصلحتوں اور تدبیروں کی حقیقت سے وہی واقف ہے اور وہی حکیم ہے۔ یعنی اس کا ہر کام اسی وقت اور اسی طرح پر ہوتا ہے جیسا حکمت کا تقاضہ ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہر چیز کے ذخیرے اور خزانہ کی ماں باپ کو سیر کرائی کاغذ کا ذخیرہ دیکھ کر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اتنا کثیر انبار کاغذ کا تیرے پاس پڑا ہے اور تو نے ایک خط صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر مجھے نہیں بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا جبریلؑ نے مجھے یہی ہدایت کی تھی حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تو نے جبریلؑ سے اس کی وجہ کیوں دریافت نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ حضرت جبریلؑ سے زیادہ بے تکلف ہیں آپ ہی دریافت فرمائیں حضرت یعقوبؑ نے جبریلؑ سے (اطلاعی خط بھیجنے کی ممانعت کی) وجہ دریافت کی حضرت جبریلؑ نے کہا مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذَّنْبُ کہا تھا اس پر اللہ نے فرمایا تم کو بھیڑیے کا تو اندیشہ ہو اور میرا خوف نہیں ہوا۔ بعوی نے لکھا ہے اہل تاریخ کہتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کے پاس مصر میں ۲۴ سال انتہائی امن چین اور قابل رشک خوشگواہی کے ساتھ گزارے پھر مصر ہی میں آپ کی وفات ہو گئی وفات کے وقت حضرت یوسفؑ کو وصیت کی کہ مجھے لے جا کر میرے باپ اسحاقؑ کے پاس دفن کرنا۔ یوسفؑ نے وصیت کی تعمیل کی اور لے جا کر شام میں دفن کر دیا پھر مصر لوٹ آئے۔

امام احمد نے الزہد میں مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت یعقوبؑ جب بہت کمزور اور اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہو گئے تو اپنے بیٹے یوسفؑ سے فرمایا کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر ربِّ یعقوبؑ کی قسم کھا کر اقرار کرو کہ مجھے میرے باپ دادا کے ساتھ دفن کرو گے میں زندگی کے کام میں ان کا شریک رہا تو مرنے کے بعد مجھے انہی کے قبرستان کے ساتھ دفن کرنا۔ جب آپ کی وفات ہو گئی تو حضرت یوسفؑ نے ایسا ہی کیا کنعان میں لے جا کر آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کر دیا۔ سعید بن جبیرؑ نے فرمایا سارے تابوت میں حضرت یعقوبؑ کی میت کو بیت المقدس لے گئے اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز عیص کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کو ایک ہی مقبرے میں (یا ایک ہی قبر میں) دفن کیا گیا دونوں کی عمر ۱۴ برس ہوئی عیص اور یعقوبؑ ساتھ ہی ایک بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (اگرچہ توأم نہ تھے) جب حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی امور کامل طور پر درست ہو گئے تو آپ نے خیال کیا یہ راحت اور نعمت بانی رہنے والی تو ہے نہیں۔ دنیا کی کسی نعمت کو بقا نہیں اس لئے حسنِ خاتمہ کی دعا کی اور کہا۔

رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ، فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ تَعَانَتْ وَلِيَّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، تَوْفَنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۱﴾

اے میرے رب تو نے مجھے سلطنت کا ایک بڑا حصہ عطا فرمایا اور خوابوں کی تعبیر دینا سکھائی اے آسمانوں اور زمین

کے پیدا کرنے والے تو میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھ کو پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھالے اور نیک بندوں کے ساتھ شامل کر دے۔

مِنَ الْمُلْكِ مِّنْ تَبْعِيضِهِ ہے یعنی سلطنت کا حصہ، مراد مصر کی حکومت۔ جس شخص کے ہاتھ میں نظم و نسق ہو اس کے اقتدار کی ہمہ گیری کو ملک کہتے ہیں۔ مِّنْ تَأْوِيلِ (میں) بھی مِّنْ تَبْعِيضِهِ ہے (یعنی کچھ کسی قدر تعبیر دینی، مکمل تعبیری علم تو حضرت یوسفؑ کو دیا نہیں گیا تھا) (اللہ کا علم کامل ہے) وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ۔ فاطر پیدا کرنے والا ایجاد کرنے والا۔ ولی ہذا ذمہ دار، کارساز مددگار، یا وہ ذات جو دونوں جہان میں نعمت عطا فرماتی اور کارساز کر تی ہے۔ اور ملک فانی کو ملک باقی سے ملاتی ہے۔ الصالحین سے مراد ہے انبیاء کیونکہ صلاح کامل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان ہر خطا سے معصوم ہو اور معصوم انبیاء کے سوا کوئی نہیں (یعنی الصالحین سے مراد ہیں کامل صالحین اور کامل صالحین صرف انبیاء ہیں)۔

قادہ نے کہا سوائے یوسفؑ کے اور کسی نبی نے اپنی موت کی دعا نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ قول محل تامل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی۔ اللَّهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَى۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس

وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کو دنیا و آخرت (میں سے ایک کو انتخاب کر لینے) کا اختیار نہیں دے دیا جاتا (اور وہ آخرت کو پسند نہیں کر لیتا) چنانچہ حضور ﷺ کی بیماری میں جب سخت بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تو میں نے خود سنا، حضور ﷺ فرما رہے تھے۔ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا یہ سن کر میں نے یقین کر لیا کہ حضور ﷺ کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دے دیا گیا۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین وابن سعد۔

..... قِصَّةُ كَاتِمَلَه ❁

حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی احوال جب درست ہو گئے اور ماں باپ اور دوسرے متعلقین بھی مل گئے تو اس وقت اپنے رب سے ملنے کا شوق غالب آیا اور مذکورہ دعا کی۔ حسن بصریؒ نے فرمایا اس کے بعد آپ چند سال زندہ رہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ سے کتنی مدت جُدا رہے علماء کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کلبی نے کہا ۲۲ سال جُدا رہے۔ بعض نے ۴۰ سال مدت جدائی بیان کی۔ حسن بصریؒ نے کہا ۷ سال کی عمر میں کنوئیں میں ڈالے گئے اور باپ سے اسی برس غائب رہے اور حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال جئے اور ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ توریث میں آپ کی عمر ۱۱۰ سال ذکر کی گئی ہے۔

عزیز کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسفؑ کے تین بچے ہوئے افرائیم ہمیشہ اور (تیسری لڑکی) رحمت افرائیم کی نسل میں سے یوشع بن نون، خادم موسیٰ ہوئے۔ رحمت حضرت ایوب صابر کی بیوی تھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بعد حضرت یوسفؑ ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے بہر حال وفات کے وقت (بر قول صحیح) آپ کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ اہل مصر نے سنگ مرمر کے ایک تابوت میں بند کر کے نیل میں آپ کو دفن کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کی وفات کے بعد ہر محلے والوں نے اپنے محلہ میں آپ کو دفن کرنا چاہا تا کہ اس محلے والوں کو برکت حاصل ہو اختلاف اتنا بڑھا کہ باہم جنگ ہونے اور لڑنے مرنے کا اندیشہ ہو گیا آخر سب نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو نیل کے اندر دفن کر دیا جائے۔ نیل کا پانی پورے شہر میں پھیلتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرہ اندوز ہو گا۔

عکرمہ نے کہا نیل کے دائیں جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور غلہ آفریں ہو گیا اور دوسرا جانب خشک ہو گیا پھر آپ کو دائیں جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو دایاں جانب سوکھ گیا اور بائیں جانب سر

سبز ہو گیا آخر نیل کے وسط میں دفن کر دیا۔ اس طرح نیل کے دونوں رخ سر سبز ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ تک آپ کی قبر نیل ہی میں رہی پھر حضرت موسیٰؑ نے آپ کا تابوت نیل سے نکلوا کر ملک شام کو منتقل کیا اور باپ دادا کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم نے بحوالہ معرودہ بن زبیر بیان کیا کہ اللہ نے جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کو لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا تھا کہ یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے جانا، مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا بلکہ ارض مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰؑ نے تلاش کی کہ کوئی یوسفؑ کی قبر کا نشان جاننے والا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک بڑھیا اسرائیلی ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسفؑ کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سر زمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو قبر بتا دوں گی۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا، میں تیری خواہش کے مطابق کر دوں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جس وقت چاند نکلے گا اس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے، چاند نکلنے کا وقت آ گیا اور حضرت یوسفؑ کا تابوت اس وقت تک آپ پر آمد نہ کر سکے اس لئے آپ نے اللہ سے دعا کی کہ چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو جائے تاکہ وعدہ خلافی نہ ہو دعا قبول ہو گئی اور چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو گئی پھر بڑھیا آپ کو اپنے ساتھ لے گئی اور نیل کے پانی کے اندر ایک طرف کو حضرت یوسفؑ کی قبر دکھادی۔ جس کے اندر سے ایک مرم کا صندوق حضرت موسیٰؑ نے نکلوا لیا اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بعد عمالقہ کے خاندان میں پے در پے مصر کے فرعون ہوتے رہے اور بنی اسرائیل ان کے زیر حکم رہے مگر حضرت یوسفؑ کے مذہب پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے ہاتھ سے اللہ نے فرعون کو ہلاک کر لیا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْتَمَعُوْا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۷﴾

یہ (قصہ یوسفؑ) غیب کی خبروں میں سے ہے جو وحی کے ذریعہ سے ہم آپ کو بتا رہے ہیں اور آپ ان (برادران یوسفؑ) کے پاس اس وقت موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے۔ یعنی کنویں کے گڑھے میں یوسفؑ کو ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مقصد یہ ہے کہ قصہ یوسفؑ کا وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس آنا اور آپ کا بذریعہ وحی اس پر مطلع ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اولاد یعقوبؑ میں سے کسی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی کہ آپ نے ان کی زبانی سن لیا ہو اور خود وہاں موجود نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والوں کو یہ قصہ معلوم تھا کہ کسی سے پوچھ کر آپ نے بیان کر دیا ہو۔ یہ مؤخر الذکر آیت مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ میں ذکر دی گئی ہے اس لئے یہاں ذکر نہیں کی گئی۔

پغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ یہود و قریش دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔ جب آپ نے توریت کے موافق ذکر کر دیا تب بھی وہ اسلام نہیں لائے اس پر رسول اللہ ﷺ کو سخت رنج ہوا اس پر آیت نازل ہوئی۔

وَمَا اَكْثَرَ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸﴾

اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کی کتنی ہی زیادہ خواہش ہو اور آپ ان سے اس کا کچھ معاوضہ تو طلب نہیں کرتے، یہ تو صرف تمام جہاں والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ یعنی آپ کتنی ہی یعنی آپ کتنی ہی ان کے مؤمن ہو جانے کی خواہش کریں اور کتنے ہی معجزات کا اظہار کریں، لیکن اللہ نے چونکہ ان کے کافر رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے اور آپ ان سے اس قرآن کو پیش کرنے یا خبریں بیان کرنے کی کوئی اجرت بھی تو نہیں مانگتے (کہ ان پر کچھ مالی بوجھ پڑتا ہو) یہ قرآن تو محض ایک عمومی نصیحت نامہ ہے (جس کو ماننے میں پیسے صرف کرنا نہیں پڑتے) جو اس کو نہ مانے گا تو اتمام حجت ہو جائے گا اور جو ایمان لانے والے ہیں ان کے لئے رحمت و بصیرت ہے۔

وَكَائِنٌ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ﴿۱۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ

اور بہت سی نشانیاں آسمانوں اور زمین میں

اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ﴿۱۶﴾

ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے اور جو لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ان میں سے اکثر شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔ کائین کے معنی ہیں کثیر یعنی اللہ کی صنعت، حکمت اور کمال قدرت و توحید کی کتنی ہی دلیلیں ہیں جو ان کی نظر کے سامنے آتی ہیں اور یہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر ان کی طرف توجہ نہیں کرتے، منہ پھیر لیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ بہت سی آیات عبرت ان کے سامنے آتی ہیں اور اقوام پارینہ کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت اندوز نہیں ہوتے۔ اور اگر اللہ کے وجود و خالقیت کا اقرار کرتے بھی ہیں تو اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کی بھی پوجا کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا تو جواب دیتے تھے اللہ نے اور جب دریافت کیا جاتا تھا کہ اوپر سے پانی کون برساتا ہے تو کہتے تھے اللہ۔ مگر اس کے باوجود وہ پتھروں کی پوجا کرتے تھے اور کہتے تھے پتھر کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی (یعنی بعض ستاروں کو بارش ہونے میں دخل سمجھتے تھے فقط مادی اسباب کی حیثیت سے نہیں بلکہ علت تامہ کی حیثیت سے۔ مترجم)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اس آیت کا نزول عرب کے مشرکوں کے لبتیک کہنے کے سلسلے میں ہوا۔ عرب کے مشرک (احرام یا طواف کعبہ کے وقت) ان الفاظ میں لبتیک کہتے تھے، اے اللہ! ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک ہے جس کو تو نے شریک بنا لیا ہے اور تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں۔

عطانے کہا مشرکوں کی یہ دعا (یعنی شرک آمیز دعا) آسائش و فراغت کے زمانے میں ہوتی تھی، کہ اپنے رب (کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے، شریکوں کو پکارتے اور رب) کو بھول جاتے تھے۔ لیکن جب مصیبت میں گرفتار ہوتے اور پتھر پڑتی تو اس وقت صرف اللہ کو پکارتے تھے۔ اِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ جب جہازوں اور کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو خالص طور پر اللہ کو پکارتے ہیں اور جب اللہ سمندر سے بچا کر خشکی میں پہنچا دیتا ہے تو پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھ ہے کہ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف علماء و مشائخ کے احکام پر چلتے اور ان کو رب قرار دیتے ہیں یا اللہ کی طرف والد ہونے کی نسبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ کی اولاد ہیں یا (مجوسی ہیں) نور و ظلمت کی الوہیت کے قائل ہیں مجملہ شرک کے قدر یہ فرقہ کا یہ قول بھی ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے توحید خالص تو اہل سنت کا قول ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں۔ بلکہ مسبب کی طرف سے غافل ہو کر اسباب پر نظر رکھنا (اور عملی طور پر اسباب کو ہی کارساز قرار دینا) بھی شرک کی قسم ہے اہل توحید صرف صوفیا ہیں (جن کی نظر اسباب پر نہیں بلکہ ہر وقت مسبب پر ہوتی ہے۔ مترجم)۔

اَفَاٰمِنُوْا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۷﴾

سو کیا پھر بھی ان کو اس بات کا خوف نہیں کہ اللہ کے عذاب کی کوئی آفت ان پر آڑے جو ان کو گھیر لے یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ یعنی کیا یہ اپنے رب کو بھول گئے اور مطمئن ہو گئے کہ کوئی چھا جانے والا عذاب خداوندی ان پر آجائے۔ قتادہ نے غَاشِيَةٌ کا ترجمہ کیا پڑنے والی آفت اور ضحاک نے کہا اس سے مراد ہے آسمانی بجلیاں اور غیبی حوادث۔ بَغْتَةً اچانک جس کی پہلے سے نہ کوئی علامت ہونے علم نہ وقت معین ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ بے خبر ہوں اس کے لئے تیار بھی نہ ہو۔ اَفَاٰمِنُوْا میں استفہام انکاری ہے یعنی ان کے لئے یہ خدا فراموشی اور عذاب فراموشی اور عذاب سے بے خونی مناسب نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ ایک سخت چیخ لوگوں کو ہیجان میں ڈال دے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے (سودا کرنے میں مشغول) ہوں گے کہ قیامت آجائے گی نہ خرید و فروخت کر سکیں گے نہ کپڑے کو لپیٹ سکیں گے۔ یہ حدیث اور

قیامت کی تشریح سورہ اعراف کی آیت **يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا الْخ** کی تفسیر کے ذیل میں کر دی گئی ہے
قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ①
 (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کہ یہ توحید اور آخرت کی تیاری کی دعوت میرا راستہ ہے
 میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں بھی دلیل پر قائم ہوں اور وہ لوگ بھی جو میرے پیرو ہیں اور اللہ ہر طرح کے نقص اور
 شرک سے پاک ہے اور میں شرکوں میں سے نہیں ہوں۔

سَبِيلِي میرا طریقہ، میرا راستہ۔ **أَدْعُو إِلَى اللَّهِ** یہ سبیل کی تشریح ہے یعنی میں اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان
 لانے اور ہر نامناسب وصف سے اس کو پاک سمجھنے اور اسی کے قرب کی طلب کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں۔ **عَلَى بَصِيرَةٍ**
 بصیرت سے مراد ہے یقین اور معرفت یعنی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود تراشیدہ خیالات کو مانتے ہیں جن کا ان کو خود
 کوئی علم نہیں ہوتا۔ یا بصیرت سے مراد ہے بیان اور واضح روشن دلیل۔ **وَمَنِ اتَّبَعَنِي** یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور
 میری تصدیق کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ کلبی اور ابن زید نے کہا رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے والوں پر لازم ہے
 کہ جس راستے کی طرف رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی ہے اس کی طرف وہ بھی لوگوں کو بلائیں اور قرآن کا ذکر کرتے رہیں یا یہ
 مطلب ہے کہ میں اور میری اتباع کرنے والے بصیرت پر ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا **مَنْ اتَّبَعَنِي** سے صحابہ کرام شرا
 ہیں، صحابہ راہ ہدایت پر تھے، معدن علم تھے، کنز ایمان تھے اور اللہ کا لشکر تھے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو سنت پر چلنا چاہے وہ
 مردوں کے طریقے پر چلے صحابہ رسول ﷺ کے راستے پر چلے صحابہ کا گروہ اس امت میں سب سے زیادہ پاک باطن گروہ تھا جن
 کا علم بہت گہرا تھا اور بناوٹ بالکل نہ تھی، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت اور اپنی دین کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا وہ راہ
 مستقیم پر گامزن تھے تم لوگ انہیں کے اخلاق اور زندگی کے طریقوں کو اختیار کرو اور انہی سے مشابہت پیدا کرو۔ **وَسُبْحَانَ اللَّهِ**
 یعنی میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور شرک سے اس کے پاک ہونے کا اعتراف و اقرار کرتا ہوں۔

اور آپ سے پہلے ہم نے
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى
 مختلف بستیوں والوں میں جتنے رسول بھیجا اور جن کو وحی بھیجتے رہے وہ سب آدمی ہی تھے (فرشتے نہیں تھے) یہ تردید ہے کافروں
 کے اس قول کی کہ ہمارا بچا ہوتا تو ملائکہ کو ہدایت کے لئے اتار دیتا۔

نُوحِي إِلَيْهِمْ یعنی جس طرح آپ کے پاس وحی بھیجی اسی طرح ان پیغمبروں کے پاس بھی وحی بھیجتے رہے جس کی وجہ
 سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ **مِنْ أَهْلِ الْقُرَى** یعنی وہ قصبوں اور بستیوں کے رہنے والے تھے صحرائی خانہ بدوش نہ تھے۔
 صحرائی لوگ بدخلق اور درشت خوتے ہیں اور بستیوں، شہروں والے دانش مند، ذی علم اور حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

حسن بصری نے کہا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے نہ کسی جن کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو نہ کسی خانہ بدوش صحرائی کو۔
 میں کہتا ہوں اس آیت سے نبوت جن کی نفی نہیں ہوتی (رجال جنات میں سے بھی ہوتے ہیں) اللہ نے فرمایا **كَانَ**
رِجَالًا مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالِ مَنِ الْجِنِّ اس کے علاوہ اس جگہ انسانوں کی پاس پیغمبر بھیجنے کا ذکر ہے اس سے یہ لازم
 نہیں آتا کہ جنات کے پاس جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا اللہ نے خود فرمایا ہے **لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمْشُونَ**
مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكَاتٌ رَسُولًا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَكِنْ الْأَخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ
 تو کیا یہ لوگ ملک میں کہیں چلے پھرے نہیں
أَتَقْوُوا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ②
 کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا بڑا انجام ہوا جو ان سے پہلے کافر ہو گزرے ہیں اور آخرت کا گھران لوگوں کے
 لئے بہت ہی اچھا ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں سو کیا تم اتنا نہیں سمجھتے۔ یعنی آپ کی تکذیب کرنے والے مشرک ملک میں چل
 پھر کر اتنا نہیں دیکھتے کہ پہلے پیغمبروں کو اور ان کے معجزات کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا برا نتیجہ ہوا ان کے برے انجام کو دیکھ

کر ان کو عبرت حاصل کرنا اور آپ کی تکذیب نہ کرنا چاہئے تھا یا اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہو کر دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا اس کو دیکھنے کے لئے دیدہ عبرت نگاہ کی ضرورت ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دنیا پرستوں کا کیا انجام ہو اور اللہ نے اپنے دوستوں اور اطاعت شعار بندوں کے لئے کیا سلوک کیا دنیا میں نازل شدہ عذاب سے ان کو بچالیا اور آخرت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس دنیا سے کہیں بہتر ہوگا۔ عقل سے کام لینے کی اور یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخرت ہی بہتر ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا إِجَاءَهُمْ نَصْرٌ مِّنَّا فَذُكِّرُوا لِمَنْ نَشَاءُ وَلَا يَرُدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۰﴾ یہاں تک کہ جب پیغمبر (اس بات) مایوس ہو گئے اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی تو ان کو ہماری مدد پہنچی پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا وہ بچالیا گیا اور ہمارا عذاب محسوس لوگوں سے نہیں لوٹایا جاتا۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ کا تعلق سابق آیت وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا سے ہے یعنی ہم نے آپ سے پہلے آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا اور ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کی یہاں تک کہ جب وہ ناامید ہو گئے اٹخ۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق محذوف کلام سے ہے اصل کلام یوں تھا کہ ان کافروں کو اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہئے کہ اتنے زمانے تک ان پر عذاب نہیں آیا اور اب تک تباہی سے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان سے پہلے لوگوں (مثلاً امتِ نوح وغیرہ) کو بڑی طویل مہلتیں دی جا چکی ہیں یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود کفر میں ڈوب جانے کے یہ لوگ عیش و آرام میں ہیں مدتِ دراز سے چین و راحت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ قَدْ كُذِّبُوا کا معنی بظاہر یہی ہے کہ پیغمبروں کو گمان ہو گیا کہ اللہ نے جو ہم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا، وعدہ پورا نہیں کیا چونکہ یہ معنی غلط ہے اسی لئے حضرت عائشہ نے كُذِّبُوا کی قرأت کا انکار کر دیا اور كُذِّبُوا کی جگہ كُذِّبُوا پڑھا۔ مگر كُذِّبُوا کی قرأت متواتر ہے خواہ حضرت عائشہ کو اس کا علم نہ ہو البتہ ظاہری معنی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ قوم نے جو ہم سے ایمان کا وعدہ کیا وہ غلط کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں نے گمان کر لیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی ہم سمجھتے تھے کہ ہماری مدد بہت جلد کی جائے گی مگر ہمارا یہ فہم غلط تھا۔ یا ظَنُّوا کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے یعنی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ کافر خیال کرنے لگے کہ پیغمبروں نے جو ہم کو توحید کی دعوت دی تھی اور بصورتِ خلاف ورزی عذاب کی دھمکی دی تھی وہ غلط تھی ہم سے جھوٹ کہا گیا تھا، یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں پر ایمان لانے والوں کو خیال ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو ہم سے فتح و نصرت کا اور کافروں کی ہلاکت کا وعدہ کیا تھا وہ غلط نکلا کچھ معاملہ گڑ بڑ ہو گیا یعنی غوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک آیت کا ظاہری مطلب ہی مراد ہے۔ پیغمبر بھی بشر تھے اور بہ تقاضائے بشریت ان کو گمان ہونے لگا کہ ہم سے جو فتح و نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا یہ گمان پیغمبروں کے ضعفِ قلب اور تقاضائے بشریت کا نتیجہ تھا پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی یہ مطلب وہی ہے جس کا حضرت عائشہ نے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے كُذِّبُوا کی قرأت کا بھی انکار کر دیا۔

بیضاوی نے لکھا ہے اگر صحیح روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ثابت ہو جائے تو اس وقت ظن سے مراد ہوگا وسوسہ اور بے اختیار دل میں پیدا ہونے والا خیال۔ طبی نے لکھا ہے روایت صحیح ہے بخاری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کا (حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ) تمثیلی معنی مراد ہے طولِ مہلت اور نزولِ عذاب میں انتہائی تاخیر کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے كُذِّبُوا بغیر تشدیدِ ذال کے کو فیوں کی قرأت ہے دوسرے لوگوں کی قرأت كُذِّبُوا تشدیدِ ذال ہے یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ کافروں نے ان کی ایسی تکذیب کی ہے کہ اس کے بعد ایمان لانے کی امید نہیں رہی، قتادہ نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پیغمبر جب تکذیب کرنے والوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے

گمان کر لیا کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو بھی جھوٹا کر دیا گیا اور سخت شدائد میں مبتلا ہونے اور امداد میں تاخیر کی وجہ سے ان میں بھی تزلزل پیدا ہو گیا اور وہ بھی ایمان سے پھر جائیں گے مَن نَشَاءُ سے مراد ہیں انبیاء اور ان کے سامعی اہل ایمان چونکہ انبیاء اور ان کے سامعی مستحق نجات تھے اور کسی دوسرے کے نجات پانے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا اس لئے صراحتاً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور مبہم طور پر مَن نَشَاءُ فرمادیا وَلَا يَرْدُّ بَأْسَنَا بَأْسًا عَذَابٍ۔ یعنی آیا ہوا اللہ کا عذاب لوٹایا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے مَن نَشَاءُ سے بعض مؤمن مراد ہوں اور کافروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض مؤمن عذاب سے ہلاک کر دیئے گئے ہوں، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَأَتَقُوا فِتْنَةَ لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً اور اس عذاب سے ڈرو جو صرف انہیں لوگوں پر نہیں آئے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ
ان (انبیاء اور ان کی امتوں کے یا یوسف اور ان کے بھائیوں) کے قصے میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ یعنی ان دانش مندوں کے لئے عبرت ہے جن کی عقلیں سلیم اور محسوس پرستی کی طرف میلان سے پاک ہیں عقیدہ چاہ سے مرتبہ شاہ پر فائز کرنا اور بوریہ سے اٹھا کر تخت شاہی پر پہنچانا بڑا عبرت آفریں ہے صبر کا انجام سلامتی اور عزت ہے اور فریب کا نتیجہ رسوائی اور ندامت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱۱﴾
کی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔

یُفْتَرَىٰ: از خود گڑھی ہوئی تراشی ہوئی۔ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد ہے توریت و انجیل۔ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد ہے ہر ضروری دینی بات جس کی بندوں کو حاجت ہوتی ہے ہر دینی امر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے خواہ براہ راست یا حدیث یا اجماع اور اجتہاد کے واسطے سے۔ جو مسئلہ حدیث سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَبَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ہم نے ہر پیغمبر کو اس لئے بھیجا کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ جو کچھ تم کو حکم دے دیں لے لو اور جس چیز سے روک دیں رک جاؤ جو مسئلہ اجماع سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ هِدَايَتًا ظاہر ہونے کے بعد جو شخص رسول ﷺ سے کٹ جائے گا اور اہل ایمان کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو اسی کے اختیار کردہ راستہ پر چلنے دیں گے۔ اور جو مسئلہ قیاس سے ثابت ہے وہ بھی قرآن سے ہی ثابت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ اے عقل والو نصیحت حاصل کرو عبرت پکڑو۔ چونکہ اہل ایمان ہی قرآن سے نفع اندوز ہوتے ہیں اس لئے انہی کا خاص طور پر ذکر کیا (اگرچہ قرآن کی راہنمائی ہر شخص کے لئے عام ہے)

شیخ ابو منصور ماتریدی نے فرمایا حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے صبر کی تلقین ہے۔ یوسف کے بھائی تو یوسف کے ساتھ دین میں موافق تھے اور سب ایک باپ کے بیٹے تھے یوسف کے ساتھ انہوں نے بد سلوکی کی اور یوسف نے صبر کیا اور دانستہ ان کی خطاؤں سے درگزر کی اور معاف کر دیا، پس آپ کو تو اپنی قوم کی ایذا رسانیوں پر زیادہ صبر کرنا چاہیے آپ کی قوم تو کافر اور جاہل ہے۔

وہب کا قول ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی اس میں قرآن کی طرح پوری سورت یوسف نازل فرمائی۔

الحمد للہ یکم صفر ۱۲۰۲ھ کو سورہ یوسف کی تفسیر ختم ہوئی۔ بحمد اللہ ۱۵ رمضان ۱۳۸۶ھ کو تفسیر سورہ یوسف کا ترجمہ ختم ہوا۔ مہر

سُورَةُ الرَّعْدِ.....

سورہ رعد مکی ہے اس میں تینتالیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الْمَرَاتِفِ تِلْكَ آيَاتِ الْكِتَابِ ط
یہ قرآن کی (یا کامل سورت کی) آیات ہیں، الکتاب سے مراد ہے قرآن مجید یا پوری سورت اور تِلْكَ سے آیات کی طرف اشارہ ہے اور آیاتِ الْكِتَابِ میں اضافت بتقدیر من ہے یعنی یہ آیات قرآن یا سورت کا ایک حصہ ہیں۔

وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ①

اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔ (یہ ترجمہ اس صورت میں ہو گا کہ واو کو استینافیہ قرار دے کر الَّذِي کو مبتدا اور الْحَقُّ کو خبر مان کر جملہ کو بالکل علیحدہ مستقل تسلیم کیا جائے لیکن حضرت مفسر نے لکھا ہے کہ) اگر الْكِتَابِ سے مراد سورت ہو تو الَّذِي سے مراد قرآن ہو گا اور اس کا الْكِتَابِ پر عطف بحالت جر ایسا ہی ہو گا جیسا عام کا عطف خاص پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ آیات سورت کی اور قرآن کی آیات ہیں اور اگر الْكِتَابِ سے مراد قرآن ہو اور الَّذِي سے مراد بھی قرآن ہی ہے تو ایک صفت کا دوسری صفت پر عطف ہو گا اور الْحَقُّ خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے یعنی وہی حق ہے۔

..... ایک شبہ.....

الْحَقُّ پر الف لام لانا بتارہا ہے کہ قرآن ہی حق ہے تو کیا حدیثِ رسول اللہ ﷺ اور اجماع اور قیاس حق نہیں ہے۔

..... جواب.....

مَا أَنْزَلَ سے مراد عام ہے جو کچھ نازل کیا گیا خواہ صریحاً یا ضمناً قیاس، اجماع اور حدیث کے اتباع کرنے کا حکم چونکہ قرآن میں صریحاً ہے اس لئے ارکانِ ثلاثہ بھی ضمناً حق ہیں۔
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ الْح یعنی اکثر لوگ چونکہ غور و نظر کی غلطی اور فکر و نظر کے اختلال میں مبتلا ہیں۔ اس لئے وہ قرآن کی حقانیت سے واقف نہیں۔ مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول مشرکین مکہ کے حق میں ہوا تھا، مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے قرآن خود بنا لیا ہے اللہ نے اس قول کی تردید فرمادی اور اگلی آیات میں اپنی توحید کے دلائل بیان فرمائیں۔

اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ أَسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَجَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ②

ہے اور تمام اسباب کو فراہم کر رہا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَجَوِّبَاتٌ
اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے مختلف قطعات ہیں کوئی عمدہ اور
پیداواری ہے اور کوئی شور یلا نمکین، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کرنے کے قابل ہے درخت بونے کے قابل نہیں، کوئی
درختوں کی سر زمین ہے کھیتی کے ناقابل، کسی میں سبزہ کم ہے (یا بجز ہے) اور کوئی سبزہ زار ہے اگر یہ فعل قادرِ مختار اور صالحِ حکیم کا
نہیں تو پھر یہ اختلاف کیوں ہے اور کیوں خواص میں تفاوت ہے زمین کی طبیعت ایک ہی ہے، لوازم طبیعت بھی یکساں ہیں سماوی
اسباب کی تاثیر بھی ایک ہی جیسی ہے وضع اور نسبت میں بھی کوئی فرق نہیں پھر سوائے اس کے کہ ایک قادرِ مختار کی مشیت کی
کار فرمائی قرار دی جائے اور کیا سبب اختلاف بتایا جاسکتا ہے۔

وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزُرْعٌ وَنَخِيلٌ وَصِنَوَانٌ وَغَيْرُصِنَوَانٍ يُسْقَىٰ بِهَاءٍ وَآحِدٍ تَفَاوُتٌ وَنُفُضِلٌ بَعْضُهَا عَلَىٰ بَعْضٍ
اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں کچھ تو ایک تنہ سے اوپر دو
شاخہ ہو گئے ہیں اور کچھ دو تنہ نہیں ہوئے ان میں سے ہر ایک کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے
پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں۔

زرع اصل میں مصدر ہے اس لئے اس کو جمع لانے کی ضرورت نہیں۔
صِنَوَانٌ: صِنَوٌ کی جمع ہے جیسے قِنَوَانٍ (خوشے) قِنَوٌ کی جمع ہے اس کے تشبیہ کا نون مکسور ہوتا ہے اور بغیر تنوین کے
ہوتا ہے اور جمع کے نون پر ہر حرکت مع تنوین کے آتی ہے ایک جڑ سے دو تنہ برآمد ہوں تو ان کو صِنَوٌ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ
نے حضرت عباس کے متعلق فرمایا آدمی کا چچا اس کے باپ کا صِنَوٌ ہوتا ہے۔

غَيْرُ صِنَوَانٍ یعنی الگ الگ ہوئے ہیں جڑیں جدا ہوتی ہیں۔
الْأَكْلُ پھل یعنی مقدار میں مزہ... میں رنگ میں خوشبو میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ ترمذی نے
بروایت حسن اور حاکم نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وقل اور فارسی اور
میٹھا اور کھٹا۔

ان سب میں بھی صالحِ حکیم کی قدرت کی جھلک ہے اصول کے ایک اسباب ایک جیسے پھر ان کا بھی اختلاف کسی قادرِ
مختار کی خصوصی عطا ہے۔ مجاہد نے کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ سے سب آدمی پیدا ہوئے لیکن کوئی اچھا ہے کوئی
برا، حسن نے اس کی تشبیہ انسانوں کے دلوں سے دی ہے۔ زمین کا ایک خمیر تھا اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے اس کو پھیلایا بچھایا
اور پاس پاس اس کے جدا جدا ٹکڑے کر دیئے پھر اس پر آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے ایک ٹکڑے سے پھل پھول اور
کھیتیاں درخت پیدا کئے اور دوسرے کو شور یلا نمکین ٹکڑے اور بنجر کر دیا، باوجود یہ کہ سب پر ایک، طرح کا پانی برسایا، آدمیوں کی
حالت بھی اسی طرح ہے سب کو آدم سے پیدا کیا اور سب کے لئے ہدایت نامہ کا پانی آسمان سے اتارا کچھ دل تو اس کی وجہ سے نرم
پڑ گئے اور ان کے اندر خشوع پیدا ہو گیا اور کچھ سخت ہو گئے اور غافل بن گئے۔

حسن نے کہا خدا کی قسم جو شخص بھی قرآن کا جلیس (ہم نشین) ہو تو اٹھنے کے وقت کچھ زیادتی لے کر اٹھلایا کمی لے کر
(فائدہ لے کر یا نقصان لے کر) اللہ نے فرمایا ہے وَنُنزِلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ
الْآخِسَارًا۔

ان امور میں بھی سمجھ داروں کے لئے توحید کے دلائل موجود
ہیں جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اور غور کرتے ہیں ان کو ان امور کے اندر اللہ کی توحید نظر آتی ہے۔

وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ إِذْ كُنَّا رَبَّاءً إِنَّ الْبَفَىٰ خَلْقٍ جَدِيدٍ
اور اے محمد! اگر آپ
کو تعجب ہو تو واقعی ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم خاک ہو گئے تو کیا از سر نو پھر (قیامت کے دن) پیدا ہوں گے۔

جملہ استفہامیہ قَوْلُهُمْ كَابِدِلْ ہے یا مقولہ یعنی مفعول ہے یعنی ان کا یہ قول حشر کا انکار کر رہا ہے وہ اس بات کا تو اقرار کرتے ہیں کہ اول تخلیق اللہ نے کی لیکن دوبارہ پیدا کئے جانے کے منکر ہیں حالانکہ یہ بات ہر شخص مانتا ہے کہ کسی کام کی ابتدا سے دوبارہ اس کو کرنا آسان ہوتا ہے بشرطیکہ ابتداً ارادہ و اختیار کے ساتھ علم اور اندازہ کے تحت کی گئی ہو بے اختیار بلا ارادہ بغیر جانے بوجھے نہ ہو گئی ہو اور مشرکوں کو اللہ کی با اختیار خلافت اور علم و ارادہ کے ساتھ موجد ہونے کا تو اقرار تھا۔ وہ فلاسفہ کی طرح خدا کو غیر مختار نہیں جانتے تھے پھر تخلیق جدید کا انکار بے عقلی کی بات تھی۔ مترجم)

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو آپ کے دعویٰ رسالت کی تکذیب کر رہے ہیں باوجود یہ کہ کھلے ہوئے معجزات دیکھ رہے ہیں اور واضح دلائل بھی ان کے سامنے ہیں پھر بھی ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جن میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور آپ کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا ہے تو ان کا یہ قول بھی تعجب کے لائق ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد کیا دوبارہ از سر نو پیدا کئے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی نے تمام وہ چیزیں جن کی تفصیل ذکر کر دی گئی نیست سے ہست کی ہیں پھر ان کے مرنے کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنا تو آسان ہے۔

آیات مذکورہ اور دلائل واضح چاہتے ہیں کہ ان کا ایک (با اختیار) فاعل ہو اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے امکان پر بھی ان سے استدلال کیا جاسکتا ہے ان سے اللہ کا قادر مطلق ہونا اور مختلف قابلیت کی چیزوں میں مختلف تصرفات کرنا ثابت ہو رہا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ
یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے یعنی قیامت کا انکار کرنے والے اپنے رب کے منکر ہیں کیونکہ اس کی قدرت کا انکار کرتے ہیں اور جو قادر نہ ہو عاجز ہو وہ رب ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ
اور یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں گمراہی کے طوق ہیں (جن سے خلاصی کی کوئی امید نہیں یا) دوزخ کے اندر ان کے گلے میں آگ کے طوق ہوں گے۔ قیامت کے دن ان کو طوق پہنائے جائیں گے۔

وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ
اور یہی (قیامت کے دن) دوزخی ہوں گے۔
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے کبھی نہیں نکالے جائیں گے۔ ضمیر فصل (یعنی ہم) کا درمیان میں لانا بتا رہا ہے کہ کفار ہی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مخلوق فی النار کافروں کے لئے مخصوص ہے اہل سنت کا یہی قول ہے۔ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے (وہ مؤمن فاسق کو دوائی دوزخی کہتے ہیں کیونکہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو وہ ایمان سے خارج جانتے ہیں اگرچہ کافر نہیں کہتے۔ مترجم)

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلَاتُ
اور یہ لوگ بھلائی (عافیت کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے بُرائی (یعنی مصیبت کے نزول) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعات عقوبت گزر چکے ہیں۔

إِسْتَعْجَالِ وَقْتٍ مَّقَرَّرِهِ سَبَلُهُمْ كَيْسِيءُ كَيْسِيءُ كَيْسِيءُ كَيْسِيءُ كَيْسِيءُ
پہلے کسی چیز کی طلب کرنا (عجلت طلبی) سبیل سے مراد ہے عذاب اور سزا اور حسنہ سے مراد ہے نعمت و عافیت۔ مشرکین مکہ عافیت کی جگہ عذاب (خداوندی) کے طالب تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔

الْمَثَلَاتُ ان جیسے دوسرے کافروں پر نازل ہونے والی سزائیں، یعنی سابق کافروں پر نازل ہونے والی عقوبتوں سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور کیوں ان کو اپنے اوپر ویسے ہی عذاب نازل ہونے سے ڈر نہیں لگتا۔ مَثَلَةٌ مَثَلَةٌ جیسے صَدَقَةٌ اور صَدَقَةٌ ہر سزا کو کہتے ہیں کیونکہ سزا جرم کی مثل ہوتی ہے قصاص کو بھی مثال اسی وجہ سے کہا جاتا ہے امثالُ الرَّجُلِ میں نے اس کا قصاص لے لیا۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ
اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی
خطائیں باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے۔

عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ یعنی باوجود یہ کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ
یہ آیت منکرین قیامت کے متعلق ہے اور منکرین قیامت کی مغفرت اللہ کبھی نہیں کرے گا تو مغفرت سے مراد ہے ڈھیل دینا
فوراً پکڑ نہ کرنا یعنی اللہ حلیم ہے کافروں کو بھی باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے ڈھیل دیتا رہتا ہے اور ان کو فی الفور عذاب نہیں
دیتا۔ حالانکہ وہ عذاب آنے میں عجلت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ①
اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت عذاب دیتا ہے جب اللہ کی
طرف سے عذاب آجاتا ہے تو کوئی اس کو دفع نہیں کر سکتا۔ سدی نے کہا کہ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ۔
مؤمنوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں جتنی آیات گناہگار مؤمنوں کو امید مغفرت دلا رہی ہیں اور
ان سب سے بڑھ کر امید گاہ مغفرت یہ آیت ہے اس آیت میں "عَلَىٰ ظُلْمٍ" کا لفظ امید دلا رہا ہے کہ بغیر توبہ کے بھی مغفرت
ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنے والا ظلم پر نہیں رہتا۔ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ حدیث حضرت ابن
مسعودؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ اور آیت وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ۔ دونوں کا
تعلق مؤمنوں سے ہے مگر دونوں مشروط بہ مشیت ہیں، مطلب یہ ہے کہ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ جس کو
چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی اور واحدی نے سعید بن مسیبؓ کے روایت سے مرسل بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اللہ
کی طرف سے معافی اور درگزر نہ ہوتی تو یہاں کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر اس کی طرف سے عذاب کی دھمکی نہ ہوتی تو ہر ایک اس کی
رحمت پر بھروسہ کر بیٹھتا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَوْلًا لَّا نُزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ
اور یہ کفار کہتے ہیں ان پر کوئی
(خاص) معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں ان کے رب کی طرف سے نہیں نازل کیا گیا۔ آیت یعنی کوئی خاص نشانی اور معجزہ جو ان کی
نبوت کو ثابت کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جو معجزات نازل کئے گئے کافروں کے نزدیک درخور اعتناء نہیں تھے اور عناد و ضد کی
وجہ سے خود پسند معجزات کے طلب گار تھے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ②
آپ صرف (مخالفت کرنے والوں کو اللہ کے عذاب
سے ڈرانے والے نبی ہیں اور ہر قوم کے لئے راہنما ہوتے چلے آئے ہیں۔ یعنی آپ کے ذمے صرف احکام الہی پہنچانا اور نہ
ماننے والوں کو عذاب کا خوف دلانا ہے۔ مطلوبہ معجزات کو پیش کرنا اور جبراً ہدایت یافتہ بنا دینا آپ کا کام نہیں۔ راہ حق کی طرف
بلا نا آپ کا کام ہے اور ہر قوم کی ہدایت کے لئے کوئی نہ کوئی پیغمبر آتا رہا ہے جو خدا واد معجزات پیش کرتا رہا ہے۔ مطلوبہ فرمائش
معجزات کسی نے پیش نہیں کئے۔

سعید بن جبیرؓ کے نزدیک ہادی سے مراد اللہ ہے۔ یعنی ہر قوم کو ہدایت یاب بنانا اور ہدایت پر قدرت دینا تو اللہ کا کام ہے
وہی ہدایت پر قادر ہے يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ عکرمہ نے کہا ہادی سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ۔ یعنی
آپ تو صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کو راستہ دکھانے والے ہیں۔

رافضی کہتے ہیں اصل آیت میں وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ عَلَيَّ ہر قوم کے ہادی علی ہیں تھا عثمان نے حسد کی وجہ سے علیؓ کا لفظ
ساقط کر دیا۔ ان کو اللہ سزا دے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے قرآن کے متعلق وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ فرمادیا ہے ہم ہی قرآن کی
حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر بفرض محال ان کے قول کو مان بھی لیا جائے تو پھر اصل آیت کی رو سے رسول اللہ ﷺ پر بھی

حضرت علیؑ کی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم اس وقت یہ ہوگا کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے ہادی تو علیؑ ہیں (یعنی آپ ہدایت کے درجہ پر فائز نہیں یہ کام تو علیؑ کا ہے)

اللہ کا علم کامل ہے قدرت تام ہے، قضاء و قدر کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں وہ ہر فرمائشی معجزہ کو پیدا کر سکتا ہے اور قادر مطلق ہے ان کافروں کو ہدایت بھی کر سکتا ہے مگر مطلوبہ معجزات کی درخواست سے طلب ہدایت مقصود نہیں بلکہ محض عناد کے زیر اثر ایسی فرمائشیں کی جاتی ہیں اس لئے ان فرمائشوں کو پورا نہیں کرتا اور چونکہ ان کے کافر رہنے کا ازلی فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اس لئے ہدایت یاب ہونے کی ان کو توفیق بھی نہیں دیتا۔ ان تمام مضامین پر آیات ذیل دلالت کر رہی ہیں۔

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيصُ الْأَرْحَامَ وَمَا تَزِدَادُ
کچھ کسی مادہ کو حمل رہتا ہے اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

مَا تَحْمِلُ (میں ما مصدری ہے یعنی) حاملہ ہونے کو اللہ جانتا ہے یا (ما موصولہ ہے یعنی) جس چیز کو مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوتی ہے۔ نریا مادہ ایک یا متعدد، پورے سالم اعضاء والا بچہ پانا قص اور اس کی ہر موجودہ اور آئندہ حالت کو اللہ جانتا ہے۔ تَغِيصُ، غَاضٌ کا مضارع ہے اور غَاضٌ لازم بھی ہے بمعنی اِنْغَاضٌ (باب انفعال) کے اور متعدی بھی ہے بمعنی اِنْغَاضٌ (باب افعال) کے۔ قاموس میں ہے غَاضٌ الْمَاءِ پانی کم ہو گیا گھٹ گیا۔ غَاضٌ تَمَنُّ السِّلْعَةِ سامان کی قیمت گھٹ گئی۔ غَاضٌ الْمَاءِ وَ تَمَنُّ السِّلْعَةِ اس نے پانی تھوڑا کر دیا کم کر دیا اور سامان کی قیمت گھٹا دی۔

تَزِدَادُ، اِزْدَادٌ سے مضارع ہے اِزْدِيَادٌ (انفعال) لازم بھی آتا ہے۔ جیسے اِزْدَادُ الْقَوْمِ عَلَيَّ عَشْرَةَ قَوْمٍ دس افراد سے زیادہ ہو گئی اور متعدی بھی آتا ہے جیسے وَ تَزِدَادُ كَيْلٍ بَعِيرٍ ہم ایک بار شتر بڑھا دیں گے۔ اگر دونوں فعلوں کو لازم کہا جائے تو ما مصدری ہوگا یعنی اَرْحَامَ کے گھٹنے اور بڑھنے کو اللہ جانتا ہے، رحم کے گھٹنے بڑھنے سے مراد ہے رحم کے اندر والی چیز کے جثہ، مدت اور تعداد کا گھٹنا بڑھنا اور اگر دونوں فعل متعدی مانے جائیں تو ما موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور مصدریہ بھی۔

..... مسئلہ ❁

باتفاق علماء حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا چھ مہینے میں عورت کا بچہ پیدا ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے عورت کو سنگسار کر دینے کا حکم دے دیا حضرت ابن عباسؓ (مانع ہوئے اور) فرمایا کتاب اللہ کی روشنی میں اگر میں تم سے اس مسئلہ میں مناظرہ کروں تو تمہارے پاس جو اب نہ ہوگا اللہ نے فرمایا وَ حَمْلُهُ وَ فِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا اس کا حالت حمل میں رہنا اور دودھ پینا تیس ماہ ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے دونوں آیتوں کے ملانے سے مدت حمل کم سے کم چھ ماہ رہتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر تعزیری سزا منسوخ کر دی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سزا ساقط کر دی اور کسی نے مخالفت نہیں کی تو یہ اجماع سکونتی ہو گیا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے) کبھی چھ ماہ بچہ پیدا ہوتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل دو سال ہے۔

دار قطنی اور بیہقی نے سنن میں ابن المبارک کے طریق سے از داؤد بن عبدالرحمن از ابن جریج از جمیلہ بنت سعد ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تکلے کے سایہ کی بقدر بھی کوئی عورت حمل میں دو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے حمل دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ زیادتی تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔

ایک قول میں امام شافعیؒ و امام مالکؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل چار سال ہے دوسری روایت میں امام مالکؒ کا قول آیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدت حمل پانچ برس ہے حماد بن سلمہ نے کہا ہرم بن سنان کو ہرم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماں کے پیٹ میں چار برس رہا تھا (ہرم بہت زیادہ بوڑھے آدمی کو کہتے ہیں)

بیہتی کا بیان ہے کہ ولید بن مسلم نے امام مالک بن انس سے کہا مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا عورت کے حمل کی مدت میں دو سال سے نکلے کے سایہ کے بقدر بھی اضافہ نہیں ہوتا امام مالک نے فرمایا۔ سبحان اللہ یہ کون کہتا ہے میری یہ ہمسائی محمد بن عجلان کی بیوی بہت سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بڑا سچا آدمی ہے اس عورت کے تین بطن بارہ سال میں پیدا ہوئے ہر بطن چار سال میں۔

ابن ہمام نے کہا ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو مدت آئی ہے وہ (حضرت عائشہؓ کا قیاس نہیں ہے ایسے مسائل میں قیاس کو دخل نہیں) صرف سماعی ہے (رسول اللہ ﷺ سے آپ نے ایسا ہی سنا ہوگا) لہذا مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے) اور حدیث مرفوع بہر حال محمد بن عجلان کی بیوی کے قول سے زیادہ قابل اعتماد ہے اگر حدیث کی نسبت شارع کی طرف صحیح ثابت ہو جائے تو پھر حدیث میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہو سکتا اور ولید بن مسلم کی روایت اگر صحیح بھی ہو اور امام مالکؒ نے ایسا ہی فرمایا ہو اور عورت نے بھی ایسا ہی بیان کیا ہو تب بھی اس میں غلطی کا احتمال ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ چار برس تک (حیض کا) خون نہیں آتا اور چار سال کے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس سے یہ یقین کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ عورت پورے چار برس حاملہ رہی ہو سکتا ہے کہ اس کی پاکی کی مدت دو سال یا اس سے زیادہ رہی ہو پھر دو سال یا اس سے کم مدت حمل والی ہوئی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ پیٹ کے اندر حرکت ہوتی ہوئی چار سال تک محسوس ہوتی رہی (لا محالہ بچہ ہی حرکت کرتا ہوگا) تو حرکت سے بچہ کے وجود پر بھی استدلال قطعی نہیں بغیر بچہ کے (صرف ریاض منجمد کی) حرکت بھی ممکن ہے ہم سے بیان کیا گیا تھا کہ ایک عورت نے نو ماہ تک پیٹ میں کسی چیز کی حرکت محسوس کی اس عرصہ میں خون بھی بند رہا اور پیٹ بھی بڑا ہو گیا جب وضع حمل کا وقت آیا اور دایہ جا کر پیٹھی اور درد ہوئے تو پانی چھوٹ گیا اور رفتہ رفتہ پیٹ لگ گیا اور کوئی بچہ پیدا نہ ہوا آخر دایہ اٹھ گئی..... شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر چند سال گھر سے غائب رہا جب واپس آیا تو بیوی کو حاملہ پایا حضرت عمرؓ نے اس کو سنگسار کر دینے کا ارادہ کیا حضرت معاذؓ نے فرمایا امیر المؤمنین اگر اس عورت پر آپ کو شرعی دسترس ہو بھی تب بھی اس کے پیٹ کے بچہ پر آپ کو کوئی دسترس نہیں ہو سکتی یعنی اس کو آپ قتل نہیں کر سکتے جب بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کو سنگسار کر سکتے ہیں غرض بچہ پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کے دو اگلے دانت بھی نکل آئے تو اس شخص نے بچہ کو دیکھا تو بولا قسم ہے رب کعبہ کی یہ میرا بچہ ہے۔ (حضرت عمرؓ نے عورت کی سزا منسوخ کر دی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال سے زائد مدت حمل حضرت عمرؓ نے تسلیم کر لی)۔

..... جواب

یہ سزا کی منسوخی تو اس وجہ سے ہوئی کہ مرد نے اس بچہ کو اپنا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے اور جس کا فریاد ہوتا ہے بچہ اسی کا شرعاً مانا جاتا ہے (خواہ وہ بچہ زنا کا ہی ہو مگر مانا جائے گا شوہر ہی کا) اسی لئے حضرت عمرؓ نے سزا موقوف کر دی۔

..... مسئلہ

ایک بطن میں ایک جھلی کے اندر زیادہ سے زیادہ کتنے بچے ہوتے ہیں اس کی کوئی حد نہیں۔ بعض نے کہا کہ چار بچوں کا ہونا تو معلوم ہوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا بیوی قول ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا یمن میں مجھ سے ایک شیخ نے بیان کیا تھا کہ اس کی بیوی کے پانچ بطن ہوئے اور ہر بطن میں پانچ پانچ بچے ہوئے۔ میں کہتا ہوں ہندوستان میں ایک خبر مشہور ہوئی تھی کہ پورب کی طرف قاضی قدوہ کی بیوی کے ایک بطن میں ایک جھلی میں سونکے ہوئے اور سب زندہ رہے۔ بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کہتے ہیں کہ غِیْضُ الْأَرْحَامِ حیض ہے جو بچہ پر اثر انداز ہوتا ہے اگر حاملہ کو حیض آنے لگے

تو بچہ میں نقصان آجاتا ہے۔ رحم کے اندر حیض کا خون بچہ کی غذا ہے جب خون آجاتا ہے تو بچہ کی غذا گھٹ جاتی ہے اور بچے میں نقصان آجاتا ہے اور حمل کی حالت میں حیض بند رہے تو بچہ بڑھتا رہتا ہے اور پورا ہو جاتا ہے۔ پس نقصان سے مراد ہے بچے کی جسمانی بناوٹ کا نقصان جو خون کے نکلنے سے ہو جاتا ہے اور زیادتی سے مراد ہے بچہ کی تخلیقی بناوٹ کا پورا ہو جانا جو خون بند رہنے سے ہوتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حاملہ کو حیض ہو جائے تو بچہ کی غذا کم ہو جاتی ہے اور مدت حمل بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ پاکی کے نو ماہ پورے ہو جائیں (تب بچہ پورا پیدا ہوتا ہے) اگر حمل کی حالت میں پانچ دن خون آگیا تو نو ماہ پانچ روز میں بچہ پیدا ہو گا پس غذا کی کمی بیشی سے مدت حمل میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ حسن بصریؒ نے فرمایا غِيْضُ الْأَرْحَامِ سے مراد ہے (حمل کی مدت) نو ماہ سے کم ہونا اور زیادہ سے مراد ہے نو ماہ سے مدت حمل کا زیادہ ہو جانا۔

بعض نے کہا نقصان سے مراد ہے، بچہ کا ساقط ہونا اور زیادت کا معنی ہے بناوٹ کا پورا ہونا۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَنَا بِمِقْدَارٍ ① اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے مقرر ہے۔ یعنی ہر چیز کی اللہ کے علم میں ایک حد معین ہے حد مقرر سے کوئی چیز نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے۔

وَعِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ② وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کو جاننے والا ہے سب سے بڑا اور عالی شان ہے۔

غیب اور شہادت کی تفسیر سورہ جن میں ذکر کر دی گئی ہے۔ الْكَبِيرُ سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز اس سے پست اور کم درجہ ہے اور الْمُتَعَالِ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی قدرت سے ہر چیز پر غالب ہے یا یہ مراد ہے کہ مخلوق کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ③

جو شخص تم سے کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب خدا کے علم میں برابر ہیں۔

مَنْ أَسْرَأَ جودل میں بات چھپائے رکھے۔ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ اور جو دوسروں سے اپنی بات کہہ دے۔ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ جو اپنے کو دوسروں سے چھپائے رکھنا چاہے۔ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ جودن میں باہر نکلے کہ اس کو ہر شخص دیکھے۔ سَارِبٌ، سَرَبٌ، سُرُوبًا سے مشتق ہے۔ سروب کا معنی ہے برآمد ہونا باہر نکلنا۔ بعض نے کہا سراب کا معنی ہے راستہ۔ پس سارب کا معنی ہوا، راستہ میں چلتے پھرتے رہنے والا۔ قیتی نے کہا سَارِبٌ بِالنَّهَارِ یعنی دن میں اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت میں فرمایا کہ مُسْتَخْفٍ سے مراد ہے رات کو چھپ کر زنا کرنے والا اور سَارِبٌ بِالنَّهَارِ کا یہ مطلب ہے کہ دن میں باہر نکل کر وہ لوگوں کو دکھاتا ہے کہ میں جرم سے پاک ہوں۔

لَهُ مَعْقِبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ط ہر شخص (کی حفاظت یا اعمال کے لکھنے) کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا اس کی حفاظت یا نگرانی رکھتے ہیں۔

مُعَقَّبَاتٌ، مُعَقَّبَةٌ کی جمع ہے یہ لفظ عَقَبَ سے بنا ہے (اور متعدی نہیں ہے بلکہ) مبالغہ کے لئے عَقَبَهُ اس کے پیچھے آگیا۔ یا اعتقب سے بنا ہے۔ اس صورت میں معقبہ کی اصل معتقبہ ہوگی۔ تا کو قاف میں اوغام کر دیا گیا۔ باب افعال کی تا مبالغہ کے لئے ہے۔

بغوی نے لکھا معقب واحد کا صیغہ ہے اس کی جمع معقبہ ہے اور معقبہ کی جمع معقبات ہے جیسے انثاوات سعدی سعد کی عورتیں اور رجالات بکر (قبیلہ بکر کے مرد) کہا جاتا ہے انثاوات، اناث کی اور رجالات، رجال کی جمع ہے اور اناث کا واحد انثی ہے اور رجال کا مفرد رجل بہر حال اس سے مراد فرشتے ہیں جو رات دن باری باری سے آتے جاتے رہتے

ہیں، رات کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے پیچھے دن کے فرشتے آجاتے ہیں اور دن کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے بعد رات کے فرشتے آجاتے ہیں اور بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔
 بغوی نے صحیح سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں دونوں کا اجتماع ہوتا ہے رات بھی جو فرشتے تم میں رہتے ہیں فجر کو جب وہ چڑھ جاتے ہیں تو ان کا رب باوجود یہ کہ خود بخوبی واقف ہوتا ہے پھر بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں ان کو ہم نے نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

مِنْ كَبِينٍ يَدِيهِ يَعْنِي چھپنے والے اور ظاہر ہونے والوں میں سے ہر ایک کے آگے۔
 وَمِنْ خَلْفِهِ يَعْنِي اس کے باقی اطراف میں۔ (حضرت مفسر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خَلْف سے مراد صرف پیچھے کا رخ کا نہیں بلکہ دایاں بایاں رخ بھی اس میں شامل ہے کیونکہ دائیں بائیں رخ سے حفاظت کرنے پر بھی تو فرشتے مقرر ہیں)

يَحْفَظُونَهُ يَعْنِي اگر تقدیری وقت اور حکم نہیں آیا ہے تو حفاظت کرتے ہیں اور تقدیر کا لکھا آچکا ہے تو بندے کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہر بندے پر ایک فرشتہ موکل (مقرر) ہے جو سوتے جاگتے اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر جن وانس اور کیڑے مکوڑے سے اس کی نگہداشت کرتا ہے جو (ضرر رساں) چیز بھی بندے پر آنا چاہتی ہے فرشتہ اس سے کہتا ہے ہٹ پرے جا۔ ہاں اللہ ہی کا حکم کسی چیز کے آپہنچنے کا ہوتا ہے تو وہ چیز پہنچ جاتی ہے کیونکہ اجارے کا اگر اللہ فرشتوں کو تم پر مامور نہ کر دیتا جو کھانے پینے اور برہنگی کے وقت تمہارے قریب رہتے ہیں تو جنات تم کو جھپٹ لیتے یا يَحْفَظُونَهُ سے مراد ہے کہ آدمی کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اس مطلب پر معقبات سے مراد ہوں گے وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں ہاتھ پر بیٹھے نیکیاں اور بدیاں لکھتے رہتے ہیں (اور چونکہ یہ فرشتے چار ہیں دو دن کے اور دو رات کے اس لئے معقبات بصیغہ جمع فرمایا۔ مترجم)
 اللہ نے فرمایا ہے اِذْ يَتَلَقَى الْمُتَلَقِيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ۔ ابن جریج نے کہا یعنی آدمی پر اس کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں۔

ازانہ الحفاء میں کنانہ عدوی کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتائیے کہ بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ فرمایا ایک فرشتہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف ہے جو تیری نیکیوں پر مامور ہے اور وہ بائیں ہاتھ والے فرشتے کا سردار ہے جب تو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب تو کوئی ایک بدی کرتا ہے تو بائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے میں اس کو لکھ لوں تو دائیں ہاتھ والا کہتا ہے (ابھی ٹھہرو) شاید یہ توبہ واستغفار کر لے جب تین بار ایسا کہہ چکتا ہے تو دائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے اچھا اب لکھ لو اللہ اس سے ہم کو بچائے یہ بڑا سناھی ہے نہ اس کو اللہ کا پاس و لحاظ ہے نہ اللہ سے شرم اللہ فرماتا ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ بندہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک محافظ تیار اس کے پاس لکھنے کیلئے موجود رہتا ہے جو لکھ لیتا ہے اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں، اللہ فرماتا ہے لَهُ مُعَقَّبَاتٌ مِنْ كَبِينٍ يَدِيهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ اور ایک فرشتہ تیری پیشانی پر مسلط ہے جب تو اللہ کے لئے اس کو نیچے رکھتا ہے تو وہ تجھے سر بلند کرتا ہے اور اگر تو غرور کرتا ہے تو وہ تجھے شکستہ کر دیتا ہے (ذلیل کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے لبوں پر مامور ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ تو نبی پر جو درود پڑھے اس کی نگہداشت کریں اور ایک فرشتہ تیرے منہ کا محافظ ہے کہ سانپ (وغیرہ) کو منہ میں داخل ہونے نہیں دیتا اور دو فرشتے تیری دونوں آنکھوں پر مامور ہیں یہ ہر آدمی کے دس فرشتے ہوتے۔ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں پر اترتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں سے الگ ہیں۔ پس ہر آدمی کے لئے بیس فرشتے ہیں اور ابلیس دن میں ہے اور اس کی لولا درات کو آتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

مِنْ أَمْرِ اللَّهِ کے دونوں ترجمے ہو سکتے ہیں وہ فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں اللہ کے حکم سے یا بندہ کی حفاظت کرتے ہیں اللہ کے حکم کی وجہ سے۔ اول مطلب پر معقبات کی صفت ہوگی اور دوسرے مطلب پر یَحْفَظُونَ سے اس کا تعلق ہوگا۔ یا أَمْرُ اللَّهِ سے مراد ہے اللہ کا عذاب یعنی اللہ کے عذاب سے بندے کو بچاتے ہیں۔ اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں، مہلت طلب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا مِنْ أَمْرِ اللَّهِ میں مِنْ بمعنی بَاء ہے۔ یعنی اللہ کے حکم کے سبب اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

بعض کے نزدیک معقبات سے مراد وہ آدمی ہیں جو بادشاہ کے گرداگرد اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور بادشاہ اپنی خام خیالی کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ اللہ کے جاری کردہ فیصلہ سے وہ مجھے بچالیں گے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہ مُعَقَّبَات میں کہ کی ضمیر محمد ﷺ کی طرف راجع ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ فرشتے مقرر ہیں جو آپ کے آگے پیچھے رہتے ہیں اور شیاطین جن و انس کے شر اور حوادثِ لیل و نہار سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔

عبدالرحمن بن زید نے کہا اس آیت کا نزول عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے سلسلہ میں ہوا۔ کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل عامری اور اربد بن ربیعہ عامری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے چلے۔ آپ مسجد کے اندر صحابہ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے دونوں مسجد میں داخل ہوئے۔ عامر بن طفیل کا ناتھا مگر تھا بہت ہی حسین، خوبصورتی کی وجہ سے لوگ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے فرمایا آنے دو اگر اللہ کو اس کی بھلائی منظور ہوگی تو اس کو ہدایت کر دے گا۔ عامر آکر کھڑا ہو گیا اور بولا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے (یعنی نفع و نقصان میں تم مسلمانوں کے برابر کے شریک ہو جاؤ گے) کہنے لگا اپنے بعد یہ حکومت میرے سپرد (کرنے کا وعدہ) کرو (تو میں مسلمان ہو جاؤں گا) حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اختیار مجھے نہیں یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے کرے، کہنے لگا تو آپ صحراؤں، بدویوں اور خانہ بدوشوں پر مجھے حاکم بنا دیں اور شہریوں (گھروں میں رہنے والوں) پر آپ حاکم رہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا بولا پھر آپ مجھے کیا دیں گے۔ فرمایا میں گھوڑوں کی لگامیں تم کو سپرد کر دوں گا جن پر سوار ہو کر تم جہاد کرو گے۔ بولا کیا آج تک میرے پاس یہ نہیں ہیں (یعنی گھوڑے تو میرے پاس موجود ہیں جن پر سوار ہو کر میں جنگ کرتا ہوں) اچھا آپ میرے ساتھ اٹھ کر آئیں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، حضور ﷺ اٹھ کر اس کے ساتھ ہوئے۔ عامر نے اربد سے کہہ دیا تھا کہ جب تو مجھے محمد ﷺ کے ساتھ باتوں میں مشغول دیکھے تو ان کے پیچھے سے آکر تلوار سے حملہ کر دینا چنانچہ عامر جب رسول اللہ ﷺ سے کچھ جھگڑا اور گفتگو میں لوٹ پلٹ کرنے لگا تو اربد حملہ کرنے کے ارادے سے گھوم کر حضور ﷺ کے پیچھے آگیا اور ایک بالشت تلوار نیام سے کھینچ بھی لی لیکن اللہ نے اس کو روک دیا اور وہ پوری تلوار نہ کھینچ سکا عامر اس کی طرف اشارے بھی کرتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو منہ پھیر کر اربد کو دیکھا اور تلوار نکالنے کی کوشش میں مشغول پایا تو دعا کی اے اللہ جس طرح تو چاہے میری طرف سے ان کا کام تمام کر دے (یعنی مجھے ان کا تدارک نہ کرنا پڑے تو غیب سے ان کو ختم کر دے) اس روز آبرنام کونہ تھا دن سخت گرمی کا تھا اور فضا صاف تھی لیکن یکدم اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور اس کو سوختہ کر دیا۔ عامر پیٹھ پھیر کر بھاگا اور کہنے لگا محمد ﷺ تو نے اپنے رب سے دعا کی اس نے اربد کو مار ڈالا خدا کی قسم میں تیرے اوپر اتنے کم موگھوڑے اور نوجوان (سوا ہا چڑھا کر لاؤں گا کہ اس سارے میدان کو فوج سے بھر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تجھے ایسا کرنے ہی نہ دے گا اور قیلہ کی دونوں شاخیں یعنی قبائل اوس و خزرج بھی تجھے ایسا نہ کرنے دیں گے (ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا) غرض عامر ایک سلولیہ عورت کے گھر جا کر اتر اور صبح کو اٹھ کر ہتھیار باندھے چہرہ کارنگ بدلا ہوا تھا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور دوڑاتا ہوا صحرا میں پہنچا اور غرور سے کہنے لگا اے موت کے فرشتے میرے سامنے

نکل کر آپھر کچھ شعر پڑھنے لگا، اور بولا قسم ہے لات و عزلی کی اگر دوپہر تک میں محمد ﷺ اور اس کے ساتھی یعنی ملک الموت تک پہنچ گیا تو اپنا یہ بر چھا دونوں کے آر پار کر دوں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کی ایک جھپٹ اس کے منہ پر رسید کی اور عامر چکر اکر زمین پر گر پڑا، اور اسی وقت اس کی زانوں پر ایک بڑی گلٹی نکل آئی مجبوراً سلویہ عورت کے گھر لوٹ آیا اور کہنے لگا اونٹ کی گلٹی کی طرح گلٹی اور سلویہ کے گھر میں موت۔ پھر گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور دوڑاتا ہوا چل دیا آخر گھوڑے کی پشت پر ہی مر گیا۔ اور اس طرح اللہ نے رسول ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔

عامر طاعون سے مر اور اربد بجلی سے ہلاک ہوا اور اسی واقعہ کے سلسلہ میں اللہ نے نازل فرمایا سَوَاءٌ سَمَوَاتٍ مِّنْ أَسْرَ الْقَوْلِ وَمِنْ جَهَرِّهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ لَهُ مَعْقِبَاتٌ مِّنْ كَيْبِنٍ يَدِيهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِّنْ أَمْرِ اللَّهِ یعنی اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت وہ فرشتے کرتے ہیں جو رسول ﷺ کے آگے پیچھے ہیں۔ جیسا کہ ثعلبی نے روایت کیا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اربد بن قیس اور عامر بن طفیل مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عامر نے کہا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کا فائدہ ہو گا وہ تمہارا بھی ہو گا اور جو مسلمانوں پر فرض ہو گا وہ تم پر بھی ہو گا۔ عامر نے کہا کیا اپنے بعد آپ میرے لئے یہ حکومت مقرر کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ نہ تم کو ملے گی نہ تمہاری قوم کو یہ سن کر عامر نے اربد سے چپکے سے کہا میں محمد ﷺ کو باتوں میں لگا لوں گا تم تلوار سے ان پر حملہ کر دینا غرض اس کے بعد دونوں لوٹ گئے (چلتے وقت) عامر نے کہا محمد ﷺ ذرا میرے ساتھ اٹھ کر چلو حضور ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے اربد نے تلوار سوٹ لی اور قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہاتھ سوکھ گیا رسول اللہ ﷺ نے گردن پھیر کر اس کو دیکھ لیا پھر دونوں کو چھوڑ کر آپ واپس چلے گئے۔ دونوں چلے گئے جب مقام رقم میں پہنچے تو بحکم خدا اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور بجلی نے اس کو ہلاک کر دیا اس پر اللہ نے آیات اللہ يعلم ما تحمِلُ كُلُّ أَنْثَى..... شَدِيدُ الْمِحَالِ تک نازل فرمائیں۔ (ثعلبی اور طبرانی کی روایت میں فرق یہ ہے کہ ثعلبی کی روایت میں اربد بن ربیعہ آیا ہے اور طبرانی کی روایت میں اربد بن قیس۔ ثعلبی کی روایت میں بہت زیادہ تفصیل ہے اور طبرانی کی روایت مختصر ہے وغیرہ۔ مترجم۔)

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُم مِّنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۝۱۱

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی اچھی حالت کو بری حالت سے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اچھی حالت کو نہیں بدلتے اور جب اللہ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور کوئی اللہ کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا۔

مَا بِقَوْمٍ يَعْنِي كَيْسِي قَوْمٍ كَيْسِي قَوْمٍ يَوْمَ نَبِيٍّ يَمْنَانٍ ۝۱۲

احوال اختیار نہ کر لیں۔

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۝۱۱

ہے، عذاب دینا اور تباہ کرنا چاہتا ہے۔ فَلَا مَرَدَّ لَهُ تُو اس کو کوئی لوٹانے والا نہیں۔ مَرَدٌّ مصدر ہے بمعنی اسم فاعل۔ مِّنْ دُونِهِ کار ساز مددگار کہ مصیبت کو دفع کر سکے۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ ارادہ خداوندی کے خلاف ہونا محال ہے (یہی مسلک اہلسنت کا ہے۔ معتزلہ قائل ہیں کہ جس طرح حکیم خداوندی کی خلاف ورزی ممکن بلکہ واقع ہے اسی طرح اللہ کے ارادہ و مشیت کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے۔ مترجم)

هُوَ الَّذِي يُزِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝۱۲

وہ ہی تو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بھاری پانی سے بھرے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ یعنی کڑک کا خوف، سفر میں بارش کے ضرر کا خوف، بعض وقت کھیتی تباہ ہونے کا خوف اور بعض مکانوں کے گر جانے کا خوف اور گرمی کو دور کرنے اور کھیتی اور پھلوں اور درختوں کو فائدہ پہنچنے کی امید۔ سحاب سحابہ کی جمع ہے بادل (سَحَابٌ کھینچنا السحاب کھینچنا) ہوا کے ساتھ فضا میں بادل کھج کر آتے ہیں اسی لئے ان کو سحاب کہا جاتا ہے، کذانی القاموس۔ بیضاوی نے سحاب کو اسم جمع کہا ہے۔

يَقَالُ تَقِيلَةُ كِي جَمْعُ بَهَارِي يَعْنِي بَارِشٌ سَهْرَ هَوْنِ۔ بَعُوِي نَزَلَتْ عَلَيَّ فِي فَرْمَايَا بَادِلِ پَانِي كِي چھلنی ہے۔ اور اس کے خوف سے رعد اور دوسرے

فرشتے اس کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سبحان اللہ و بحمدہ کہتے ہیں۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مامور ہے اسکے پاس آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

فَرْمَاوَهُ اِيك فَرِشْتَه هِي جَو بَادِلِ پَر مَامُور هِي اِسْكَه پَاسِ اَكْ كِي كُوڑَه هَوْتَه هِي جَن سَه بَادِلُوه كُو هَنَكَا تَا هِي۔ مِّنْ خِيفَتِهِ اللّٰهُ كِي خَوْفٌ سَه خِيفَتِه كِي ضَمِيرُ اللّٰهِ كِي طَرَفِ لُوثِ رَهِي هِي۔ بَعْضُ نَزَلَتْ كَمَا الْمَلَائِكَةُ سَه مَرَادُوه فَرِشْتَه هِي جَو رَعْدُ كِي مَدَدْ گَارِ اور اس کے زیر حکم ہیں اس صورت میں مِّنْ خِيفَتِه كِي ضَمِيرُ رَعْدِ كِي طَرَفِ لُوثَا تِي جَا سَكْتِي هِي يَعْنِي رَعْدُ كِي خَوْفٌ سَه اِسْ كِي مَدَدْ گَارِ تَسْبِيحُ كَرْتَه هِي۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو شخص رعد کی آواز سن کر سُبْحَانَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَهُوَ عَلِيُّ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ پڑھے اور بالفرض اس پر بجلی گر پڑے تو وہ اپنے دین اسلام پر مرے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ رعد کی آواز سن کر باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ اور فرماتے تھے یہ زمین والوں کے لئے سخت دھمکی ہے۔

جو سیر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رعد (فرشتہ) بادلوں پر مامور ہے جہاں حکم ہوتا ہے بادلوں کو چلاتا ہے اور پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں (بھرے ہوئے) ہیں اور وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور جب وہ پاکی بیان کرتا ہے تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا باقی نہیں رہتا جو اس کی تسبیح کے ساتھ خود بھی بلند آواز سے تسبیح نہ کرے اس وقت بارش اترتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے رب نے فرمایا اگر میرے بندے میرے حکم پر چلتے تو میں رات میں ان کو بارش سے سیراب کرتا اور دن میں ان پر دھوپ نکال دیتا (تاکہ ان کے کلمہ و بار کا نقصان نہ ہو۔ مترجم) اور ان کو رعد کی آواز بھی نہ سنا تا (کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں) رواہ احمد بسند صحیح والحاکم، بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا کہ اس کو سننے والے تسبیح اور تحمید کرتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یا یہ مطلب ہے کہ رعد تسبیح کرتا ہے یعنی بادل کی گرج اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس کے فضل و نزول رحمت کا بھی اظہار کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب اس وقت ہوگا جب رعد کا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔

اور وہ بجلیاں بھیجتا اور جس پر چاہتا ہے ان کو گراتا ہے۔ صَوَاعِقُ الصَّوَاعِقُ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ۔ یہاں مراد ہے ٹوٹ کر گرنے والی بجلی۔ یہاں مراد ہے ٹوٹ کر گرنے والی بجلی کہ جس پر گرتی ہے

ترمذی، احمد اور نسائی نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہودیوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا بتائیے رعد کیا ہے۔ فرمایا بادل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس طرف اللہ حکم دیتا ہے وہ بادل کو ہنکاتا ہے بولے یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہم کو سنائی دیتی ہے۔ فرمایا یہ اس کی آواز ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک فرشتہ آبر پر مامور ہے جو نافرمان بادلوں کو جمع کرتا ہے اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے جب وہ کوڑا اٹھاتا ہے تو چمک پیدا ہو جاتی ہے جب ڈانٹتا ہے تو گرج پیدا ہوتی ہے اور جب مارتا ہے تو بجلی گرتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

اس کو سوختہ کر دیتی ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ
اور وہ اللہ کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ سے جھگڑتے ہیں یعنی اللہ کی توحید اللہ کی قدرت کاملہ اللہ کے علم محیط اور لوگوں کے دوبارہ پیدا ہونے اور سزا و جزا دیئے جانے کے متعلق اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہیں۔ جدال جھگڑے میں سختی کرنا۔ یہ لفظ جدل سے بنا ہے۔ جدل کا معنی ہے قتل کر دینا۔ یعنی اللہ کی صفات کمالیہ کی تو یہ نشانیاں ہیں جو اوپر ذکر کر دی گئیں اور اس حالت میں بھی یہ لوگ جھگڑتے ہیں اور اس کے وجود کمال قدرت کا انکار کرتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن علی باقر نے فرمایا بجلی مسلم وغیر مسلم سب پر گرتی ہے مگر ذکر کرنے والے مسلم پر نہیں گرتی۔

نسائی اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو دور جاہلیت کے کسی بڑے آدمی کے پاس دعوت ایمان دینے کے لئے بھیجا، اس شخص نے کہا جس رب کی طرف تو مجھے بلا رہا ہے وہ کس چیز کا ہے لوہے کا ہے، تانبے کا ہے، چاندی کا ہے، سونے کا ہے۔ صحابی نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو جواب سنایا آپ ﷺ نے دوسری بار اور تیسری بار بھیجا (اور اس شخص نے وہی جواب دیا) اس کے بعد اللہ نے اس پر ایک بجلی گرا دی جس سے وہ سوختہ ہو کر رہ گیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ الْخ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول اربد بن ربیعہ کے حق میں ہوا تھا۔ اربد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تمہارا رب کس چیز کا ہے، موتی کا ہے، یا قوت کا ہے یا سونے کا ہے اس پر آسمان سے ایک بجلی گری جس نے اربد کو جلادیا۔

حسن بصریؒ سے جب آیت وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ الْخ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا عرب کے شیطان (بڑے مشرکوں) میں سے ایک شخص تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلانے کے لئے چند آدمیوں کو بھیجا وہ بولا محمد ﷺ کا رب جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو بتاؤ کس چیز کا بنا ہوا ہے، سونے کا ہے، چاندی کا ہے، لوہے کا ہے، تانبے کا ہے۔ ان لوگوں نے اس کے قول کو بڑی گستاخی سمجھا اور واپس آکر خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور ﷺ نے ہم کو ایسے آدمی کے پاس بھیجا کہ اس سے بڑھ کر کافر دل اور اللہ کا سرکش اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کے پاس پھر جاؤ۔ حسب الحکم صحابہؓ دوبارہ گئے اس شخص نے پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ گستاخانہ کلام کیا اور بولا کیا محمد ﷺ کے کہنے سے میں ایسے رب کو مان لوں جو نہ مجھے دکھائی دیتا ہے نہ میں اس کو پہچانتا ہوں۔ صحابہؓ لوٹ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو پہلی بات سے بھی زیادہ بری بات کہی، فرمایا پھر لوٹ کر جاؤ۔ صحابہؓ پھر لوٹ کر گئے اس سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ اپنی سابقہ بات کہہ رہا تھا کہ اچانک ایک بدلی اٹھی اور سب کے سروں پر آگئی اور اس میں گرج اور چمک پیدا ہوئی اور ایک کڑک اس شخص پر گر پڑی اور سب کے سامنے وہ سوختہ ہو گیا۔ صحابہؓ دوڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دینے آئے راستے میں صحابہؓ کی ایک جماعت اور مل گئی اور انہوں نے کہا وہ آدمی جل گیا۔ لوٹ کر آنے والوں نے دریافت کیا تم کو کیسے معلوم ہوا۔ جماعت صحابہؓ نے کہا اللہ نے اپنے رسول کے پاس وحی بھیجی اور یہ آیت نازل فرمائی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ۔

حالانکہ وہ بڑی سخت قوت والا ہے۔

وَهُوَ شَدِيدُ الْحَالِ ۝۱۳

بغوی نے لکھا ہے حسن بصریؒ نے اس کا ترجمہ کیا سخت کینہ والا اور مجاہد نے کہا سخت قوت والا اور ابو عبیدہ نے کہا سخت سزا دینے والا۔ بعض نے کہا سخت تدبیر اور مقابلہ والا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے بحال بروزن کتاب۔ مکر، خفیہ تدبیر سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ۔ تدبیر، قدرت، جھگڑا، عذاب، سزا، دشمنی، قوت، شدت، ہلاک ہونا، ہلاک کرنا، ان معانی میں سے اکثر اس جگہ مراد لئے جاسکتے ہیں۔ بحال کا وزن فعال ہے (میم اصلی ہے) محال سے مشتق ہے۔ بعض نے کہا بحال کا وزن مفعول ہے (میم اصلی نہیں) اس وقت حول یا حیلہ یا حیلولة سے برخلاف قیاس مشتق ہوگا، اسی بناء پر حضرت ابن عباسؓ

نے اس کا ترجمہ کیا شدید الحول اور حضرت علیؑ نے فرمایا سخت پکڑ والا۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ط سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے، یعنی اسی کی دعوت واجب القبول ہے اور دوسرے کی دعوت قابل قبول نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسی کی سچی پکار ہے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت کی طرف بلا یا جائے اور اسی سے حاجتیں پوری کرنے کی دعا کی جائے۔ یادِ عموۃ الحق سے مراد ہے اخلاص کے ساتھ دعا کرنا۔ یعنی اخلاص کے ساتھ دعا اسی سے کی جاسکتی ہے۔ ان تمام توجیہات پر حق سے مراد ہو گا وہ مفہوم جو باطل کی ضد ہے۔ دَعْوَةُ موصوف سے الحق صفت۔ موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے جیسے مسجد الجامع اور جانب الغربی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الحق کا موصوف المدعو محذوف ہو۔ یعنی دعوة الحق المدعو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد اللہ ہے۔ اللہ کی ہر پکار حق کی طرف بلاوا ہے۔

..... ایک شبہ

اگر حق سے مراد اللہ ہو تو کلام غیر مفید ہو گا۔ اللہ کی پکار تو اللہ کے ساتھ مخصوص ہی ہے جیسے دوسروں کی پکار دوسروں کے ساتھ مخصوص ہے۔

..... ازالہ

(بے شک اللہ حق ہے لیکن) لفظ حق ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی پکار، حق کی پکار ہے۔ دعوتِ حق، حق ہوتی ہے، جیسے باطل کو پکارنا باطل ہوتا ہے۔ گویا یہ جملہ اپنے اندر دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی رکھتا ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا دعوتِ حق توحید ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دعوتِ حق لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی شہادت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے توحید اور شہادت کی دعوت۔

اگر آیت کا نزول عامر اور اربد کے متعلق مانا جائے تو دونوں جملوں کا مقصد یہ ہو گا کہ ان دونوں شخصوں کو اس طور سے ہلاک کرنا کہ ان کو پتہ بھی نہ ہو اللہ کی خفیہ تدبیر کے زیر اثر تھا اور رسول اللہ ﷺ کی دعا کی وجہ سے تھا یعنی آپ کی دعا قبول ہو گئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رسولِ برحق ہیں جب ہی تو آپ کی دعا اللہ نے قبول فرمائی۔ اور اگر آیت کو کسی شانِ نزول سے متعلق قرار نہ دیا جائے بلکہ عام مانا جائے تو کافروں کو تہدید کرنی مقصود ہوگی کہ تم اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہو، اللہ بڑا طاقتور اور خفیہ تدبیر کرنے والا ہے اور رسول کی دعا قبول کرنے والا ہے۔

یا صرف کافروں کی بد عقیدگی اور گمراہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ (تہدید مقصود نہیں)۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفِيهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ

اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلانے ہوئے ہو کہ پانی خود بخود اس کے منہ تک آجائے حالانکہ وہ پانی از خود آگے بڑھ کر اس کے منہ تک آنے والا نہیں۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ - الَّذِينَ سے مراد یا تو کفار ہیں اور یدعون کا مفعول محذوف ہے، یعنی بت وغیرہ ترجمہ اس طرح ہو گا اور وہ کافر جو اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کو پکارتے ان کی عبادت اور یاد کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یا الَّذِينَ سے مراد وہ چیزیں ہیں۔ جن کی کافر پوجا کرتے ہیں۔ ترجمہ اس طرح ہو گا اور جن بتوں کو یہ کافر پوجتے ہیں۔ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ وہ بت ان کافروں کی کوئی درخواست حصول نفع کی ہو یا دفع ضرر کی قبول نہیں کرتے۔ لَا يَسْتَجِيبُونَ کا معنی ہے لَا يُجِيبُونَ منظور نہیں کرتے۔ إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفِيهِ مستثنیٰ محذوف ہے اور باسط سے پہلے مضاف بھی

مخدوف ہے مگر اتنی ہی منظوری جتنی منظوری اس شخص کے لئے ہوتی ہے جو پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے کہ پانی خود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ یعنی ایک پیاسا جو کنویں کی منڈیر پر بیٹھ پانی کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو اور پانی کو اپنی طرف بلارہا ہو خود تو اندر اتر نہیں سکتا پانی کو بلاتا ہے۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ (ظاہر ہے کہ) پانی اس کے منہ تک اڑ کر پہنچنے والا نہیں وہ تو بے جان اور بے شعور چیز ہے اس کو معلوم بھی نہیں کہ کون اس کو پکار رہا ہے نہ وہ کسی کے بلاوے کو قبول کر سکتا اور نہ دعوت پر آسکتا ہے۔ کافروں کے معبودوں کی بھی یہی حالت ہے، کافر بتوں کو پکارتے ہیں بتوں کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہوتا وہ بے شعور و بے جان ہیں وہ ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔ مطلب کی یہ تشریح مجاہد اور عطائے کی ہے اور حضرت علیؑ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ لیکن بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ بتوں کی عبادت اور دعا کی عدم افادیت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو پینے کے لئے چلو بھر کر پانی لینا چاہتا ہو اور دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلائے اور پانی کو ہتھیلی میں اٹھانا چاہے ظاہر ہے کہ پانی کو پکڑنے والا پکڑ نہیں سکتا اور اس کے منہ تک پانی پہنچ نہیں سکتا۔ بتوں کے پجاریوں کی بھی یہی حالت ہے۔ بت نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتے نہ ضرر (ان کی عبادت ایسی ہے جیسے پانی کو پکڑنے کی کوشش) یہ تشریح حضرت ابن عباسؓ کے قول میں بھی آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا غیر اللہ کی پوجا کرنے والے ایسے ہیں جیسے کوئی پیاسا اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کے اندر پھیلا دے جب تک ہتھیلیاں پھیلائے رکھے گا چلو نہ بنائے گا پانی نہ آئے گا اور منہ تک نہیں پہنچے گا۔ اس صورت میں بت پرستوں کی ناکامی کی ہتھیلیاں پھیلائے رکھنے والے پیاسے کی ناکامی سے تشبیہ ہوگی۔

اور (ان باطل معبودوں سے) کافروں کا درخواست کرنا محض
وَمَا دَعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝۱۳
بے اثر ہے۔ ضلال بے کار، ضائع، سراسر خسارہ۔

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ تشریحی قول نقل کیا ہے کہ کافروں کا اپنے رب کو پکارنا بالکل بے سود ہے، بے کار ہے کفر و معاصی کے پردے خدا تک پہنچنے میں آڑے آتے ہیں ان کی دعائیں رب تک پہنچتی ہی نہیں۔

وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالَهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝۱۵

اور اللہ ہی کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام کے اوقات میں۔

مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا یعنی ملائکہ اور اہل ایمان بندے خوشی سے اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔
وَكَرْهًا اور وہ منافق و کافر جو تلوار کے خوف سے سر خمیدہ ہوتے ہیں، کراہت کے ساتھ سر جھکاتے ہیں یا مصائب کی شدت اور ضرورت ان کو سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے اگرچہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔

وَظِلَالَهُمْ اور بالتبع ان کے سائے بھی سر خمیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کرنے سے مراد ہو تابع مشیت ہونا اور ارادہ خداوندی کے دائرہ میں محصور رہنا خواہ ان کا خود ارادہ ہو یا نہ ہو مشیت کے تابع سب ہیں اور سایوں کے تابع مشیت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جس طرح چاہتا ہے سایوں کو پھیلاتا اور سمیٹتا بڑھاتا اور گھٹاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سے مراد ہوں حقائق اور ملائکہ و مؤمنین کی ارواح اور ظلال سے مراد ہوں اشخاص و اجسام۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ظاہر کو سیاہی اور باطن کو خیال سے تشبیہ دی تھی اور دعا کی تھی اور سجدہ میں عرض کیا تھا میری سیاہی (ظاہری جسم) اور میرا خیال (باطنی نور) تجھے سجدہ کرتا ہے (ظلال کی یہ تشریح اول تشریح سے بہتر ہے کیونکہ سایہ اسی سیاہی کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کی آڑ کی وجہ سے دھوپ وہاں نہیں پہنچتی اور سایہ کا یہ مفہوم عدی ہے۔ سجدہ کرنے کی نسبت اس کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں اگر سایہ سے مراد ظاہر اور جسم ہو تو سجدہ کی نسبت اس کی طرف کرنا صحیح ہے۔

غدو اور اصل سے مراد ہے ہمہ اوقات ہمیشہ اصل جمع ہے اصیل اس کا واحد ہے عصر سے مغرب تک درمیانی وقت کو اصیل کہتے ہیں۔

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
 آپ دریافت کیجئے کہ آسمان وزمین کا رب کون ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا ان کا انتظام رکھنے والا اور ان کے تمام امور کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے (یعنی کیا ایسا ہے کہ اللہ ہی خالق و مدبر ہے) کیونکہ مشرک بھی قائل تھے اور ان کو بھی یہ امر تسلیم تھا کہ ان کا اور آسمان وزمین کا خالق اللہ ہی ہے۔
 قُلِ اللّٰهُ
 آپ خود ہی کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ان کا خالق ہے۔ یعنی اگر وہ کوئی جواب نہ دیں تو ان کی طرف سے آپ جواب دے دیں کہ اللہ ہی آسمان وزمین کا رب ہے کیونکہ وہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ان کا بھی یہی جواب ہو گا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کا خالق و رب ہونا اتنا ظاہر ہے کہ اس کا کوئی منکر ہو ہی نہیں سکتا لہذا آپ ہی ان کی طرف سے جواب دے دیجئے۔ یا قُلِ اللّٰهُ کہنے سے مشرکوں کو جواب کی درپردہ تعلیم دینی مقصود ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں سے پوچھا کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے تو انہوں نے جواب دیا آپ ہی بتائیے اس پر اللہ نے فرمایا قُلِ اللّٰهُ آپ جواب دے دیجئے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اس طرز کلام سے یہ جواب ان پر لازم کر دیا۔

قُلْ اَفَاَتَّخِذُكُمْ مِّنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ
 آپ کہہ دیجئے تو پھر بھی کیا تم اس کے سوا دوسروں کو کار ساز و مددگار قرار دیتے ہو۔ اس کلام کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی کیا تم اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہو اور پھر دوسروں کو اپنا کار ساز بناتے ہو یہ بات تقاضائے عقل کے خلاف ہے کیونکہ جن کو تم کار ساز بناتے ہو ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان کا اپنا نفع و ضرر بھی ان کے بس میں نہیں۔ اپنے لئے وہ لایبداً لایملاکون لانفسہم نفعاً ولا ضرراً
 فائدہ حاصل کر سکتے ہیں نہ آئے ہوئے ضرر کو اپنے اوپر سے دفع کر سکتے ہیں جب ان کی خود اپنے لئے یہ حالت ہے تو تمہاری کار سازی کیا کر سکتے ہیں اور کس طرح تم کو فائدہ پہنچا سکتے اور تم پر آنے والے ضرر کو دفع کر سکتے ہیں۔ مشرکوں کے گمراہ ہونے اور بتوں کو اپنا کار ساز بنانے کی یہ دوسری تردید ہے کہ تم جو ان کی شفاعت کے امیدوار ہو وہ تمہاری شفاعت تو کیا اپنے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرَۃُ
 آپ پوچھے کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں نابینا سے مراد ہے بے عقل بے بصیرت یا وہ شخص جو اپنی بصیرت سے کام نہ لے۔ اور بصیر سے مراد وہ بصیرت مند آدمی جو اپنی بصیرت سے عبادت کی حقیقت اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور جانتا ہو کہ عبادت و کار سازی کا مستحق کون ہے کس کی عبادت کی جائے اور کس کو کار ساز سمجھا جائے۔ بعض علماء نے کہ اعلیٰ سے مراد وہ معبود ہے جو تمہاری طرف سے لائلم ہے اور بصیر ہے مراد وہ معبود ہے جو تمہارے احوال سے واقف ہو۔

اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ
 یا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ یعنی کیا کفر اور ایمان برابر ہو سکتے ہیں۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہُ الْخَلْقِ عَلَیْہِمْ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَہُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾
 یا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی کسی چیز کو پیدا کیا ہو جیسا خدا نے پیدا کیا ہے، پھر ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد اور غالب ہے۔

اَمْ بِمَعْنٰی بَلْ ہے۔ استفہام انکاری ہے۔ خَلَقُوْا شُرَکَآءَ کی صفت ہے۔ ایسے شرکاء جنہوں نے پیدا کیا ہو۔ فَتَشَابَہُ کہ دونوں کی مخلوق میں باہم اشتباہ ہو گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جن معبودوں کو شریک بنا رکھا ہے وہ کسی چیز کے خالق

نہیں کہ ان کو خدا کی تخلیق اور معبودوں کی تخلیق میں اشتباہ ہو جاتا اور یہ کہتے کہ خدا خالق ہے اس لئے معبود ہے اور ہمارے معبود بھی خالق ہے اس لئے وہ بھی مستحق عبادت ہیں۔ بلکہ جن کو یہ اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں وہ تو بالکل عاجز ہیں ان میں تو بالکل ہی قدرت نہیں۔ دوسری مخلوق میں بھی کچھ نہ کچھ قدرت ہے۔ ان معبودوں میں تو اپنی بھی سکت نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اجسام ہوں یا اعراض یا غیر مادی ارواح جس کو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اگر وہ کسی چیز کو پیدا کرنا نہ چاہے تو اس کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں لہذا اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں جو لوگ (یعنی معتزلہ فرقہ والے) کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ ان کے افعال کا خالق نہیں۔ وہ اسی گروہ میں سے ہیں جن کو دونوں انسان اور خدا کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہوتی ہے (حضرت مفسر کے کلام سے اس طرف اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت کے نزدیک معتزلہ کا گروہ بھی مشرک ہے یا مشرکوں جیسے عقائد رکھتا ہے اس فرقہ معتزلہ کو بدعتی گروہ بھی قرار دیا ہے۔ لیکن کافر کسی نے نہیں کہا۔ مترجم)

وَهُوَ الْوَاحِدُ يَعْنِي اللَّهُ رَبُّبِيَّتٍ اور معبودیت میں اکیلا ہے بلکہ اصل وجود میں بھی واحد ہے اصل وجود میں اس کا کوئی شریک نہیں سارے عالم کا وجود تو ظنی ہے اور اللہ کے وجود کا پر تو ہے۔

الْقَهَّارُ وہی ہر چیز پر غالب ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر چیز فی ذاتہ معدوم ہے بغیرہ موجود ہے خود اس کا اپنا وجود نہیں پھر کس طرح اس موجود کا مقابلہ کر سکتی ہے جس کا وجود ذاتی ہے، اور اسی کی ہستی اصل ہستی ہے۔ لہ

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا

اللہ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب خس و خاشاک کو بہا لایا جو (پانی کے) اوپر آ رہا ہے۔

أَوْدِيَةٌ وادی کی جمع ہے وہ ندی نالے جہاں پانی بکثرت بہتا ہے وادی کہلاتے ہیں مجازاً وادی میں بہنے والے پانی کو بھی وادی کہہ لیا۔ (یعنی بہنے کی نسبت پانی کی بجائے وادی کی طرف کر دیتے ہیں جیسا کہ آیت مذکورہ میں آیا ہے) بارش ہونے سے تمام وادیاں تو نہیں بہتی ہیں بعض بہتی ہیں اسی لئے اس کو بصورت نکرہ ذکر کیا (غیر معین وادیاں)

بَقَدَرِهَا۔ یعنی وادیوں کے اندازے کے موافق چھوٹی بڑی جیسی بھی ہوں۔

السَّيْلُ وادیوں میں بہنے والا پانی سیلاب زبداً، کف، جھاگ، میل کچیل جو سیلاب کے اوپر آتا ہے۔ رَابِيًا صَافِ پانی کے اوپر۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلِيَّةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدًا مِّثْلَهُ ط

اور جن چیزوں کو آگ کے اندر زوریا اور سامان بنانے کے لئے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل اوپر آجاتا ہے۔

يُوقِدُونَ کا فاعل ضمیر مستتر ہے مراد لوگ۔ فاعل معلوم معروف تھا اس لئے ذکر نہیں کیا۔ ايقاد (مصدر باب افعال) پگھلانے کے لئے کسی چیز کو آگ میں تپانا۔

مِمَّا میں سے ابتدا کے لئے ہے یعنی جو چیزیں لوگ پگھلانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں ان سے بھی پانی کے جھاگوں کی طرح جھاگ اور میل کچیل پیدا ہوگا ہے۔ یا مِّنْ تَبْعِيضٍ کے لئے ہے یعنی بعض چیزوں سے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ آیت اَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ کی تفسیر کے ذیل میں ابن جریج کی روایت آئی ہے جو چند وسائط سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت معتقل بن یسارؓ تک پہنچتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اندر شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ (طور پر داخل ہو جاتا) ہے میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس کی وجہ سے (اقسام) شرک چھوٹے ہوں یا بڑے سب دور ہو جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا فرمائیے فرمایا ہر شخص ہر روز تین بار کہے اے اللہ میں دانستہ طور پر تیرے ساتھ شریک بنانے سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نادانستہ شرک کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں۔ اور (شرک) یہ (بھی) ہے کہ مجھے اللہ نے اور فلاں شخص نے دیا اور یہ بھی شرک ہے کہ کوئی یوں کہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو فلاں شخص مثلاً زید مجھے مار ڈالتا۔

مَا يُوقِدُونَ جس کو پتاتے ہیں سونا چاندی، لوہا تانبا، پتیل بہر حال لفظ عام ہے ہر پگھلائی جانے والی دھات اس میں داخل ہے۔

ابْتِغَاءَ حَلِيَّةٍ زِيور بنانے کے لئے جیسے سونا چاندی پگھلایا جاتا ہے۔

اَوْ مَتَاعٍ يَاجْچھ سامان ظروف بنانے کے لئے جیسے برتن بنانے کے لئے تانبا پتیل پگھلایا، تپایا جاتا ہے یا اسلحہ بنانے کے لئے یا کھیتی کے اوزار کے لئے لوہا پگھلایا تپایا جاتا ہے۔ اِبْتِغَاءَ حَلِيَّةٍ اَوْ مَتَاعٍ کننے سے دھاتوں کو پگھلانے کی غرض کا اظہار مقصود ہے۔

زَبَدٌ مِّثْلُهُ پانی کے کف کی طرح اس سے بھی میل اوپر آجاتا ہے۔ یعنی بھٹی میں پڑ کر اس سے بھی میل نکل کر اوپر آجاتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۗ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَاِمَّا يَنْفَكُ وَلَٰكِنَّ الْبَاطِلَ فِي الْاَرْضِ ط
كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝۱۲

یعنی اللہ کے نازل کردہ علم (قرآن اور دوسری کتب سماویہ) سے لوگ طرح طرح کے دنیوی اور آخروی فائدے حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کی وسعت کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور یہ علم خداوندی قیامت تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اس کو کبھی زوال نہیں ہے اس کی تمثیل بارش کے پانی سے دی جاسکتی ہے اوپر سے بارش ہوتی ہے ندی نالے بھر جاتے ہیں وادی میں بہہ نکلتے ہیں وادی کی جتنی وسعت ہوتی ہے اور جیسی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی پانی وادی میں سماتا ہے۔ چھوٹی ندی میں تھوڑا پانی اور گہری بڑی ندی میں زیادہ پانی رواں ہو جاتا ہے لوگ اس پانی سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اس پانی کا کچھ حصہ زمین کے اندر بھی سما جاتا ہے اور اندر گھسنے کے بعد باؤلی، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کچھ حصہ زمین کے اوپر گڑھوں اور تالابوں میں رُک جاتا ہے اور مدت تک باقی رہتا ہے۔

یا اللہ کے نازل کردہ علم کو دھات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے لوگ زیور، برتن، ہتھیار اور اوزار وغیرہ بنانے میں اس سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اور اس سے بنا ہوا سامان مدت دراز تک باقی رہتا ہے، رہا باطل یعنی منکرین و مشرکین (کی خود ساختہ خرافات اور نفس) کی اختراعات اور شیطانی توہمات تو ظاہر ہے کہ وہ سب بے اصل ہیں پر آگندہ اور منتشر ہیں نہ ان کو پائیداری حاصل ہے نہ استقرار و ثبات نہ وہ فائدہ رساں اور نہ دنیا و دین میں منفعت بخش ہیں ان کو ہم ان جھاگوں اور میل کچیل سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آجاتا ہے، جو کوڑا کرکٹ سیلاب کے اوپر آجاتا ہے سیلاب اس کو ادھر ادھر پھینک دیتا ہے، اسی طرح حق بھی باطل کو جتنے نہیں دیتا ادھر ادھر پر آگندہ کر دیتا ہے۔

جُفَاءً وَہ میل کچیل جو سیلاب یا پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آکر ادھر ادھر منتشر ہو جاتا ہے۔ جَفَا الْوَادِي (ثلاثی مجرد) اور اَجَفَا الْوَادِي (ثلاثی مزید) دونوں ہم معنی ہیں۔ یعنی وادی اور سیلابی نالے نے کوڑا کرکٹ ادھر ادھر پھینک دیا۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ جُفَاءً کا معنی ہے، منتشر، پر آگندہ، جَفَاتِ الرِّيحُ ہوانے پر آگندہ کر دیا۔

وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔ یعنی اصل پانی اور دھات تو زمین میں قائم رہتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علم نافع کی بھی یہی حالت ہے یہ بھی پائیدار اور قائم رہنے والا اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے۔

كَذٰلِكَ یعنی جس طرح اللہ نے حق و باطل کی مذکورہ تمثیل بیان کی اسی طرح غیر واضح امور کو کھول کر سمجھانے کے لئے اللہ تمثیلات سے کام لیتا ہے۔ بعض علماء نے کہا اس میں اہل ایمان کے لئے درپردہ پیام تسکین ہے کہ کفر اگرچہ بظاہر بلند و بالا نظر آتا ہے لیکن اس کی تاریکی چھٹ جائے گی اور نور اسلام چمکے گا۔ اور اس کی روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔

لٰكِنَّا نَسْتَجِيبُ لَہُمُ الْحَسَنٰی وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيبُوْا لَہٗ لَوْ اَنَّ لَہُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَ مِثْلَہٗ مَعًا لَا فُتُوْا
جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا ان کے واسطے اچھا

بدلہ ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا ان کے پاس اگر دنیا بھر کی چیزیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی ہو تو وہ

سب اپنی رہائی کے لئے دے ڈالیں گے (مگر ان کی رہائی نہ ہوگی)

الْحُسْنَى مَفْعُولٌ مَطْلُوقٌ كِي صِفْتِ بِي مَحْذُوفٌ كِي صِفْتِ بِي يَعْنِي جِن لُؤْكَوُن لِي اِنِي رِب كِي دَعْوَتِي اِسْلَام كُو اِجْهِي طَرَح قَبُول كَر لِيَا اِر اِس كِي اِحْكَام كِي تَعْمِيل كِي يَا اِنِي رِب كِي اِجْهِي دَعْوَت كُو قَبُول كَر لِيَا۔

الَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِلَّهِ مِنْ لَام كَا تَعْلُق يَضْرِبُ سِي هُو كَا يَعْنِي اللّٰهُ دُونُوں كَرُو هُوُن كِي حَال بَطُور تَمْتِيل بِيَان كَر تَا بِي دَعْوَتِ اِلٰهِي كُو قَبُول كَر نِي وَالُوُن كِي اِحْوَال كُو بْهِي اُور نِي قَبُول كَر نِي وَالُوُن كِي اِحْوَال كُو بْهِي۔ بَعْض اَهْل تَفْسِير كِي زَوْدِيك الْحُسْنَى مَتَبَدَلُو مَوْخَر سِي اُور لِلَّذِينَ خَبْر مَقْدَم يَعْنِي اِجْهَا ثَوَاب يَا جَنّت اِن لُؤْكَوُن كِي لِي سِي جَنُوُن لِي اِنِي رِب كِي دَعْوَت قَبُول كَر لِي اِس تَقْدِير پَر اَلَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِلَّهِ بَجَا سِي خُود مَبْتَدَا هُو كَا اُور لُو اَنَّ لَهُمُ الْخ اس كِي خَبْر۔

لَا فَتَدَّ وَايِه يَعْنِي قِيَامَت كِي دِن اَكْر كَل زَمِيْن كِي دُولت اِن كُو مِل جَا سِي تُو دُو زَخ سِي اِنِي رِهَائِي كِي لِي سِي وَه دِي دِي س

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۝
ان لُؤْكَوُن كَا سَخْت حَسَاب هُو كَا۔ اِبْر اِهِيْم مَخْجِي نِي كَمَا سُوء حَسَاب يِه

بِي كِي اِن سِي سَخْت كِي سَا تْه حَسَاب فَنْهِي كِي جَا سِي كِي اُور كُو نِي كِنَا ه مَعَا ف نِهِي سِي كِيَا جَا سِي كَا۔
اور اِن كَا ٹْه كَا نَا جَنْم هِي اُور جَنْم بُرِي قَرَار كَا هِي۔ اللّٰهُ نِي اِيك

وَمَا وَايَهُمْ جَهَنَّمَ وَيَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝
اور آيت ميں فرمایا ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٌ۔ اِن كَا بْچْهُونَا اُوڑْ هِنَا جَنْم كَا هُو كَا۔
جو شخص يَاقِيْن رَکْهَتَا هُو كِي جو كَچْه

اَفَمَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَا اُنزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی
آپ كِي رِب كِي طَرَف سِي اُپ پَر نَا زِل كِيَا كِيَا هِي وَه سِر اِس رِ حَق هِي كِيَا اِيَا شَخْص اِس كِي طَرَح هُو سَكْتَا سِي جو اِنْد هَا هِي۔ اِنْد هِي سِي مَرَا دِي سِي بِي بَصِيْرَت كُو رِ دَالِش ، حَق كُو بَا طَل سِي تَمِيْز نِي كَر نِي وَالَا۔ رُوَايَت ميں آيَا هِي كِي اُول اَلذِّكْر شَخْص سِي مَرَا دِي سِي حَضْرَت حِزْبِيَا حَضْرَت عَمَّار اُور نَابِيْنَا سِي مَرَا دِي سِي اَبُو جَهْل۔

اِنَّهَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ ۝
پس نصيحت تو سمجھ دار هِي لُؤْكَوُن قَبُول كَر تِي سِي يَعْنِي سَلِيْم دَالِش وَا لِي جُو

عقل كو جذبات حميت و تعصب سے اور فہم كو وہم سے پاک رکھتے ہیں۔
اللَّذِينَ يُوْفُوْنَ بَعْثِ اللّٰهِ
جو اللّٰهُ كِي عَمْد كُو پُور اَكْر تِي سِي۔ يَعْنِي يَوْم مِيثَاق ميں جو اللّٰهُ كِي رُبُوبِيْت كَا اِنْهُوُن لِي اَقْرَار كِيَا تْهَا اُور اَلْسَت پَر تَكْمُّم كِي جَوَاب ميں بَلِي كَمَا تْهَا اِس كُو پُور اَكْر تِي سِي اُور اللّٰهُ نِي جُو اِنِي كِتَابُوُن ميں اِحْكَام كِي پَابَنْدِي كَا

وَعَدِه لِيَا تْهَا اِس كُو بْهِي پُور اَكْر تِي سِي۔
اور پِيَان كُو نِهِي سِي تُوڑ تِي يَعْنِي اللّٰهُ سِي اُور آپِي سِي ميں بَنْدُوُن سِي كِي هُو نِي وَعْدُوُن

وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۝
كُو نِهِي سِي تُوڑ تِي۔ يُوْفُوْنَ بَعْثِ اللّٰهِ ميں سَرَف عَمْدِ خُود اِنْدِي كِي صَرَا حَت تْهِي اُور اَلْمِيثَاق كَا لَفْظ عَام هِي اللّٰهُ سِي كِيَا هُو اَعْمَد

هُو يَا بَنْدُوُن سِي كِي هُو نِي وَعْدِي۔
اور وَه لُؤْكَوُن جُوڑِي رَکْهَتِي سِي ، اِن تَمَام چِيْزُوُن كُو جِن

وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهِ اَنْ يُّوْصَلَ
كُو جُوڑِي رَکْهَتِي كَا اللّٰهُ نِي حَكْم دِيَا هِي۔

مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهِ اَنْ يُّوْصَلَ كِي ذَمِيْل ميں تَمَام اَنْبِيَاء اُور سَارِي آسْمَانِي كِتَابُوُن پَر بَغِيْر تَفْرِيْق كِي اِيْمَان لَانَا اُور تَمَام مَوْمِنُوُن كِي سَا تْه تَعَاوُن و تَنْظِيْم اُور اَقْرَاب سِي حَسَن سَلُوك كَر نَا دَا خِل هِي (اِن تَمَام چِيْزُوُن كُو جُوڑِي رَکْهَتِي كَا اللّٰهُ نِي حَكْم دِيَا

هِي) بَغِيْوِي نِي لَكْهَا هِي كِي اَكْثَر عُلَمَاء كِي زَوْدِيك اِس جَلْه مَّا اَمَرَ اللّٰهُ سِي مَرَا دِي سَرَف صِلَةُ رَحْم هِي۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے فرمایا ہے میں ہی اللہ ہوں میں ہی رحمن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمن سے لفظ رحم کو مشتق کیا جو اس کو جوڑے رکھے گا میں اس کو

اپنے ساتھ جوڑے رکھوں گا جو اس کو کاٹے گا اس سے میں قطع تعلق کر لوں گا۔ رواہ ابو داؤد۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا، پیدا کر چکا تو رحم نے کھڑے ہو کر رحمٰن کی کمر پکڑ لی۔ اللہ نے فرمایا کیا ہے۔ رحم نے عرض کیا یہ اس کی جگہ ہے جو قطع تعلق سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ جو تجھے جوڑے رکھے گا میں اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس سے قطع تعلق کر لوں گا۔ رحم نے عرض کیا بے شک میں اس پر راضی ہوں اے میرے رب! اللہ نے فرمایا پس یہ فیصلہ تیرے لئے ہے۔ متفق علیہ۔

بلغوی اور حکیم اور محمد بن نصر نے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی۔ قرآن مجید، امانت، رحم۔ قرآن (بندوں سے یا بندوں کی طرف سے) حجت کرے گا اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور رحم ندا کرے گا خوب سن لو جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھے توڑا اللہ اس سے قطع تعلق کر لے گا۔ رواہ ابوغوی و حکیم و محمد بن نصر۔

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں درازی عطا کرے تو وہ قرابت داروں کو جوڑے رکھے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ روای ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی فرود گاہ پر سامنے سے آیا اور عرض کیا مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے فرمایا اللہ کی بندگی کر کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دے، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور رشتہ داری کو جوڑے رکھ (یعنی قرابت داروں سے اچھا سلوک کر) رواہ ابوغوی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ روای ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رشتہ قرابت کو جوڑنے والا وہ نہیں جو برابر کا بدلہ دے۔ بلکہ قرابت کو جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر رشتہ قرابت (کسی عزیز کی طرف سے) ٹوٹ گیا ہو تو وہ اس کو جوڑ دے۔ (یعنی جو شخص تجھ سے عزیز داری اور قرابت ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا ختم کر چکا ہو تو اس سے قرابت پیدا کر اور رشتہ کو جوڑ کر رواہ البخاری۔

حضرت ابو ہریرہؓ روای ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری طرف سے حسن سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد کون فرمایا تیرا باپ۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ تیرا باپ کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا پھر تیرے قرابت دار حسب درجہ قرابت۔ متفق علیہ۔

حضرت ابن عمرؓ روای ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (باپ کے ساتھ یہ بھی) بہت اچھا سلوک اور پرہے کہ باپ کے منہ پھیرنے (یعنی مرنے) کے بعد اس کے دوستوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ روای ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے اپنے نسب کو جانو تاکہ رشتہ داروں کو جوڑے رکھو صلہ رحم سے رشتہ داروں میں محبت، مال میں وسعت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔ رواہ الترمذی و قال حدیث غریب۔

اور اپنے رب سے یعنی اس کی وعید سے (بالعموم) ڈرتے ہیں۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ظاہر و باطن ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ باطن قرآن ظاہر کے مخالف ہے اور کوئی ایسا معنی مراد ہے جو اہل لغت اور علماء امت کی سمجھ میں نہیں آسکتا، صرف ائمہ اور اہل عرفان ہی کی عقل کی رسائی وہاں تک ہو سکتی ہے۔ مثلاً موسیٰؑ سے مراد باطنی طور پر قلب یا روح ہے اور بنی اسرائیل سے مراد روحانی اور علمی طاقتیں اور فرعون سے مراد نفسِ امّارہ ہے اور قبطیوں سے نفسِ امّارہ کی شہوانی اور غضبی قوتیں۔ یہ حقیقت میں قرآن کی معنوی تحریف ہے بلکہ باطن سے مراد قرآن کا مغز اور رُوح ہے اور ظاہر سے مراد پوست اور ہیئت مثلاً نماز سے مراد یہی خاص ہیئت کی نماز ہے اور حضور قلب، استغراق، خلوص اس کا باطن ہے زکوٰۃ یہی مقررہ خیرات ہے مگر اس کا باطن غریب پروری اور اہل ضرورت کی معاشی کفالت حسب مال کو دل سے دور کرنا ہے۔

وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ⑩ اور (بالخصوص) حسابِ آخرت کی خرابی سے خوف کھاتے ہیں اس لئے آخرت کی حسابِ فہمی سے پہلے وہ خود اپنے نفسوں سے اسی زندگی میں حسابِ فہمی کرتے ہیں (اور سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا گناہ کئے ہیں پھر اپنے آپ کو سزا دینا کرتے ہیں)

وَالَّذِينَ صَبَرُوا اور جن لوگوں نے صبر کیا یعنی جو احکام ان کو دیئے گئے ہیں ان پر ثابت قدم رہے (حضرت ابن عباسؓ) یا مصائب اور شدائد پر صابر رہے (عطاء) بعض علماء کے نزدیک صبر سے مراد ہے نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ صبر سے مراد ہو خواہشات کی مخالفت پر جہاد ہنا۔ یہ تفسیر تمام اقوال کو جامع ہے۔ لہٰذا اپنے رب کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے۔ کسی دوسری دنیوی غرض کے لئے نہیں نہ دکھاؤ اور شہرت کے لئے۔ (نہ مال و جاہ و حکومت کے حصول کے لئے۔ مترجم)

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ اور نماز قائم کی یعنی فرض نماز اور سنن و نوافل میں سے اپنی مرضی کے مطابق جس قدر چاہا نماز پڑھی۔

وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ واجب اور بطورِ صدقہ و نفل راہِ خدا میں خرچ کیا۔ (خدا داد مال میں سے شرائطِ مقررہ کے مطابق کچھ مال زکوٰۃ میں ادا کرنا ضروری ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی اگر مسلمانوں کو یا اسلام کو ضرورت ہو تو مزید کچھ مال امدادی طور پر دینا لازم ہے اِنْ فِي الْأَمْوَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ اور کچھ مال بطورِ خیرات دینا مستحب ہے۔ اَنْفَقُوا کا لفظ ان تینوں صورتوں کو حاوی ہے حضرت مفسر کی یہی مراد ہے۔ مترجم)

سِرًّا وَعَلَانِيَةً چھپا کر اور کھلم کھلا۔ نفل خیرات چھپا کر دینا افضل ہے (تاکہ شہرت طلبی کا شائبہ بھی نہ ہو) اور (لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے اور دوسروں کو ترغیب دینے) کے لئے زکوٰۃ کھلم کھلا دینا بہتر ہے۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ کا وجوب بہت کم ہوتا ہے (اول تو اتنا مال ہی نہیں ہو پاتا کہ زکوٰۃ واجب ہو اور مال ہوتا بھی ہے تو اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ پہلے ہی سے ادا کر دے) عموماً مسلمان نفل خیر، خیرات کرتا ہی رہتا ہے (اتنی کہ اس پر زکوٰۃ بہت کم ہی واجب ہوتی ہے) اس لئے سِرًّا کو علانیۃ سے پہلے ذکر کیا۔ (ورنہ زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے خیرات پر مقدم ہے اس لئے علانیۃ کا لفظ سِرًّا سے پہلے آنا چاہئے تھا۔)

وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نیک کام کر کے کئے ہوئے برے کاموں کی تلافی کر دیتے ہیں اللہ نے فرمایا اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی بھی کر یہ اس کو مٹا دے گی۔ رواہ احمد صحیح۔

ابن عساکر نے عمر بن اسود کی مُرسَل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دس گناہ تو نے کئے ہوں تو ایک نیکی بھی ایسی کر جس سے تو گناہوں کو اتار دے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو زرہ کی ایک کڑی ٹوٹ گئی پھر دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ رواہ الطبرانی۔

لے حاصل اختلاف یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور عطاء کے نزدیک صَبَرُوا کے بعد عَلٰی محذوف ہے احکام پر ثابت قدم رہنا یا مصائب پر دونوں صورتوں میں عَلٰی (جو صبر کا صلہ ہے) محذوف ہو گا۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک عَنْ (حرف صلہ) محذوف یعنی نفسانی خواہشات یا گناہوں سے اجتناب کرنا۔ حضرت مفسر کی تفسیر زیادہ عام ہے مگر عَلٰی اس صورت میں بھی محذوف ماننا پڑے گا۔ مترجم)

ابن کیسان نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ گناہ توبہ کے ذریعہ سے دفع کر دیتے ہیں (یعنی حسنہ سے مراد توبہ ہے) امام احمد نے عطاء کی مرسئل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو نے گناہ کیا ہو تو فوراً اس کے بعد توبہ کر لے۔ چھپے گناہ کی توبہ مخفی طور پر اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ (الزہد)

بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ برائی کے عوض برائی نہیں کرتے بلکہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ جب ان کے خلاف کوئی جہالت کرتا ہے تو (جہالت کا جواب وہ جہالت سے نہیں دیتے) وہ تحمل کرتے ہیں سنیۃ سے مراد ہے جہالت اور حسنہ سے مراد ہے تحمل۔ قتادہ نے کہا جب کوئی ان سے برائی کرتا ہے اور تو وہ لوٹا کر اس سے بھلائی کرتے ہیں جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔

حسن نے کہا جب ان کو محروم رکھا جائے تب بھی محروم رکھنے والوں کو وہ محروم نہیں رکھتے بلکہ وہ دیتے ہیں ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اگر ان سے قطع قرابت کیا جائے تو وہ پھر بھی قرابت کو جوڑتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قرابت توڑتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ ان کی زیادتیوں کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ رہے ہو تو تم ان پر خاک جھونک رہے ہو (یعنی ان کو ناکام بنا رہے ہو وہ خسارے میں رہیں گے اور تم کامیاب ہو گے) جب تک تم اس سلوک پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں تمہاری حمایت ہوتی رہے گی۔ رواہ مسلم۔

عبداللہ ابن مبارک نے فرمایا یہ مذکورہ بالا آٹھ خصائل ہیں جو جنت کے آٹھ دروازوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں (ہر خصلت جنت کے ایک دروازے کی طرف رہنمائی کر رہی ہے)

أُولَئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ اس جہان میں نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے۔ عَقَبَى کسی کام کا بدلہ۔ اَعَقَبَهُ اس کو بدلہ دیا (قاموس) کام کے پیچھے اس کا بدلہ (نتیجہ) آتا ہے اس کو عَقَبَى کہا جاتا ہے (خواہ اچھا بدلہ ہو یا برا) لیکن (عرف عام میں) عَقَبَةُ عَقَبَى اور عَاقِبَةُ اچھی جزا یعنی ثواب کے لئے خاص کر لیا گیا ہے اور عَقُوبَةُ معقَابَةُ اور عِقَابُ کا اطلاق عذاب اور برے بدلہ پر ہی ہوتا ہے۔ ثواب کے متعلق اللہ نے فرمایا خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عِقَابًا۔ أُولَئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ۔ نِعَمٌ عَقَبَى الدَّارِ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ اور عذاب کے بارے میں فرمایا ہے۔ فَحَقَّ عِقَابٌ شَدِيدٌ الْعِقَابِ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوِّبْتُمْ بِهِ۔ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوِّبَ بِهِ۔ لیکن لفظ عَاقِبْتُ اگر مضاف ہو تو عَقُوبَةُ کے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے تَمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الدِّينِ أَسَاؤًا وَسُوَايَ يَا فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ۔ عَاقِبْتُ بمعنی عَقُوبَةُ یا تو بطور استعارہ مستعمل ہے یا بطور اشتراک (یعنی لفظ عَاقِبْتُ دونوں معنی میں مشترک ہے اچھا انجام اور برے انجام)

حقیقت میں آخرت ہی قرار گاہ ہے اس لئے الدَّار سے مراد آخرت ہے، دنیا تو گزر گاہ ہے قرار گاہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص کے لئے دارِ آخرت میں اچھا نتیجہ اور ثواب ہوگا۔

جَنَّاتٍ عَدْنٍ یعنی قیام اور رہنے کے باغ۔ عَدْنُ کا معنی ہے قیام کرنا۔ لے۔ جَنُّوا فِيهَا وَمَنْ صَدَقَ مِنْ أَبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے مال باپ اور بیٹیوں اور اولادوں میں سے جو جنت کے لائق ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے۔

۱۷ مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے ممبر پر آیت جناتِ عَدْنِ تلاوت فرمائی پھر فرمایا لوگو! تم کو معلوم ہے کہ جناتِ عَدْنِ کیا ہیں عَدْنِ جنت میں قصر ہے جس کے دس ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے پر پچیس ہزار فرخ چشم حوریں متعین ہیں اس قصر میں سوائے نبی، صدیق اور شہید کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ (از مفسر رحمہ اللہ)

”صلاح“ سے صرف ایمان مراد ہے کامل (عملی اور سستی مراد نہیں۔ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہئے۔ ہاں الْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ میں کامل صلاح والے مراد ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کاملوں کی عزت افزائی کرے گا اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو بھی ان کے مرتبے پر فائز کر دے گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں گے اور کاملین کے اعمال کی طرح ان کے اعمال نہ ہوں گے آباؤ اجداد، اولاد اور بیویاں خواہ اہل جنت کے درجات پر فائز ہونے کے اہل نہ ہوں مگر جنتیوں کی خوشی کی خاطر ان کو بھی اہل جنت کا ساتھ دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں۔ صالح (یعنی مؤمن) ہونے کی شرط بتا رہی ہے کہ بغیر ایمان کے قرابتِ نسب مفید نہ ہوگی۔ آباء کے اندر بدالالتِ نص مائیں بھی داخل ہیں۔

..... ایک شبہ

طبرانی حاکم اور بیہقی نے حضرت عمرؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ و حضرت مسور بن مخزومؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتہ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ ابن عساکر نے صحیح سند سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث مذکورہ نقل کی ہے۔ ہر نسب اور رشتہ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے منقطع ہو جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت (نسبی و سسرالی) کے علاوہ اور کسی کی قرابت کام نہ آئے گی (اور آیت میں مؤمنوں کے لئے ان کی قرابت و زوجیت کا سود مند ہونا مذکور ہے)۔

..... حل

تمام مؤمن رسول اللہ کی اولاد ہیں۔ اللہ نے فرمایا النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ۔ حضرت اہل کی قرأت میں اتنا لفظ اس کے بعد زیادہ ہے۔ وَهُوَ أَبٌ لَهُمْ (رسول اللہ ﷺ مؤمنوں کے باپ ہیں)۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ سُوْرَةُ كُوْثِرِ كِي تفسیر میں ہم نے ذکر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق عاص بن وائل نے لوگوں سے کہا اس کو چھوڑو یہ تو دم بریدہ ہے اس کے پیچھے اس کی نسل نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ آپ کا دشمن ہی حقیقت میں دم بریدہ ہے اسی کی نسل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ عاص بن وائل کے بیٹے عمر اور ہشام تھے مگر عمر و ہشام مسلمان ہو گئے اس سے عاص کا ان سے کوئی رشتہ والدیت قائم نہیں رہا اور عاص کو اولاد کہہ دیا گیا۔ عمر و ہشام عاص کے وارث بھی انقطاع رشتہ کی وجہ سے نہ قرار پائے۔ بلکہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی اولاد ہو گئے۔ اس تو ضیح کی روشنی میں حدیث مذکور کا مطلب یہ ہو گا کہ قیامت کے دن میرا رشتہ اور نسب سود مند ہو گا اور سب رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ میرا نسب و رشتہ براہ راست ہو یا بالواسطہ حاصلِ مطلب یہ کہ کافروں کا کافروں سے یا کافروں کا مؤمنوں سے رشتہ و قرابت و زوجیت منقطع ہو جائے گا اور مؤمنوں کا باہمی رشتہ سود مند ہو گا۔ اسی مضمون کو اللہ نے آیت الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ الخ میں بیان فرمایا ہے۔

اور (جنت یا محلاتِ جنت کے ہر دروازے سے یا تحائف و ہدایا کی پیش کش کے ہر دروازے سے ملائکہ ان کے پاس داخل ہوں گے۔ مقاتل نے کہا روزانہ یعنی ہر رات دن میں تین بار فرشتے ان کو تحفے اور ہدیے پیش کریں گے اور رات دن کی یہ مقدار دُنیوی شبِ دروز کے برابر ہوگی۔ (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔ یعنی جن تکالیف کا تم کو ڈر رہتا تھا۔ اب اللہ نے ان سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ تم کو بچا لیا اور لازوال نعمتیں عطا فرمادیں۔

تمہارے صبر کرنے کی وجہ سے یعنی گناہوں سے بچ کر نفسانی خواہشات کو روک کر طاعت پر پُہنچا صبرِ تم

قائم رہنے اور مصائب کو برداشت کرنے کی وجہ سے تم کو یہ ثواب ملا ہے۔

فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۱۳﴾ سواں جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

حضرت ابو امامہ کا بیان ہے کہ جنت کے اندر اپنی مسند (مسہری) پر مؤمن راحت اندوز ہو گا خادموں کی دو قطاریں اس کے سامنے ہوں گی۔ دونوں قطاروں کے سرے پر ایک بند دروازہ ہو گا دروازے پر فرشتہ اندر آنے کا طلب گار ہو گا۔ مؤمن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم اپنے برابر والے خادم سے اور یونہی سلسلہ وار ہر خادم اپنے متصل خادم سے کہے گا کہ فرشتہ دروازہ پر خواستگار اجازت ہے۔ یہاں تک کہ آخری خادم جو دروازہ سے متصل ہو گا وہ دروازہ کھول دے گا فرشتہ اندر آ کر سلام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر سب سے پہلے وہ فقراء و مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی بندش ہوتی ہے اور مصائب سے بچاؤ ہوتا ہے۔ غریب دل کی خواہش دل ہی میں لے کر مر جاتے ہیں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی اللہ اپنی مشیت کے مطابق فرشتوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کرو۔ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ان کو جا کر سلام کریں، اللہ فرمائے گا یہ میرے بندے میری عبادت کرتے تھے کسی چیز کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کے ذریعہ سے اسلامی سرحدوں کی بندش ہوتی تھی اور انہی کے سبب مصائب سے بچاؤ ہوتا تھا یہ ایسی حالت میں مرے کہ ان کی تمنا ان کے دلوں میں ہی رہی۔ دنیا میں ان کی حاجت پوری نہیں ہوئی، حسب الحکم ملائکہ ان کے پاس آئیں گے اللہ نے فرمایا يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، یعنی پختہ اقرار اور قبول کرنے کے بعد پھر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ

اور جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں۔ یعنی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، ماننے سے انکار کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفرقہ کرتے ہیں اللہ کو مانتے ہیں اور رسول کو نہیں مانتے اور رشتہ داریاں منقطع کرتے ہیں۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ

اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے اور نسل (یعنی انسانوں اور مویشیوں) کو ہلاک کرتے ہیں راستے لوٹتے ہیں اور ناحق بغاوت و ظلم کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ کی طرف سے جلد ملنے کا استحقاق ہو جاتا ہے وہ بغاوت اور قطع رحم ہے (اس سے زیادہ جلد عذاب دنیا کو لانے والا اور کوئی گناہ نہیں کروا احمد و البخاری فی

الادب و ابو داؤد و الترمذی و ابن ماجہ و الحاکم و ابن حبان۔ حضرت جبیر بن مطعم راوی ہیں میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ

فرما ہے ہیں رحم کو کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ متفق علیہ۔

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی راوی ہیں، میں نے حضور کو فرماتے سنا، ان لوگوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جن میں

قربت رحم کو کاٹنے والا موجود ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا (احسان کر کے) احسان جتانے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا نہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہمیشہ مخمور رہنے والا (نشہ کا

خوگر کرواہ النسائی و الدارمی۔

اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی یعنی دار آخرت میں ان کے لئے بُری سزا

اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی، لعنت سے مراد ہے اللہ کی رحمت سے دور رہنا۔

وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۱۵﴾

ہے۔ بُری سزا سے مراد ہے جہنم کی آگ۔

اللہ ہی جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔

وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا اور اہل مکہ دنیوی زندگی پر پھولے ہوئے ہیں۔ فَرِحُوا مغرور ہیں اتراتے ہیں۔ یعنی دنیا میں اللہ نے جو ان کو رزق کی کشائش عطا فرمادی ہے اس پر مغرور ہیں اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ اور آخرت (کے مقابلہ) میں دنیوی زندگی صرف ایک حقیر متاع ہے جو ہمیشہ رہنے والی نہیں، جیسے مسافر کا زادراہ اور چرواہے کی وقتی غذا۔ دنیوی عیش و راحت قابل بھروسہ نہیں، آخرت کی فلاح و آسائش کے مقابلہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ دنیوی سرمایہ کی وسعت ناقابل افتخار ہے اگر اس کو نعیم آخرت کے حصول کے لئے صرف کیا جائے تو بہتر ہے ورنہ مستحق نفرت۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ نبوت دیکھنے کے باوجود محض عناد اور سرتابی کے زیر اثر (من مانے) معجزات اور نشانات کے یہ کافر طلبگار ہوتے ہیں اور کہتے ہیں محمد ﷺ پر کوئی ایسی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی (جو ان کی صداقت کی شہادت دیتی)۔

قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے یعنی نزول آیات اور قیام معجزات میں کوئی کمی نہیں مگر (گمراہی اور ہدایت اللہ کے قبضہ میں ہے) آیات و معجزات کا کام (راہنمائی ہے) ہدایت بخشی نہیں (ہدایت بخش تو اللہ ہے) ہدایت و گمراہی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یابی کی توفیق نہیں دیتا اور تم جیسے لوگوں کا شمار مؤخر الذکر گروہ میں ہے اس لئے ہر معجزے کے ظہور کے بعد بھی تم ہدایت یاب نہیں ہو سکتے۔

وَيَهْدِي رَبِّي لِمَن يَشَاءُ اور جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کی ہدایت کر دیتا ہے یعنی اپنی اطاعت ایمان اور مراتب قرب کے حصول اور جنت کی طرف ان لوگوں کو ہدایت کرتا ہے جن کے دل کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہتا ہے پس جس کی توجہ کو وہ اپنی طرف پھیر دیتا ہے وہ عناد چھوڑ کر اللہ کی طرف پھر جاتا ہے۔ ایسا آدمی نازل شدہ معجزات بلکہ ان سے بھی ادنیٰ معجزہ اور ضعیف ترین نشان دیکھ کر ہی ایمان لے آتا ہے (مزید فرمائشی معجزات کے ظہور کا طلبگار ہی نہیں ہوتا)

الَّذِينَ آمَنُوا اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی ان کے دلوں

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ میں ایمان و یقین جم جاتا ہے۔ ہر طرح کا شک زائل ہو جاتا ہے۔ ”ذکر“ سے مراد ہے قرآن اور اطمینان سے مراد ہے ایمان کیونکہ ایمان دلوں کا سکون ہے اور رفاق دلوں کی بے چینی یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطانی وسوسے زائل ہو جاتے ہیں (اس مطلب پر ذکر سے مراد ہوگی اللہ کی یاد۔ صرف قرآن مراد نہ ہوگا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل کے دو خانے ہوتے ہیں ایک خانہ میں فرشتہ کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرے خانہ میں شیطان کا ظہور جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سمٹ جاتا ہے اور اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل کے اندر رکھ دیتا ہے اس طرح وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے (رواہ ابن ابی شیبہ فی المصنف عن عبد اللہ بن شقیق ورواہ البخاری تعلیقاً عن ابن عباس) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے آدمی کے دل پر شیطان مارش کرتا ہے جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سٹکڑ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا ہے یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اہل ایمان کے پاک و صاف دلوں کی روزی اللہ کی یاد ہے اللہ کی یاد سے ان کو چین اور سکھ ملتا ہے جیسے پھلیوں کو پانی میں پرندوں کو ہوا میں اور وحشی جانوروں کو جنگل میں لیکن اگر غفلت آفریں کوئی اندرونی خیال دل میں آجاتا ہے یا اہل غفلت کی صحبت اثر انداز ہو جاتی ہے تو دلوں کا چین جاتا رہتا ہے بے چینی

اور عدم سکون پیدا ہو جاتا ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کو اور خشکی کے جانور کو پانی کے اندر اور وحشی جانوروں کو پنجرے میں اضطراب ہوتا ہے۔

صوفیہ صافیہ کے خادموں کے لئے ان حالات کا مشاہدہ بالکل بدیہی ہے ہر مُرشدِ برحق کا خدمت گزار ان حالات کو دیکھا کرتا ہے اس مطلب پر **الَّذِينَ آمَنُوا** سے مراد ہوں گے پاک باطن روشن دل صوفیہ۔

خوب سن لو اللہ کی یاد سے ہی (پاک صاف) دلوں کو چین ملتا ہے۔
الْأَبْدَانُ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۲۸
 بغوی نے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے **إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ** بس مؤمن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس جگہ ذکرِ الہی مؤمن کے قلب کا اطمینان فرمایا گیا ہے۔ ایک حالت میں خوف اور اطمینان ایک دل میں کیسے جمع ہو سکتے ہیں اس شبہ کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ عذاب کے ذکر کے وقت مؤمن کا دل ڈر جاتا ہے اور ثواب کے وعدہ کے ذکر کے وقت اس کے اندر اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے اللہ کے انصاف اور عذاب سے اور چین پاتا ہے اللہ کے فضل و کرم کے ذکر سے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اطمینان و خوف میں باہم تضاد ہے (لیکن ایک حالت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا اطمینان کی حالت جدا ہوتی ہے اور خوف کی جدا)

میرے نزدیک طمانیت اور خوف میں کوئی تضاد نہیں طمانیت اُنس سے پیدا ہوتی ہے اور اُنس خوف کی حالت میں بھی ہوتا ہے بلکہ خوف و امید بھی ایک حالت میں جمع ہو سکتے ہیں حضرت اُنسؓ راوی ہیں کہ ایک جوان کے مرنے کے وقت رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا تجھے (اپنے دل کی) کیفیت کیا محسوس ہوتی ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کا مجھے خوف بھی ہے۔ فرمایا ایسے موقع پر جس بندہ کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہوتی ہیں اللہ ضرور اس کو اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے اس کو خوف ہوتا ہے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشی ہے۔
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ

حضرت ابن عباسؓ نے طُوبَى کا ترجمہ کیا ہے خوشی اور خنکی چشم۔ عکرمہ نے کہا ان کا مال اچھا ہوگا۔ قتادہ نے کہا ان کے لئے بھلائی ہوگی (ان تمام مطالب پر) طُوبَى بروزن بَشْرَى مصدر ہوگا۔ طاب (ماضی) يَطِيبُ (مضارع)۔ معمر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے اگر تم کو کوئی بھلائی اور فائدہ حاصل ہو جائے تو دوسرا آدمی کوئی دوست تم سے کہتا ہے۔ طُوبَى کک گو یا طُوبَى کلمہ متبریک ہے ابراہیم نے کہا نیکو کار مؤمنوں کے لئے بھلائی اور عزت ہوگی۔ سعید بن جبیر نے کہا حبشی زبان میں طُوبَى باغ (جنت) کو کہتے ہیں۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابو امامہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا طُوبَى جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ فگن ہے۔

عبید بن عمیر نے کہا طُوبَى جنتِ عدن کے اندر رسول اللہ ﷺ کے جنتی مکان میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں (مؤمن کے ہر جنتی) مکان اور بالا خانہ پر سایہ فگن ہیں۔ سوائے سیاہ رنگ کے ہر رنگ اور ہر پھول اور ہر پھل اور ہر میوہ اللہ نے اس درخت میں پیدا کیا ہے اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں کافور اور سلسبیل۔

مقاتل نے کہا اس کا ہر پتہ ایک گروہ پر سایہ فگن ہے اور ہر پتہ پر ایک فرشتہ اللہ کی طرح طرح کی تسبیح بیان کرنے میں

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے طُوبَى کا ذکر آیا تو فرمایا ابو بکرؓ کیا تم کو معلوم ہے کہ طُوبَى کیا ہے حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا طُوبَى جنت میں ایک درخت ہے جس کی لمبائی سے اللہ ہی واقف ہے اس کی ایک شاخ کے نیچے ستر برس تک گھوڑا سوار چلتا رہے (تو اس کو طے نہ کر پائے) الخ (ازالۃ الخفاء)

مشغول ہے۔

احمد، ابن حبان، طبرانی، ابن مردویہ، اور بیہقی نے حضرت عتبہ بن عبد اللہ سلمیٰ کا بیان نقل کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا جنت کے اندر پھل ہوں گے فرمایا ہاں وہاں ایک درخت ہو گا طوبیٰ جو فردوس کے مطابق ہو گا (شاید مطابق ہونے سے یہ مراد ہے کہ پوری جنت فردوس پر چھایا ہوا ہو گا) سائل نے عرض کیا ہماری زمین کے کس درخت سے اس کی مشابہت ہو سکتی ہے فرمایا تیری اس زمین کے کسی درخت سے اس کی مشابہت نہیں، کیا تو شام کو گیا ہے سائل نے جواب دیا نہیں، فرمایا شام میں ایک درخت ہوتا ہے جو طوبیٰ سے کچھ مشابہت رکھتا ہے اس درخت کو اخروٹ کا درخت کہتے ہیں اس کا ایک تنہ ہوتا ہے اور اوپر جا کر اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں۔ سائل نے کہا وہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں کا گلہ لے کر اس کی جڑ کے گرد اگر دگھومے تو اگر تو بوڑھا ہو جائے اور بوڑھا ہو کر گر پڑے تب بھی اس کی جڑ کا دورہ پورا نہ ہو گا۔ سائل نے عرض کیا، کیا اس میں انگور بھی ہوں گے فرمایا ہاں عرض کیا ان کا خوشہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا چت کبرے کوئے کی ایک ماہ کی رفتار اڑان کے برابر عرض کیا اس کا ایک دانہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا کیا تیرے باپ نے کوئی بڑا بکرا کبھی ذبح کیا ہے۔ عرض کیا جی ہاں، فرمایا کیا اس کی کھال اتار کر تیری ماں کو دے کر یہ کہا تھا کہ اس کی دباغت کر کے ایک بڑا ڈول اس کا بنا لینا جس میں پانی بھر کر ہم اپنے جانوروں کو پلایا کریں گے۔ سائل نے عرض کیا تو (اس سے اندازہ یہ ہوا کہ) اس کا ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا فرمایا ہاں اور تیرے سارے کنبہ کا بھی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا طوبیٰ کیا ہے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کا پھیلاؤ سو سال کی رفتار کے برابر ہے اہل جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے برآمد ہوں گے رواہ ابن حبان۔

معاویہ بن قرظہ نے اپنے باپ کی مرفوع روایت سے بیان کیا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اس درخت سے زیور اور کپڑے پیدا ہوں گے اور اس کی شاخیں حصار جنت کے باہر سے دکھائی دیں گی۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں گھوڑا سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی قطع نہ کر سکے اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو پڑھو وَظِلِّ تَمْدُودٍ (متفق علیہ) امام احمد نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد اتنا زیاد بیان کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانک لیں گے۔

نہاد بن سری نے الزہد میں بغوی نے تفسیر میں آخر میں اتنا اور بھی بیان کیا کہ اس بیان کی اطلاع کعب کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ سچ ہے قسم ہے اس خدا کی جس نے موسیٰؑ پر تورات اور محمد ﷺ پر قرآن نازل کیا اگر کوئی شخص سو سالہ یا چار سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس درخت کے تنہ کے گرد اگر دچکر لگائے تو دورہ پورا نہ کر سکے یہاں تک کہ عمر ختم ہو جائے اور پیر فرقت ہو کر گر پڑے اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اپنی روح اس میں پھونکی ہے اس کی شاخیں جنت کے باہر سے نظر آئیں گی (یعنی پوری جنت پر وہ سایہ فگن ہو گا) جنت کے ہر نہر اسی درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے اللہ اس سے فرمائے گا میرا بندہ جو کچھ چاہتا ہے تو شگافتہ ہو اپنے اندر سے اس چیز کو برآمد کر دے۔ حسب الحکم درخت پھٹے گا اور اس کے اندر سے بندہ کی خواہش کے مطابق گھوڑا زین اور لگام پورے ساز سمیت برآمد ہو جائے گا اور بندہ کی خواہش کے مطابق اونٹنی اپنے کجاوے، ٹیکیل اور سامان سمیت برآمد ہو جائے گی اور کپڑے بھی پھٹکر اس درخت سے نکلیں گے۔ رواہ البغوی وابن ابی الدنیا، ابن مبارک اور ابن جریر نے شہر بن حوشب کا قول نقل کیا ہے کہ طوبیٰ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اسی سے پیدا ہے اس کی شاخیں حصار جنت سے باہر دکھائی دیں گی۔

وَحَسَنَ مَا بٍ ۲۹ اور اچھا انجام ہے، ماب پلٹنے کی جگہ۔

كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لَتَلْتَؤُا عَلَيْهِمُ الذِّمَىٰ أَوْحِينَا إِلَيْكَ

اسی طرح (یعنی دوسرے پیغمبروں کی طرح) ہم نے آپ کو بھی ایک امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے دوسری امتیں گزر چکی ہیں (جن کی طرف دوسرے پیغمبروں کو بھیجا تھا۔ مطلب یہ کہ آپ کی پیغمبری کوئی انوکھی چیز نہیں ہے) تاکہ جو قرآن ہم نے آپ کو وحی کے ذریعہ دے دیا ہے اس کو پڑھ کر آپ ان کو سنائیں۔

وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ یہ رحمن کی ناشکری کرتے ہیں۔ رحمن بہت

زیادہ رحمت والا جس کی نعمت سب کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو اپنے اندر سمونے ہوئے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا ان

پر بہت بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے آپ کو ان کے اندر رسول بنا کر بھیجا، قرآن نازل فرمایا جو تمام دنیوی و اخروی منافع کا خزانہ ہے۔

مگر یہ لوگ ناشکرے ہیں اتنی بڑی نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کرتے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ، مقاتل اور ابن جریج نے بیان کیا

کہ اس آیت کا نزول صلح حدیبیہ کے سلسلے میں ہوا (یعنی یہ آیت مدنی ہے) ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کا یہ

بیان نقل کیا ہے۔ اس کی توضیح اس طرح ہے کہ جب قریش اور صحابہ کا صلح نامہ لکھنے پر اتفاق ہو گیا اور سہل بن عمرو قریش کی

طرف سے آگیا۔ سورۃ الفتح میں تفصیل کے ساتھ ہم نے لکھ دیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، لکھو بسم اللہ

الرحمن الرحیم، قریش بولے ہم تو الرحمن کو نہیں جانتے ہم تو صرف یمامہ والے رحمن (یعنی مسلمانوں کو جانتے ہیں) ہم اللہ

کو رحمن نہیں کہتے تم وہی لکھو جو پہلے لکھتے تھے۔ یعنی باسمک اللهم (سے تحریر شروع کرو) هُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ کا یہی

مطلب ہے (یعنی یہ لوگ اللہ کے رحمن ہونے کا انکار کرتے ہیں)

بغوی نے لکھا ہے (عام اہل تفسیر میں) مشہور ہے کہ یہ آیت مکی ہے ابو جہل وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی حجرِ اسود کے

پاس رسول اللہ ﷺ دعا میں یا اللہ یا رحمن فرما رہے تھے ابو جہل نے یہ لفظ سن پایا فوراً مشرکوں سے جا کر کہا محمدؐ دو معبودوں کو پکار

رہے تھے اللہ کو اور رحمن کو اور ہم تو یمامہ والے رحمن کے علاوہ کسی اور رحمن سے واقف نہیں (پھر وہ رحمن کو نسا ہے جس کو محمدؐ

پکار رہے تھے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوْادِعُوا الرَّحْمٰنَ اَيَّامًا تَدْعُو فَلَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت کفارِ قریش کے حق میں نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ ﷺ

نے ان سے فرمایا تھا کہ رحمن کو سجدہ کرو، کافروں نے جواب میں کہا رحمن کیا چیز ہے۔

قُلْ هُوَ رَبِّي آپ کہہ دیجئے وہ ہی میرا رب ہے یعنی جس رحمن کو جاننے کے تم منکر ہو وہی میرا خالق اور کارساز

ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی مستحقِ عبادت نہیں، اسی

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابٍ ۳۰ پر میرا بھروسہ ہے (وہی تمہارے مقابلے میں میری مدد کرے گا) اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے وہی مجھے ثواب دے گا۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تم جو کچھ کہہ

رہے ہو اگر وہ صحیح ہے تو ہمارے مُردہ اسلاف کو ہم سے ملا دو تاکہ ہم ان کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں (اور وہ تمہاری تصدیق

کریں، مترجم) اور مکہ کے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے ہٹا کر) پھیلا دو اس زمین کو کشادہ کر دو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اگر قرآن کے ذریعہ سے پہاڑوں کو چلا دیا جائے (جگہ سے ہٹا کر

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سِپِّرْتُمْ بِهِ الْجِبَالُ

پھیلا دیا جائے)

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے عطیہ عوفی کا بیان نقل کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اگر مکہ کے

پہاڑوں کو یہاں سے چلا دیں کہ میدان نکل آئے اور ہم اس میں کھیتی کریں یا جس طرح ہوا کہ ذریعہ سے سلیمان قطع مسافت

کرتے تھے اور قوم کو ہوا کے دوش پر قطع مسافت کراتے تھے آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیتے یا جس طرح عیسیٰؑ مردوں کو

زندہ کر دیتے تھے آپ بھی ہمارے مردوں کو زندہ کر دیتے (تو ہم ایمان لے آتے) اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ بغوی نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ آیت مذکورہ چند مشرکوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جن میں ابو جہل بن ہشام اور عبد اللہ بن امیہ بھی شامل تھے، وہاں سے عبد اللہ بن امیہ نے ایک شخص کی زبانی یہ کہلویا کہ اگر آپ ہم کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں تو قرآن کے ذریعے سے مکہ کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دیجئے تاکہ کشائش پیدا ہو جائے ہماری کھیتی کے لئے اس وقت زمین تنگ ہے اور یہاں چشمے اور نہریں بھی نکال دیجئے تاکہ ہم درخت لگائیں کھیتیاں بوئیں اور باغ تیار کریں۔ آپ اپنے دعوے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک داؤد سے کم مرتبہ تو نہیں ہیں آپ کہتے ہیں کہ داؤد کے لئے پہاڑ رواں کر دیئے گئے تھے جو ان کے ساتھ مل کر اللہ کی پاکی بیان کرتے تھے آپ ہو ا کو بھی ہمارا تابع بنا دیجئے کہ ہم غلہ کو حاصل کرنے اور دوسری ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے جو شام کو جاتے ہیں ہو ا پر چلے جایا کریں اور ہم روز لوٹ آیا کریں۔ آخر آپ کا قول ہے کہ ہو ا کو سلیمان کے زیر حکم کر دیا گیا تھا اور آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ عیسیٰ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور خدا کے نزدیک آپ کا مرتبہ (بقول آپ کے) عیسیٰ سے کم نہیں ہے لہذا آپ اپنے دادا قصی یا ہمارے مردوں میں سے کسی کو زندہ کر دیجئے تاکہ ہم اس سے آپ کے معاملہ میں دریافت کریں کہ آپ کا دعویٰ نبوت صحیح ہے یا غلط۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

ابو یعلیٰ نے مسند میں حضرت زبیر بن عوام کے حوالہ سے بھی حدیث مذکورہ کے ہم معنی حدیث نقل کی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن یعنی کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے اگر پہاڑ رواں کئے جاسکتے ہیں ان کی جگہ سے ان کو ہٹایا

جاسکتا ہے۔

یا کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے زمین طے کی جاسکتی ہے یعنی اللہ ہو ا کو تابع حکم بنا سکتا ہے اور لوگ دوش ہو ا پر سوار ہو کر قطع مسافت کر سکتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے زمین پھاڑی جاسکتی ہے اور اس سے چشمے اور نہریں نکالی جاسکتی ہیں۔

یا اس کے ذریعے سے مردوں سے کلام کیا جاسکتا ہے یعنی مردے زندہ ہو کر کلام کر سکتے ہیں۔ الموتیٰ سے مراد قصی وغیرہ ہیں بشرط کا جواب محذوف ہے یعنی امور مذکورہ میں سے کوئی امر کسی آسمانی کتاب سے سر انجام پانا ممکن ہو سکتا تو اللہ قرآن کے ذریعے سے بدرجہ اولیٰ ایسا کر دیتا مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔

یا یہ مطلب ہے کہ اگر امور مذکورہ قرآن کی ذریعے سے کر بھی دیئے جاتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔ اسی مؤخر الذکر مضمون کو آیت ذیل میں ادا کیا ہے۔ وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ الْخِ اگر ہم فرشتوں کو اتار کر ان کے پاس بھیج دیتے اور مردے ان سے کلام کرتے اور ہر چیز کو جمع کر کے ان کی سامنے لے آتے (اور سب توحید و رسالت کی شہادت دیتے) تب بھی یہ ماننے والے نہ تھے۔ بعض نے کہا کہ جواب شرط مقدم ہے وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ جواب شرط ہے اور درمیانی کلام جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے گو یہ مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن کے ذریعے سے پہاڑ بھی رواں کر دیتے تب بھی یہ کفر ہی کرتے ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کے لئے بد بختی لکھ دی گئی ہے ان کافروں کا مبداء تعین اللہ کے اسمِ مُضِل کا پر تو ہے ان کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔

بلکہ سارا اختیار خاص اللہ ہی کو ہے۔

بَلِ لِلَّهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا

اس جملہ سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے جو عبارت کی رفتار سے سمجھ میں آرہا ہے پورا کلام اس طرح تھا کہ کافروں کی فرمائشوں کا پورا نہ کیا جانا اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ ایسا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا بلکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ان کی فرمائشیں بلکہ ہر امر کر سکتا ہے مگر اللہ ایسا چاہتا نہیں کیونکہ اس کو علم ہے کہ یہ لوگ اس کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے خواہ کوئی سی بھی نشانی ان کو نظر آجائے یا اس لئے یہ فرمائشیں معجزات اللہ ظاہر نہیں کرتا کہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب مذکورہ بالا معجزات کی درخواست سنی تو ان کی بھی خواہش ہوئی کہ اللہ یہ فرمائشیں پوری کر دے تو

بہتر ہے یہ کافر لوگ اسی طرح سے ایمان لے آئیں (تو مناسب ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

أَفَلَمْ يَأْتِئْسِ الَّذِينَ آمَنُوا
باوجود یہ کہ ان معجزات سے بڑھ چڑھ کر یہ کافر معجزات دیکھ چکے پھر بھی ایمان نہ لائے چاند پھٹنے کا معجزہ انہوں نے دیکھا پھر بھی تصدیق نہیں کی، کنکریوں کا کلام کرنا انہوں نے دیکھ لیا اور ایمان نہ لائے، پہاڑوں کے روال کرنے اور دوش ہوا پر قطع مسافت کرنے سے تو چاند کے پھٹنے کا معجزہ زیادہ مؤثر ہونا چاہئے اور مردوں کے کلام کرنے سے کنکریوں کا بولنا زیادہ مشکل ہے، جب یہ معجزات ان کو قبول ایمان پر آمادہ نہ کر سکے تو فرماؤ معجزات کی تکمیل کیا ایمان بخش ہو سکتی ہے۔

أَنْ لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا
کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام دنیا کے آدمیوں کو ہدایت کر دیتا۔
اس کلام کا تعلق ایک محذوف لفظ سے ہے۔ یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اہل ایمان کافروں کے ایمان لانے سے ناامید نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت کر دے یا یہ مطلب ہے کہ مؤمنوں کا ایمان ہے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو مؤمن بنا دے اس ایمان کے باوجود کیا مؤمن ان کافروں کے ایمان دار بن جانے کی امید رکھتے ہیں ابھی ناامید نہیں ہوئے۔
اکثر اہل تفسیر نے لکھا کہ لَمْ يَأْتِئْسِ کا معنی ہے لَمْ يَعْلَمْ یعنی کیا اہل ایمان نہیں جانتے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت یاب کر دے۔

کلبی نے کہا قبیلہ مخخ کے محاورے میں یأس بمعنی علم آتا ہے بعض لوگوں نے ان کو بنی ہوازن کا محاورہ قرار دیا ہے یعنی ہوازن والے یأس کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فراء نے اس کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ کسی عرب سے یأس کا معنی علم نہیں سنا گیا یئسْتُ بمعنی عَلِمْتُ نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یأس کو مجازاً بمعنی علم قرار دیا جائے۔ علم کا نتیجہ کبھی ناامیدی ہوتا ہے۔ مسبب بول کر سبب مراد لیا جاسکتا ہے جس چیز سے مایوسی ہو وہ مجہول نہیں ہوتی یقیناً معلوم ہوتی ہے لَمْ يَأْتِئْسِ کو لَمْ يَعْلَمْ کے معنی میں لینے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ اسی آیت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بموجب لَمْ يَأْتِئْسِ کی جگہ لَمْ يَتَّبِعْنِ آیا ہے اور لَمْ يَتَّبِعْنِ کا معنی ہے لَمْ يَعْلَمْ گویا لَمْ يَتَّبِعْنِ، لَمْ يَأْتِئْسِ کی تفسیر ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا نَصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةً
اور یہ مکہ کے کافر تو ہمیشہ آئے دن اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کردار کے سبب ان پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے۔

قارعة سے مراد ہے کوئی مصیبت، بلاء، آفت خواہ بصورت قحط ہو یا بصورت قید و قتل یا مال کی تباہی اور عارت گری ہو یعنی کفر و بد اعمالی کی وجہ سے ان کافروں پر کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قارعة سے مراد ہیں وہ فوجی دستے جو رسول اللہ ﷺ کافروں پر بھیجتے رہتے تھے۔

أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ
یا ان کی بستی کے قریب نازل ہو تا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے گا۔ یعنی فوجی دستے یا کوئی دوسری آفت اگر براہ راست ان پر نہیں آئے گی تو ان کی بستیوں کے قریب کسی جگہ آتی رہے گی اور اس کی چنگاریاں اڑ کر ان پر بھی پڑتی رہیں گی۔ بعض نے کہا تَحُلُّ مخاطب کا صیغہ ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی آپ خود ان کی بستیوں کے قریب جا کر اتریں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ حدیبیہ میں جا کر اترے تھے۔ مؤخر الذکر قول اور ابن عباسؓ کی تشریح پر آیت کا نزول کفار مکہ کے متعلق مانا جائے گا۔ اگر آیت میں کفار مکہ مراد ہوں تو وَعْدُ اللَّهِ سے مراد فتح ہوگی اور اگر آیت عموم پر رکھی جائے تو وَعْدُ اللَّهِ سے مراد موت یا قیامت ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۲۱﴾
یہ حقیقت ناقابل شک ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اللہ کے کلام میں کذب اور وعدہ کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔
وَلَقَدْ اسْتَهْزَيْتُمْ بِرُسُلِكُمْ مِّنْ قَبْلِكُمْ
(یعنی جس طرح یہ کافر آپ سے استہزاء کرتے ہیں اسی طرح) آپ سے پہلے پیغمبروں سے کافروں کی طرف سے استہزاء کیا جا چکا ہے۔

پھر میں نے کافروں کو ڈھیل دی۔

فَأَمَلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

المَلُوءَةُ کا معنی ہے لمبی مدت، طویل زمانہ۔ مَلُوءَانِ رات دن کو امتداد کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں رات دن مَلُوءَانِ نہیں ہیں۔ ملوہ کا حقیقی معنی تو مدت ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

علیٰ کل حال المرء یختلفان

نہار و لیل دائم ملوہما

رات اور دن کی مدت بہر حال آتی جاتی ہے۔ آدمی کا کوئی حال ہو اچھا یا بُرا۔ ملو کی ہما کی طرف اضافہ بتا رہی ہے کہ ملو (بمعنی مدت ہے) بعینہ رات دن اس کا معنی نہیں ہے۔ اس تفسیح کی بنا پر اَمَلَيْتُ کا ترجمہ ہوا، میں نے بغیر عذاب دیئے ان کو چھوڑے رکھا ڈھیل دی۔

آخر میں نے (عذاب میں) ان کو دھر پکڑا پس (دیکھو) میرا عذاب کیسا بڑا محل وقوع ہو اسی طرح جو لوگ آپ سے استہزاء کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی میں یہی سلوک کر دوں گا۔

ثُمَّ أَخَذْنَا نَجْمَهُمْ فَكَفَيْتُمْ كَانِ عِقَابٍ ۝۲۲

بھلا وہ اللہ جو شخص کے اچھے برے تمام اعمال کا

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ

نگراں ہے اس مخلوق کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرح علم نہیں رکھتی یعنی اللہ ہر عمل سے واقف ہے اس لئے کسی عمل کا بدلہ اس کی طرح سے فوت نہیں ہوگا۔ ہمزہ سوالیہ ہے اور فاعل عطفہ اور معطوف علیہ محذوف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا تم اللہ کے ساتھ بتوں کو شریک قرار دیتے ہو اور جو ذات ہر شخص کے ہر عمل کی نگرانی ہے اس کو بے خبر، جماد، عاجز کی طرح سمجھتے ہو۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ۗ اور بنا رکھے ہیں انہوں نے اپنے گمان میں اللہ کے ساتھ۔ اس جملہ کا عطف کَسَبَتْ پر ہے اگر ما کو مصدری کہا جائے یا کلام محذوف پر ہے یعنی وہ اللہ کو ایک نہیں کہتے اور استحقاقِ معبودیت میں دوسروں کو اللہ کا

شریک بنا رکھا ہے۔

آپ ان سے کہیے کہ ان شریکوں کے اوصاف تو بیان کرو اور پھر غور کرو کہ کیا وہ مستحقِ معبودیت اور قابلِ شرکت ہو سکتے ہیں۔

قُلْ سَمُّوهُمْ ۗ

یا اللہ کو تم ایسی بات بتا رہے ہو جس سے وہ ساری زمین میں واقف نہیں۔ یعنی جو چیز ہے یا ہونے والی ہے، اللہ تو سب سے واقف ہے مگر اس کو ایسی کوئی ہستی معلوم نہیں جو استحقاقِ عبادت میں اس کی شریک ہو۔ پس کیا تم بتوں کے وہ اوصاف بتا سکتے ہو جن کی وجہ سے وہ مستحقِ عبادت ہو سکیں۔ اور ایسے شریکوں کی صفات بیان کر سکتے ہو جو مستحقِ عبادت قرار پائیں۔

أَمْ تَتَّبِعُونَٰ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ

یا (بتوں کو تم اللہ کا شریک) صرف ظاہری طور پر کہتے ہو۔ سطحی طور پر یونہی سننا کر زبان سے کہہ دیتے ہو جس کی واقع میں کوئی حقیقت نہیں۔ جیسے جہشی کا نام کافر رکھ دیا جاتا۔ بعض اہل تفسیر نے بِظَاهِرٍ تَبَيَّنَ الْقَوْلِ کا ترجمہ کیا ہے باطل قول، غلط بات۔

أَمْ بِيظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ

بلکہ کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں مرغوب معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی شیطان نے ان کی فریب کاری اور مکر سازی کو ان کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے (دلکش اور فائدہ آگیاں بنا رکھا ہے) اس لئے وہ اپنی غلط جھوٹی باتوں اور فریب کاریوں کے تخیل میں مست ہیں۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ

اور صحیح راستہ سے ان کو روک دیا گیا ہے یعنی دین کی راہ سے اللہ نے ان کو پھیر دیا ہے اور شیطان نے ان کو بہکا دیا ہے۔

وَصَدَّوْا عَنِ السَّبِيلِ ۗ

اور جس کو بے مدد چھوڑ کر اللہ گمراہ کر دے اس کو صحیح راستے پر ڈالنے والا ہدایت کی توفیق دینے والا کوئی نہیں۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۲۳

دنیوی زندگی میں ان پر عذاب مسلط ہے یعنی قتل ہونا قید ہونا اور جزیہ ادا

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

کرتا۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ

ہی ہے (جس میں یہ گرفتار ہوں گا)

وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۶﴾

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعِدَ الْمُتَّقُونَ ط

اور آخرت کا عذاب تو دنیوی عذاب سے زیادہ سخت اور دوامی اور بلاشبہ موجود

اور ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے یعنی

جنت کی خوبی اور ندرت کی حالت وہ ہے جو آئندہ بیان کی جا رہی ہے۔ سیبویہ نے کہا مَثَلُ الْجَنَّةِ مَبْتَدَاً ہے اور خبر محذوف ہے یعنی جنت کی حالت وہ ہے جو آگے بیان کی گئی ہے۔

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

وہ ایسی جنت ہے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

أُكُلُهَا دَائِمٌ

اس کے پھل ہمیشہ ہوں گے کبھی منقطع نہ ہوں گے۔

بزار اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ثوبان نے فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جنت والوں میں سے جو شخص بھی جنت کا کوئی پھل لے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل دوبارہ آجائے گا۔

فرقہ جہمیہ قائل ہے کہ جنت کی راحت فناپذیر ہے آیت مذکورہ اور حدیث سے اس فرقہ کے قول کی تردید ہو رہی ہے۔
وَوِظَلُّهَا ط اور اس کا سایہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یعنی ہمیشہ رہے گا دنیا میں سایہ دھوپ کی وجہ سے معدوم ہو جاتا ہے۔ جنت میں سایہ اس طرح نہ ہوگا۔بیہقی نے شعیب بن جحان کا قول نقل کیا ہے۔ شعیب نے کہا میں اور ابو العالیہ ریاحی سورج نکلنے سے پہلے نکلے (سہانا وقت دیکھ کر) ابو العالیہ نے کہا مجھے بتایا گیا ہے کہ جنت کا وقت ایسا ہی ہوگا پھر انہوں نے آیت وَظِلٌّ مَّمْدُودٌ تلاوت کی۔
یہ جنت پرہیزگاروں کے لئے جزا ہوگی یا ان کا انجام اور آخری نتیجہ بصورت
نِزْلِكَ عُقْبَى الدِّينِ اتَّقُوا ط جنت ہوگا۔

اور کافروں کا برا انجام دوزخ ہے۔ عُقْبَى کا معنی اس جگہ اگر جزا اچھا انجام قرار دیا جائے تو اس لفظ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا جیسے آیت هَلْ تُؤْتُونَ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ میں لفظ ثواب اور آیت وَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابِ الَّيْمِ میں لفظ بشارت آیا ہے۔

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے۔ اس سے مراد یا تمام صحابہؓ ہیں یا یہودیوں اور عیسائیوں میں سے وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی اور حبش کے عیسائی مسلمان۔

يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ

وہ اس قرآن سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر اتارا گیا ہے کیونکہ قرآن ان

کی سابق کتابوں کے موافق ہے۔

وَمِنَ الْأَحْزَابِ

اور ان گروہوں میں سے یعنی کافروں میں سے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جھٹا

بندی کر لی تھی یا ان یہودی اور عیسائیوں میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے جیسے کعب بن اشرف اور اسید اور عاقب وغیرہ۔

مَنْ يُنْكِرْ بَعْضَهُ ط

وہ لوگ ہیں جو قرآن کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی اس حصہ کا انکار کرتے ہیں جو ان

کی خواہشات یا ان کی شریعتوں کے موافق نہیں ہوتا۔

بغوی نے لکھا ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ الرَّحْمَنُ کا لفظ قرآن مجید میں کم آیا تھا جب حضرت عبد اللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی مسلمان ہو گئے اور قرآن میں الرَّحْمَنُ کا ذکر انہوں نے کم پایا تو یہ چیز ان کو کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ کیونکہ تورات میں تو یہ لفظ بکثرت آیا ہے اس کے بعد جب بار بار یہ لفظ قرآن میں آیا تو ان کو اس سے خوشی ہوئی۔ اس پر یہ آیت نازل

ہوئی۔

بعض علماء تفسیر کے نزدیک **وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ** میں منکرین سے مکہ کے مشرک مراد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں جب **بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ** لکھوائی تو مشرکین کہنے لگے ہم تو **رَحْمَنِ** یمامہ (مسئلہ کذاب) کے علاوہ کسی اور **رَحْمَنِ** سے واقف نہیں۔ اس پر آیت **وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمَنِ هُمْ كَافِرُونَ** اور آیت **هُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ** نازل ہوئی۔ **بَعْضَهُ** کا لفظ بتا رہا ہے کہ مشرکین لفظ اللہ کے ذکر کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ **الرَحْمَنِ** کا لفظ ذکر کرنا ان کو گوارا نہ تھا۔

قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے مجھے تو بس یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دوں۔ اگر یہ قول پیش کرنے کا حکم منکرین اہل کتاب عیسائی اور یہودی کے مقابلہ میں ہے تو آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ آپ کہہ دیجئے جو قرآن مجھ پر نازل ہو اور جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے اس میں مجھے اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دین کا مرکزی ستون یہی ہے تم لوگ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ باقی تمہاری شریعتوں سے میرے شرعی احکام کا مختلف ہونا سو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں، جزئی احکام میں باہم اختلاف رکھتی ہیں ایک دوسری کا نسخ کرتی چلی آئی ہیں۔

اگر آیت کو عام کافروں کے حق میں قرار دیا جائے گا تو مطلب اس طرح ہو گا۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اللہ کو اللہ، رحمن، رحیم کے مختلف ناموں سے پکارنا توحید کے خلاف نہیں۔ لفظ **رَحْمَنِ** کا انکار بے حقیقت ہے (شاید مشرکوں کو لفظ **رَحْمَنِ** سے اس لئے چڑھی تھی کہ ان کی صلاحیت و استعداد میں رحمت الہی کی قابلیت ہی نہیں تھی)

إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مآبٍ اسی کی طرف میں لوگوں کو بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے نہ کسی دوسرے کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں نہ کسی اور کی طرف میرا رجوع ہے۔

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا وَعَرَبِيًّا اور..... جس طرح ہم نے گزشتہ قوموں کے انہیں کی زبانوں میں کتابیں نازل کیں..... اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں (تمام معاملات، عبادات، حلت و حرمت وغیرہ کا) فیصلہ بنا کر اتارا ہے۔ تاکہ تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے اس کو سمجھنا سمجھانا آسان ہو۔

وَلَكِنْ اتَّبَعْتُمْ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ اور آپ کے پاس علم پہنچ جانے (یعنی قرآن نازل ہونے) کے بعد اگر آپ ان کی خواہشات پر چلیں گے تو اللہ کے عذاب و گرفت سے آپ کو بچانے والا اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ یعنی کوئی ایسا مددگار اور حامی نہ ملے گا جو اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا اس شخص کا **مطعم** نظر تو صرف عورتیں ہیں (یعنی یہ شخص نفس پرست اور عورتوں کا شیفتہ و فریفتہ ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے (جو فرشتے نہ تھے آپ کی طرح آدمی تھے) اور ہم نے ان کے لئے بیویاں اور اولاد (نر و مادہ) مقرر کیں (جیسے آپ کو عطا کی گئیں)۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ اور کسی رسول کے اختیار میں نہیں (نہ کسی رسول کے لئے جائز ہے) کہ کوئی آیت (معجزہ اور حکم جو اس سے طلب کیا جائے وہ خود) لے آئے (کیونکہ سب پیغمبر بندے ہیں کوئی رب نہیں)۔

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ہاں اللہ کے حکم (اور اجازت) سے۔ (وہ معجزات اور احکام پیش کرتے تھے)۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

ہر مدت (اور ہر چیز کے وقت) کے لئے (اس کی طرف سے ازل میں) ایک مقرر تحریر ہے (اس تحریر میں ہر چیز کی ابتدا اور انتہا لکھی ہوئی ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت پیدا ہو گا اور اتنی مدت تک زندہ رہے گا۔ کافر ہو گا یا مؤمن وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح قرآن کی ہر آیت کے نزول اور ہر معجزے کے ظہور کو بھی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ فلاں وقت نزول یا ظہور ہو گا۔ لوگ خواہ کتنی بھی طلب میں عجلت کریں مگر وقت مقرر سے پہلے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے وہ احکام جو توریت کے خلاف تھے اہل کتاب ان کو نہیں مانتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس خیال اور انکار کو دور کرنے کے لئے اللہ نے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ فرمایا ہو۔ یعنی ہر مدت اور وقت کے لئے اللہ نے حکم نازل فرمایا ہے اور صرف مقررہ مدت کے لئے بندوں کو کوئی معین حکم دیا ہے۔ بندوں کی مصلحت کے مطابق اللہ نے وقتی احکام بھیجے ہیں (جب مقررہ مدت ختم ہو گئی تو دوسرے زمانے کے لئے دوسرے احکام بھیج دیئے اور پہلے احکام بدل دیئے)۔

اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت برقرار رکھتا ہے۔

يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۗ

اس آیت کے مطلب میں اختلاف ہے سعید بن جبیر اور قتادہ نے فرمایا، جن فرائض و احکام کو خدا چاہتا ہے منسوخ کر دیتا اور بدل دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے منسوخ نہیں کرتا ہے آیت لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کا یہی مطلب مناسب ہے۔ حضرت ابن

عباس نے فرمایا لوح محفوظ میں سے جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اس میں مثبت کر دیتا ہے۔ لوح محفوظ کی جو تحریر مٹانے کے قابل ہوتی ہے جس کو تقدیر معلق کہا جاتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسری چیز پیدا کر دیتا ہے کہ خواہ اس قضاء کا معلق ہونا لوح محفوظ میں درج ہو یا نہ ہو صرف اللہ کے علم میں پوشیدہ ہو اور تحریر لوح مٹانے کے قابل نہیں ہوتی جس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں اس کو نہیں مٹاتا قضاء مبرم رد نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے رزق اور عمر اور سعادت و شقاوت کے یعنی یہ امور نہیں بدلے جاتے۔

بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت حذیفہ بن اسید کی روایت سے یہ فرمان رسول پہنچا ہے کہ استقرار نطفہ کے چالیس یا پینتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ داخل ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ سستی ہے یا سعید یہ دونوں باتیں لکھ دی جاتی ہیں پھر فرشتہ کہتا ہے اے رب یہ نر ہے یا مادہ یہ دونوں امور بھی لکھ دیئے جاتے ہیں پھر اس کا عمل، اثر، عمر اور رزق لکھ دیا جاتا ہے پھر یہ تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں جن کے اندر اس کے بعد نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

یحییٰ بن جابر نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو سچا بنایا گیا تھا کہ آدمی کی بناوٹ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ پھرتا ہے ہی روز بصورت علقہ (لو تھرا، خون جما ہوا) پھر اتنی ہی مدت بصورت مٹغہ (گوشت کی بوٹی) رہتی ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ چار باتوں

۱۔ طہرائی نے ضعیف سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا آپ ﷺ فرماتے تھے اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے بد بختی اور خوش بختی اور زندگی اور موت کے (یعنی ان چاروں چیزوں کو نہیں بدلتا) ابن مردود نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت سے حضرت رباب کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ رزق کی وسعت و کثرت کو مٹا بھی دیتا ہے اور رزق میں زیادتی بھی کر دیتا ہے اور عمر (کی میعاد) کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس میں زیادتی بھی کر دیتا ہے۔ ابن مردود نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ۗ اِلٰی کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ ہر شب قدر میں ہوتا ہے اللہ مرتبہ مٹاتا ہے اور پناہ یعنی دوزخ سے پناہ دیتا ہے اور رزق دیتا ہے سوائے زندگی اور موت اور شقاوت و سعادت کے کہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ (از مؤلف رحمہ اللہ)

کے لئے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا عمل اس کی زندگی اس کا رزق اور اس کا تعلق (دوزخی) یا سعید (جنتی) ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

بغوی نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے دونوں حضرات نے فرمایا اللہ سعادت و شقاوت کو بھی مٹا دیتا ہے اور رزق و مدت حیات کو بھی اور کچھ ثابت رکھتا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کعبہ شریف کا طواف کرنے میں رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہل سعادت میں لکھا ہے تو ان میں قائم رکھ (میرا نام ان کی فہرست سے نہ مٹا) اور اگر تو نے میرے لئے شقاوت لکھ دی ہے تو میرا نام اہل شقاوت کی فہرست سے مٹا دے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھ دے بلاشبہ تو جو کچھ چاہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہے قائم رکھتا ہے تیرے ہی پاس اُمُّ الْکِتَاب (اصل کتاب، ہر چیز کا تحریر نامہ) ہے۔ ایسی ہی روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی آئی ہے۔

بعض آثار میں آیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں لیکن جب وہ قرابت کو قطع کرتا ہے (قطع رحم کرتا ہے) تو لوٹا کر تیس سال کے تین دن کر دیئے جاتے ہیں اور بعض آدمیوں کی عمر کے تین دن باقی رہتے ہیں اور وہ کنبہ کی پرداخت (صلہ رحمی) کرتا ہے تو تین دن کھینچ کر تیس سال کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ اثر نقل کرنے کے بعد بغوی نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کی عمر کے جب صرف تین گھنٹے رہ جاتے ہیں تو اللہ رات کے آخری تین گھنٹوں میں نزول اجلال فرماتا ہے اور کتاب مندرج شدہ کو پہلے گھنٹہ میں ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی اس کتاب کو نہیں دیکھ سکتا پس جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثبت فرمادیتا (یا برقرار رکھتا ہے)۔

میں کہتا ہوں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق مقاماتِ مجددیہ میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے ایک شخص ملا طاہر لاہوری تھے حضرت مجدد صاحبؒ کے دونوں صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم کے معلم تھے حضرت مجدد قدس سرہ نے بنظر کشف ملاحظہ فرمایا کہ ملا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہے "ملا طاہر لاہوری شقی" حضرت نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کر دیا صاحبزادگان تو ملا طاہر کے شاگرد تھے ہی اس لئے انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر دیجئے اللہ اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے حضرت نے فرمایا، میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ قضاء مبرم ہے جس کو بدلا نہیں جاسکتا لڑکوں نے دعا کرنے کے لئے اصرار کیا حضرت مجدد نے فرمایا مجھے یاد آیا کہ حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا۔ میری دعا سے قضاء مبرم بھی بدل دی جاتی ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں اور بارگاہِ الہی میں عرض کرتا ہوں اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے ہمہ گیر فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمائے اور ملا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کر دے جیسے تو نے میرے آقا حضرت غوث اعظم کی دعا قبول فرمائی تھی حضرت مجدد قدس سرہ کا بیان ہے اس دعا کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا کہ گویا میری نظر کے سامنے لفظ "شقی" ملا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ لفظ "سعید" لکھ دیا گیا اور اللہ کے لئے یہ بات دشوار نہیں۔

حضرت مفسر کا بیان ہے اس تقریر کے بعد میرے دل میں ایک اشکال پیدا ہو گیا کہ کسی کی دعا سے قضاء مبرم کے نکل جانے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے اگر قضاء مبرم بھی نکل جاتی ہے تو وہ مبرم ہی کب ہوئی ایسی قضاء کو مبرم کہنا ہی غلط ہے اس اشکال کا جواب اللہ نے میرے دل میں اس طرح القاء کیا کہ قضاء معلق دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا معلق ہونا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے دوسری وہ قضاء جس کا مبرم ہونا لوح محفوظ میں درج نہیں۔ اس کا معلق یا مبرم ہونا صرف اللہ کے علم میں ہے لوح محفوظ میں چونکہ اس کی تعلیق مکتوب نہیں اس لئے تحریر لوح کے اعتبار سے اس کو قضاء مبرم کہا جاتا ہے حضرت غوث الثقلین نے جس قضاء مبرم کا اپنی دعا سے بدل جانا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہی قضاء ہے جو لوح محفوظ میں مبرم یعنی غیر معلق ہے اور علم الہی میں

معلق غیر مبرم ہے۔ ملاطہر کی بد بختی بھی اسی قسم کی تھی۔ لوح میں غیر معلق یعنی مبرم تھی، لیکن اللہ کے علم میں معلق غیر مبرم تھی اس لئے بدل دی گئی۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلبی نے آیت **يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْثِتُ كَايَ مَطْلَبِ بَيَانِ كِيَا ه** کہ کر اماکاتبین آدمی کے تمام افعال و اقوال اپنے رجسٹروں میں لکھ لیتے ہیں ان میں کچھ ایسے اعمال و اقوال بھی ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ عذاب مثلاً کوئی کہتا ہے میں نے کھالیا، میں نے پی لیا، میں وہاں گیا، میں گھر سے نکلا۔ یہ کلام اگر سچا ہوتا ہے تو اس پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو موجب ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ اول قسم کے اندر اجات کو اللہ کر اماکاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور دوسری قسم کی تحریروں کو قائم رکھتا ہے۔ کلبی نے اتنا مزید بیان کیا کہ جمعرات کے دن ایسے لا حاصل اعمال و اقوال مٹائے جاتے ہیں۔

عطیہ نے حضرت ابن عباس کا قول تشریح آیت کے ذیل میں اس طرح بیان کیا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے، لیکن آخر میں نافرمانی کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مڑ جاتا ہے تو اللہ اس کے سابق نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور جو شخص مرتے دم تک اطاعت پر قائم رہتا ہے اللہ اس کی نیکیاں قائم رکھتا ہے۔

مسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام آدمیوں کے سارے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمٰن کی ایک چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے پھر حضور نے یہ دعا کی اے اللہ اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے۔ (یعنی اپنی طاعت پر قائم رکھ)

حسن نے آیت کی تفسیر اس طرح کی جس کی موت کا وقت آجاتا ہے اللہ اس کو لے جاتا ہے یعنی (اس کی زندگی کا نقش) مٹا دیتا ہے اور جس کی موت کا وقت نہیں آیا ہوتا اس کو قائم رکھتا ہے۔

سعید بن جبیر نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جو گناہ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے معاف نہیں کرتا۔

عکرمہ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ توبہ سے معاف کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں مثبت کر دیتا ہے، اس نے خود دوسری آیت میں فرمایا **أُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ**۔

مسلم نے حضرت ابو ذر کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بعض آدمیوں کی پیشی ہوگی تو حکم ہوگا اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہ رکھو، حسب الحکم صغیرہ گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے اور کبیرہ گناہ مخفی رکھے جائیں گے اور کہ جائے گا فلاں دن تو نے کیا کئے تھے وہ شخص اقرار کرنا چاہئے گا۔ انکار نہیں کرے گا مگر کبائر سے خوفزدہ رہے گا کبائر اس پر شدید رکھے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہر گناہ کی جگہ اس کو ایک نیکی دے گا۔ بندہ عرض کرے گا میرے گناہ تو اور بھی تھے جو میں یہاں نہیں دیکھتا۔ راوی کا بیان ہے یہ فرمانے کے وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنس دیئے کہ آپ کی کچلیاں بھی نمودار ہو گئیں۔ مؤلف نے کہا میں کہتا ہوں شاید یہ عمل ان لوگوں کے لئے ہوگا جو محبوبیت کے سمندر میں غرق ہیں صاف بدن عالی قدر صوفی ہیں۔

سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، یعنی چاندنی کو مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت کرتا ہے یعنی سورج یا دھوپ کو لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی کا اس آیت میں اظہار کیا ہے فرمایا ہے **فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً** ہم نے رات کی نشانی یعنی چاندنی مٹا دی اور ہم دن کی نشانی نظروں کے سامنے لے آئے۔

ربیع نے کہا اس آیت کے مطلب کا تعلق ارواح سے ہے، اللہ سونے کی حالت میں ارواح کو قبض کر لیتا ہے، اس کے بعد جس کو موت دینا چاہتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور جس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کی روح واپس لوٹا دیتا ہے اللہ نے خود فرمایا ہے **اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا** الخ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے جو اعمال ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں اللہ ان کو کر اماکاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور جو اعمال خالص اللہ کے لئے کئے

جاتے ہیں ان کو قائم رکھتا ہے۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ ایک قوم کو مٹاتا ہے اور دوسری قوم کو قائم رکھتا ہے۔

وَعِنْدَنَا أُمُّ الْكِتَابِ ③۹ اور اسی کے پاس اُمُّ الْكِتَابِ ہے۔ اُمُّ الْكِتَابِ، کتاب کی اصل جڑ اُمُّ الْكِتَابِ سے مراد

ہے ”اللہ کا علم“ حضرت ابن عباس نے جب حضرت کعب بن عجر سے اُمُّ الْكِتَابِ کا معنی دریافت کیا تو حضرت کعب نے فرمایا ”اللہ کا علم“ (یعنی اللہ کا علم) عکرمہ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں ایک کتاب تو وہ ہے جس میں مخلوق اثبات ہوتا ہے (کچھ برقرار رکھا جاتا ہے کچھ مٹا دیا جاتا ہے) دوسری اُمُّ الْكِتَابِ ہے اس کے مندرجات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

بغوی نے کہا اُمُّ الْكِتَابِ لوح محفوظ ہے جس کے مندرجات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ عطا نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ کی ایک لوح محفوظ ہے (تنی بڑی کم) بقدر پانسو برس کی راہ کے لاس کی لمبائی ہے یا سفید موتی کی بنی ہوئی ہے اس کے دونوں پتھے یا قوت کے ہیں اللہ روزانہ تین سو تیس بار اس کو ملاحظہ فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اس میں سے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ يَا هُمْ وَعَدَهُ پورا کرنے سے پہلے آپ کو وفات دے دیں اور آپ کی زندگی میں ان کو کامل شکست نہ ہو تو آپ اس کی فکر نہ کریں ان کی روگردانی کی پروا نہ کریں اور ان کے جلدی عذاب پانے کی خواہش نہ کریں۔

فَاتَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ ④۰ کیونکہ آپ کے ذمہ تو فقط پہنچا دینا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ آپ کر چکے۔

وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ④۱ اور ہمارے ذمہ حساب ہے اور قیامت کے دن ہمزادینا ہے جب ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کو سزا دے دیں گے۔ اُولَئِكَ يَدْرُونَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ④۲

کیا (مکہ کے کافروں نے) نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو ہر چہ طرف سے کم کرتے چلے آ رہے ہیں۔

بغوی نے اکثر اہل تفسیر کا قول بیان کیا ہے کہ ”زمین“ سے مراد ہے کافروں کی زمین اور ”کم کرنے“ سے مراد ہے مسلمانوں کا کافروں کی زمین کو فتح کرنا۔ کیونکہ مسلمانوں کے مقبوضات بڑھنے کا معنی ہی یہ ہے کہ کافروں کے مقبوضات میں کمی آئے۔ پورا مطلب اس طرح ہے کہ ہم نے جو ان کو وعید دی ہے کہ یہ بہت کچھ کفر کی حمایت میں صرف کریں گے لیکن وہ تمام مصارف ان کے لئے باعث حسرت بن جائیں گے آخر ان کو مغلوب ہونا پڑے گا کیا ان کو اس قول کی سچائی کا انکار ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمین کفر گھٹا رہے ہیں مسلمانوں کے مفتوحات بڑھا رہے ہیں کیا ان کی عبرت اندوزی کے لئے یہ مشاہدہ کافی نہیں ہے۔ آیت کی یہ تفسیر حضرت ابن عباس، قتادہ اور اکثر علماء نے کی ہے۔ آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین ہے تاکہ آپ فکر نہ کریں، رنجیدہ نہ ہوں اور یقین رکھیں کہ اللہ کا وعدہ فتح پورا ہو کر رہے گا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک ”زمین کی کمی“ سے مراد ہے ویرانی اور تباہی اس توجیہ پر مطلب کا خلاصہ اس طرح ہو گا کیا ان لوگوں کو اپنی بربادی اور اپنی بستیوں کی ویرانی کا اندیشہ نہیں، کیا ان کو نہیں نظر آتا کہ ہم ان کی آبادیوں کو اجاڑ رہے ہیں اور آبادیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ تفسیر مجاہد اور شعبی کی طرف منسوب ہے۔

وَاللَّهُ يَحْكُمُ ④۳ اور اللہ (اپنی مخلوق کے معاملات میں) جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

لَا مَعْقِبَ لِحُكْمِهِ ④۴ اس کے حکم کو پلٹنے والا کوئی نہیں۔ یعنی اس کی قضاء کو رد کرنے والا اور اس کے حکم کو توڑنے والا کوئی نہیں مَعْقِبَ کا معنی ہے کسی چیز کو پیچھے کی طرف پلٹ دینے والا اور موڑ کر بے کار کر دینے والا۔ مطلب یہ ہے

کہ اللہ نے اسلام کی ترقی اور کفر کی بربادی کا حکم دے دیا ہے ایسا ضرور ہو کر رہے گا اس کو بلٹنے والا کوئی نہیں۔
 وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۳۱﴾ اور وہ جلد محاسبہ کرنے والا ہے، یعنی دنیا میں قتل و قید اور جلا وطنی کی سزا دینے کے بعد
 قیامت کے دن ان سے حساب فہمی کرے گا۔
 وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
 انبیاء اور مؤمنوں سے جھل فریب کئے تھے جیسے ان لوگوں نے آپ سے فریب کیا ہے۔ ”مکر کا معنی ہے نامعلوم طریقوں سے کسی
 کو دکھ پہنچانا۔

پس اللہ ہی کے پاس ہے ان کا مکر یعنی ان کے مکر کی سزا۔ بعض علماء نے یہ مطلب
 فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا
 بیان کیا کہ اللہ ہی ان کے فریب کا خالق ہے، خیر و شر اسی کے قبضہ میں ہے نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے اس کی اجازت اور حکم
 کے بغیر کسی کا فریب کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لہذا ان کی فریب کاری بے سود ہے۔
 يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ
 جو شخص بھی جو کچھ کرتا ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور عمل کے مطابق بدلہ بھی دے
 گا، یہی اللہ کی مخفی تدبیر ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ نامعلوم طریقے سے دیتا ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابِ الدَّارِ ﴿۳۲﴾ اور کافروں کو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ دونوں گروہوں میں سے کس
 کے لئے آخرت میں اچھی جزا ہوگی جب کہ غفلت کی حالت میں کافر بتلائے عذاب ہوں گے اور مؤمن جنت میں داخل ہوں
 گے۔ یہ کلام گویا مکر اللہ کی تفسیر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا
 قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ
 اللہ کی شہادت کافی ہے۔
 وہ (کفار مکہ یا سرداران الیہود) کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔
 آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت پر

اللہ کی شہادت کافی ہے۔
 یعنی میری سچائی نبوت کے لئے اللہ کی شہادت کافی ہے۔ اس نے میری رسالت کی صداقت ایسے دلائل سے واضح کر
 دی ہے کہ ان کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں۔ اور وہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اس روز ان منکروں کے پاس کوئی
 عذر نہ ہوگا۔

وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿۳۳﴾
 اور ان لوگوں کی شہادت کافی ہے جن کے پاس اللہ کی کتابوں کا علم
 ہے۔ یعنی ایمان رکھنے والے اہل کتاب کی شہادت کافی ہے، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام وغیرہ۔ رہا کافروں کا انکار تو اس کی بناء
 محض حسد، عناد اور مال و جاہ کی طلب پر ہے۔ حرص و ہوا اور حسد ان کو اقرار کرنے سے روک رہے ہیں۔ اس تفسیر کی بناء پر بعض
 علماء نے کہا کہ پوری سورت اگرچہ مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہے۔

شعبی اور ابو بشر نے آیت کی مندرجہ بالا تفسیر کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور
 حضرت عبد اللہ بن سلام تو مدنی تھے ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان کے حق میں آیت کا نزول نہیں ہو سکتا۔
 میں کہتا ہوں آیت کو اگر ہم مکی ہی قرار دیں تب بھی آیت میں اہل کتاب مراد ہونا ممکن نہیں ہے گویا اللہ نے کفار مکہ
 سے فرمایا کہ اگر تم کو محمدؐ کی رسالت کا یقین نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کر لو۔ معتبر اہل کتاب تصدیق کریں گے اور محمدؐ کی
 نبوت کی شہادت دیں گے۔

حسن اور مجاہد نے کہا اللہ سے مراد لوح محفوظ ہے اور مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ سے مراد اللہ ہے دونوں جملوں کا لولا
 کہ یہ مطلب ہوگا کہ اس کی شہادت کافی ہے جو محقق الوہیت ہے اور لوح محفوظ کی تحریر کا حکم اس کے سوا کسی کو نہیں، پس وہی
 جھوٹے کو سزا دے گا تم ہو یا میں، ہم دونوں میں سے کوئی ہو۔ حسن اور سعید بن جبیر کی قرأت میں مَنْ عِنْدَهُ بَكْسَرٍ مِيمٌ آیا ہے اس
 قرأت سے بھی حسن و مجاہد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ الحمد للہ سورہ الرعد کی تفسیر اور اس کے ترجمے کی تصحیح ختم ہوئی (از مصحح)

﴿.....سورۃ ابراہیم.....﴾

یہ سورت مکی ہے اس میں باؤن آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الْاٰلَافِ كِتٰبٍ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ (یہ سورۃ یا قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری

ہے۔ لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط
تاکہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایات کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایات کی طرف لوگوں کو بلائیں اور نفع و نقصان میں امتیاز پیدا کرنے والے امور کی تعلیم دیں۔

”تاریکیوں“ سے مراد ہیں طرح طرح کی گمراہیاں اور ”نور“ سے مراد ہے ہدایت۔ اذن سے مراد ہے توفیق اور اسبابِ سہولت فراہم کر دینا۔ دربانِ داخلہ کی اجازت دیتا ہے یعنی اندر داخل ہونے میں سہولت دے دیتا ہے (رکاوٹ دور کر دیتا ہے) اِلَى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ①
(نور کی طرف نکال کر لائیں یعنی) اس خدا کے راستے کی طرف لائیں جو

غالب اور مستحق ستائش ہے اس کے سوا کوئی بھی قابلِ تعریف نہیں۔
اللہ کے یہ دونوں اوصاف ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ غالب و محمود اللہ کی راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا اور نامراد نہیں رہتا۔

اللّٰهُ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط
اس اللہ کا راستہ جس کی (مخلوق اور مملوک) ہر وہ چیز ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اور بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں
وَوَيْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ②
کے لئے۔

وَيْلٌ کا معنی ہے نزولِ شر (اس سے مراد ہے پوری خرابی) بیضاوی نے لکھا ہے وَّیْلٌ کا معنی وال کے معنی کی ضد ہے وَاَل کا معنی ہے نجات (پس ویل کا معنی ہو اہلاکت) ہلاک کی طرح وَّیْلٌ مصدر ہے مگر اس سے کوئی صیغہ مشتق نہیں ہوتا بیضاوی کے تحقیقی ترجمہ کی بنا پر یہ کلمہ وعید قرار پائے گا کافروں سے مراد ہیں وہ منکرین کتاب جو تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں نہیں آئے۔

الذّٰیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیْوَۃَ الدُّنْیَا عَلٰی الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنِ سَبِیْلِ اللّٰهِ
جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ استخباب پسند کرنا اختیار کرنا کسی چیز کو اپنا محبوب

قراردے لینا۔ دنیوی زندگی سے مراد ہے دنیا کی لذتیں۔ اللہ کے راستے پر چلنے سے روکنے کا مطلب ہے اللہ کے پیغمبر کے اتباع سے روکنا۔

وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا اور اللہ کے راستے میں کجی ڈھونڈتے ہیں یعنی عیب چینی اور۔۔۔ خوردہ گیری کے لئے دین میں کجی ڈھونڈتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ حق سے مڑ کر اپنا رخ موڑ کر اللہ کی راہ کے طلب گار ہوتے ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں (کہ حق سے منہ موڑ کر اللہ کا راستہ مل جائے) ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ راہِ خدا سے منہ موڑ کر دنیا کے طلب گار ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ حرام مال چاہتے ہیں۔

اُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۝۳ ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں یعنی ایسی گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔ حق سے دور ہونا حقیقت میں گمراہ کا وصف ہے لیکن بطورِ مبالغہ کے گمراہی کی صفت قرار دے دیا گیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ اور ہم نے ہر پیغمبر کو اسی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا۔ قَوْمِهِ سے مراد ہے وہ قوم جس میں پیغمبر پیدا ہوا اور مبعوث ہوا۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ ”لسانِ قوم“ سے مراد ہے قوم کی بولی اگر قوم عربی ہوئی تو پیغمبر کی زبان بھی عربی ہوئی اور عربی میں ہی اس کو پیام دے کر بھیجا گیا اور اگر قوم کی زبان گجھی ہوئی تو پیغمبر کو بھی گجھی زبان میں پیام دے کر بھیجا گیا۔ اسی طرح سریانی کو سریانی زبان میں (اور ہندی کو ہندی زبان میں، مترجم) پیام دیا گیا۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمْ تاکہ (پیغمبر کی امت کو جو احکام دیئے گئے تھے) وہ قوم کے سامنے کھول کر بیان کر دے اور قوم والے آسانی کے ساتھ ان کو سمجھ لیں اور پیغمبر کو قوم کے خلاف تبلیغ کی ایک مضبوط دلیل مل جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی اصلاح کے لئے (خصوصیت کے ساتھ) بھیجا گیا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا مگر اول اپنی قوم کو تبلیغ کرنے کے لئے آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ دوسری آیت ہے لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا تیسری آیت ہے لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَنْذَرِ آبَاءَهُمْ (اول آیت میں صرف اقربا کو تبلیغ کرنے کا حکم ہے۔ دوسری آیت میں اہل مکہ اور دوسرے آقاؤں کو اور تیسری آیت میں تمام عرب کو۔ مترجم) لے لے اہل حجاز کے لئے (اول اور بلا واسطہ) اور پھر بلا واسطہ تمام انسانوں کے لئے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور واضح عربی زبان میں پیام نازل فرمایا گیا پس اہل حجاز نے اللہ کا کلام اور پیام رسول اللہ ﷺ سے سیکھا پھر اس کو منتقل کیا اور دوسرے لوگوں نے (اپنی زبانوں میں) اس کے ترجمے کئے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔ رواہ احمد و مسلم فی الصحیح عن جابر۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارِ قریش چونکہ سب سے پہلے منکرِ نبوت ہوئے۔ اس لئے دوسرے کافرِ نبوت کفارِ قریش کے تابع ہوئے اور کفارِ قریش سب کے امام۔ اسی طرح جو قریش ایمان لے آئے اور دوسروں سے پہلے ایمان لائے اور دوسرے لوگ ان کے بعد مؤمن ہوئے اس لئے ایمان لانے والے قریشی امام اور دوسرے مؤمن ان کے تابع ہوئے پس خیر و شر دونوں میں قریش امام اور باقی لوگ ان کے پیرو قرار پائے۔

حضرت جریر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کو اس طریقے پر چلنے کا اور قائم کرنے کا ثواب بھی ملے گا اور اس طریقے پر جتنے لوگ چلیں گے ان کے ثواب کے برابر بھی اجر ملے گا (بعد کو) اس طریقے پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی (ایسا نہ ہو گا کہ ان کا ثواب گھٹا کر طریقہ حسنہ قائم کرنے والے کا ثواب بڑھا دیا جائے) اور جس نے اسلام میں کوئی طریقہ بُرا جاری کیا اس پر اس طریقے کو (اختیار کرنے) کا گناہ بھی ہو گا اور (آئندہ) جو لوگ اس طریقے پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی ہو گا مگر اس سے برے طریقے پر چلنے والوں کے گناہ (اور سزا) میں کوئی کمی نہیں ہو جائے گی۔ رواہ مسلم۔

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مدینے

والو، لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں۔ مدینے والوں سے مراد ہیں انصار اور مہاجر، دوسرے لوگ مہاجرین و انصار کے تابع ہیں مگر انصار، دین (خلافت) میں مہاجرین کے تابع ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

حضرت ابورافع کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے لئے شیخ (سب کا بزرگ) ایسا ہے جیسے امت کے لئے پیغمبر۔ رواہ ابن النجار و الجلیلی فی مشیختہ، حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر میں شیخ ایسا ہے جیسے اپنی قوم (امت) میں پیغمبر۔ رواہ ابن حبان فی الضعفاء۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں رواہ احمد و الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ و الدارمی عن کثیر بن قیس۔ ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر بتلایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور لوگ تمہارے تابع ہیں لوگ تمہارے پاس اطراف سے دین سیکھنے آتے ہیں تم ان سے اچھا سلوک کرو، بھلائی کی ان کو نصیحت کرو، رواہ الترمذی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث الشیخ فی بیتہ کا نبی فی قومہ میں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے (اور انہی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کتابیں عربی میں اتاری گئی تھیں پھر حضرت جبرئیل نے ان کا ترجمہ مختلف (انبیاء کی) زبانوں میں کیا۔ ابن مردویہ نے بوساطتِ کلبی حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جبرئیل کو عربی زبان میں وحی کی جانی تھی پھر جبرئیل ہر نبی کے پاس ان کی قوم کی زبان میں وحی لے کر آتے تھے۔

ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے کہ (پیغمبروں پر) وحی تو صرف عربی میں نازل کی گئی پھر ہر نبی نے وحی کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کر دیا۔ سفیان ثوری نے یہ بھی کہا قیامت کے دن سریانی زبان ہوگی اور جنت میں جو لوگ جائیں گے وہ عربی میں کلام کریں گے۔

(حضرت مفسر نے کہا) میں کہتا ہوں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع کرنا بعید از فہم ہے آیت لِسَانِ قَوْمِهِ کی صراحت اس کے خلاف ہے۔

پس اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی ایمان کی توفیق نہیں دیتا۔
اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے یعنی ایمان کی توفیق دے دیتا ہے اور حق کا یقین اسکے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ اور وہی غالب ہے اس کی مشیت پر کوئی غالب نہیں جس کو وہ ہدایت کر دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا۔
وہی حکیم والا ہے۔ اپنی مصلحت کے تحت ہدایت یاب یا گمراہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ ارسلنا موسى بايذنا
ان اخذج قومك من الظلمت الى النور و ذكرهم بايذنا الله
اور ہم نے اپنی (نو) نشانیاں دے کر موسیٰ کو بھیجا۔
(ہم نے یہ پیام دے کر بھیجا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ اور اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرو۔

ایام اللہ سے حضرت ابن عباس، حضرت ابی بن کعب، مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور مقاتل کے نزدیک وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں (عاد، ثمود، قوم نوح) کو پیش آئے۔ محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام العرب کا عالم ہے یعنی عرب کی لڑائیوں سے واقف ہے اس تقریر پر کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اپنی قوم کو وہ واقعات بتاؤ جو اللہ نے گزشتہ ایام میں ظاہر کئے خواہ وہ بصورتِ نعمت ہوئے ہوں یا بشکلِ مصیبت۔

ان فی ذلک لآیت
بلاشبہ ان واقعات میں (اللہ کی ہستی اس کی قدرت و حکمت اور توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں
ہر ایسے آدمی کے لئے جو (مصیبت اور طاعت اور گناہ سے اجتناب پر) بہت صبر کرنے والا۔
لکل صبار

شکوٰۃ ⑤ (اور نعمتوں پر) بڑا شکر ادا کرنے والا ہو۔ مراد یہ ہے کہ ہر مؤمن کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں صبر اور شکر کے الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر مؤمن کے اندر صبر و شکر کی صفت ہونی لازم ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم نے باسناد ابو ظبیان حسب روایت علقمہ حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان۔ یہ قول علاء بن بدر کے سامنے ذکر کیا گیا تو علاء نے کہا یہ قرآن میں نہیں ہے کیا اللہ نے نہیں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَا اٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبّٰرٍ شٰكُوْرٍ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَا اٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی ایک آیت میں اللہ نے صبر اور شکر کے لئے اور دوسری آیت میں مؤمنین کے لئے اس کو آیاتِ توحید ذاتی و صفاتی قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صابر و شاکر سے مراد مؤمن ہی ہے۔)

بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ایمان دو حصوں کا مجموعہ ہے ان کا آدھا حصہ صبر میں اور آدھا حصہ شکر میں ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں اور ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے کہ ایمان صبر و ساحت (ایشار) کا نام ہے۔

مسلم اور امام احمد نے حضرت صہیبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے، مؤمن کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں، اگر اس کو سکھ پہنچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔

بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ مؤمن کی عجیب حالت ہے اگر اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ امیدِ ثواب رکھتا اور صبر کرتا ہے اور اس کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی حمد اور شکر کرتا ہے مؤمن کو ہر بات میں ثواب دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر وہ اپنے منہ میں رکھتا ہے (اس کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے) حضرت ابو درداءؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ نے فرمایا عیسیٰؑ میں تیرے بعد ایک ایسی امت پیدا کروں گا کہ جب ان کو کوئی مرغوبِ خاطر چیز حاصل ہوگی تو وہ اللہ کی حمد کریں گے اور اگر کوئی ناگوار بات ان کو پیش آئے گی تو وہ ثواب کی امید رکھیں گے اور صبر کریں گے حالانکہ (ان میں) نہ برداشت ہوگی نہ سمجھ۔ حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ بات ان کو کیسے حاصل ہوگی جب کہ ان کو نہ برداشت حاصل ہوگی نہ عقل فرمایا میں ان کو اپنی دانش اور علم سے عطا کروں گا۔ رواہ بیہقی فی شعب الایمان۔

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجَاكُمْ مِّنْ اِلٍ فِرْعَوْنَ يَسُومُوْنَكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ
وَ يَذَّبِحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہوئی جب کہ اللہ نے تم کو فرعون والوں سے نجات دی وہ تم کو بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ ”نعمت“ سے مراد انعام (بمعنی مصدری) نہیں ہے بلکہ عطیہ الہی مراد ہے ”عذاب“ سے مراد قتل اولاد نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو غلام بنانا اور سخت ترین کام لینا مراد ہے کیونکہ وَ يَذَّبِحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ کا عطف يَسُومُوْنَ پر ہے اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے (معطوف، معطوف علیہ سے غیر ہوتا ہے) ہاں سورہ بقرہ اور سورہ اعراف میں عذاب سے مراد ذبح کرنا ہی ہے۔

اور تمہاری ان تمام باتوں میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

وَ اِذْ تَاَذَنَ رَبُّكُمْ لَبِئْسَ كٰفِرِيْنَ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ⑥

اور جب تمہارے رب نے اطلاع دے دی تھی کہ اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور ناشکری کرو گے تو (سمجھ لو) میرا عذاب یقیناً سخت ہے یہ بھی حضرت موسیٰؑ کے کلام کا ایک حصہ ہے تَاَذَنَ کا معنی ہے اطلاع دے دی، بتا دیا

اور شکر تم و فکر تم کا خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ شکر نعمت سے مراد ہے ایمان لانا اور اپنے پیغمبر کے حکم پر چلنا۔ شکر زیادتی نعمت کا موجب ہے موجود نعمت کو برقرار رکھتا ہے اور غیر موجود کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو جاتا ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو شکر دیا گیا (شکر کرنے کی توفیق دی گئی) وہ زیادتی سے محروم نہ رہے گا۔ رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ۔ بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر تم اطاعت (کی شکل میں شکر ادا) کرو گے تو میں تمہارے ثواب میں زیادتی کروں گا۔

إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ سے مراد یہ ہے کہ میں تم کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اپنی نعمت تم سے چھین لوں گا اور آخرت میں عذاب دوں گا کیونکہ میرا عذاب سخت ہے۔

آیت میں وعدہ زیادتی کی تو صراحت ہے اور وعید عذاب کی طرف اشارہ ہے اس سے تشبیہ مقصود ہے اس امر پر کہ زیادتی نعمت تو شکر کی حالت میں لازم ہے اس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور ناشکری پر عذاب کی وعید کو پورا کرنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے معاف فرمادے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرًا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ①

اور موسیٰ نے کہا (اے بنی اسرائیل) اگر تم اور تمام زمین کے باشندے اللہ کی ناشکری کریں تو اللہ (تم سب کے شکر سے) بے نیاز ہے فی نفسہ وہ مستحق حمد اور محمود ہے اس کی حمد ابدی ازلی ہے خود اس کی ذات سے پیدا ہو رہی ہے فرشتے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد میں مشغول ہے پورا کلام اس طرح تھا اگر تم ناشکری کرو گے تو اپنے آپ کو خود نقصان پہنچاؤ گے اپنی ذات کو مستحق عذاب اور ثواب سے محروم بناؤ گے اللہ بے نیاز اور مستحق حمد ہے۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۗ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۗ

کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی (تباہی) کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے، جیسے ابراہیم اور لوط، کی قومیں اور اصحاب الرس اور مدین والے اور ایکہ والے اور نوح کی قوم۔ یہ بھی حضرت موسیٰ کے کلام کا جزو ہے اس صورت میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے یا اللہ کا کلام ہے اس صورت میں امت محمدیہ کو خطاب ہوگا۔

جن (کی گنتی شمار) کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت تلاوت کی پھر فرمایا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان تیس قرن ہوئے ہیں۔ جن سے سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں۔ امام مالک بن انسؒ کو یہ امر پسندیدہ نہ تھا (یعنی جائز نہ سمجھتے تھے) کہ کوئی شخص مسلسل اپنے اسلاف کا سلسلہ پشت در پشت حضرت آدمؑ سے جوڑتا چلا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق بھی امام موصوف کی یہی رائے تھی۔

جاء نوح رسالہم بالبینت
تعب یا استہزاء سے)

تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دے لئے۔

فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ

حضرت ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا انہوں نے غصہ سے اپنے ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹے۔ اسی طرح دوسری روایت میں آیا ہے عَصُّوا عَلَيْكُمْ إِلَّا نَائِلَ مِنَ الْغَيْظِ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب انہوں نے اللہ کی کتاب سنی تو تعجب کیا اور تعجب یا استہزاء سے اپنے ہاتھ منہ میں دے لئے جیسے ہنسی سے مغلوب ہو کر کبھی آدمی منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے کلبی نے کہا انہوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر پیغمبروں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اشارہ کر کے بتایا کہ منہ بند رکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ مقاتل نے کہا انہوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ پر ان کو خاموش کرنے کے لئے رکھ دیئے۔ (اس صورت میں

افواہم کی ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہوگی) بعض علماء کے نزدیک ایدئی کا معنی ہے ایدئی "نعمتیں" یعنی پیغمبروں کی نصیحتیں اور احکام شریعت و وحی۔ یعنی انہوں نے پیغمبروں کے احکام اور شریعت کو پیغمبروں کے منہ پر لوٹا کر دے مارا اور انکار کیا مجاہد و قتادہ نے یہی مطلب بیان کیا محاورہ میں بولا جاتا ہے میں نے اس کی بات اس کے منہ میں لوٹا دی (یعنی اس کے منہ پر) اس کی تکذیب کر دی۔ بعض نے کہانی افواہم کا معنی ہے بافواہم یعنی اپنی زبانوں سے انہوں نے احکام انبیاء کا انکار کیا اور پیغمبروں کی نصیحتوں کو لوٹا دیا۔

وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ
اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے ہم (تمہارے دعوے کی صحت و حقانیت کے) منکر ہیں۔

وَأِنَّا لَفِي شَكِّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ① قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ
اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلا تے ہو ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو ہم کو تردد میں ڈالے ہوئے ہے ان کے پیغمبروں نے کہا کیا تم کو اللہ کے بارے میں شک ہے۔ استفہام انکاری ہے یعنی ہم تو تم کو اللہ کی توحید کی طرف بلارہے ہیں اور اللہ کی توحید قابل شک نہیں ہے تمام محسوسات اور ذہنی موجودات اللہ کی توحید کو پکار پکار کر ظاہر کر رہی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط
جو آسمانوں کو اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ یہ فقرہ اللہ کی صفت یا لفظ اللہ سے بدل ہے۔

يَدُّعُوْكُمْ
وہ تم کو (اپنی طرف ہم کو بھیج کر) بلارہا ہے تم کو دعوت دے رہا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔
لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
تاکہ تمہارے گناہ معاف کر دے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو مغفرت کی طرف بلارہا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِّنْ زَائِدٌ ہے مطلب یہ کہ تمہارے سب گناہ معاف کرنے کی طرف تم کو بلارہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اسلام ڈھا دیتا ہے اس (گناہ) کو جو مسلمان ہونے سے پہلے کا ہو۔ رواہ مسلم فی حدیث عمرو بن العاص۔ بعض کے نزدیک مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِّنْ تَبْعِيْضِيَّةٌ ہے۔ کیونکہ اسلام سے وہ گناہ معاف ہوتے ہیں جو براہ راست اللہ کے حقوق سے متعلق ہوں انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں کافروں کو خطاب ہے وہاں مِّنْ ضرور آیا ہے اور جہاں مؤمنوں کو خطاب ہے وہاں مِّنْ نہیں ہے اس تفریق کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کافروں کے خطاب میں جو مغفرت کا اظہار کیا گیا ہے وہ شرط ایمان پر مبنی ہے اور مسلمانوں کے خطاب میں جو مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا جوڑ طاعت اور اجتناب عن البعصیۃ کے ساتھ ہے پس ادائے طاعت اور گناہ سے اجتناب کے ذیل میں حقوق انسانی کی ادائیگی اور معاملات باہمی میں حق تلفی سے اجتناب بھی داخل ہے اس لئے خطاب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو شامل ہے۔

وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسْتَقَرٍّ ط
اور تم کو ایک معین وقت تک چھوڑے رکھے اجل مستقی یعنی وہ وقت جو اللہ نے زندگی کا مقرر کر دیا ہے۔ اس معین وقت تک اللہ تم کو چھوڑے رکھے گا عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا۔
اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن سابق قوموں کو کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ان کی ہلاکت کفر پر اصرار رکھنے کے ساتھ مشروط تھی اور یہ قضاء ہلاکت معلق تھی اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی عمریں طویل ہو جاتیں (اور انتہائے عمر سے پہلے ہلاک نہ ہوتے)

قَالُوا إِنَّا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ط
کافروں نے (پیغمبروں سے) کہا تم تو بس ہماری طرح آدمی ہو۔ یعنی تمہاری حقیقت اور صورت انسانوں جیسی ہے تم کو ہم پر کوئی (خلقی) برتری حاصل نہیں ہے پھر خصوصیت کے ساتھ تمہارے پیغمبر ہونے کی کوئی وجہ نہیں اگر انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ کو کوئی نبی اور رسول بھیجتا ہی تھا تو اس نوع میں سے بھیجتا جو نوع انسان سے افضل ہوتی۔ دوسری آیت میں کافروں کا اسی مضمون کا قول نقل کیا ہے فرمایا ہے لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلْنَا مَلَائِكَةً ط۔

ثَرِيدًا وَاَنْ تَصَدَّقُوا عَلٰى مَا كَانَتْ اَبَاؤُنَا فَاَتُونَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ⑩

(اس دعوت سے) تمہارا مقصد یہ ہے کہ جن معبودوں کی ہمارے اسلاف پر ستش کرتے تھے ان کی پرستش سے ہم کو روک دو (اگر یہی بات ہے) تو کوئی کھلی ہوئی دلیل پیش کرو۔ جس سے تمہاری فضیلت اور عزت نبوت کا استحقاق ثابت ہو یا مراد یہ ہے کہ ایسی واضح حجت پیش کرو جس سے تمہارا دعوائے نبوت ثابت ہو سکے۔ کافروں نے واضح معجزات کو نہیں مانا اور محض عناد اور ضد کے زیر اثر مزید واضح دلائل کی طلب کی۔

قَالَتْ لَهُمْ سُرُسُلُهُمْ اِنْ نَحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۙ

کافروں سے ان کے پیغمبروں نے کہا بے شک ہم تمہاری ہی طرح آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے۔ یعنی نبوت اور دوسری نعمتیں عنایت کرتا ہے انبیاء نے عام نوع بشری سے اپنا اشتراک تسلیم کرتے ہوئے اختصاص نبوت کو اللہ کا فضل و انعام بیان کیا۔

وَمَا كَانْ لَنَا اَنْ نَّتٰنِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ
اور ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اللہ کی مشیت کے بغیر ہم تمہارے سامنے کوئی دلیل لاسکیں۔ یعنی اپنے اختیار اور قابو سے معجزات پیش کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم تمہاری درخواست پوری کریں اس کا مدار تو اللہ کی مشیت پر ہے وہی ہر نبی کو ایسے اور اتنے معجزات عطا فرماتا ہے جن سے نبوت کا ثبوت ہو جائے۔

وَعَلٰى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪

اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کلام سے انبیاء نے دوسرے ساتھی ایمانداروں کو ہدایت کر دی کہ کافروں کے مقابلے میں تم کو اللہ پر اعتماد کرنا چاہئے اور اپنے توکل علی اللہ کا بھی اظہار کر دیا۔ آیت سے درپردہ وہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا تقاضاء ایمان ہے کیونکہ مؤمن کا جب یہ پختہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ خیر و شر کو پیدا کرنے والا اور نفع و ضرر پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو لازمی طور پر وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

وَمَا لَنَا اِلَّا اَنْتَ وَكَلَّ عَلٰى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ۗ

اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ رکھیں جب کہ اسی نے ہم کو ہماری راہیں دکھادی ہیں جن کی وجہ سے ہم جانتے اور پہنچتے ہیں کہ تمام امور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہیں۔

وَلَنْصَبِرَنَّ عَلٰى مَا اٰذَيْتُمُوْنَا ۗ

اور ہم (اور ہمارے مؤمن ساتھی) ضرور تمہاری طرف سے ایذا رسانیوں پر صبر کریں گے یہ محذوف قسم کا جواب ہے پہلے انبیاء نے اللہ پر توکل کرنے اور کافروں کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا اور اس کلام سے اس کو پختہ کر دیا۔

وَعَلٰى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ⑫

اور اہل توکل کو اللہ ہی پر توکل کرنا لازم ہے یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ ہی پر توکل کریں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَا اَوْ لَنَعُوْدَنَّ فِيْ مِلْكِنَا ۗ

کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا ہم تم کو اپنی زمین (بستی، شہر و نیرہ) سے ضرور نکال باہر کر دیں گے یا تم کو ہمارے مذہب میں ضرور لوٹ کر آنا ہو گا۔ یعنی اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارے مذہب میں آنا ہو گا۔ لوٹ کر آنے سے مراد ہے اپنا مذہب چھوڑ کر کافروں کے دین میں آنا کیونکہ پیغمبر کبھی کافروں کے مذہب پر پہلے بھی نہ تھے اس لئے لوٹنے سے مراد دوبارہ کفر اختیار کرنا نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب تمام مؤمن ہوں، پیغمبر بھی اور ان پر ایمان لانے والے رفقاء بھی۔ جماعت کو بطور تغلیب خطاب کیا گیا (پیغمبروں پر ایمان لانے والے پہلے کفر پر تھے، کر چھوڑ کر ایمان لائے تھے اور پیغمبر کبھی کافر نہ تھے اس لئے خطاب تو پیغمبروں کو کیا مگر روئے خطاب دوسرے مؤمنوں کی طرف ہے کہ تم کو دوبارہ اپنے اصلی مذہب کی طرف لوٹنا لازم ہے ورنہ ہم

تم کو نکال دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ اذکا معنی الا ان (ورنہ) یا الی ان (یہاں تک) ہو اس وقت دھمکی کا تعلق صرف اخراج سے ہو گا مطلب اس طرح ہو گا کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ، یا یہاں تک کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔

فَاَوْحَىٰ اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنْهَضِكُمْ الظَّالِمِينَ ﴿۱۳﴾
پس پیغمبروں کے رب نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔ یعنی ہم نے وحی بھیجی اور کہہ دیا۔

وَلَنْسُكِنَنَّكُمْ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ
اور (کافروں کے گھروں اور) ان کی زمین میں ان کے بعد تم کو (یعنی پیغمبروں کو اور مؤمنوں کو) ضرور بسائیں گے۔ ان کے بعد سے مراد ان کو ہلاک کرنے کے بعد۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدًا ﴿۱۴﴾
(میری) یہ (رحمت و عنایت) اس شخص کے لئے ہو گی جو (قیامت کے دن) میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھتا ہو اور میرے عذاب کی وعید سے (یا میرے موعود عذاب سے جو کافروں کے لئے مقرر ہے) خوف کرتا ہے۔

مَقَامِي سے مراد ہے اللہ کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہونا لفظ مقام کا اسی معنی میں استعمال آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ میں بھی ہوا ہے۔ یا مقام سے مراد ہے قیامت یعنی اعمال کی نگہداشت۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو اعمال کو محفوظ رکھتا ہوں اور ہر عمل میری نگہداشت میں ہے مؤمن اس سے ڈرتا ہے (اور حفظِ اعمال پر یقین رکھتا ہے) بعض علماء نے کہا مقام کا لفظ زائد ہے یعنی جو شخص مجھ سے ڈرتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوا
اور انہوں نے (یعنی انبیاء نے اللہ سے دشمنوں پر) فتح پانے کی دعا کی یہی مضمون آیت رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ میں بھی آیا ہے اِسْتَفْتَحُوا کا عطف اَوْحَى پر ہے اور ضمیر انبیاء کی طرف لوٹ رہی ہے (اسی کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے) ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی جاتم نے یہی قول نقل کیا ہے اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے یعنی جب انبیاء قوم کے ایمان لانے سے ماپوس ہو گئے تو انہوں نے فتح پانے اور کافروں پر عذاب نازل ہونے کی دعا کی۔ حضرت نوح نے کہا رَبِّ لَا تَذَرُ عَلَيَّ الْاَرْضَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دِيَارًا اور حضرت موسیٰ نے کہا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَيَّ اَمْوَالِهِمْ حضرت ابن عباس اور مقاتل کا قول ہے کہ استفتحوں کی ضمیر کافروں کی طرف لوٹ رہی ہے کافروں کا اسی مضمون کا قول دوسری آیت میں بھی آیا ہے کافروں نے کہا تھَا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ اَللّٰهُ اَكْرَمُ مِنْ هٰذَا اِنْ هِيَ اِلَّا سِحْرٌ مِّنْ سِحْرِ الْكٰفِرِيْنَ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے۔ بعض اہل تفسیر نے کہا اِسْتَفْتَحُوا کی ضمیر دونوں فریقوں کی طرف راجع ہے اہل حق اور اہل باطل دونوں نے دعا کی کہ سچے کو فتح دی جائے اور باطل پرست کو تباہ کر دیا جائے کُلُّ حِزْبٍ لِّمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر فریق اپنے مسلک پر مگن تھا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدًا ﴿۱۵﴾
اور ہر ظالم سرکش ناکام ہو گیا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے یعنی مؤمن

کا میاب ہوئے اور نامراد و تباہ ہو گیا ہر سرکش مغرور۔ صاحب قاموس نے جبّار کا ترجمہ سرکش اور عنید کا ترجمہ مغرور سے کیا ہے۔ جبّار کا معنی ہے تکبر یعنی بڑا ہونا (خواہ برحق ہو یا ناحق) اللہ جبّار ہے یعنی برحق اس کے اندر کبریائی ہے اور ہر سرکش بھی جبّار ہے۔ یعنی اس کی بزرگی کا دعویٰ تو ہے مگر غلط اور ناحق یا جبّار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں رحم کا گزر بھی نہ ہو اور ناحق خون ریزی کرتا ہے یا جبّار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو انتہائی غرور کی وجہ سے کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہ سمجھے (اور ہر ذمہ داری سے اپنی ذات کو بالا قرار دے) بغوی نے لکھا ہے کہ جبّار اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے اعلیٰ اور بالا کسی کو نہ سمجھے جبریتہ (مصدر ہے) انتہائی بزرگی کی طلب کہ اس سے اونچی کوئی چیز نہ ہو اسی معنی کی وجہ سے اس صفت کا استحقاق صرف حق تعالیٰ کو ہے اس کے سوا جو بھی اس صفت کا دعویٰ کرے گا وہ مستحق لعنت و ہلاکت اور نامراد ہو گا۔ بعض علماء نے کہا جبّار اس کو کہتے ہیں جو مخلوق کو اپنے حکم پر چلنے کے لئے مجبور کرے۔ اور عنید کا معنی ہے حق سے عناد رکھنے والا اور سچائی سے بیزار ہونے والا۔

قاموس میں ہے عَنَدَ دانتہ حق کی مخالفت کی۔ عَنید و عاند حق کی دانتہ مخالفت کرنے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے عنید کا ترجمہ کیا حق سے روگردانی کرنے والا مقاتل نے کہا عنید متکبر کو کہتے ہیں قنادہ نے کہا عنید وہ شخص ہے جو لا الہ الا اللہ کا انکار کرے۔

قَمِنْ وَرَأِيهِ جَهَنَّمُ
اس کے پیچھے یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جہنم ہے۔ مقاتل نے یہی ترجمہ کیا ہے یا یہ مراد ہے کہ اس کے سامنے جہنم ہے دنیا میں گویا وہ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوا ہے۔ جہنم، اس کی گھات میں ہے آخرت میں اس کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا ابو عبیدہ نے کہا وراء کا ترجمہ ہے آڑ۔ یہ لفظ اُضد او میں سے ہے آگے اور پیچھے دونوں اس کے معنی ہیں۔

وَلْيَسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ۝۱۶
اور اس کو پانی یعنی کچھ لہو پلایا جائے گا صدید وہ پانی جو دوزخیوں کے جوف اور کھالوں سے بے گا اور پیپ و خون اس میں آمیختہ ہو گا۔ محمد بن کعب نے کہا جو پانی زنا کاروں کے اعضاء نہانی سے بے گا وہ کافروں کو پلایا جائے گا۔ بر قول بیہقی مجاہد نے صدید کا ترجمہ کیا پیپ و خون (کچھ لہو)۔

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بیہقی، بغوی نے اور ابن ابی الدنیا نے صفتہ النار میں اور حاکم نے اپنی صحیح اسناد سے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا، صدید کو دوزخی کے قریب لایا جائے گا تو اس کو برداشت نہ ہوگی اور زیادہ قریب لایا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا اس کے سر کی کھال گر پڑے گی جب اس کو پئے گا تو انتر یوں کا ٹکڑے دُبر سے نکل جائے گا پس اللہ فرمائے گا وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَ هُمْ وَإِنْ يُسْتَخِيئُوا يَغَابُوا بِيَمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهُ۔

تَجْبَعُهُ
وہ گھونٹ گھونٹ کر کے اس کو پئے گا یعنی تکلف کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پئے گا (بدبو، بد مزگی اور ناگواری کی وجہ سے پینے کے طریقے سے نہ پی سکے گا)

وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ
اور آسانی کے ساتھ ان کو نگل نہ سکے گا۔ بلکہ وہ صدید اس کے حلق کا پھندا بن جائے گا آسانی سے اندر نہ اترے گا اور یونہی کافر طول عذاب میں مبتلا رہے گا۔ سَوَّغ (مصدر) کا معنی ہے آسانی کے ساتھ کسی پینے کی چیز کا حلق سے اتر جانا اور طبیعت کا اس کو (خوش گواری کے ساتھ) قبول کر لینا۔ قاموس میں ہے سَاعَ الشَّرَابِ سَوَّغًا آسانی کے ساتھ پینے کی چیز کو حلق میں اتار لیا۔

وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
اور موت (یعنی تکلیفیں اور قسم قسم کے عذاب) ہر طرف سے اس پر آئیں گے یعنی ہر طرف سے اس کو طرح طرح کا عذاب گھیر لے گا۔ یا الموت سے مراد موت کی سختیاں اور شدائد ہیں اور کل مکان سے مراد ہے جسم کا ہر حصہ یعنی ہر حصہ جسم سے اس پر موت کی سختیاں آئیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم تمیمی کا قول نقل کیا ہے کہ ہر (بن) مو سے اس پر موت (کی شدت) آئے گی۔

وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ
اور وہ مردہ نہ ہو گا کہ تکلیف سے چھوٹ جائے۔ ابن جریر نے کہا سانس گلے میں اٹکی رہے گی نہ منہ سے باہر نکلے گی نہ اندر ہی اترے گی۔ ابن المنذر نے فضیل بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سانس کا (گلے میں) بند ہو جانا ہے۔

وَمِنْ وَرَأِيهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ۝۱۷
اور اس (عذاب) کے بعد اس سے بھی سخت عذاب ہو گا۔ بعض علماء نے کہا کہ عذاب غلیظ سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا کبھی نہ نکلنا۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت اِسْتَفْتَحُوا کا انبیاء کے قصہ سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل الگ آیت ہے اور اس کا نزول مکہ والوں کے متعلق ہوا اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے قحط میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے فتح یعنی بارش کے لئے اللہ سے دعا کی مگر اللہ نے انکی مراد پوری نہیں کی اور بجائے پانی کے دوزخ میں دوزخیوں کے جوف کا گندہ پانی پلائے جانے کی وعید سنا

دی۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ
جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کی تعجب آفریں حالت ایسی ہے۔ ”مثل“ سے مراد ہے ایسی صفت جس میں ندرت ہو۔

أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ
(یعنی) ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے کچھ راکھ جس کو تیز آندھی کے دن ہوا تیزی کے ساتھ اڑالے جائے۔ عَصُوفٌ ہوا کا تیز چلنا (عَاصِفٌ تیز چلنے والی ہوا) دن کو عاصف بطورِ مبالغہ قرار دیا گیا جیسے ہمارہ صائم اور لیلہ نائم کہا جاتا ہے (آدمی دن میں روزہ رکھتا ہے اور رات کو سوتا ہے دن کو روزہ دار اور رات کو سونے والا بطورِ مجاز کہا جاتا ہے) اعمال سے مراد ہیں کافروں کی وہ خود تراشیدہ نیکیاں جن کے ثواب کے وہ امیدوار تھے، جیسے (ان کی مفروضہ) خیرات، کنبہ پروری، اعانتِ فقراء، آزادی غلامان وغیرہ۔ ان تمام کارہائے خیر کی بنیاد چونکہ خدا شناسی پر نہ تھی اور ان سے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں تھی یا بتوں کے نام پر یہ نیکیاں کی جاتی تھیں جو ان کے کسی عمل اور عبادت سے واقف نہ تھے اور نہ بدلہ دینے کی ان میں طاقت تھی اس لئے اللہ نے ایسی خوش اعمالیوں کو آندھی کی خاک سے تشبیہ دی جس کو آندھی اڑا کر لے جاتی ہے۔

لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَيَّ شَيْءٌ
انہوں نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہو گیا (قیامت کے دن) اسکے کسی حصہ پر قادر نہ ہوں گے۔ یعنی کسی عمل کا کوئی ثواب نہ پائیں گے نام و نشان بھی کسی نیکی کا انکو نظر نہ آئے گا۔ اس تشبیہ کا خلاصہ یہی ہے۔

ذَلِكَ
یہ یعنی نیکی سمجھ کر کسی کام کو کرنا اور پھر اس نیکی کا برباد ہو جانا اور نیکی کا گمراہی پر مبنی ہونا۔
هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ⑱
(پرکے درجہ کی) حق سے بہت دور کی گمراہی ہے۔ بد کاریوں کا گمراہی ہونا تو دور کنار ان کی تو نیکیاں بھی گمراہی ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ
کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے ”حق“ سے مراد ہے حکمتِ کاملہ اور وہ طریقہ جو کائنات کی تخلیق کے لئے مناسب تھا اس جہان بالا و پست کی یہی حکمتِ تخلیق حق و باطل میں امتیاز کا راستہ بتاتی اور صانعِ حکیم کی واحد ہستی کو ثابت کرتی ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُدْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ⑲
اگر وہ چاہے تو تم کو (دنیا سے) لے جائے (تم کو معدوم کر دے) اور نئی مخلوق پیدا کر دے جو تم سے زیادہ فرماں بردار ہو جس نے یہ آسمان و زمین حکمت سے پیدا کئے ایسا بڑا قادر اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم کو دنیا سے معدوم کر دے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق پیدا کر دے۔

وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ⑳
اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز پر وہ قادر ہو اور دوسری چیز اسکی قدرت سے خارج ہو۔ اور جو ایسا قادر مطلق ہو وہی مستحق ہے اس امر کا کہ اسی کی پرستش اور اطاعت کی جائے اور اسی سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے خوف کیا جائے۔

وَبَرَسُوا لِلَّهِ جَمِيعًا
اور اللہ کے حکم سے (اور حسابِ نعمی کے لئے) سب کے سب (اپنی قبروں سے) باہر نکل آئے (یعنی قیامت کے دن یقیناً قبروں سے نکل آئیں گے گویا نکل ہی آئے)

فَقَالَ الضُّعَفَاءُ
پس کہیں گے کمزور (نچلے طبقہ کے) لوگ کمزور سے مراد ہیں مال و دولت میں کمزور یا عقل و دانش میں کمزور۔

الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
ان لوگوں سے جو (دنیا میں) بڑے بن بیٹھے تھے۔ یعنی ان سرداروں اور لیڈروں سے کہیں گے جو پیغمبروں کے اتباع سے روکتے تھے۔

إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا
ہم تو بلاشبہ تمہارے تابع حکم تھے تم نے پیغمبروں کی تکذیب اور ان سے اعراض

کرنے کا حکم دیا تھا ہم تمہارے حکم پر چلے۔ تَبِعَ تَابِعَ کی جمع ہے۔

فَهَلْ أَنْتُمْ مَخْفُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ

پس کیا (تم) ہم سے اللہ کے عذاب کا کچھ

حصہ بھی دفع کر دو گے۔ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ فِي مَنُ بَيَانِيهِ اور مِنْ شَيْءٍ فِي مَنُ تَبْعِيضِيهِ ہے۔

وہ کہیں گے اگر اللہ ہم کو (ایمان کی) ہدایت نصیب کر دیتا تو ہم تم

کو ہدایت پر آنے کی دعوت دے دیتے۔ لیکن ہم گمراہ تھے سو ہم نے تم کو بھی گمراہ کر دیا جو چیز اپنے لئے پسند کی تھی وہی تمہارے لئے بھی پسند کی، یا یہ مطلب ہے کہ ہم تم کو آگ کے کنارے پر لے آئے اب اگر اللہ عذاب سے بچنے کا کوئی طریقہ ہم کو بتا دیتا تو ہم تم کو وہی راستہ بتا دیتے اور تم کو عذاب سے بچا لیتے مگر نجات کا راستہ تو خود ہمارے لئے بھی بند کر دیا گیا۔

سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ عَلَانَا أَمْ صَبْرُنَا مَا لَنَا مِنَ مَحْجِيصٍ ۝۱۳

اب ہمارے لئے دونوں باتیں برابر ہیں (کوئی سود مند نہیں) ہمارے لئے بچنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ مَحْجِيصٌ اسم ظرف

ہے حیصٌ مصدر حیص کا معنی بھاگنے کے لئے مڑنا یا مَحْجِيصٌ مصدر ہے جیسے مغیب۔ یہ جملہ یا سرداروں کے کلام کا جز ہے یا

دونوں فریقوں کا مقولہ ہے مقاتل کا قول ہے کہ کافر دوزخ کے اندر سب مل کر پانچ سو برس تک فریاد و زاری کریں گے لیکن کوئی

حاصل نہ ہو گا پھر پانچ سو برس تک صبر کریں گے پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس وقت کہیں گے سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ عَلَانَا

أَمْ صَبْرُنَا مَا لَنَا مِنَ مَحْجِيصٍ -

ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت کعب بن مالک کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم

صبر کریں (شاید اللہ کو رحم آجائے) چنانچہ پانچ سو برس تک صبر کریں گے اور جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کہیں

گے سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ عَلَانَا

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے منتظمین سے کہیں گے اِدْعُوا رَبَّكُمْ

يُخَفِّفْ عَلَيْنَا يَوْمَ مَا مِنَ الْعَذَابِ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے منتظمین دوزخ

جو اب دیں گے اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر احکام واضح لے کر نہیں پہنچے تھے دوزخی کہیں

گے پہنچے کیوں نہ تھے، اس پر منتظمین جواب دیں گے اِدْعُوا وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ اَلَا فِي ضَلَالٍ تم خود دعا کرو کافروں کی دعا کا

سوائے ناکامی کے اور کچھ نتیجہ نہیں۔ جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو کہیں گے يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ اے مالک

(داروغہ جہنم) تمہارا رب تو ہمارا کام تمام ہی کر دے (یعنی موت ہی دے دے تو اس عذاب سے چھوٹ جائیں) مالک ان کو اسی

برس تک کوئی جواب نہیں دے گا۔ اسی برس میں ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہی ہو گا لیکن ہر دن ہزار برس کا ہو گا (یعنی ہمارے

ہزار برس کے برابر ہو گا) اسی برس کے بعد جواب دے گا تم کو یہیں رہنا ہو گا جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو ایک دوسرے سے

کہے گا تم پر جو مصیبت آئی تھی وہ آہی گئی (اب جزع فزع کرنا بیکار ہے) ہم کو صبر کرنا چاہئے، ممکن ہے صبر سے کچھ اچھا نتیجہ نکل

آئے جس طرح دنیا میں جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا تھا اور ہر دکھ کو برداشت کیا تھا تو ان کو (آج) فائدہ ہوا۔ غرض

بالا تفاق (مجبوراً) صبر کریں گے اور طویل مدت تک صبر رہیں گے (مگر بے سود) پھر جزع فزع کریں گیا اور طویل مدت تک

کریں گے (لیکن کچھ نتیجہ نہ ہو گا) آخر پکارا اٹھیں گے سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ عَلَانَا أَمْ صَبْرُنَا مَا لَنَا مِنَ مَحْجِيصٍ یعنی کوئی بچنے کا

مقام نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھڑا ہو کر انکو خطاب کرے گا اور کہے گا اللہ نے بلاشبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدے

تم کو دیئے تھے ان کے خلاف ہوا مگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت

مان لی۔ لہذا آج مجھے ملامت نہ کرو خود اپنے کو ملامت کرو ابلیس کا یہ کلام سن کر لوگوں کو خود اپنے سے نفرت ہو جائے گی اس پر

لَإِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقُّ وَوَعَدْتُمْ فَأَخْلَفْتُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ

فَأَسْتَجِبْتُمْ لِي فَلَا تَكُونُوا لِلذَّنْبِ وَالذَّنْبِ لَكُمْ ط

ندا آئے گی جتنی نفرت تم کو (آج) اپنے سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت بھی جب تم کو ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی اور تم انکار کر رہے تھے یہ ندا سکر وہ پکارا اٹھیں گے اے ہمارے رب (نبی کے قول اور تیرے وعدے کی سچائی) ہم نے دیکھ لی اور سن لیا اب ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے ہم کو یقین آگیا۔ اللہ ان کی تردید میں فرمائے گا وَكُوْنُوْا بِشِيْئِنَا لَا تَتِيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هٰذَا هَا۔ وہ تیسری مرتبہ پکاریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور پیغمبروں کا بھی اتباع کریں گے تو تھوڑی مدت کو ہم کو مہلت دے دے۔ اللہ فرمائے گا کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہ کہا تھا کہ ہم کو فنا نہیں۔ پھر وہ چوتھی مرتبہ پکاریں گے اے ہمارے رب تو ہم کو (یہاں سے) نکال دے ہم جو کام پہلے کر چکے ہیں ان کے سوا دوسرے عمل کریں گے۔ اللہ ان کے رد میں فرمائے گا کیا ہم نے تم کو ایسی اور اتنی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت پکڑنے والا تھا نصیحت پکڑ لیتا اور کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا۔ پھر ایک مدت تک توقف کرنے کے بعد اللہ اُن سے فرمائے گا کیا میرے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے اور تم ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ بات سکر وہ کہیں گے کیا ہم پر آئندہ ہمارا رب رحم (بالکل) نہیں کرے گا۔ اس کے بعد پکارا اٹھیں گے اے ہمارے رب ہم پر ہماری بد بختی غالب آگئی تھی ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے اے ہمارے رب (اب کی بار) ہم کو یہاں سے نکال لے اگر پھر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے اللہ فرمائے گا اس میں ذلت کے ساتھ رہو مجھ سے بات بھی نہ کرو۔ اس وقت وہ بالکل مایوس ہوں گے اور دعا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور باہم نوحہ کریں گے اور دوزخ کا پٹ بند کر دیا جائے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ
فِرَاعْت هُوَ حَلَكِي۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو شیطان کافروں سے کہے گا۔ مقاتل نے کہا شیطان کے لئے ایک تخت رکھا جائے گا تمام کفار اپنے پیشواؤں کے ساتھ اس کے پاس جمع ہوں گے اور جن و انس دونوں قسم کے بد بختوں میں وہ تقریر کرے گا۔

ابن جریر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم، بغوی، طبرانی اور ابن المبارک نے حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ انگوں پچھلوں کو سب کو جمع کر کے ان کا فیصلہ کر چکے گا تو اہل ایمان کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ کر دیا اب کوئی شخص ایسا ہو جو ہمارے رب سے ہماری سفارش کر دے، لوگ کہیں گے آدم ایسے ہو سکتے ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے ان کو بنایا تھا اور ان سے کلام کیا تھا چنانچہ سب لوگ جا کر حضرت آدم سے گزارش کریں گے کہ ہمارا رب ہمارا فیصلہ کر چکا اور حکم جاری کر چکا اب آپ اٹھ کر ہماری شفاعت کر دیجئے۔ حضرت آدم کہیں گے نوح کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت نوح کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم کے پاس جانے کی ہدایت کر دیں گے لوگ حضرت ابراہیم کے پاس جائیں گے آپ حضرت موسیٰ کا راستہ بتادیں گے لوگ حضرت موسیٰ کے پاس جائیں گے۔ آپ حضرت عیسیٰ کا حوالہ

۱۔ لَمَقَّتْ اللّٰهُ الْاَكْبَرِ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسِكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ۔

۲۔ رَبَّنَا اَبْصُرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوقِنُوْنَ۔

۳۔ رَبَّنَا اَخْرِنَا اِلَى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرَّسُوْلَ۔

۴۔ اَوْلَمْ تَكُوْنُوْا قَسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلِ مَا لَكُمْ مِّنْ زُوْاْلِ۔

۵۔ رَبَّنَا اَخْرَجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرِ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ۔

۶۔ اَوْلَمْ نَعْمَرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَن تَذَكَّرُ وَجَاءَكُمْ النَّذِيْرُ۔

۷۔ اَلَمْ تَكُنْ اٰيَاتِيْ تَتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكْذِبُوْنَ۔

۸۔ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنَّا ظَالِمُوْنَ۔

۹۔ اِحْسِنُوْا فِيْهَا وَلَا تَكْلِمُوْنَ۔

دے دیں گے جب لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس پہنچیں گے تو آپ کہیں گے میں تم کو پتہ بتاتا ہوں تم نبی اُمّی عربی ﷺ کے پاس جاؤ وہ سب سے زیادہ صاحبِ فخر (فضیلت) ہیں آخر لوگ میرے پاس آئیں گے اور اللہ مجھے کھڑے ہو کر گزارش کرنے کی اجازت دے گا پھر میری مجلس ایک بے نظیر پاکیزہ ترین خوشبو سے مہکادی جائے گی ایسی مہک ہوگی کہ کسی نے ایسی خوشبو نہیں سونگھی پھر میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہو کر شفاعت کروں گا اللہ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک مجھے نور ہی نور کر دے گا سر تا قدم میرے لئے نور کر دے گا۔ یہ بات دیکھ کر کافر کہیں گے مسلمانوں کو تو سفارشی مل گیا اور ہماری سفارش کون کرے خود ہی جواب دیں گے اب تو ابلیس ہی جس نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہمارے سامنے ہے اور کوئی سفارشی موجود ہی نہیں ہے چنانچہ یہ لوگ ابلیس سے جا کر کہیں گے مؤمنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا اب تو اٹھ کر ہماری شفاعت کر، تو نے ہی ہم کو گمراہ کیا تھا ابلیس جو نہی اٹھے گا اس کی مجلس میں بدترین بُوائے لگے گی ایسی بدبو تو کسی نے سونگھی ہی نہ ہوگی پھر ابلیس ان کو جہنم کی طرف لے جائے گا اور کہے گا۔

بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دیا وعدہ سے مراد ہے

إِنَّ اللَّهَ وَعَدَاكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ

دوبارہ زندہ کرنے اور بدلہ دینے کا وعدہ۔

وَوَعَدْتُكُمْ اور میں نے تم سے (غلط) وعدہ کیا تھا کہ نہ دوبارہ زندگی ہوگی نہ حساب فہمی ہوگی اور دوبارہ زندگی ہوگی

بھی تو بت تمہاری سفارش کر دیں گے۔

فَاخْلَفْتُمْ پس میں نے (آج) وعدہ کے خلاف کیا یعنی میرے وعدے کے خلاف واقعہ کا ظہور ہوا

وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ اور میرا تم پر کوئی جبر نہ تھا کہ تم کو مجبور کر کے کفر و گناہ کی طرف

کھینچ لیتا یا سلطان سے مراد ہے دلیل یعنی میں نے تم کو دعوت دی تھی مگر میری دعوت کی کوئی دلیل نہیں تھی میں تمہارے

سامنے کوئی دلیل نہیں لایا تھا۔

میں نے تم کو صرف دعوت دی کفر و معاصی کی طرف بہکاو اداے کر بلایا تھا اور میرا یہ بہکاوا

إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ

کوئی دلیل نہ تھا۔

فَأَسْتَجِبْتُمْ لِي پس تم نے میری بات مان لی۔ میری دعوت قبول کر لی اور جس نے حجتِ کاملہ پیش کی تھی اسکی

بات ماننے سے تم نے انکار کر دیا۔

فَلَا تَلُومُونِي اب تم مجھے (میرے بہکانے پر) ملامت نہ کرو۔

وَلَوْ مَوَّأْنَا نَفْسَكُمْ اور اپنی جانوں کو ملامت کرو کہ تم نے میری اطاعت کی باوجود یکہ میرے پاس اپنے قول

کی کوئی دلیل نہ تھی اور اپنے رب کی اطاعت نہیں کی۔

فرقہ معزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود (خالق) و مختار ہے مگر معزلہ

کا یہ استدلال غلط ہے آیت سے یہ مضمون ثابت نہیں ہوتا صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی قدرت کو عمل میں کچھ دخل ہے

اور اسی دخل کو اشاعرہ کسب کہتے ہیں۔ (پس خالق افعال اللہ ہے اور کاسب بندہ ہے)۔

مَا آتَانَا بِمُصْرِحِكُمْ تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا کہ تم کو عذاب سے بچالوں۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِحِي اور نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو (کہ مجھے عذاب سے بچالو)

میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ تم اس کے قبل (دنیا

میں) مجھ کو خدا کا شریک بناتے تھے۔

بمّا میں ما مصدر ہے اور بین قبل میں بین کا تعلق اَشْرِكْتُمُونِ سے ہے مطلب یہ ہوگا کہ آج سے پہلے دنیا میں جو تم

مجھ کو اللہ کے ساتھ عبادت و طاعت میں شریک کرتے تھے آج اس شرک کا میں انکار کرتا ہوں تمہاری اس حرکت سے بیزاری

(اندر اُن) کا درخت ہے۔

لغت میں حین کا معنی ہے "وقت" مجاہد اور عکرمہ کے نزدیک اس جگہ پورا سال مراد ہے کیونکہ درخت کھجور میں پورے سال پھل آتا ہے۔ سعید بن جبیر، قتادہ اور حسن بصری کے نزدیک چھ مہینے کی مدت مراد ہے۔ یعنی گایا نکلنے کے وقت سے کھجور توڑنے کے وقت تک حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی جاتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک چار ماہ کی مدت مراد ہے۔ یعنی پھل برآمد ہونے کے وقت سے پھل پکنے کا وقت سعید بن مسیب نے کہا دو ماہ مراد ہیں یعنی کھجور کھانے کے قابل ہو جائے اس وقت سے لے کر توڑنے کے وقت تک۔ ربیع بن انس نے کہا کل حین سے مراد ہے ہر صبح شام کیونکہ کھجوریں ہر زمانہ میں اور ہر فصل میں اور ہر وقت کھائی جاتی ہیں صبح ہو یا شام گرمی کی فصل ہو یا سردی کا موسم چھواروں کی شکل میں اس کو کھلایا جاتا ہے یا کھجوروں کی صورت میں یا نیم پخت حالت میں۔ مؤمن کے عمل کی بھی یہی حالت ہے صبح و شام رات و دن اور درمیانی اوقات میں، غرض ہر وقت نیک عمل اوپر چڑھتا ہے اور ایمان کی برکت کبھی منقطع نہیں ہوتی ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی طرح ہوتا ہے بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا لوگوں کے خیالات صحرائی درختوں کی طرف جا پڑے اور میرے دل میں آیا کہ ایسا درخت کھجور ہوتا ہے مگر میں چھوٹا تھا اس لئے جھجکا (اور کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی) آخر حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور خود ہی بیان فرمادیں فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

بغوی نے لکھا ہے درخت کی تکمیل تین اجزاء سے ہوتی ہے زمین کے اندر جمے ہوئے ریشے تنہ اور شاخیں۔ ایمان کی تکمیل بھی تین ہی چیزوں سے ہوتی ہے (دل سے) تصدیق سے، زبان سے اقرار اور اعضاء جسم سے عمل۔

ابوظبیر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا کہ شجرہ طیبہ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے (خلوص کے ساتھ) سبحان اللہ العظیم و بحمدہ کہا اس کے لئے کھجور کا ایک درخت جنت میں بودیا جاتا ہے۔ (رواہ الترمذی)

وَيُضْرَبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۵﴾ اور اللہ لوگوں کے (فائدہ کے) لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ تمثیل نام ہے معانی کی تصویر کشی کا اور غیر محسوس کو جس کے قریب لے آنے کا۔ اس لئے تمثیلات سے مقصود کے سمجھنے میں آسانی اور نصیحت اندوزی میں سہولت ہو جاتی ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ اور ناپاک کلمہ کی مثال ایسی ہے بظاہر کلمہ خبیثہ سے مراد ہے وہ کلمہ توحید و رسالت جو نفاق کے ساتھ کہا جائے اللہ کی رضامندی پیش نظر نہ ہو۔

كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ جیسے خراب درخت یعنی غیر مفید، ناکارہ درخت جس کی جڑ زمین کے اندر پیوست نہ ہو۔

بِاجْتِنَانٍ مِّنْ فَوْقِ الْأَرْضِ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ جس کو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ لیا جائے اس کے سونٹے زمین کے اوپر ہی رکھے ہوں۔

مَا كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ ۖ لِيَفْقَهُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ (زمین کے اندر) اس کا جماؤ نہ ہو اسی طرح اس کلمہ کی حالت ہے جو رضائے الہی کے لئے

نہ ہو۔ اس کا کبھی کوئی فائدہ نہیں ابن مردویہ نے بوساطت حبان بن شعبہ، حضرت انس بن مالکؓ کا قول بیان کیا کہ شجرہ خبیثہ شربانہ ہے حضرت انسؓ سے پوچھا گیا شربانہ کیا ہے۔ فرمایا اندر اُن۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ شجرہ طیبہ کے اندر کھجور کا درخت بھی داخل ہے اور شجرہ خبیثہ کا لفظ درخت حنظل کو بھی شامل ہے (خاص طور پر کھجور اور حنظل کے درخت مراد نہیں ہیں) اور حدیث میں جو طیبہ کی تشریح میں نخلہ اور خبیثہ کی تشریح میں حنظلہ آیا ہے وہ بطور تمثیل ہے طیبہ اور خبیثہ کے بعض افراد کا ذکر بطور مثال کر دیا گیا ہے۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۖ

اللہ ایمان والوں کو اس کی بات (یعنی کلمہ طیبہ) کی برکت سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین و امتحان میں) بچلا دیتا ہے، القول الثابت سے مراد ہے کلمہ توحید جس کا اعتراف خلوص کے ساتھ کیا گیا ہو خلوص دل سے کلمہ توحید کا اقرار دل میں جم جاتا ہے اور اس کا ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو جاتا ہے دین کے معاملات میں دنیا کے اندر جو دکھ اور آلام اہل ایمان پر آتے ہیں ان کے ایمان کو نہیں ہلا سکتے وہ ایمان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں جیسے حضرت زکریاؑ حضرت یحییٰؑ حضرت جبریلؑ حضرت اسمعونؑ اصحاب اُخدود (جن کو گڑھوں میں آگ بھڑکا کر جھونک دیا گیا تھا یہ واقعہ یمن میں ہوا تھا اور شاہ ذونواس کے حکم سے ہوا تھا مترجم) حضرت خبیث اور آپ کے ساتھی اور چاہر معونہ والے (قاری جن کو دھوکہ سے شہید کیا گیا تھا مگر وہ اپنے ایمان پر قائم رہے) اور آخرت میں یعنی قبروں کے اندر نکیرین کے سوال کے وقت بھی اللہ ان کو اقرار توحید پر قائم رکھتا ہے ظالمین سے مراد ہیں منافق اور کافر یہ لوگ آزمائش کے وقت ثابت قدم نہیں رہتے آغاز مصیبت کے وقت ہی ان کے قدم پھسل جاتے ہیں اور آخرت میں تو ان کا گمراہ ہونا اور ثابت قدم نہ ہونا ظاہر ہی ہے۔

ائمہ ستہ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں آیت یُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ كَمَا فِي مَطْلَبِ هَذِهِ رِوَايَتٍ فِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ قَالَ رَبُّكَ كَيْفَ أَجَبْتَهُ قَالَ كَيْفَ أَجَبْتَهُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ كَانَزُولِ عَذَابِ قَبْرِكَ سَلْسَلَةً فِي هَوَا صَاحِبِ قَبْرِكَ كَمَا جَاءَ كَاتِرًا رَبُّكَ كَيْفَ أَجَبْتَهُ قَالَ اللَّهُ رَبُّكَ كَيْفَ أَجَبْتَهُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (متفق علیہ)

ابوداؤد اور امام احمد کی روایت میں حدیث مذکورہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے (مردہ کے پاس) دو فرشتے آتے ہیں اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ شخص جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ جواب دیتا ہے میرا دین اسلام ہے فرشتے کہتے ہیں وہ شخص کیسا تھا جس کو تمہارے اندر بھیجا گیا تھا وہ شخص جواب دیتا ہے وہ اللہ کے رسول تھے فرشتے کہتے ہیں تجھے کیا معلوم وہ شخص کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور میں نے اس کو مانا اور اس کو سچا جانا پس آیت یُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (کی مراد) یہی ہے حضور ﷺ نے فرمایا پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے میرے بندے نے سچ کہا اس کے لئے جنت کا بستر کر دو اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو حضور ﷺ نے فرمایا پھر اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آنے لگتی ہیں اور حدنگاہ تک اس کے لئے جنت کی وسعت کر دی جاتی ہے کافر کی موت کا ذکر کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا اس کی روح بدن میں لوٹائی جاتی ہے دو فرشتے آکر اس کو بیٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے ہا ہا مجھے نہیں معلوم فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ کہتا ہے ہا ہا مجھے نہیں معلوم۔ فرشتے کہتے ہیں وہ آدمی جو تمہارے پاس بھیجا گیا تھا اس کی کیا حالت تھی وہ کہتا ہے ہا ہا مجھے نہیں معلوم۔ پھر آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے اس نے جھوٹ کہا اس کے لئے آگ کا پھوٹا کر دو اور آگ کا لباس پہنا دو اور دوزخ کی طرف ایک دروازہ اس کے لئے کھول دو پھر دوزخ کی گرمی اور لو اس پر آنے لگتی ہے اور اس کی قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ادھر سے ادھر نکل جاتی ہیں پھر اس کو عذاب دینے کے لئے ایک اندھے بہرے (فرشتے) کو مقرر کر دیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اگر اس کی ضرب پہاڑ پر پڑ جائے تو اس کو بھی خاک کر دے یہ فرشتہ گرز اس کافر پر مارتا ہے جس کی آواز آدمی اور جن کے علاوہ مشرق سے مغرب تک ہر چیز سنتی ہے گویا ضرب سے کافر خاک ہو جاتا ہے پھر دوبارہ اس میں جان ڈالی جاتی ہے۔

حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ مردہ کے دفن سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ اس کے پاس توقف فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اپنے بھائی کے لئے دعائے مغفرت کرو اور اللہ سے اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی درخواست کرو۔ اس وقت اس

سے سوال کیا جا رہا ہے۔ رواہ ابو داؤد۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انس کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آنے لگتے ہیں تو مردہ اس کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے (اس وقت) دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس شخص یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا ہے، مؤمن جواب دیتا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے کہا جاتا ہے اپنے دوزخ والے ٹھکانے کو دیکھ اس کی جگہ اللہ نے جنت کا ٹھکانہ عطا فرمادیا، مؤمن دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے۔ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کی بابت کیا کہتا تھا تو وہ کہتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جو بات اور لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا فرشتے کہتے ہیں نہ تو نے جانا اور نہ (قرآن میں) پڑھا پھر اس پر لوہے کے ہتھوڑوں کی مار پڑتی ہے اور وہ چیختا ہے اس کی چیخوں کو سوائے جن وانس کے سب قریب والے سنتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو سیاہ فام نیلے (یعنی نیلی آنکھوں والے) فرشتے اس کے پاس آتے ہیں ایک کا نام منکر دوسرے کا نام نکیر ہے دونوں فرشتے پوچھتے ہیں تو اس شخص کے متعلق کیا کہتا تھا مردہ کہتا ہے وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں فرشتے کہتے ہیں ہم تو جانتے ہی تھے کہ تو یہ کہے گا پھر اس کی قبر میں ستر ستر ہاتھ ہر طرف وسعت کر دی جاتی ہے اور روشنی کر دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے سو جاؤ، وہ سو جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے میں واپس جا کر اپنے گھر والوں کو (اس کیفیت کی) اطلاع تو دے دوں۔ فرشتے کہتے ہیں اس دلہن کی طرح (محبت آرام اور سکون کے ساتھ) سو جا جس کو سوائے اس شخصیت کے جو سب گھر والوں میں اس کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی نہیں اٹھاتا (آخر وہ سو جائے گا) یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا اور اگر مردہ منافق ہو گا تو جواب دے گا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا میں نے بھی ویسے ہی کہہ دیا مجھے کچھ نہیں معلوم (کہ یہ اللہ کے رسول تھے یا نہ تھے) فرشتے کہیں گے ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو یہ بات کہے گا پھر زمین کو حکم دیا جاتا ہے تو اس پر مل جا (یعنی ایسا دبا کہ تیرے دونوں حصے آپس میں مل جائیں) زمین اس منافق کو اتنا دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر نکل جائیں گی اس طرح یہ برابر عذاب میں مبتلا رہے گا یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا۔ رواہ الترمذی۔

اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے کسی کو ایمان کی توفیق دیتا ہے کسی کو توفیق ایمان **وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ﴿۲۵﴾** سے محروم رکھتا ہے کسی کو ایمان پر قائم رکھتا ہے کسی کو قائم نہیں رکھتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا اور ان کی گوری نسل باہر آگئی۔ گویا (کثرت میں) وہ چھوٹی چھوٹی نیلیوں کی طرح تھی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کالی نسل جیسے کوئلہ باہر آگئی۔ پھر اس نسل کے متعلق جو دائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) جنت کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پرواہ نہیں اور اس نسل کے متعلق جو بائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے پرواہ نہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تمام آسمانوں وزمین والوں کو اللہ عذاب دے تو وہ عذاب دے سکتا ہے اور وہ ظالم نہیں ہو گا اور اگر سب پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہو گی اگر (کوہ) احد کے برابر سونا تم راہ خداوندی میں دے دو تو جب تک تقدیر پر تمہارا ایمان نہ ہو گا اللہ اس کو قبول نہیں فرمائے گا اور جان لو کہ جو کچھ تم کو پہنچے گا وہ تم سے چوکنے والا نہیں اور جو کچھ نہیں پہنچے گا وہ کسی طرح پہنچنے والا نہیں۔ اگر اس کے خلاف عقیدہ پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول ہیں۔ رواہ احمد و ابن ماجہ۔

کما آپ نے ان لوگوں نہیں دیکھا جنہوں نے **الْمُتَرَاتِلِي الْكِنَانِ بَدَلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا** بجائے نعمتِ الہی کے کفر کیا۔ یعنی اللہ کی نعمت کے شکر یہ کوٹا شکر سے بدل دیا (شکر کے بجائے ناشکری کی) یا یہ مطلب ہے کہ

اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا ناشکری کی وجہ سے ان سے اللہ کی نعمت چھین لی گئی تو گویا انہوں نے بجائے نعمت کے ناشکری کو پسند کر لیا۔ بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وَاللّٰهُ وَهُوَ كَفَّارٌ قَرِيشٍ (یعنی کفارِ قریش آیت میں مراد ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ (ناشکرے) قریش تھے اور اللہ کی نعمت محمد ﷺ کی ذات تھی۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو لوگ مکہ والوں میں سے مارے گئے وہ مراد ہیں اللہ نے ان کو پیدا کیا، حرم کا سا کرن بنایا، جہاں ہر طرف سے پھل اور غلہ لایا جاتا تھا (اور چین کے ساتھ مکہ والے بیٹھے کھاتے تھے) اصحابِ فیل (نے جب کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے ان) کو مکہ والوں کی طرف سے دفع کیا ان کے لئے رزق کے دروازے کھول دیئے (شام و یمن کو) سردی و گرمی کے زمانہ میں سفر کرنے کا ان کو خوگر اور مانوس بنایا (تاکہ غلہ، پھل، کپڑا اور ہر ضرورت کی چیز ان کو بافراط مل سکے) اور انہی میں سے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا۔ تاکہ آپ ان کو قرآن پڑھ کر سنائیں ان کے عقائد و اخلاق کو پاکیزہ اور ستھر بنا سکیں اور ان کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیں اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا لیکن انہوں نے تمام نعمتوں کی ناشکری کی رسول اللہ ﷺ کے دشمن بن گئے اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی پر قائم رہے۔ آخر قحط ہفت سالہ میں مبتلا ہوئے اور بدر کے دن قید بھی ہوئے اور مارے بھی گئے اور ذلیل بھی ہوئے اور مرتے دم تک اللہ کی مذکورہ نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

اور (کفر پر ابھار کر) انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے مقام میں اتار

وَاحْلُوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾

دیا۔
جہنم بَصُلُوْنَهَا
یعنی جہنم میں جس میں یہ خود بھی داخل ہوں گے (اور ان کے ساتھ والے بھی) سب کے سب جہنم کی گرمی میں جلیں گے جہنم یا عطف بیان ہے یا فعل محذوف کا مفعول۔

وَبَيْتِ الْقَرَارِ ﴿۲۹﴾
اور جہنم بری قرار گاہ ہے، بُرِ اٹھکانہ ہے۔ ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المؤمنین آیت الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا مِّنْ كُونِ لَوْگ مراد ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا قریش کے وہ دو (قبیلے) جو سب سے زیادہ بدکار تھے۔ بنی مغیرہ اور بنی امیہ۔ بنی مغیرہ کے شری سے تو بدر کی لڑائی میں تمہاری حفاظت ہو چکی (یعنی بدر میں انکا زور ٹوٹ گیا) اور بنی امیہ کو ایک وقت تک مزے اڑانے کا موقع دیا گیا ہے۔ بغوی نے بھی اسی طرح حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے اسی طرح کا قول حضرت علیؓ کا بھی مختلف روایات سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں بنی امیہ کو حالت کفر میں مزے اڑانے کا موقع دیا گیا یہاں تک کہ ابوسفیانؓ معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ وغیرہ مسلمان ہو گئے پھر یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اہل بیت کی دشمنی کا جھنڈا انہوں نے بلند کیا آخر حضرت حسینؓ کو ظلماً شہید کر دیا اور یزید نے دین محمدی کا ہی انکار کر دیا اور حضرت حسینؓ کو شہید کر چکا تو چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا آج میرے اسلاف ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آل محمدؓ اور بنی ہاشم سے ان کا کیسا بدلہ لیا۔ یزید نے جو اشعار کہے تھے ان میں آخری شعر یہ تھا۔

وَلَسْتُ مِنْ جَنْدَبٍ اِنْ لَمْ اَنْتَقِمِ
بَنُ بَنِي اَحْمَدَ مَا كَانَ فَعَلِ
(احمد نے جو کچھ (ہمارے بزرگوں کے ساتھ بدر میں) کیا اگر احمد کی اولاد سے میں نے اس کا انتقام نہ لیا تو میں بنی جندب سے نہیں ہوں)

یزید نے شراب کو بھی حلال قرار دے دیا تھا شراب کی تعریف میں چند شعر کہنے کے بعد آخری شعر میں اس نے کہا تھا:

فَخَذَهَا عَلِيٌّ دِينَ الْمَسِيحِ بْنِ مَرْيَمَ

فَاِنْ حَرَمْتُ يَوْمًا عَلِيٌّ دِينَ اَحْمَدَ

(اگر شراب دین احمد میں حرام ہے تو (ہونے دو) مسیح بن مریم کے دین (یعنی عیسائیت) کے مطابق تم اس کو (حلال سمجھ کر) لے لو۔

یزید اور اس کے ساتھیوں اور جانشینوں کے یہ مزے ایک ہزار مہینے تک رہے اس کے بعد ان میں سے کوئی نہ بچا۔
 وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا
 اور انہوں نے اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دیا جو دیکھ اللہ کا کوئی مثل نہیں۔ مثل قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ نام اور عبادت میں اللہ کی طرح دوسروں کو قرار دیا (اللہ کی پرستش کی طرح دوسروں کو معبود والا مانا)
 لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ
 تاکہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دیں لِيُضِلُّوا میں لام سبب اور علت کے لئے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو پوجا کرنے سے ان کی غرض نہ خود گمراہ ہونا تھا نہ دوسروں کو گمراہ کرنا۔ بلکہ یہ لام غایت ہے یعنی اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ گمراہ ہو گئے۔

آپ کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو کیونکہ اخیر انجام تمہارا
 قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِن مَّصِيرِكُمْ إِلَى النَّارِ ۝۳۰
 دوزخ میں جانا ہے یعنی اپنی نفسانی خواہشات یا بت پرستی اور گمراہی میں پڑے کچھ مدت تک مزے اڑاتے رہو۔ جو کچھ تمہارے لئے مقدر کر دیا گیا ہے اور جس وقت تک مزہ اڑانا تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے اتنی مدت تک مزے اڑاؤ۔ ذوالنون نے کہا تمہارے لئے یہ معنی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہو۔

تَمَتَّعُوا اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن امر سے مراد حکم نہیں بلکہ یہ ایک تمہید اور عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ تمہاری یہ گمراہیاں تم کو عذاب میں لے جائیں گی۔ اسی لئے امر کے بعد فرمایا کہ آخر تم کو دوزخ میں جانا ہے گویا دوزخ میں جانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
 (اے محمد ﷺ) آپ ﷺ میرے ان بندوں سے جو ایمان لے آئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ نمازیں قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر راہِ خدا میں کچھ خرچ کریں۔ اہل ایمان کو خصوصی طور پر نماز پڑھنے اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرنے کا حکم دیا اور مومنوں کو خاص طور پر عبادی فرمایا اور اپنے بندے قرار دیا اس سب سے مقصود اہل ایمان کی عزت افزائی ہے اور اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہل ایمان ہی حقیقتاً حقوقِ عبدیت کو ادا کرنے اور تعمیل احکام کرنے والے ہیں وہ امر کی تعمیل کریں گے۔

يُقِيمُوا قُلْ کا مفعول نہیں ہے۔ قُلْ کا مفعول محذوف ہے یعنی آپ ان کو حکم دیں کہ تم لوگ نماز پڑھو اور راہِ خدا میں خرچ کرو۔ يُقِيمُوا اور يُنْفِقُوا شرط محذوف کی جزا ہے یعنی اگر تم ان کو حکم دو گے تو وہ تعمیل کریں گے اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ وہ رسول اللہ کے فرماں بردار ہیں فرمان کو ضرور مانیں گے اور تعمیل کریں گے۔

مِن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَالٍ ۝۳۱
 قبل اس کے کہ وہ دن آجائے کہ اس میں نہ خرید فروخت ہوگی (کہ کوئی قصور وار کوئی ایسی چیز خرید کر دے جو اس کے قصور کا بدلہ ہو سکے) اور نہ کوئی دوستی ہوگی (کہ دوست اپنے دوست کی سفارش کر کے بچالے)

ایک شبہ: متقی شفاعت کریں گے اور بعض مومن بعض مومنوں کی بھی شفاعت کریں گے یہ مسئلہ مسلمہ ہے۔ اللہ نے فرمایا اَلْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ سب دوست باہم دشمن ہو جائیں گے سوائے تقویٰ والوں کے (یعنی متقی باہم دشمن نہ ہوں گے) پھر عموماً دوستی کام نہ آنے کی جو اس آیت میں صراحت ہے وہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔
 جواب: نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم ہی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جن میں تقویٰ نہ ہو ان میں باہم دوستی نہ ہوگی اور دوستی نہ ہوگی تو ان میں سے کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ

اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس پانی سے تمہاری معیشت کے لئے پھل (غلہ، روئی وغیرہ) پیدا کئے۔ "رزق" کا لفظ عام ہے کھانا، ہو یا لباس، سب کو یہ لفظ شامل ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ، وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝

اور (تمہاری سواری و بار برداری کے لئے) جہازوں اور کشتیوں کو تمہارے کام پر لگا دیا تاکہ اللہ کی مشیت کے مطابق وہ سمندر میں چلیں اور دریاؤں کو بھی تمہارا خدمت گار بنا دیا جہاں چاہتے ہو تم ان کو (رخ موڑ کر) لے جاتے ہو ان کے پانی سے فائدہ حاصل کرتے ہو اور ان پر پل اور بند باندھتے ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۝ اور تمہارے کام کے لئے سورج اور چاند کو بھی سرگرم کر دیا۔ یعنی انسانوں کے لئے منافع کے لئے یہ تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

قاموس میں (دَابَّ فِي عَمَلِهِ، کام میں کوشش اور محنت کی) (دَابَّ، دَابَّ، اور دَابَّ) مصدر تیزی سے ہنکانا

دَائِبَيْنِ شب و روز۔ یعنی دونوں تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ نے اپنی اطاعت میں ان کو تیز رفتار بنا دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ اور رات دن کو بھی تمہاری خدمت پر لگا دیا۔ رات دن کے پیچھے آتی ہے اور دن رات کے پیچھے تمہارے آرام کے لئے رات بنا دی کہ کام کی تھکان اور ماندگی دور ہو جائے اور کسبِ معاش کے لئے دن کا اجالا کر دیا۔

وَاللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ اور جو کچھ تم نے اس سے مانگا اس میں سے کچھ (بقدر ضرورت و مناسبت) تم کو دیا۔ من کبَلِّ میں من تبعیضیہ ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے شاید مراد یہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کا جو تقاضا تھا اور تمہاری حاجتیں (فطری طور پر جس چیز کی خواہش مند تھیں وہ سب تم کو دیا خواہ زبان سے تم نے مانگا ہو یا نہ مانگا۔ لفظ "کل" کثرت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے (استغراقِ حقیقی مراد نہیں ہے) جیسے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص سب کچھ جانتا ہے (یعنی بقدر ضرورت) اس کے پاس ہر شخص آگیا ہے یعنی بہت آدمی آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی بہت چیزوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیئے۔

وَأَنَّ تَعَدُّ وَانْعَمْتَ اللَّهُ لَا تُحْصَوْهَا ۝ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو پوری گنتی نہیں کر سکتے یعنی ان کے انواع و اقسام کو بھی نہیں گن سکتے افراد کا تو ذکر ہی کیا ہے افرادِ نعمت تو ان گنت ہیں ان سب کا شکر ادا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے لیکن اللہ نے اپنے کرم سے ادائے شکر نہ کر سکنے کے اقرار کو ہی اہل ایمان کے لئے شکر کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور جو لوگ شکر سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں ان کو اپنا شکر گزار بندہ فرمایا ہے اور جو لوگ شکر نہ کر سکنے کے باوجود اپنی عاجزی کا اقرار نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۝ بے شک انسان بے صبر انا شکر ہے سختی اور مصیبت میں اللہ کا شکوہ کرتا اور

بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا رب جو ادا ہے، کریم ہے، حکیم ہے یہ مصیبت بھی پر از مصلحت ہے، تقاضائے حکمت ہے، خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے اور آسائش و نعمت ملتی ہے تو آدمی شکر ادا نہیں کرتا۔ ناشکرے کی ضد شکر گزار ہے ظاہر ہے کہ شکر اور عدم شکر باہم ضد ہیں اور بالواسطہ ظلم کی ضد کو صبر کہا جاتا ہے کیونکہ ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا۔ مصیبت پر صبر کرنا بے محل ہے مصیبت کا تقاضا ہے پس اگر مصیبت پر صبر نہ کیا جائے بے صبری کے ساتھ شکایت کرنے لگے تو یہ ظلم ہو جائے گا اسی وجہ سے آیت میں ظلم سے مجازاً مراد ہے بے صبر۔ بعض علماء نے کہا کہ انسان کو ظلم کہنے

کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہو جانے کے اسباب فراہم کر دیتا ہے یا یوں کہو کہ شکرِ نعمت کو ترک کر کے آدمی اپنے نفس کو نعمت سے محروم کر دیتا ہے یہی اپنے نفس پر ظلم ہو لیا یوں کہا جائے کہ ناشکر آدمی نعمت پر ظلم کرتا ہے کہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا یا غیر منعم کا شکر یہ ادا کرتا ہے اور منعم حقیقی کا شکر نہیں کرتا تو اس طرح شکر کا استعمال بے محل کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرے اور جن وانس کے معاملات عجیب ہیں۔ میں پیدا کرتا ہوں اور وہ دوسروں کو پوجتے ہیں میں رزق دیتا ہوں اور وہ دوسروں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رواہ الحاکم والبیہقی۔ عن ابی الدرداءؓ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا
اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے رب
اس شہر (یعنی مکہ) کو امن والا (شہر) بنا دے جو یہاں رہے (یا آئے) امن سے رہے امن سے ہو جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ مکہ سے خوف کو دور کرنے اور شہر کو پُر امن بنانے کی دعا کی اور آیت اِجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا سے یہ درخواست کی کہ اس وادی کو امن کی بستی بنا دے۔ (یعنی یہاں وادی میں ایک شہر بسا دے جو پُر امن ہو)

وَ اجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۗ
اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی کرنے سے بچا، دور رکھ، الگ رکھ، یہ آیت بتا رہی ہے کہ انبیاءؑ کا معصوم ہونا محض اللہ کی توفیق اور نگہداشت سے وابستہ ہے (یعنی انسانی فطرت تو انبیاءؑ میں بھی کار فرما ہے خیر و شر کے جذبات تو انبیاءؑ میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتے ہیں پیدائش اور عناصر پیدائش میں کوئی فرق نہیں لیکن اللہ کی توفیق انبیاءؑ کے شامل حال رہتی ہے جو ہر وقت ان کو گناہوں سے بچائے رکھتی ہے) بنین (اولادِ صلبی) کے لفظ کے اندر اولاد کی اولاد داخل نہیں ہے۔ آیت یا بَنِيَّ اٰدَمَ، یا بَنِيَّ اِسْرٰئِيْلَ سے مراد جو ساری نسلِ آدم و اسرئیل ہے وہ عموم مجاز کے طور پر مراد ہے پس آیت زیر تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنی اولاد کے لئے شرک سے محفوظ رکھے جانے کی دعا کی تھی اس سے مراد صرف صلبی اولاد تھی تمام نسلِ اسماعیل (واسحاق) مراد نہ تھی، نسلِ اسماعیل میں تو بکثرت بت پرست گزرے ہیں لیکن آیت مذکورہ کے لفظ بنی کو دیکھ کر بقول ابن ابی حاتم سفیان بن عیینہ نے بیان کیا کہ اولادِ اسماعیل میں سے کوئی بھی بت پرست نہ تھا جن کو بت پرست کہا جاتا ہے ان کی بت پرستی کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ وہ پتھروں کا طواف کر لیا کرتے تھے اور اسکو دوار (طواف) کہا کرتے تھے وہ کہتے تھے کعبہ بھی تو پتھروں کا نام ہے (جن کا طواف کیا جاتا ہے) اس لئے ہم جہاں پتھر نصب کر لیں وہ کعبہ کی طرح ہو جائیں گے (ان کا طواف کیا جاسکتا ہے) درمثور میں اتنا مزید آیا ہے کہ سفیان بن عیینہ سے دریافت کیا گیا پھر آپ نے اولادِ اسحاق اور دوسری نسلِ ابراہیمی کو کیوں اس میں داخل نہیں کیا اولادِ اسماعیل کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر کیا سفیان نے جواب دیا، حضرت ابراہیمؑ نے اس شہر کے رہنے والوں ہی کے لئے دعا کی تھی کہ وہ بت پرستی نہ کریں اور آبادی کے بعد انہی کے لئے دعا کی کہ اللہ اس شہر کو پُر امن بنا دے تمام بستیوں کے لئے دعا نہیں کی تھی اور آیت رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ دُرِّيْثٍ میں اسی شہر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ سفیان بن عیینہ کی یہ تشریح قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت و اجماع کے بھی۔ خبر متواتر سے ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب میں مشرکوں سے مراد اہل مکہ (نسلِ اسماعیل) ہیں اور اللہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰشْرَكُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اٰشْرَكْنَا وَلَا اٰبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ دُوْنِهِ مِنْ شَيْءٍ کے علاوہ بھی دوسری آیات سے (یہی) ثابت ہے کہ اہل مکہ مشرک تھے اور ان کے باپ دادا بھی۔

رَبِّ اِنَّهُمْ اَضَلُّنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
اے میرے رب ان مورتیوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے ان کی وجہ سے لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے ان کی پوجا کرنے لگے یہ مورتیاں لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گئیں۔
پس جو شخص (دین میں) میرا پیرو ہو گا وہ میرا ہے یعنی مجھ سے متعلق ہے دنیا اور آخرت میں اس کا تعلق مجھ سے نہیں ٹوٹے گا یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

وَمَنْ عَصٰنِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
اور جو میری نافرمانی کرے گا تو (اس کو تو بخش دے اس پر رحم

فرما کیونکہ تو) غفور و رحیم ہے۔ سدی نے کہا اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو میری نافرمانی کرے پھر توبہ کر لے تو اس کو تو معاف کر دے تو غفور و رحیم ہے۔ مقاتل نے کہا نافرمانی سے مراد ہے شرک سے کم درجہ کی نافرمانی یعنی شرک کے علاوہ جو میری نافرمانی کرے۔

ظاہر یہ ہے کہ (لفظ عصائی میں شرک بھی داخل ہے لیکن) حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب کہ آپ کو شرک کا غیر مغفور ہونا معلوم نہ ہوا تھا جب آپ کو شرک کے غیر مغفور ہونے کی اطلاع دے دی گئی تو اس وقت آپ نے دعا کی **وَأَرْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِّنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ أَمِنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** اور ان کو پھلوں سے رزق دے۔ اور اس (شہر) کے باشندوں میں سے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں کھانے کے لئے پھل عطا فرما۔ اس دعا میں صرف اہل ایمان کو رزق عطا کرنے کی دعا اس لئے کی کہ شرک کے غیر مغفور ہونے کی صراحت سے آپ کو خیال پیدا ہو گیا کہ شرک سے اللہ دنیا میں بھی انتقام لے گا اور اپنے پیدا کئے ہوئے پھلوں سے محروم رکھے گا۔ (چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لئے اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَنْ كَفَرَ فَأُمْتِعْهُ** اور جو کفر کرے گا اس کو تھوڑی مدت (بقدر مدتِ زندگی) میں بہرہ اندوز رکھوں گا پھر اس کو عذابِ دوزخ کی طرف بھیج کر لے جاؤں گا (یعنی کافروں کو دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھوں گا۔ ہاں آخرت میں اس کی مغفرت نہ ہوگی۔)

اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد کو باشندہ کر دیا۔ کچھ اولاد سے **رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي** مراد ہیں اسمعیلؑ اور آپ کی نسل۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمعیلؑ کو وادی مکہ میں رکھا تھا نسلِ اسمعیلی اس کے ذیل میں آ گئی۔

ایسے وادی میں جہاں کھیتی نہیں ہے لغت میں وادی پہاڑی نالے کو کہتے ہیں پھر (توسیعِ **بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ** استعمال کے بعد) چند پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے درمیانی میدان پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا مکہ کی بستی بھی ایسے ہی میدان میں تھی جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ یہ وادی پتھر یا علاقہ تھا ناقابلِ روئیدگی تھا اس لئے اس کو غیر ذی زرع فرمایا۔ **عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ** تیرے ممنوعہ گھر کے پاس۔ بیت اللہ سے مراد وہ بیت اللہ ہے جو طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھا۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جس روز آسمان و زمین بنائے (اسی روز) اس شہر کو باحرمت (ممنوعہ) قرار دے دیا۔ پس روزِ قیامت تک اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ شہر ممنوعہ (باحرمت) رہے گا یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہیں اور ایک ساعت سے زیادہ میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔ روزِ قیامت تک خدا داد حرمت کی وجہ سے یہ باحرمت (ممنوعہ) رہے گا۔ یہاں کے کانٹے یعنی جھاڑیاں (بھی) نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کے شکار کو (بھگا کر) باہر نکالا جائے نہ یہاں گری پڑی چیز کوئی اٹھائے ہوئے اس غرض کے کہ اس چیز کی شناخت کرانی ہو (کہ شناخت کر کے اس کا مالک لے لے) نہ یہاں کی گھاس کالی جائے حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اذخر (مرچیا گند) اس سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ لوہاروں کے اور مکہ والوں کے گھر کے کام میں آتی ہے فرمایا اذخر مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ۔ رواہ ابن عباسؓ۔

واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید کے سلسلہ میں حسبِ ذیل روایت کی ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی تھیں مدت تک حضرت کے پاس رہیں لیکن اولاد نہیں ہوئی جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیلؑ پیدا ہو گئے تو حضرت سارہ کو جذبہٴ رقابت نے ابھارا اور آپ کے دل میں کچھ احساسِ افسردگی و انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے قسم کھالی کہ ہاجرہ کے تینوں ناک کان کاٹیں گی (تاکہ بد صورت ہو جائیں اور حضرت ابراہیمؑ کو ان سے نفرت ہو جائے) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تم اپنی قسم پوری کرنی چاہتی ہو۔ حضرت سارہ نے عرض کیا میں کیا کروں (میری قسم پوری ہونے کی کیا صورت ہو) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاجرہ کے کانوں میں سوراخ کر دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ حضرت سارہ نے ایسا ہی کیا حضرت ہاجرہ نے کان چھدنے

کے بعد دو بالیاں کانوں میں پہن لیں، اس سے ان کا حسن اور بڑھ گیا۔ حضرت سارہ بولیں اس سے تو میں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا غرض حضرت سارہ نے پسند نہیں کیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہیں۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہ سے بڑی محبت تھی۔ (بہر حال) آپ ہاجرہ کو مکہ لے گئے اور چونکہ آپ کو ہاجرہ سے بڑی محبت تھی اور بغیر ہاجرہ کے نہیں رہ سکتے تھے اس لئے روزانہ براق پر سوار ہو کر شام سے مکہ کو ہاجرہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

بخاری نے صحیح میں اور بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے نطق حضرت ہاجرہ نے اس غرض سے پہنا کہ قدموں کے نشانوں کو پیچھے سے نطق کا سر اٹھاتا چلے اور حضرت سارہ کو ان کا نشان قدم معلوم نہ ہو (عرب کی عورتوں نے نطق کا استعمال حضرت ہاجرہ سے ہی سیکھا تھا)

غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ کے پاس پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زم زم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھایا۔ حضرت اسماعیلؑ (ان دنوں) شیر خوار تھے، حضرت ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوڑے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا پھر کوٹ پڑے، حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا ابراہیمؑ آپ ہم کو اس ویران وادی میں (جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز) چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں! اس پر ہاجرہ بولیں تو اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر کوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیمؑ چل دیئے جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبے کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ... یَشْكُرُوْنَ تک۔

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں اور بچہ کو دودھ پلاتی رہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا اور پیاس لگی اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا تو چل دیں بچہ کی طرف نظر اٹھائی تو بچہ اپنی زبان منہ میں گھما رہا تھا یہ منظر دیکھ کر (بے تاب ہو گئیں اور) نظر پھیر لی اور چل کر کوہ صفا پر پہنچ گئیں۔ وہاں سے قریب ترین پہاڑ صفا تھا۔ صفا پر چڑھ کر اوپر کھڑی ہو کر وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آجائے جب کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اتر کر وادی میں پہنچیں اور قوت کے ساتھ دوڑنے والے آدمی کی طرح کڑتے کادامن اوپر کو اٹھا کر دوڑ کر وادی سے گذر کر مروہ پہاڑی پر پہنچیں اور ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کوئی نظر پڑ جائے لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس طرح سات بار کیا حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی لئے (حاجی لوگ صفا مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں آخر (مرتبہ) جب مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز سنی، اور خود اپنے آپ سے کہنے لگیں چپ۔ پھر کان لگا کر سنا تو پھر آوازی سنائی دی۔ کہنے لگیں میں نے آواز تو سنی لی اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہو (تولا) اچانک زم زم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا اور زمین کو ایڑی مارتا کرتا اس نے کھودا نور آبی نکل آیا حضرت ہاجرہ پانی کا گھیرا بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے چلو بنا کر پانی لے کر مشکیزہ میں بھرنے لگیں جو نہی چلو بھر کر اٹھائی تھیں پانی اور ابل آتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ زم زم کو یونہی رہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اگر وہ چلو نہ بھرتیں تو زم زم ایک جاری چشمہ ہو جاتا غرض حضرت ہاجرہ نے خود پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ بھی پلایا فرشتہ نے کہا تم ہلاکت کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے یہ لڑکا اور اس کے والد اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ کعبہ اس زمانہ میں ٹیلہ کی شکل میں زمین سے کچھ اونچا تھا۔ سیلاب آکر اس کے دائیں بائیں کناروں کو کاٹ کر لے جاتا تھا۔ حضرت ہاجرہ اسی حالت میں رہتی رہیں، آخر بنی جرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گذرا اور آکر مکہ کے نشیبی مقام پر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ قافلہ والوں نے دیکھا کہ کچھ پرندے پانی کے اوپر اڑ رہے ہیں کہنے لگے یہ پرندے یقیناً پانی پر گھوم رہے ہیں لیکن ہم تو اس وادی سے پہلے گذر چکے ہیں یہاں تو پہلے کوئی پانی نہ تھا کچھ لوگوں کو (تفتیش احوال کے لئے) بھیجا انہوں نے جا کر دیکھا تو پانی موجود پایا، لوٹ کر آئے اور ساتھیوں کو اطلاع دے دی اس کے بعد قافلہ والوں نے آکر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ سے گزارش کی کہ ہم کو اپنے پاس رہنے کی

اجازت دے دیں حضرت ہاجرہ نے فرمایا لیکن پانی پر تمہارا کوئی (مالکانہ) حق نہ ہوگا۔ قافلے والوں نے اس کا اقرار کر لیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ انس کی طالب تھیں (تنہائی کی وحشت دور کرنا چاہتی تھیں) پانی پر قبضہ انہی کا رہا قافلہ والوں نے اپنے متعلقین کو بھی بلوایا اور سب وہیں مقیم ہو گئے رفتہ رفتہ بہت خاندان بن گئے اسماعیلؑ بھی جوان ہو گئے بنی جرہم سے عربی بھی انہوں نے سیکھ لی اور جوان ہونے کے بعد سب کے محبوب بن گئے بنی جرہم نے اپنی ہی ایک عورت سے ان کا نکاح کر دیا اور اسماعیلؑ کی والدہ کی وفات بھی ہو گئی۔

حضرت اسماعیلؑ کا نکاح ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ (اپنی دعا کی) برکت کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ باقی حصہ ہم نے سورت بقرہ کی آیت **وَآتَخِذُوا مِن تَقَامِ اِبْرٰهٖمِ مُصَلِّیْ** کی تفسیر کے ذیل میں نقل کر دیا ہے۔

رَبَّنَا لِيَقِيْمُوا الصَّلٰوَةَ
اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں یعنی میں نے اپنی اولاد کو اس ویران وادی میں جہاں نہ کچھ کھانے کو ہے نہ آرام کا کوئی ذریعہ ہے صرف اس لئے رکھا ہے کہ وہ تیرے محترم گھر کے پاس نماز قائم کریں ربنا کو مکرر ذکر کرنے سے اور درمیان میں لانے سے اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں اپنی اولاد کو رکھنے سے میرا مقصود صرف اقامتِ صلوة ہے اور میری دعا کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ ان کو نماز کی توفیق عطا فرمائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ **لِيَقِيْمُوا** کا صیغہ ہے اس سے آپ کا مقصد تھا اولاد کے لئے اقامتِ صلوة کی دعا کرنا گویا آپ نے یہ لفظ کہہ کر اولاد کو اقامتِ نماز کا حکم غائبانہ دیا اور اللہ سے دعا کی کہ ان کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

فَاَجْعَلْ اَفْئِدَةَ قٰمِنِ النَّاسِ
پس کچھ لوگوں کے دلوں کو بنا دے۔ من الناس میں من تبعیض کے لئے ہے یعنی کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف پھیر دے۔ مجاہد نے کہا اگر (بغیر من کے) **اَفْئِدَةَ النَّاسِ** فرماتے تو تمام فارسی، رومی، ہندی اور ترک تم پر ہجوم کر آتے۔ سعید بن جبیر نے کہا یہودی، عیسائی اور مجوسی بھی کعبہ کا حج کرنے لگتے۔ مگر من الناس فرمایا اب صرف مسلمان ہی حج کرتے ہیں۔

تَهْوٰی اِلَیْہِمَّ
کہ (شوق و محبت میں) ان کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں۔ یہی نے ترجمہ کیا کہ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف جھک جائیں۔

وَارْتَفِعُوْہُمْ مِّنَ الشَّمْرِ لَعَلَّہُمْ یَشْكُرُوْنَ ۴۵
اور کھانے کے لئے ان کو پھل عطا فرما۔ امید ہے کہ وہ تیری نعمت کا شکر ادا کریں گے۔ یعنی باوجودیکہ یہ وادی ویران ہے اس میں کھیتی باڑی اور باغ نہیں ہیں مگر ان کو یہاں پھل عطا فرما، جس طرح شاداب مقامات پر رہنے والوں کو تو عطا فرماتا ہے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی وادی کو پُر امن حرم بنا دیا یہاں ہر طرف سے پھل لائے جانے لگے یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں یہاں گرمی سردی اور رنج و خریف کے پھل ملتے ہیں۔

رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا نَعْلَمُ
اے ہمارے رب ہم جو کچھ چھپائے رکھیں یا ظاہر کریں تو سب کو جانتا ہے یعنی ہمارے تمام احوال و مصالحوں سے واقف ہے اور ہم سے زیادہ ہم پر رحم کرنے والا ہے ہم کو دعا کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن ہم اپنی عبدیت و بندگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے تجھ سے دعا کرتے ہیں اور اپنی احتیاج کا اظہار کرنے اور تیری رحمت کی طلب میں اور عجلت اختیار کرنے کی غرض سے تجھ سے سوال کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے کہ **مَا نَخْفِیْ وَمَا نَعْلَمُ** سے مراد ہے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو وادی غیر فروع میں چھوڑنے کا غم جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ **مَا نَعْلَمُ** سے مراد ہے زاری اور تضرع اور ما نخفی سے مراد ہے غم جدائی۔

وَمَا یَخْفٰی عَلٰی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمٰوٰتِ ۴۸
اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے زمین میں نہ آسمان میں وہ بالذات عالم ہے اس کے علم کی ہر چیز کی طرف نسبت برابر ہے۔ لہذا ہر چیز اس کو معلوم

ہے (ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو معلوم ہو اور کوئی نامعلوم) اکثر علماء کے نزدیک یہ اللہ کا قول ہے بعض علماء اس کو حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا جز قرار دیتے ہیں۔

التَّحَمُّدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ
جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھ کو اسمعیلؑ و اسحاقؑ (دونوں بچے) عطا فرمائے یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا ایسی حالت میں اللہ نے اولاد عطا فرمائی یہ اللہ کی عظیم الشان نعمت اور شانِ قدرت ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال کی تھی تو حضرت اسمعیلؑ پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہوئی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک سو سترہ سال کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔

إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝۳۹
میرا رب دعا کو خوب سننے والا ہے یعنی دعا قبول کرنے والا ہے سَمِيعُ الْمَلِكِ الْكَلَامِ بادشاہ نے بات سن لی یعنی بات کا اثر لے لیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی اور اولاد ہونے کی درخواست کی تھی اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ناامیدی کی حالت میں زینہ اولاد عطا کی۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۝۴۰
اے میرے رب مجھے اور میری کچھ نسل کو نماز کا پابند بنا۔ اقامتِ صلوٰۃ نماز کو ارکان و آداب اور پابندی اوقات و شرائط کے ساتھ ہمیشہ ادا کرنا۔ مِنْ ذُرِّيَّتِي میں من تبعیضی اس لئے ذکر کیا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آئندہ میری نسل میں کچھ کافر بھی ہوں گے کیونکہ اللہ نے فرمادیا تھا لَا يَنَالُ عَمْدِي الظَّالِمِينَ۔

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝۴۱
اے میرے رب اور میری دعا (یا عبادت) قبول فرما۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے امام احمد نے اور بخاری نے الْأَذْبَابِ میں اور چاروں اصحابِ ائسن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے اور ابو یعلیٰ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيْ
اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والدین مسلمان تھے آزر آپ کا چچا تھا اور تاریخ آپ کے باپ کا نام تھا۔ تفصیل سورہ بقرہ میں گذر چکی ہے چونکہ آزر کا لفظ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے اگر وَالِدَيْ کی جگہ أَبَوَيْ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو خیال ہو سکتا ہے شاید حضرت نے آزر کے لئے بھی دعاء مغفرت کی تھی (باوجودیکہ آزر مشرک تھا اور مشرک ناقابلِ مغفرت ہے) اس خیال کو دفع کرنے کے لئے وَالِدَيْ فرمایا یعنی حقیقی ماں اور حقیقی باپ۔ اور بالفرض اگر آزر کو (حقیقی) باپ مان بھی لیا جائے تو اس کے لئے دعاء مغفرت کی وجہ خود ہی اللہ نے بیان فرمادی ہے کہ ابراہیمؑ نے باپ کے لئے دعاء مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی کہ اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے سبزار ہو گئے اور سبزاری کا اظہار کر دیا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيمَ لَابِيهِ اِلَّا عَنْ تَوْعِدَةٍ وَعَدَّهَا اِيَّاهُمْ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ اَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ تَبَرَّ اَيْتَهُ۔

وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝۴۲
اور (تمام) ایمان والوں کو جس روز حساب برپا ہوگا۔ برپا ہونے سے مراد ہے موجود ہونا یا ظاہر ہونا۔ یہ معنی قیام علی الرجل (پاؤں پر کھڑا ہونا) سے مستعار لیا گیا ہے محاورے میں بولا جاتا ہے قَامَتِ الْحَرْبُ عَلَى سَاقٍ لڑائی اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی (یعنی برپا ہو گئی) یا الْحِسَابُ سے پہلے لفظ اہل محذوف ہے یعنی جس روز اہل حساب کھڑے ہوں گے جیسے آیت وَاسْأَلُ الْقُرْيَةَ اور بستی سے پوچھ لو یعنی بستی والوں سے بعض لوگوں نے کہا کہ کھڑے ہونے کی نسبت حساب کی طرف مجازی ہے (پہلی صورت میں مجازی الحذف ہو گا اور اس صورت میں مجازی الاسناد) یعنی لوگ

حساب کے لئے کھڑے ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۝
 خیال کرو کہ اس کو حقیقتِ امور کا علم نہ ہو یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آپ تو اللہ کو غافل خیال ہی نہیں کر سکتے تھے یہ تو ہم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ حضور اللہ کو لا علم سمجھتے ہیں اس لئے آیت میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو اللہ کو واقفِ کل جانتے ہیں اس خیال پر آپ جمے رہیں اور جانتے رہیں کہ اللہ ظالموں کے تمام احوال و افعال پر مطلع ہے اس سے ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں وہ لا محالہ ان کے ہر چھوٹے بڑے ظلم کی سزا دے گا۔

یا آیت میں خطاب عمومی ہے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ کی ذات و صفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کو غافل خیال کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے کو اللہ کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہے بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مظلوم کے لئے پیامِ تسلی اور ظالم کے لئے عذاب کی دھمکی ہے۔

إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۝
 کیونکہ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی یعنی اس دن کے ہول سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی پلک نہ جھپکے گی یا یہ مطلب ہے کہ نظر اٹھ جائیں گی اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔

مُهْطِعِينَ
 تیزی کے ساتھ بھاگ رہے ہوں گے ادھر ادھر منہ پھیر کر نہیں دیکھیں گے نہ یہ جانیں گے کہ ان کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ قنادہ نے کہا تیزی کے ساتھ بلانے والے کی طرف دوڑیں گے۔ مجاہد نے کہا رنگلی باندھے ہوں گے، برابر نظر جمائے ہوں گے۔ قاموس میں ہے ہَطَّعَ (ماضی) ہَطُّوعًا (مصدر) سامنے سے دوڑتا ہوا تیزی کے ساتھ آیا، یا کسی چیز پر نظر جمائے رکھی نگاہ نہ ہٹائی۔ مُهْطِعٌ بروزن محسن عاجزی کے ساتھ دیکھنے والا جو اپنی نظر کو نہ ہٹا سکے یا خاموشی کے ساتھ پکارنے والے کی آواز کی طرف جانے والا۔

مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ
 اپنے سر اوپر اٹھائے۔
 قسبی نے کہا مُقْنِعٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو سر اٹھائے اپنے سامنے دیکھتا رہے، سامنے سے نظر نہ ہٹائے۔ حسن نے کہا قیامت کے دن لوگوں کے منہ آسمان کی طرف ہوں گے کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھے گا۔
 لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۝
 ان کی نظر ان کی طرف واپس نہیں آئے گی۔ کہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں بلکہ رنگلی باندھے اوپر ہی کی طرف تکتے رہیں گے۔

وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ۝
 اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے یعنی انتہائی دہشت اور حیرت کی وجہ سے ان کے دل، فہم و عقل سے خالی ہو جائیں گے۔ احمق آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے قَلْبُهُ هَوَاءٌ اس کا دل (فہم سمجھ اور قوت سے) خالی ہے (مطلب یہ کہ اس کا دماغ کھنڈ کھلا ہے) قنادہ نے کہا ان کے دل سینوں سے نکلنے لگیں گے اور حلق میں آکر اٹک جائیں گے نہ منہ سے باہر آئیں گے نہ اپنی جگہ پر لوٹیں گے۔ پس دل ہوا ہو جائیں گے یعنی ان کے اندر کچھ نہ ہوگا۔ آسمان و زمین کی درمیانی خلاء کو اسی وجہ سے ہوا کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ان کے دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا۔ بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل اپنی جگہ سے ہٹ چکے ہوں گے اور نظریں خیرہ اور اوپر کو اٹھی ہوئی رنگلی باندھے تنگ رہی ہوں گی۔

وَأَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ
 اور (اے محمد ﷺ) لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس دن ان پر عذاب آجائے گا یعنی قیامت کے دن یا مرنے کے دن سے۔ مرنے کا دن بھی عذاب کا پہلا دن ہوگا، یا یہ مراد ہے کہ اس دن سے ڈراؤ جس روز ان کو مکمل تباہ کرنے اور جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے والا عذاب دنیا میں ہی آجائے گا۔

فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا
ظلم کیا ہے کہیں گے۔

پس ظالم یعنی وہ لوگ جنہوں نے شرک اور تکذیبِ رسول ﷺ کر کے اپنے اوپر
اے ہمارے رب ہم کو (دنیا میں) مہلت دے، یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو دنیا میں لوٹا دے اور عذاب کو
پچھے کر دے۔

إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ
تیری دعوت کو قبول کر لیں۔

تیرے دعوت کو قبول کر لیں اور تیرے پیغمبروں کی پیروی کریں یہ
نَجِبٌ دَعْوَتِكَ وَتَتَّبِعِ الرَّسُولَ
امر کا جواب ہے اسی کی نظیر آیت لَوْلَا آخِرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَقَ وَآكُنُ مِنَ الصَّالِحِينَ ہے اس در خواست
کا ان کو جواب دیا جائے گا۔

إِذْ لَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلِ مَا لَكُمْ مِنْ سِنَائِلٍ
کیا اس سے پہلے (دنیا میں) تم
نے قسمیں کھا کر یہ نہیں کہا تھا کہ ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے ہم کو کبھی نہیں مرنے کا ہے شاید یہ الفاظ انہوں نے انتہائی غرور و تکبر کی
حالت میں کہے ہوں یا اقسام سے مراد ہے دلالتِ حال کی پختگی۔ انہوں نے مستحکم عمارتیں بنائی تھیں لمبی لمبی امیدیں باندھی
تھیں جس سے (بدلالتِ التزامی) ثابت ہو رہا تھا کہ ان کو اپنے ہمیشہ رہنے کا یقین ہے۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ (زوال
سے مراد ہے دارِ آخرت کی طرف منتقل ہو جانا) انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم کو دارِ آخرت کی طرف پہنچنا نہیں (قیامت
نہیں ہوگی اور دوبارہ کوئی زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا) دوسری آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ
جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ انہوں نے پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اس کو اللہ دوبارہ زندہ نہیں
کرے گا۔

وَسَكَنْتُمْ فِي مَسْكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ
اور جن لوگوں نے (کفر و معصیت
کر کے) اپنے آپ پر خود ظلم کیا تھا (جیسے قوم نوح، عاد، ثمود وغیرہ) کیا ان کے گھروں میں ان کی جگہ پر تم نہیں رہے تھے۔

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْآمَثَالَ
اور (کیا ان کے آثارِ قدیمہ کا
مشاہدہ کر کے اور ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی خبر سن کر) تم پر ظاہر نہ ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور (کیا) تمہاری
عبرت کے لئے ہم نے (ان کے احوال کی) مثالیں (نہیں) بیان کر دی تھیں۔ یعنی کیا ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور ان کی زبانی
نہیں بیان کر دیا تھا کہ تم کفر و استحقاقِ عذاب میں گزشتہ اقوام کی طرح ہو یا یہ مطلب کہ گزشتہ اقوام کے حالات و اعمال اور ان
کے نتائج جو قدرت میں مشہور کہاوتوں کی طرح ہو گئے تھے تم سے بیان نہ کر دیئے تھے، یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری سبق
آموزی کے لئے ہم نے قرآن میں مثالیں نہیں بیان کر دی تھیں۔

وَقَدْ مَكَرُوا وَمَكْرَهُمْ
اور انہوں نے اپنی سازشیں کیں یعنی کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو جلا وطن کرنے
یا قید کر دینے یا قتل کر ڈالنے کی سازش کی۔ اہل تفسیر کے نزدیک مکروا کی ضمیر فاعلی اور ضمیر مہم دونوں کفار مکہ کی طرف لوٹ
رہی ہیں۔ یعنی کفار مکہ نے اپنی ہی ہر تدبیر کر لی اور حق کو مٹانے اور باطل کو اٹھانے کی ہر کوشش جو کر سکتے تھے کر لی۔ اس تفسیر پر
اس کلام کا سابق کلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میرے نزدیک اس جملے کا عطف سَكَنْتُمْ پر ہے مَكْرُوا کی ضمیر تو کفار مکہ کی
طرف راجع ہے۔ اور مہم ضمیر الذین کی طرف لوٹ رہی ہے اور الذین سے مراد اقوام گزشتہ ہیں یعنی کفار مکہ نے بھی گزشتہ
امتوں کے کافروں جیسے فریب کئے اور ان کی تدبیروں کی طرح سازشیں کیں۔

وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ
اور اللہ کے پاس ان کا فریب (لکھا ہوا) موجود ہے وہ اس فریب کاری کی ان
کو سزا دے گا یا یہ مطلب ہے کہ ان کی سازشوں اور مکاریوں کی سزا دینے کے لئے اللہ کے پاس بھی پوشیدہ تدبیر ہے جس سے ان

کی سازشوں کو بے حقیقت کر دے گا۔

وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِلتَّزْوِيلِ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝

اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے

پہاڑ بھی ٹل جائیں ان نافیہ ہے اور لتزویل میں لام تاکید نفی کے لئے ہے اور "جبال" سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا معاملہ اور قوانین شریعت اور آیات خداوندی مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر ایسا نہیں کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں یعنی نبوت محمدیہ اور احکام الہیہ ان کی سازشوں سے باطل نہیں ہو سکتے نہ ان کی فریب کاریوں سے ان میں زوال آسکتا ہے۔ یٰٰلَئِنَّ اِنَّ كَا مَحْقَقٌ ہے مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور شریعت الہیہ اور احکام خداوندی جو پہاڑوں کی طرح پائیدار ہیں، انہوں نے اپنی سازشوں سے ان کو اکھاڑ دینا چاہا اور ارادہ کیا کہ فریب و مکر سے ان کی تیج کنی کر دیں لیکن ایسا ناممکن ہے۔ حسن نے کہا ان کا مکر پہاڑوں کو ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ ابن جریج کی قرأت میں لتزویل کی جگہ لتزویل آیا ہے۔ اِنَّ مَحْقَقٌ ہے اور لام تاکید فیصل کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر بلاشبہ ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ کر اکھڑ جائیں۔ یہی مضمون ایک اور آیت میں آیا ہے۔

تَخِرُّ الْجِبَالُ هَذَا اَنْدَعُو لِلرَّحْمٰنِ وَكَدٰ

بغوی نے حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نمرود کے حق میں ہوا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کی ہستی کی بابت مناظرہ کیا تھا نمرود نے کہا اگر ابراہیمؑ کا قول سچا ہے تو میں آسمان تک پہنچ کر خود دیکھوں گا کہ وہاں کون ہے، کیا ہے۔ چنانچہ آسمان تک چڑھنے کی اس نے یہ اسکیم بنائی کہ گیدھ کے چار بچے لے کر ان کو پالا اور ٹریننگ دی جب وہ جوان ہو گئے تو ایک صندوق بنوایا اور جس کے دو دروازے قائم کئے۔ ایک بالائی جانب ایک نیچے کی طرف اور چار لکڑیاں لے کر صندوق کے ہر گوشہ میں ایک ایک لکڑی کھڑی کر دی اور ہر لکڑی کی بالائی نوک پر گوشت کا ٹکڑا باندھ دیا پھر صندوق کو گیدھوں کی ٹانگوں سے باندھ دیا (صندوق نیچے گدھ اوپر اور لکڑیوں میں گوشت باندھا ہو گا گدھوں کے اوپر) اسکے بعد نمرود ایک آدمی کو ساتھ لے کر صندوق میں بیٹھ گیا اور گدھوں کو اڑایا گدھ اڑے اور گوشت حاصل کرنے کے لئے اوپر اٹھتے گئے (جتنا اوپر اٹھتے تھے گوشت لکڑیوں میں لٹکتا ہوا ان کے اوپر ہی رہتا تھا اور گدھوں کی رسائی گوشت تک نہیں ہوتی تھی) اس طرح اوپر چڑھتے رہے اور دور ہوا میں پہنچ گئے۔ ایک روز گزر گیا تو نمرود نے ساتھی سے کہا اوپر کا دروازہ کھول کر دیکھو آسمان قریب آگیا یا نہیں ساتھی نے دروازہ کھول کر دیکھا اور بولا آسمان تو ویسا (ہی دور) ہے جیسا پہلے تھا۔ نمرود نے کہا اب نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھو آسمان تو ویسا (ہی دور) ہے جیسا پہلے تھا۔ نمرود نے کہا اب نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھا اور کہا زمین ایک تالاب کی طرح اور پہاڑ دھوئیں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ غرض گدھ اڑتے اور اوپر کو اٹھتے رہے یہاں تک کہ ایک دن اور گزر گیا اور اب خلا گدھوں کی اڑان میں رکاوٹ پیدا کرنے لگی نمرود نے ساتھی سے کہا اب دونوں دروازے کھول کر دیکھو اوپر کا دروازہ کھولا تو آسمان ویسا ہی اپنی ہیئت پر نظر آیا اور نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو زمین کی جگہ صرف ایک تاریک سیاہی نظر آئی اور (غیب سے) ندا آئی باغی تو کہاں جانا چاہتا ہے۔ عکرمہ کا بیان ہے نمرود کے ساتھ تابوت میں ایک غلام بھی تیر کمان لئے موجود تھا غلام نے (اوپر کی جانب) تیر پھینکا، تیر خون آلودہ ہو کر لوٹ آیا کوئی مچھلی (بحکم خداوندی) سمندر سے تڑپ کر خلا میں پہنچ گئی تیر اسی کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ بعض نے کہا کسی پرندے کے خون سے آلودہ ہو گیا تھا نمرود نے کہا آسمان والے خدا کے کام سے تو میں فارغ ہو گیا پھر ساتھی کو حکم دیا اب (ستون والی) لکڑیوں کو اکٹھا دو اوپر کا رخ نیچے کی طرف کر دو۔ ساتھی نے حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح گوشت نیچے کی طرف ہو گیا اور گدھ گوشت کو نیچے کی طرف دیکھ کر نیچے اترنے لگے۔ پہاڑوں نے صندوق اور گدھوں کی سرسراہٹ سنی تو خوف زدہ ہو گئے ان کا خیال ہوا کہ آسمان سے کوئی نئی مصیبت آگئی اور قیامت برپا ہو گئی۔ خوف زدہ ہو کر قریب تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں یہ ہی مفہوم ہے آیت وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِلتَّزْوِيلِ مِنْهُ الْجِبَالُ کا (حضرت مفسر نے فرمایا کہ) یہ روایت عقل و درایت کے بھی خلاف ہے اور نقل صحیح کے بھی۔

لہ آیت میں وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ ہے لیکن اس روایت میں كَانَ کی جگہ كَادَ ہے یا یہ ناقل کا سو قلم ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفًا وَعْدًا رُسُلَهُ ط
پس آپ یہ خیال بھی نہ کرنا کہ اللہ نے جو وعدہ اپنے پیغمبروں سے ان کی نصرت اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کا کیا ہے وہ ان کے خلاف کرنے والا ہے۔ اللہ نے اپنے پیغمبروں کی نصرت کا وعدہ ایک اور آیت میں کیا ہے فرمایا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا اور پیغمبروں کو غالب کرنے اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کے متعلق فرمایا ہے لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ وَلَنُسَكِّنَنَّكُمْ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ۔ وَعَدِيهِ كَوْرُسُلَهُ سے پہلے ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ وعدہ خلافی کرتا ہی نہیں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ اور وہ کسی سے وعدہ خلافی نہیں کرتا تو پیغمبروں سے جو وعدہ کیا ہے اسکے خلاف کیسے کر سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ
نا قابل شک ہے یہ بات کہ اللہ غالب ہے اس کے مقابلے میں کوئی سازش نہیں کی جاسکتی اور ایسا قادر ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔
ذُو انْتِقَامٍ ﴿۵۷﴾ (اپنے دوستوں کا دشمنوں سے) انتقام لینے والا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ
جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی، اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی یَوْمَ تَبْدَلُ يَوْمَ يَأْتِيهِمْ اور السَّمٰوٰتُ کا عطف الارض پر ہے۔

تبدیل دو طرح کی ہوتی ہے ایک تبدیل ذاتی یعنی ایک شے کی بجائے دوسری چیز لے آئی جائے جیسے میں نے درہم کو دینار سے بدل دیا، درہم دے کر دینار لے لیا۔ اللہ نے فرمایا ہے بَدَلْنَا هُمْ جُلُودًا غَيْرَ هٰذَا ہم ان کو ان کی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں دے دیں گے (۲) تبدیل وصفی (یعنی نفس شے تو باقی رکھی جائے اس کی حالت شکل وغیرہ بدل جائے) جیسے بَدَّلْتُ الْحَلْقَةَ بِالْحَاثِمِ میں نے چھلا بدل کر انگوٹھی بنا دی یعنی چھلے کو پگھلا کر انگوٹھی کی شکل دے دی۔ چھلے کی شکل کو انگوٹھی کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے حضرت ابن مسعود نے فرمایا یہ زمین بدل کر ایسی زمین کر دی جائے گی جو چاندی کی طرح ہوگی جہاں نہ کبھی حرام خون بہایا گیا ہو گا نہ کوئی اور گناہ کیا گیا ہو گا۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے، یعنی حضرت ابن مسعود کا قول نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے، اور حضرت ابن مسعود راوی ہیں اور موقوفاً بھی یعنی حضرت ابن مسعود کا قول بھی قرار دیا ہے اور موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ میں کہتا ہوں اس جگہ موقوف حدیث بھی مرفوع کی طرح ہے۔ (واقعات قیامت کا بیان اجتہاد، فکر ورائے سے کوئی صحابی نہیں کر سکتا کہ جس میں غلطی کا امکان ہو سکے۔ مبداء و معاد ملائکہ، نبوت، جنت و دوزخ اور مستقبل کے سلسلے میں جو اقوال کسی صحابی کی طرف منسوب ہیں وہ یقیناً صحابی کے از خود نہیں ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنے ہوئے ہیں احتیاطاً کسی اور وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت نہیں کی گئی پس تبدیل ارض و سماء کے سلسلے میں جو حضرت ابن مسعود کا قول ہے وہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے مترجم)

ایک دوسری سند سے ابن جریر و حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا یہ زمین بدل کر سفید زمین ہو جائے گی جیسے خالص چاندی یا احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ایوب کی روایت سے اور (صرف) ابن جریر نے حضرت انس کی روایت سے (موقوفاً) بیان کیا، قیامت کے دن اللہ اس زمین کو چاندی کی ایسی زمین سے بدل دے گا جس پر گناہ نہیں کیا گیا ہو گا۔ ابن جریر نے ابو حمزہ کے سلسلے سے حضرت زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا، یہ زمین چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔ ابن ابی الدنیا نے صفت الجنۃ میں حضرت علی کی روایت سے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا کہ (حضرت علی نے فرمایا) زمین چاندی کی ہوگی اور آسمان سونے کا۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ زمین ایسی ہوگی جیسے چاندی اور آسمان بھی ایسا ہی ہوگا۔ عبد بن حمید نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے، عکرمہ نے کہا ہم کو

بھوکے ہوں گے ایسے بھوکے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بہت زیادہ پیاسے ہوں گے ایسے پیاسے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بالکل برہنہ ہوں گے کبھی ایسے ننگے نہ رہے ہوں گے اور ایسے تھکے ہوئے ہوں گے کہ کبھی ایسے نہ تھکے ہوں گے۔ پس جس نے دنیا میں اللہ کے لئے کھانا کھلایا ہو گا اللہ اس روز اس کو کھانا کھلائے گا اور جس نے اللہ کے لئے پانی پلایا ہو گا اللہ اس کو پانی پلائے گا اور جس نے اللہ کے واسطے لباس پہنایا ہو گا اللہ اس کو لباس پہنائے گا اور جس نے (اللہ کے لئے) کوئی عمل کیا ہو گا اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ابن کعب نے کہا آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی اور زمین تبدیل کر کے کچھ اور کر دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعود کا ایک قول آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین آگ ہو جائے گی۔ کعب احبار کا قول ہے کہ سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی۔

مسلم نے حضرت ثوبان کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا جس روز زمین دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اس روز لوگ کہاں ہوں گے حضور ﷺ نے فرمایا ایل سے ورے تاریکی میں۔

مسلم نے حضرت عائشہ کا بیان نقل کیا ہے ام المؤمنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بیان فرمائیے کہ جس روز زمین تبدیل کر دی جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے، فرمایا صراط پر۔ بیہتی نے کہا اس حدیث میں صراط کا لفظ بطور مجاز استعمال کیا گیا ہے چونکہ لوگوں کو (اسکے بعد) صراط سے گزرنا ہو گا اس لئے بطور مجاز صراط پر ہونے کی صراحت فرمائی اب حضرت ثوبان کی روایت سے اس روایت کی مطابقت ہو جائے گی ثوبان کی روایت میں ایل سے ورے تاریکی میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ تبدیل ارض یعنی اس زمین سے منتقل ہو کر ارض موقوف پر پہنچنا تو زجرہ (جھڑکی یا جھنجھوڑ) کے وقت ہو گا (جو ایل صراط پر پہنچنے سے پہلے ہوگا)

بیہتی نے حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دونوں خاک ہو جائیں گے جو کافروں کے چہروں پر پڑے گی مؤمنوں کے چہروں پر نہیں پڑے گی وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کا یہی مطلب ہے کافروں کے چہروں پر اس روز خاک ہو گی جن پر سیاہی چڑھی ہو گی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ قدام کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کیا تبدیل ارض سے مراد صرف تبدیل اوصاف (احوال، رنگ، ہیئت وغیرہ) ہے یا تبدیل ذات ہی ہو جائے گی مؤخر الذکر قول کو ابن ابی حمزہ نے ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ دنیا کی زمین نابود ہو جائے گی اور موقوف قیامت کی نئی زمین پیدا کی جائے گی۔

شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ تبدیل ارض کی احادیث اور زمین کو کھینچ کر پھیلانے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ یہ سارے حوادث ارض دنیا پر واقع ہوں گے اور موقوف کی زمین اس کے علاوہ ہو گی تو ایک جھڑکی سے سب لوگ یہاں سے نکل کر ارض محشر میں پہنچ جائیں گے۔

ابن حجر نے لکھا ہے اسی طرح ان احادیث میں بھی باہم مناقات نہیں جن میں سے کسی میں زمین کاروٹی ہو جانا اور کسی میں خاک ہو جانا اور کسی میں آگ ہو جانا کو رہے کچھ زمین روٹی بن جائے گی کچھ خاک ہو جائے گی اور سمندر کی زمین آگ ہو جائے گی۔ حضرت ابی بن کعب کا اثر اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ مؤمنوں کے قدموں کے نیچے کی زمین روٹی بن جائے گی اور کافروں کے قدموں کے نیچے کی زمین خاک اور آگ ہو جائے گی۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ صاحب انصاح نے ان تمام متضاد احادیث کا تعدد و دور کرنے کیلئے کہا ہے کہ زمین و آسمان کی تبدیلی دو مرتبہ ہوگی، پہلی مرتبہ نفخۃ صعوق (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) سے چلے ہو گی کہ ستارے جھڑ جائیں گے چاند اور سورج بے نور ہو جائیں گے، آسمان تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گا اس کا پوست اتار لیا جائے

سے اسی لئے خصوصیت کے ساتھ چہروں کا ذکر کیا جس طرح باطنی اعضاء میں دل کی حیثیت ممتاز ہے اور اسی امتیاز کی وجہ سے تَطَّلِعُ عَلَى الْآفَئِكَةِ فرمایا ہے یا یوں کہا جائے کہ جب انہوں نے حق کی طرف اپنا رخ نہیں کیا اور دماغی حواس سے غور کا کام نہیں لیا باوجودیکہ آلات شعور و ادراک کی تخلیقی غرض ہی یہ تھی کہ حق پر غور کرنے کا کام ان سے لیا جائے اس لئے قیامت کے دن ان کے چہروں پر آگ چھا جائے گی اور چونکہ ان کے دل و ایمان معرفت سے خالی اور جہالتوں سے پڑتھے اس لئے آگ ان کے دلوں کو جھانکے گی۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

تاکہ جس شخص نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ اللہ اس کو دے دے۔ "نفس" سے

مراد ہے مجرم شخص عام آدمی بھی مراد ہو سکتا ہے۔ فرماں بردار ہو یا نافرماں۔ کیونکہ مجرموں کو سزا دینے کا جب اظہار کر دیا گیا تو اطاعت گزاروں کو اطاعت کا ثواب دیا جانا معلوم ہی ہو گیا اول صورت میں لیجزی کا تعلق مقررین یا نقشی وغیرہ سے ہو گا اور دوسری صورت میں اس کا تعلق برزوا سے۔

إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ⑤

بے شک اللہ بہت تیز حساب لینے والا ہے۔ سیوطی نے کہا یعنی ایک سے حساب فہمی اس کو دوسرے کی حساب فہمی سے نہیں روکتی (ایک ہی وقت میں سب کا حساب لے لے گا) سیوطی نے جلالین میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدھے دن یعنی اس دنیوی دن کی نصف مدت میں سب کی حساب فہمی کر لے گا۔ اس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ نبی کا بیان ہے وہ لوگ (غالباً صحابہ) خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ لوگوں کے حساب سے آدھے دن کی مدت میں فارغ ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک فریق جنت اور دوسرا فریق دوزخ میں قیلولہ کرے گا (دوپہر گزارے گا) رواہ ابو نعیم وابن المبارک۔

ابن ابی حاتم اور ابن مبارک نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اس دن کا آدھا حصہ گزرنے نہ پائے گا کہ یہ (جنت والے جنت میں) اور وہ (دوزخ والے دوزخ میں) قیلولہ کریں گے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کے بعد (قیلولہ کرنے کے ثبوت میں) یہ آیات تلاوت فرمائیں اصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقْرَرًا وَاحْسَنُ مَقِيلًا ۝ ثُمَّ إِنَّ مَقِيلَهُمْ لَآلِى الْجَحِيمِ (اول آیت اہل جنت کے قیلولہ کا بیان ہے اور دوسری آیت میں دوزخیوں کے قیلولہ کا۔)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ وہ صرف دوپہر تک کا وقت ہو گا پھر اولیاء اللہ (جنت کے اندر) کشادہ چشم حوروں کے ساتھ مسہریوں پر (دوپہر گزاریں گے یعنی) قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے میں کہتا ہوں مذکورہ بالا اقوال صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے دن سے مراد ہے آخرت کا آدھا دن (اس سے دنیوی دن کا آدھا حصہ مراد نہیں ہے)

هَذَا يَهْدِي قُرْآنُ يَاسُورَتِ يَاسُورَتِ كَآدِرِ آيَتِ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهُ فِي جُودِ عِظٍ وَنُصِيحَتِ دَرَجَ هِـ

بَلِّغُوا لِلنَّاسِ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (یعنی پوری نصیحت ہے)

وَلِيُنذِرُوا بِهِ وَيَلْعَلَهُمْ أَنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَلِيُنذِرُوا لَوْ أَلَّابَابِ ⑥

اور تاکہ اس کے ذریعہ عذاب سے ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کر لیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں جس عذاب قیامت سے ان کو ڈر لیا جائے گا اور وہ ڈر جائیں گے تو یہ خوف ان کو غور و فکر کرنے پر آمادہ کر دے گا اور غور و تأمل کے بعد وہ آیات اور نشانیاں ان کے سامنے آجائیں گی جو اللہ کی توحید کو ثابت کرنے والی ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اللہ کو واحد لا شریک مان لیں گے اور تسلیم توحید کے بعد اللہ کی نافرمانی سے رک جائیں گے۔

ان آیات میں اللہ نے بلاغ قرآنی کے تین فائدے بیان فرمائے تمام آسمانی کتابیں نازل ہونے کی یہی تین حکمتیں ہیں:

(۱) پیغمبروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرانا تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔

(۲) انسان کی قوتِ فکریہ کی تکمیل قوتِ فکریہ کا انتہائی کمال اعتراف توحید ہے۔

(۳) قوتِ عملیہ کی درستگی جو نصیحت پذیری اور اختیارِ تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ تفسیر سورہ ابراہیم کی تالیف محمد رشید رضا نے ۱۳۰۲ھ کو لکھی ہے۔

ہوئی تفسیر سورہ ابراہیم کی تالیف محمد رشید رضا نے ۱۳۰۲ھ کو لکھی ہے۔
انسانی قوتِ عملیہ کی درستگی جو نصیحت پذیری اور اختیارِ تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔
اولاً و آخراً

سورۃ الحجر

یہ سورۃ تکی ہے اس میں ۹۹ آیات اور چھ ۶ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

الذّٰلِکَ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ الْکَرِیْمَ ۝۱

الذّٰلِکَ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ الْکَرِیْمَ ۝۱

ہیں کامل کتاب اور واضح قرآن کی۔ تک سے سورت کی آیات کی طرف اشارہ ہے الکتاب سے مراد سورت ہے یا قرآن۔ قرآن کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو کامل کتاب بھی ہے اور عربی قرآن بھی ہے، حلال کو حرام سے جدا کرنے والا اور ہدایت و گمراہی کو کھول کر بیان کر دینے والا۔

چودھواں پارہ شروع

کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کیا خوب

رَبِّمَا یُوَدُّ الذِّیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ۝۲

ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے۔ لفظ رَبِّ اظہارِ قلت کے لئے آتا ہے لیکن اس جگہ مجازاً اظہارِ کثرت کے لئے آیا ہے۔ تقلیل و تکثیر میں علاقہ تضاد ہے یا اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اگر ان کو اسلام سے کچھ بھی موڈت ہوتی خواہ ایک ہی بار ہوتی تو ضرور جلد از جلد اسلام کے دائرے میں آجاتے پس جب ان کو اسلام کی موڈت بہت زیادہ ہے تو پھر کفر پر قائم رہنا تعجب انگیز ہے یا تکثیر سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی موڈت ان کے دلوں میں اتنی زیادہ ہو گئی ہے جو ناقابلِ بیان ہے پس قلت کا لفظ ہی اس کے لئے کافی ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک رَبِّ اس جگہ اظہارِ قلت کے لئے ہی ہے کیونکہ قیامت کی ہولناکیاں ان کو دہشت زدہ بنائے ہوئے ہوں گی۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش ہو گا تو مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔

مَا رَبِّمَا یُوَدُّ الذِّیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ۝۲

مناسب تو یہ تھا کہ اس کے بعد فعل ماضی آتا لیکن اللہ کے بیان میں آئندہ ہونے والا واقعہ بھی گزشتہ کی طرح یقینی ہوتا ہے اس لئے ماضی کی جگہ مضارع کا استعمال بھی ماضی ہی کی طرح ہے۔ ابن جریر، ابن مبارک اور بیہقی نے حضرت ابن عباس اور حضرت انس کے متعلق بیان کیا کہ ان دو بزرگوں نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا، اللہ جب دوزخ کے اندر مشرکوں اور گناہ گار مسلمانوں کو جمع کرے گا تو مشرک مسلمانوں سے کہیں گے تم کو بھی تمہارے اعمال کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اس پر اللہ ناراض ہو کر مسلمانوں کو دوزخ سے باہر نکال دے گا (رہا کر دے گا بخش دے گا) ہناد، سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ شفاعت قبول فرما کر مسلسل جنت میں داخل فرمائے گا اور شفاعت کے بعد رحم فرمائے گا بالآخر فرمائے گا جو بھی مسلمان ہو جنت میں چلا جائے (اس وقت کافر تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے) آیت رَبِّمَا یُوَدُّ الذِّیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ کا یہی مطلب ہے۔

طبرانی نے الامد سسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے اور جتنی بتا اللہ چاہے گا نہیں گے پھر (دوزخ کے اندر) مشرک ان کو طعن دیں گے کہ تم نے جو تصدیق کی تھی (اور ایمان لائے تھے) اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس پر اللہ ہر مرد کو دوزخ سے نکال لے گا کسی مرد کو آگ کے اندر نہیں چھوڑے گا یہ فرطنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے آیت رَبَّمَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔ طبرانی، ابن عاصم اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دوزخی دوزخ میں جمع ہو جائیں گے اور حسب مشیت خدا ان کے ساتھ کچھ اہل قبلہ بھی ہوں گے تو کافر مسلمانوں سے کہیں گے کیا تم مسلمان نہ تھے۔ مسلمان کہیں گے تھے کیوں نہیں، کافر کہیں گے تو اسلام سے تم کو کیا فائدہ ہوا۔ تم بھی ہمارے ساتھ دوزخ میں آگئے تو مسلمان کہیں گے ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے اللہ نے ہم کو پکڑ لیا۔ یہ گفتگو اللہ نے گا تو حکم دے گا اہل قبلہ میں سے جو بھی دوزخ کے اندر ہو اس کو نکال لیا جائے چنانچہ سب مسلمان نکال لئے جائیں گے دوزخی کافر جب یہ بات دیکھیں گے تو کہیں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو ہم کو بھی ان (مسلمانوں) کی طرح نکال لیا جاتا پھر حضور ﷺ نے آیت رَبَّمَا يُوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔

بغوی کی روایت میں اس حدیث میں اتنا زائد آیا ہے کہ اللہ ہر اہل قبلہ کے نکالنے کا حکم دے گا اور سب کو نکال لیا جائے گا اس وقت کافر تمنا کریں کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔

طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے کیا اس آیت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ فرماتے سنا ہے۔ فرمایا ہاں میں نے سنا ہے حضور ﷺ فرما رہے تھے، انتقام لینے کے بعد اللہ دوزخ سے اپنی مشیت کے موافق مؤمنوں کو نکال لے گا (لیکن شروع میں) جب مشرکوں کے ساتھ ان مسلمانوں کو دوزخ کے اندر اللہ داخل فرما دے گا تو مشرک کہیں گے تم تو دنیا میں دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہے پھر آج ہمارے ساتھ دوزخ میں کیوں ہو۔ یہ بات سماعت فرمانے کے بعد اللہ شفاعت کی اجازت دے دے گا فوراً قرشتے اور انبیاء اور مؤمن شفاعت کریں گے یہاں تک کہ ان گناہ گار مسلمانوں کو دوزخ سے بحکم خدا نکال لیا جائے گا۔ مشرک یہ بات دیکھ کر کہیں گے کاش ہم بھی تمہاری طرح ہوتے اور تمہاری طرح ہماری بھی شفاعت ہو جاتی۔ ان (رہا شدہ) مسلمانوں کے چہرے چونکہ سیاہ ہوں گے اس لئے (مسلمان) ان کو جہنمی کہیں گے ان کا نام جہنمی ہو جائے گی۔ لیکن وہ اللہ سے دعا کریں گے اے ہمارے رب ہم سے یہ نام الگ کر دے، حکم ہو گا نہر حیات میں غسل کریں گے۔ غسل کے بعد ان کے چہرے گورے چمکدار ہوں جائیں گے اور یہ نام (یا خطاب) ان کا نہیں رہے گا۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ (کافروں کی تمنا) اس وقت ہوگی جب گناہ گار مسلمانوں کو دوزخ سے نکالا جا رہا ہو گا ہناد نے اس آیت کے ذیل میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس وقت لا الہ الا اللہ کا ہر قائل (یعنی ہر مسلمان) دوزخ سے نکل آئے گا۔

ذَرَّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِمُهُمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾ (اے محمد ﷺ) آپ ان (کافروں) کو رہنے دیجئے کہ کھائیں اور (دنیا کے) مزے اڑائیں اور (آخرت کی تیاری سے) ان کو (طول زندگی کی) امید روکے رہے (جب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو) اپنی بد انجامی ان کو خود معلوم ہو جائے گی۔

اس کلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ کافروں کے ایمان لانے سے آپ نا امید ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اللہ کے علم میں ان کافروں کی شقاوت لکھی ہوئی ہے اگرچہ اللہ نے ان کو نصیحت کی ہے مگر یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ نصیحت سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ آیت میں اتمام حجت بھی ہے اور عیش پرستی سے بازداشت بھی اور طول امید کے نتیجے سے تحذیر بھی۔

وَمَا اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَاٰلِهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴﴾ اور ہم نے جہنمی بستیاں ہلاک کی ہیں ان کے لئے ایک معین وقت نوشتہ تھا۔ یعنی لوح محفوظ میں اسکی ہلاکت کا وقت لکھا ہوا تھا جو اللہ کو معلوم تھا۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿۵﴾
 کوئی قوم اپنے مقررہ وقتِ ہلاکت سے پہلے
 ہلاکت کی طرف نہ بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے یعنی مقررہ وقت سے نہ پہلے ہلاکت ہو سکتی ہے نہ پیچھے۔
 وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الذِّكْرُ نَزَّلَ عَلَيْكَ لَمْ جُنُونَ ﴿۶﴾
 بطور استہزاء کہا اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے تو بلاشبہ پاگل ہے یعنی دیوانوں کی ایسی باتیں کرتا ہے کہ کہتا ہے مجھ
 پر قرآن اتارا گیا ہے۔

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۷﴾
 اگر تو (نبوت کے دعویٰ میں)
 سچا ہے تو ہمارے سامنے (شہادت دینے کے لئے) فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جو تیرے دعویٰ کی صداقت کی شہادت دیں اور
 تیری تائید کریں یہی مطلب دوسری آیت میں بھی ادا کیا گیا ہے فرمایا ہے لَوْ لَا أَنْزَلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا يَا
 مَطْلَب ہے کہ ہم جو تکذیب کر رہے ہیں ہم کو عذاب دینے کے لئے فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جس طرح سابق امتوں کو
 ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔

مَا نُنزِّلُ الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنظَرِينَ ﴿۸﴾
 اتارتے ہیں مگر حق (عذاب) کے ساتھ (یعنی اس عذاب کے ساتھ جس کے نازل کرنے کا قطعی فیصلہ اللہ کے نزدیک ہو چکا
 ہوتا ہے) اور اس وقت (کافروں کو) مہلت نہیں دی جاتی۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۹﴾
 بلاشبہ ہم نے ہی قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت
 کرنے والے ہیں۔

اس کلام سے پُر زور طور پر کافروں کے انکار اور استہزاء کی تردید کر دی گئی۔ ”حفاظت کرنے“ سے مراد ہے ہر قسم کی الفاظ
 کے تغیر رد و بدل اور کمی بیشی سے حفاظت، اب کسی طور پر بگاڑ اور تغیر اس میں ممکن نہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ اللہ کی
 طرف سے نازل شدہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں تحریف و تغیر کا امکان ہوتا اور دین کے دشمن نکتہ چینی کر سکتے۔ افسوس کہ
 رافضی گروہ اس آیت کے باوجود قرآن کو بگاڑا ہوا (اور ناقص) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (چالیس پارے تھے) حضرت عثمان
 نے دس پارے جلوادئے۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک کہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اسی کے ہم معنی ہے آیت وَاللَّهُ
 يَعَصْمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی رسول اللہ کو کوئی بداندیش ضرر نہیں پہنچا سکے گا اللہ ان کا حافظ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيْعِ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۰﴾
 اور ہم نے آپ سے پہلے بھی پچھلی امتوں میں
 پیغمبر بھیجے۔ شیع جمع ہے شعیۃ مفرد۔ شیعہ وہ جماعت ہے جو متفق الرائے ہو اور کسی بات پر متحد ہو۔ شاعہ اس کا اتباع کیا اس کے پیچھے
 چلا، چھوٹی لکڑیاں جن کو آگ لگا کر بڑی لکڑیوں کو ان کے ذریعہ سے جلایا جاتا ہے شیع کہلاتی ہے۔

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۱۱﴾
 اور جو پیغمبر بھی ان کے پاس پہنچا
 وہ اس سے ٹھٹھول کرتے رہے۔ جیسا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرتے تھے اس جملے میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام نسی
 ہے۔

كَذَلِكَ نَسُكُّهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۲﴾
 اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرموں کے
 دلوں میں ڈال دیتے ہیں ”المجرمین“ سے مراد ہیں مشرکین مکہ یعنی جس طرح گزشتہ کافر امتوں کے دلوں میں ہم نے کفر و استہزاء کو
 داخل کر دیا تھا اسی طرح مکہ کے ان مشرکوں کے دلوں میں بھی ہم کفر و استہزاء کو داخل کرتے ہیں سلک (پرونا) ایک چیز کا
 دوسری چیز میں داخل کرنا جیسے سوئی میں ڈورے کو اور زخمی میں نیزے کی نوک کو داخل کر دینا۔ اس آیت میں فرقہ قدریہ کے
 قول کا رد ہے (فرقہ قدریہ قائل ہے کہ وہ اپنے افعال کا خود خالق ہے) آیت بتا رہی ہے کہ کافروں کے دلوں میں کفر و استہزاء کو

پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔

اسی وجہ سے یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ
وَقَدْ خَلَّتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳﴾
اور گزشتہ لوگوں کا طریقہ بھی (ایسا ہی) گزرا ہے یعنی اللہ کا طریقہ ان کے ساتھ یہی رہا ہے کہ اللہ نے ان کی مدد نہیں کی اور کفر کو ان کے دلوں میں داخل کر دیا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کو تباہ کر دیا۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿۱۴﴾
(طلبگار ان آیت) پر ہم آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور (فرشتے) اس میں چڑھنے لگیں یعنی ان کافروں کو اپنی آنکھوں سے فرشتے چڑھتے دکھائی دیں۔

حسن نے کہا یَعْرُجُونَ اور ظَلُّوا کی ضمیریں کافروں کی طرف لوٹ رہی ہیں یعنی کافر خود آسمان کی طرف چڑھنے لگیں اور دن کی روشنی میں عجائب آسمانی دیکھتے رہیں۔

لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا
تب بھی (یہی) کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے یعنی جادو کے زور سے ہماری نگاہوں کو بند کر دیا اور دیکھنے سے روک دیا گیا ہے۔

سُكَّرَتْ لفظ سُكَّرَ سے ماخوذ ہے۔ سُكَّرَ کا معنی ہے نہر کو بند کر دینا روک دینا (قاموس) کذا قال ابن عباس۔ حسن بصری نے سُكَّرَتْ کا ترجمہ کیا ہے "ہماری آنکھوں کو جادو زدہ کر دیا گیا ہے"۔ کلبی نے ترجمہ کیا "تاپینا کر دیا گیا ہے" اور قتادہ نے کہا "پچھے کر دیا گیا"۔ قاموس میں سُكَّرَتْ ابصارنا کا ترجمہ کیا گیا ہے "دیکھنے سے روک دی گئیں، حیران کر دی گئیں، ان پر پردہ ڈال دیا گیا"۔

بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ﴿۱۵﴾
بلکہ ہم سحر زدہ لوگ ہیں ہم پر محمد ﷺ نے جادو کر دیا۔ یہی بات کافروں نے دوسرے معجزات کو دیکھ کر بھی کہی تھی، إِنَّمَا أَدْرَبْتُ الْقَافِظَ بَتَارَةً هِيَ كَقَطْعَى يَاقِينٍ تَهَاكَ قُرْآنَ كُوْنِي حَقِيقَتٌ نَّهَيْتٌ بَلْ كَيْفَ حَقِيقَتٌ جَادُوْهُ جَوَافِرُوْنَ كِي قُوْتٌ خِيَالِيَه كُوْمَتَاتُرُ كُرُوْتَا هِي۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا
اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے ہیں۔

”بُرُوجُ“ بڑا ستارہ، تَبْرُج سے یہ لفظ ماخوذ ہے تَبْرُج کا معنی ہے ظاہر ہونا تَبْرَجَتِ الْمَرْأَةُ عَوْرَتٌ نَمُوْدَارٌ هُوَ كُوْنِي عَطِيَه نِي كَمَا بُرُوجِ آسْمَانِ كِي اَنْدَرِ بُرُوعِ بُرُوجِ هِي اِسْ اِيْتِ مِي بُرُوجِ سِي مَرَادُوَه مَعْنِي نِهِي هِي جَوَاهِلِ هِيْتِ كِي اِصْطِلَاحِ مِي آتَا هِي۔ اِهْلِ هِيْتِ كِي اِصْطِلَاحِي مَعْنِي كَا وُجُوْدِ مَنْدَرَجِهِ ذِيْلِ اُمُوْرٍ پَرِ مَوْقُوْفِ هِي۔ تَمَامِ آسْمَانِ بَا هِمِ جُرُوعِ هُوْنِي اُوْرِ اِيَكِ دُوْسَرِي پَرِ حَاوِي هُوْنِ كِي نُوِي آسْمَانِ كِي كُوْمَنِي سِي سَبِ اِسِي طَرَحِ كُوْمَنِي پَرِ مَجْبُوْر هُوْنِ جَسِ طَرَفِ نُوِي آسْمَانِ كِي حَرَكْتِ هُو، پُھَرِ نُوِي آسْمَانِ كِي حَرَكْتِ هُو، پُھَرِ آٹھُوِي آسْمَانِ جَسِ كُو فَلَكَ ثَوَابِتِ كَمَا جَاتَا هِي، كِي لِنِي بِي اِيَكِ مِيْنَطَقِه اُوْرِ دُوْسَرِي دُو قَطْبِ هُوْنِ، پُھَرِ آٹھُوِي آسْمَانِ كِي مِيْنَطَقِه پَرِ قَائِمِ هُو اُوْرِ دُوْنُوْنِ مِيْنَطَقُوْنِ كَا بَا هِمِ قَطَّعِ بِي هُو اُوْرِ چَارُوْنِ قَطْبُوْنِ كِي دَرِ مِيَانِ اِيَكِ خَطِ بِي كُهِنِي جَانِي جَسِ سِي چَارِ قُوْسِ سِيْدَا هُو جَانِي اُوْرِ ہر قُوْسِ مِي تِيْنِ بُرُوجِ هُوْنِ۔ اِسِ تَمَامِ خَرَاْفَاتِ كَا شَرِيْعَتِ اَنْكَارِ كَرْنِي هِي شَرِيْعَتِ سِي آسْمَانُوْنِ كِي حَرَكْتِ ثَوَابِتِ نِهِي بَلْ كِي سِتَارُوْنِ كِي حَرَكْتِ ثَوَابِتِ هُوْتِي هِي اُوْرِ ہر آسْمَانِ كَا دُوْسَرِي آسْمَانِ سِي فَاصلہ پانچ سو برس کی راہ کے بقدر بتایا گیا ہے (ایک آسمان کا دوسرے آسمان سے چسپاں ہونے کا انکار اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے) اور شریعت کے نزدیک آسمانوں کی تعداد سات ہے اس سے زائد نہیں۔

وَزَيَّنَّا لِلنَّظِيرِينَ ﴿۱۶﴾
اور ہم نے (روشنی کی وجہ سے) ان برجوں کو (یا) چاند سورج اور ستاروں کی وجہ سے (آسمان کی زینت عطا کی ہے۔

وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ الرَّجِيمِ ﴿۱۷﴾
اور ہر شیطان مردود سے آسمان کو محفوظ کر دیا ہے کوئی شیطان آسمان والوں کو بہکانے یا وہاں کے احوال معلوم کرنے یا وہاں کے انتظام میں دخل دینے کے لئے نہیں چڑھ سکتا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول لکھا ہے کہ پہلے آسمان تک پہنچنے سے شیطانوں کی روک ٹوک نہ تھی وہ جا کر آسمانوں کی خبریں لاتے اور کاہنوں کے دلوں میں القاء کرتے تھے جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو تین بالائی آسمان پر جانے سے شیطانوں کو روک دیا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ کی میلاد مبارک ہوئی تو باقی چار آسمانوں تک جانے کی بھی ممانعت کر دی گئی اب جو کوئی شیطان چوری چھپے (اوپر جا کر) کوئی خبر سن پاتا تھا فوراً اس پر (ٹوٹنے والا ستارہ بشکل) انگار امارا جاتا تھا، ان شیطانوں کی جب کامل بندش ہو گئی تو انہوں نے اس کی شکایت ابلیس سے کی۔ ابلیس نے کہا زمین میں یقیناً کوئی نیا حادثہ ہوا ہے جا کر دیکھو شیطان زمین پر آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی تلاوت کرتے پایا کہنے لگے واللہ یہی نئی بات پیدا ہوئی ہے۔

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ مُّبِينٌ ﴿۱۸﴾
ہاں جو چوری سے سن پاتا ہے تو اس کے پیچھے روشن شعلہ آتشیں آپڑتا ہے "شہاب" آتشیں شعلہ جو ستاروں سے نکلتا ہے۔ بغوی نے چوری سے سننے اور پیچھے سے شعلہ آتشیں پڑنے کی یہ تفصیل بتائی ہے کہ شیاطین نیچے سے آسمان دنیا تک ایک کے اوپر ایک سوار ہو کر (گویا) سیڑھیاں بنا لیتے ہیں اور چوری چھپے فرشتوں کی کچھ باتیں وہ سن لیتے ہیں فرشتے (مطلع ہو کر) ان پر آتشیں شعلے مارتے ہیں کوئی انگارہ خطا نہیں جاتا۔ انگارہ پڑنے سے کوئی تو مر جاتا ہے کسی کا چہرہ یا پہلو یا ہاتھ یا کوئی اور حصہ حسب مشیت الہی جل جلالہ کوئی بدحواس اور پاگل ہو جاتا ہے، اور بھوت بن جاتا ہے جو زمین پر آ کر جنگلوں میں مسافروں کو سیدھے راستے سے بھٹکاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آسمان میں اللہ کسی کام کا کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اطاعت اور احترام کے زیر اثر فرشتے اپنے بازو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر کسی زنجیر کے لگنے سے ہوتی ہے جب دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو (آپس میں) پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے فرشتے جواب دیتے ہیں جو کچھ فرمایا بلاشبہ حق ہے، وہی (سب سے) بزرگ و بالا ہے۔ چوری سے سننے والے ایک کے اوپر ایک لگے ہوتے ہیں چنانچہ (سب سے اوپر) چوری سے سننے والا کوئی بات سن پاتا ہے اور اپنے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اور نیچے والا اپنے سے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اس طرح سب سے نیچے والا جادو گریا کاہن کی زبان پر وہ بات لے آتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیچے والے تک پہنچانے سے پہلے اوپر والے پر شعلہ آتشیں آپڑتا ہے اور کبھی آتشیں شعلہ پہنچنے سے پہلے وہ نیچے والے کو بتا چکتا ہے ہاں حریا کاہن (اس ایک بات میں) سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے (جب وہ ایک بات جو کاہن کی زبان سے لوگ سنتے اور وہ واقع ہو جاتی ہے تو) کہا جاتا ہے کیا کاہن نے ہم سے ایسی ایسی بات پہلے ہی نہ کہہ دی تھی چنانچہ اس ایک آسمانی بات کی وجہ سے کاہن کی دوسری خرافات کی بھی تصدیق کی جاتی ہے۔ رواہ البخاری۔

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہاں اس بات کا تذکرہ ہوتا ہے جس کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا ہے کوئی شیطان اس کو چوری سے سن پاتا ہے اور جا کر کاہن کے دل میں ڈال دیتا ہے، کاہن اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر بیان کر دیتے ہیں، یہ روایت بخاری کی بھی ہے اور بغوی کی بھی۔ سند میں فرق ہے۔

اور ہم نے (پانی پر) زمین کو بچھایا۔

اور زمین میں ہم نے جمے ہوئے پہاڑ قائم کر دیئے پہلے زمین لرزتی تھی اللہ نے اس

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا

وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ

میں پہاڑوں کی میخیں قائم کر دیں۔

اور ہم نے زمین میں یا پہاڑوں میں یا دونوں میں ہر مناسب

وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿۱۹﴾

چیز پیدا کی۔

مَوْزُون سے مراد یا تو یہ ہے کہ حسب تقاضائے حکمت مقرر مقدار میں پیدا کی یا مَوْزُون سے مراد مناسب جو نازیبانہ ہو جیسے کلام موزون کہا جاتا ہے۔ یا موزون سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ایسی چیزیں پیدا کیں جو دوسری نعمتوں میں اپنا خصوصی وزن (اور مرتبہ) رکھتی ہیں یا قابل وزن معدنیات مراد ہیں جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبا، ہڑتال، سرمہ وغیرہ بلکہ یا قوت زبرد

، فیروزہ وغیرہ بھی پہاڑوں کی پیداوار ہے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ
اور زمین میں یا پہاڑوں میں ہم نے تمہارے لئے اسبابِ زندگی پیدا کئے کھانے
پینے کی چیزیں، لباس کی چیزیں، دوائیں، معاشِ معیشت کی جمع ہے دنیوی زندگی کے اسباب۔
وَمَنْ جَسَّدْنَا لَهُ بَشِيرًا قَبْلَ ۝ اور ان (چوپایوں) کو بھی ہم نے پیدا کیا جن کو تم رزق دینے والے نہیں (ہم ہی
رزق دیتے ہیں)

اس جگہ لفظ مَن (جو عربی زبان میں صرف عقل والی مخلوق کے لئے وضع کیا گیا ہے جیسے انسان فرشتہ، جن) بمعنی مَآ کے
ہے (کیونکہ اس جگہ چوپائے مراد ہیں اور چوپائے عقل والے نہیں قرار دیئے جاتے) اسی طرح آیت فَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي
عَلَىٰ بَطْنِهِ میں مَن سے مراد جانور ہیں اس آیت میں بھی مَن بمعنی مَآ کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا مَن سے مراد بال بچے، خادم، غلام، باندی اور چوپائے وغیرہ ہیں اہل کفر خیال کرتے تھے کہ ان سب کو ہم
کھلاتے پلاتے اور پرورش کرتے ہیں، آیت میں اس کی تردید کر دی گئی اور فرمایا ہم ان کو رزق دیتے ہیں، بعض علماء نے اس طرح
ترجمہ کیا ہے، ہم نے تمہارے اور ان کے لئے جن کے تم رازق نہیں ہو اسبابِ زندگی پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے مذکورہ بالا آیات
میں اپنی ہستی کمالِ قدرت، ہمہ گیر حکمت، استحقاقِ الوہیت اور توحیدِ ذاتی و صفاتی کے لئے مذکورہ اشیاء کی تخلیق کو پیش کیا ہے اور
بندوں کو اپنے انعامات کی یاد دہانی کی ہے تاکہ لوگ دوسروں کو اس کا شریک نہ بنائیں اور تنہا اسی کو معبود سمجھیں، اس کی نعمتوں کا
شکر ادا کریں، کفر ان نعمت نہ کریں۔

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خِزْيَانَةٌ
اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے (بھرے
پڑے) ہیں۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہمہ گیر ہے جتنی مخلوق ہم نے پیدا کی ہے اور جو چیز بنائی ہے اس سے کتنے ہی گنازا اند ہم پیدا
کر سکتے ہیں۔ خزانے موجود ہونے سے مراد ہے قدرت کے اتھاہ ہونے کا بیان۔ یا اللہ نے اپنی مقدورات کو خزانوں سے تشبیہ دی
جو جمع شدہ اور موجود ہوتے ہیں ان میں سے ہر وقت جو چاہو نکال سکتے ہو اللہ کے مقدورات بھی ایسے ہی ہیں اللہ جب چاہے اور
جتنا حصہ چاہے اور مقدورات میں سے عالمِ ظہور میں لا سکتا ہے اور پیدا کر سکتا ہے اور آیت ذیل میں جو اتارنے کا لفظ استعمال کیا
ہے اس سے مراد پیدا کر دینا اور عالمِ خارجی میں بالفعل لے آتا ہے۔

وَمَا نُنزِّلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝
اور ہم اس کو (یعنی ہر چیز کو) ایک معین مقدار سے ہی اتارتے ہیں
قدر یعنی جس کو پیدا کرنا ازل میں مقدر ہو چکا ہو اور جس کی مقدار اللہ کو معلوم ہے۔

(مفسر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا) میں کہتا ہوں، ممکن ہے کہ ”خزائن“ سے مراد اعیانِ ثابتہ ہوں (یعنی وہ حقائقِ امرکانیہ جو
اللہ کے علم میں ثابت ہوں۔ مترجم) اور اتارنے سے مراد ہو ان اعیانِ حقیقیہ کو وجودِ ظلی عطا کرنا (یعنی خارج میں موجود کر
دینا، خارجی وجود کو اہل تصوف وجودِ ظلی کہتے ہیں یعنی وجودِ ظلی پر تو ہے اور حقائقِ امرکانیہ جو علمِ خداوندی میں ثابت ہیں وہ اصل
ہیں۔ وجودِ خارجی انہی کا پر تو ہے مترجم) بغوی نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا خشکی اور سمندر میں اللہ نے جو کچھ پیدا کیا
ہے سب کی تمثال (وجودِ مثالی یعنی حقیقتِ امرکانیہ، مترجم) عرش میں ہے اور آیت وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خِزْيَانَةٌ کی یہی
تفسیر ہے۔ میں کہتا ہوں شاید امام کی مراد عرش سے عالمِ مثال ہے جس طرح انسان کا محلِ خیال دماغ ہے (اور وجودِ خارجی وجودِ خیالی
کے ظہورِ خارجی کا نام ہے) اسی طرح عالمِ کبیر (کے ظہورِ خارجی) کا محلِ عالمِ مثال ہے اور محلِ تمثالِ عرش ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ خزائن سے مراد بارش ہے۔ بارش ہر چیز کا خزانہ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ
كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ رَوَايَتٌ میں آیا ہے کہ آسمان سے جو قطرہ اترتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ ضرور ہوتا ہے یہ فرشتہ اس بوند کو
اس جگہ تک ضرور پہنچاتا ہے جہاں پہنچانے کا حکم ہوتا ہے۔

وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ
اور ہم ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں۔ لَوَاقِحَ، لَاقِحَةَ کی

جمع ہے، لَاقِحَةٌ حاملہ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملائح کی بیج کی ممانعت فرمائی ہے یعنی جو بچہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہو تھا اس کی بیج بغیر اس کی ماں جائز نہیں۔ یا لَوَاقِحُ لَقُوحٌ کی جمع ہے نَفُوحٌ دودھ دینے والی اونٹنی۔ بہر حال اس جگہ وہ ہوائیں مراد ہیں جو برسنے والے بادل کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئی ہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے ابر باران کو اٹھانے والی ہواؤں کو جس طرح لَوَاقِحُ کہتے ہیں اسی طرح عقیقہ (ناقابلِ تولید) اس ہوا کو کہتے ہیں جو برسنے والے بادل کی حامل نہ ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، اللہ ہوا کو بھیجتا ہے ہوا پانی کو اٹھا کر لاتی ہے۔ بادل پانی کو لے کر ہوا کی وجہ سے چلتا ہے اور اونٹنی کے دودھ دینے کی طرح پانی برستا ہے۔

ابو عبید نے کہا، لَوَاقِحُ کا معنی ہے ملائح۔ ملائح کا مفرد ملقحہ ہے جس کا ترجمہ ہوا حاملہ کرنے والی ہوائیں ہے یعنی وہ ہوائیں جو پھلوں کے تخم درختوں میں ڈالتی ہیں اور ان کو حاملہ کرتی ہیں۔ عبید بن عمیر نے کہا پہلے اللہ خوش خبری (یعنی بارش کی خوش خبری) دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو زمین کو صاف کر دیتی ہیں پھر بادلوں کو اٹھا کر لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو بادلوں کو اٹھا کر لاتی ہیں۔ پھر منتشر بادلوں کو یکجا کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو آبر کے مختلف ٹکڑوں کو یکجا کر کے تہہ بہ تہہ کر دیتی ہیں پھر حاملہ کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو درختوں میں پھل پیدا کر دیتی ہیں (گویا درخت حاملہ ہو جاتے ہیں) ابو بکر بن عیاش نے کہا جب تک چاروں ہوائیں اپنا اپنا عمل پورا نہیں کرتیں کوئی قطرہ نہیں اترتا۔ پروا بادل کو اٹھا کر لاتی ہے، شمالی ہوا بادل کو جمع کرتی ہے جنوبی ہوا بادل کو برسانی ہے اور پچھلی ہوا بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ لَوَاقِحُ جنوبی ہوائیں ہیں۔ بعض آثار صحابہ میں آتا ہے، جب بھی جنوبی ہوا چلتی ہے انگور کے خوشے (ساتھ) اٹھا کر لاتی ہے اور ریح عقیقہ عذاب کو لاتی ہے پھل نہیں پیدا کرتی۔

بغوی نے امام شافعیؒ و طبرانی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب کبھی کوئی تیز ہوا چلتی تھی رسول اللہ ﷺ فوراً آواز اٹھا کر دعا کرتے تھے، اے اللہ اسکو رحمت بنا دے عذاب نہ بنا لے اللہ اس کو رحمت کی ہوائیں کر دے عذاب کی آندھی نہ کر دینا۔ (رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں رحمت کی ہواؤں کے لئے لفظ رِيَّاحٌ بَصِيغَةٌ جمع اور عذاب کی آندھی کے لئے لفظ رِيَّاحٌ استعمال فرمایا ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لفظ رِيَّاحٌ سے مراد وہ رِيَّاحٌ ہے جس کا ذکر آیت **أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيَّاحًا صَرَصَرًا**۔ **أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ** میں اللہ نے کیا ہے اور لفظ رِيَّاحٌ سے مراد وہ رِيَّاحٌ ہے جس کا ذکر آیت **أَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ وَيُرْسِلُ الرِّيحَ مَبْشُرَاتٍ** میں اللہ نے کیا ہے۔

فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ
پھر ہم نے بادل سے پانی نازل کیا اور اس سے تم کو سیراب کیا یعنی بارش کو تمہارے لئے سیرابی بنا دیا۔ عربی محاورے میں **سَقَيْتُ الرَّجُلَ مَاءً** اَوْ كَبْنَاكَ مَعْنَى هِيَ فِي مِثْلِهَا مَاءً اس کو پانی یا دودھ پلا کر سیراب کر دیا اور اسقیت الرجل کا معنی ہے میں نے اس کو پانی دے دیا تاکہ وہ اپنی زمین یا جانوروں کو سیراب کرے۔

وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ﴿۲۲﴾
اور تم اس (پانی) کو اپنے پاس جمع رکھنے والے نہیں ہو یعنی بارش کا خزانہ ہمارے پاس ہے تمہارے پاس نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ چشموں اور کنوؤں وغیرہ میں پانی جمع رکھنا تمہارا کام نہیں (یہ ہمارے اختیار میں ہے) جس طرح مختلف جہات سے حرکت لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتی ہے اسی طرح پانی کی بارش بھی منافع سے پُر ہے اور یہ سب قادر و حکیم کی تدبیر اور نظم کا نتیجہ ہے ورنہ پانی کی فطرت تو نیچے جانے کا تقاضا کرتی ہے مگر اس کو کسی حد پر روک لینا بغیر کسی خاص سبب کے نہیں ہو سکتا۔

وَإِنَّا لَنَحْنُ بِنُحْيٍ وَمُنِيَّتٍ
اور بلا شک و شبہ ہم ہی زندہ کرتے اور موت دیتے ہیں۔ یعنی دلوں کو معرفت سے اور اجسام کو نفس حیوانی و نباتی کا تعلق پیدا کر کے زندہ کرتے ہیں اور ان سے تعلق کاٹ کر مردہ کر دیتے ہیں۔

وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ﴿۲۳﴾
اور ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ ہمارے سوا کوئی زندہ باقی نہیں رہے گا مردہ کے بعد زندہ باقی رہتا اور اس کا وارث ہوتا ہے بطور استعارہ فنا کے مخلوق کے بعد خالق کے باقی رہنے کو وارثت سے تعبیر کیا۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿۱۳﴾
 اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں سے بھی واقف ہیں، یعنی ہم سے تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ سابق آیت میں اپنی قدرتِ کاملہ کی دلیل بیان کی تھی۔ اس آیت میں اپنے علم کی ہمہ گیری کا اظہار فرمایا جو قدرت کی دلیل ہے اسی سے قدرت کا ثبوت ہو جاتا ہے (قدرت بغیر علم کے ناممکن ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، مستقدمین سے مردے اور مستأخِرین سے زندے مراد ہیں۔ شعبی نے کہا گلے پچھلے لوگ مراد ہیں۔ عکرمہ کا قول ہے، مستقدمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں اور اپنے آباء کی پشت سے برآمد ہو گئے ہیں اور مستأخِرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے نہ اپنے باپوں کی پشت سے باہر آئے۔ مجاہد کے نزدیک گزشتہ اقوام مستقدمین ہیں اور امتِ محمدیہ مستأخِرین سے مراد ہے۔ حسن نے کہا طاعت و خیر میں آگے بڑھنے والے مستقدمین ہیں اور طاعت و خیر میں سستی کرنے اور کچھڑنے والے مستأخِرین ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ مستقدمین و مستأخِرین سے مراد نمازیوں کی اگلی پچھلی صفیں ہیں۔ ابن مردودہ کا بیان ہے کہ داؤد بن صالح نے حضرت سہل بن حنیف انصاری سے دریافت کیا، کیا یہ آیت جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی (یعنی مستقدمین و مستأخِرین سے کیا مجاہدین مراد ہیں) حضرت سہل نے فرمایا نہیں اس کا نزول نمازیوں کی صفوں کے متعلق ہوا تھا مقاتل کے نزدیک جہاد کی صفوں میں آگے پیچھے رہنے والے مراد ہیں۔ ابن عیینہ کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو چکے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔ اوزاعی کے نزدیک اول وقت اور آخر وقت میں نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایک خوبصورت عورت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھی کچھ لوگ اگلی صف میں بڑھ گئے تاکہ نماز میں (رکوع میں بھی) عورت پر نظر نہ پڑے اور کچھ لوگ اتنے پیچھے ہو گئے کہ آخری صف میں پہنچ گئے ان میں سے بعض لوگ رکوع میں گئے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے عورت کو دیکھنے لگے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ ابن حبان، حاکم، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

وَأَنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۴﴾
 اور بے شک آپ کا رب (قیامت کے دن) ان سب کو محشور کرے گا وہ بلاشبہ بڑی حکمت اور علم والا ہے یعنی سب کو جمع کر کے بلاشک و شبہ ہر ایک کو اس کے ہر عمل کا بدلہ دے گا۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جس چیز پر مرے گا اللہ اسی چیز پر اس کو اٹھائے گا (رواہ احمد و الحاکم و البیہقی) ضمیر ہو کا اضافہ بتا رہا ہے کہ اللہ ہی قادر اور سب لوگوں کو اٹھانے کا تہاذا تمہ دار ہے اس فعل میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ حکیم ہے یعنی اس کی حکمت نمایاں اور اس کی ہر صنعت محکم ہے۔ علیم ہے اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا بھتی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۱۵﴾
 ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گاریسے تیار کی ہوئی تھی انسان (میں الف لام جنسی ہے اس) سے مراد ہے جنس بشر یعنی حضرت آدمؑ کو پیدا کیا۔ انسان کی وجوہ تسمیہ متعدد ہیں انس کا معنی ہے ظہور، انسان ظاہر ہے آنکھ سے دکھائی دیتا ہے انس کا معنی دل بستگی اور پریم بھی ہے انسان باہم مانوس ہوتے ہیں یا نسیان سے مشتق ہے۔ حضرت آدمؑ کو ایک حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس کو بھول گئے۔ نسیان کا معنی ہے بھولنا۔ صلصال خشک مٹی جو آگ میں نہ پکائی گئی ہو اور کھن کھن بولتی ہو (یعنی بجانے سے کھنکھاتی ہو) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صلصال وہ عمدہ یا کیزہ کیچڑ ہے جس میں پانی سوکھ جانے کی وجہ سے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں اور جب اسکو (اس کی جگہ سے) ہلایا جاتا ہے تو کھڑکھڑ کی آواز دیتی ہے۔ مجاہد نے کہا بدبودار کیچڑ کو صلصال کہتے ہیں۔ صَلِّ اللَّحْمُ اور أَصَلَّ اللَّحْمُ گوشت بدبودار ہو گیا صلصال اسی محاورہ سے ماخوذ ہے جماء و لدلی کیچڑ جو زیادہ پانی کے قریب ہونے سے کالی پڑ جاتی ہے۔ مسنون پتلا جس میں صورت بنا دی گئی ہو۔ یہ لفظ سنت الوجہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں مٹی، تراب، خاک پھر پانی میں گوندھے جانے کے بعد طین (کیچڑ) پھر ایک مدت تک یونہی رہنے کے بعد جماء (کیچڑ یا کدلی) پھر اس کا خلاصہ اور جو ہر نکال لیا جائے تو اس کو سَلَاکَہ (خلاصہ) کہا جاتا ہے۔ پھر اس میں نقوش، صورت بنا دیے جائیں (پتلا بنا دیا جائے) تو اس کو مسنون کہتے ہیں اور

مسنون خشک ہو جائے تو اس کو صَلْصَال کہتے ہیں۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا مسنون خراب، بدبودار یہ لفظ سننت الحجر علی الحجر سے ماخوذ ہے ابو عبیدہ نے کہا مسنون (اسم مفعول) سن سے مشتق ہے سن کا معنی ہے بہانا۔ ”مسنون“ بہایا ہوا۔ جیسے مختلف دھاتیں جن کو پگھلا کر سانچوں میں بھر کر ڈھالا جاتا ہے اسی طرح اس (پتلی سیال) کیچڑ کی حالت ہوتی ہے (جس کو مسنون کہا جاتا ہے) عرب کہتے ہیں سنت الماء میں نے پانی بہا دیا گویا (دل دلی کیچڑ سے ڈھال کر اول (قوام) تیار کیا گیا پھر انسانی صورت بنائی گئی اور مجسمہ تیار کیا گیا جو کھوکھلا تھا پھر وہ خشک ہو گیا اور بجانے سے کھن کھن بولنے لگا پھر رفتہ رفتہ اس پر تغیرات آتے رہے۔ آخر جب وہ بالکل ہموار اور درست ہو گیا تو اس میں روح پھونک دی گئی۔

اور جن کو ہم نے پیدا کیا اس سے پہلے آگ سے جو
وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ۝۲۷

ایک گرم ہوا سے بنی تھی۔

الْجَانَّ (میں لام جنسی ہے) انسان کی طرح جنس ہے جب ایک شخص سے نکلے ہوئے مختلف افراد اسی جنس کے ہوں اور اس شخص کو کسی خاص مادہ سے بنایا گیا ہو تو تمام افراد کا قوام اسی اصلی مادہ سے مانا جائے گا (پس ابوالجن کو جب آگ کے مادہ سے بنایا گیا تو اس کی ساری نسل کو بھی اسی مادہ سے بنا ہوا کہا جائے گا اگرچہ اولاد کا سلسلہ تنا سلسلی ہو گا براہ راست آگ سے ان کو نہیں بنایا گیا ہوگا)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، الجان سے مراد ہے تمام جنات کا باپ جیسے آدم تمام انسانوں کے باپ تھے۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد ابلیس ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ الجان جنات کا باپ ہے اور شیاطین کا باپ ابلیس ہے جنات میں کچھ مسلمان ہیں کچھ کافر، مرتے بھی ہیں پیدا بھی ہوتے ہیں اور شیاطین میں سے کوئی بھی مسلم نہیں نہ کسی کو موت آتی ہے جب ابلیس مرے گا تو اسی کے ساتھ سب مریں گے۔

وہب نے کہا کچھ جنات تو آدمیوں کی طرح ہیں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور کچھ جنات ہوا کی طرح ہیں ان میں تو والد و تامل نہیں ہوتا نہ وہ کھاتے پیتے ہیں۔

مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے آدم سے پہلے جان کو پیدا کیا۔
السَّمُومُ وہ سخت گرمی جو مسامات کے اندر گھس جائے۔ بغوی نے کہا السَّمُومُ وہ گرم ہوا جو انسان کے بدن میں مسامات کے راستے سے گھس کر اس کو ہلاک کر دیتی ہے (یعنی لو) بعض کے نزدیک سُموم دن کی اور حرور، رات کی گرم ہوا (لو) کو کہتے ہیں۔ کلبی نے ابو صالح کا قول نقل کیا ہے السَّموم ایک آگ ہے جو آسمان اور (زیرین) حجاب کے درمیان ہے اس میں دھواں نہیں ہے صاعقہ کی پیداوار اسی سے ہوتی ہے (صاعقہ ٹوٹ کر گرنے والی بجلی) اللہ کا حکم ہوتا ہے تو سُموم (یعنی صاعقہ) زیرین حجاب کو پھاڑ کر حسب مشیت الہی کہیں گر جاتی ہے حجاب کو پھاڑنے کی آواز ہی کڑک کہلاتی ہے۔ بعض نے کہا نَارُ السَّموم آگ کے شعلے لپٹ۔ بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے آتشِ جہنم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ کی ایک خاص شاخ (قبیلہ یا گروہ) میں سے ہے اس شاخ کو جن کہا جاتا ہے اس صنفِ ملائکہ یعنی جن کی تخلیق نَارِ سُموم سے ہوئی ہے دوسری آیت میں ان جنات کی تخلیق بھڑکتی آگ سے بتائی گئی ہے (گویا نَارِ السَّموم اور بھڑکتی آگ ایک ہی چیز ہے) باقی جن کے علاوہ ملائکہ کی تخلیق نور سے کی گئی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَآءٍ مَّسْنُوٰۤنٍ ۝۲۸

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں
فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ
آئندہ ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں۔ نفخ کا معنی ہے کسی کھوکھلی چیز میں ہوا کو گزارنا (منہ سے یا کسی اور طریقہ سے ہترجم کر دھونے کی دو قسمیں ہیں۔ علوی اور سفلی روح علوی ایک خاص مخلوق ہے جو مادے سے خالی ہے (غیر مادی ہے) نظر کشف سے اس کو دیکھا

جاسکتا ہے چونکہ عرش سے بھی زیادہ لطیف ہے اس لئے اس کا مقام عرش کے اوپر ہے فوقانی و تحتانی مراتب کے لحاظ سے ہم کہتے ہیں کہ ارواحِ علویہ پانچ ہوتی ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفی انہی کو عالمِ امر کے لطائف (خمسہ) کہا جاتا ہے۔ روحِ سفلی اس بخارِ لطیف کو کہتے ہیں جو ان چاروں عناصر سے پیدا ہوتا ہے جن سے جسمِ انسانی کی ساخت ہوئی ہے۔ اسی کو نفس کہا جاتا ہے اللہ نے اس کو روحِ سفلی یعنی نفس کو ارواحِ علویہ کا آئینہ بنایا ہے، آفتابِ آسمان پر ہونے کے باوجود جب آئینہ پر عکس ریز ہوتا ہے تو آئینہ کے اندر اس کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں روشنی بھی اور حرارت بھی۔ آئینہ روشنی آفریں بھی ہو جاتا ہے اور جلانے والا بھی۔ ارواحِ علویہ تجرد کی انتہائی چوٹی پر ہونے کے باوجود نفس کے آئینہ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انہی کی پر توکلنی کا جو اثر ہوتا ہے وہی ہر فرد کی روحِ جزئی کہلاتی ہے۔ ارواحِ علویہ سے روحِ سفلی میں نمودار ہو جاتے ہیں سب سے پہلے روحِ سفلی ان آثار کو ساتھ لے کر دل (سینہ کے اندر جو گوشت کا لو تھڑا ہے یعنی طبعی قلب) سے متعلق ہوتی ہے پھر قوتِ حیوانیہ اور معارفِ انسانیہ کو ساتھ لئے ہوئے (قلب کے ذریعہ سے) شریانوں کی خلاؤں میں پہنچتی ہے اور اس طرح بدن کے ہر حصہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی کو نفخِ روح کہا جاتا ہے۔ کھوکھلی چیز میں جس طرح نفع (ہوا کا پھونکا جانا) ہوتا ہے اسی کے مشابہ (شریانوں کی خلاؤں میں) روح کا نفع ہوتا ہے۔ روحی میں روح کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرنے سے روح کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ ہے روحی کا مطلب ہے میرے حکم سے براہِ راست بغیر مادہ کے پیدا کی ہوئی روح۔ یا انسانی روح کو اپنی روح اس لئے قرار دیا کہ صرف انسانی روح رحمانی تجلیات و انوار کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے دوسری مخلوق میں یہ استعداد نہیں۔ انسان کی ساخت میں اگرچہ مٹی کا عنصر غالب ہے اسی لئے انسان کی تخلیق کو مٹی سے قرار دیا ہے لیکن درحقیقت انسانی تقویم کے دس اجزاء ہیں، مٹی، پانی، ہوا، آگ اور وہ لطیف بخار جو ان چاروں کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے اسی کو نفس اور روح سفلی کہتے ہیں۔ ان پانچ اجزاء کے علاوہ پانچ اجزاء وہ ہیں جن کا فیضانِ عالمِ امر سے ہوتا ہے ان کا ذکر اوپر آچکا ہے (قلب، روح، سر، خفی، اخفی) انسان اسی جامعیت کی وجہ سے مستحقِ خلافت ہوا۔ معرفت کے نور اور عشق و محبت کی آگ کا اہل قرار پایا۔ انسان کی یہی جامعیت اس بے کیف معیت کی مقتضی ہے جس کا ذکر حدیثُ المرء مع من احب میں آیا ہے اور اسی جامعیت کے باعث آدمی کو انوارِ ذاتیہ، صفاتیہ، اور ظلیہ کا مہبط بنایا گیا پھر اسی معیت اور حاملِ تجلیات ہونے کے سبب سے ملائکہ کو اس کی جانب سجدہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

فَقَعُوا لَهُ سَجْدًا ۝۲۹ ﴿۲۹﴾ تو تم اس کی طرف رخ کر کے سجدے میں گر پڑنا۔

قَعُوا امر ہے وَقَعَ وَتَوَعَّأَ سے۔ لہٰذا میں لَام بمعنی اللہ ہے یعنی آدم کی جہت کو اور آدم کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا۔ اللہ نے آدم کو ملائکہ کا قبلہ سجود بنایا جیسے کعبہ کو قبلہ عبادت انسانوں کے لئے قرار دیا۔ کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا بلکہ کعبہ کو تجلیات و انوار سے چونکہ ایک خصوصیت ہے (اس لئے اس کو جہت سجدہ بنایا پس اسی طرح فرشتوں کے لئے آدم جو سجدہ کی جہت بنا دیا مسجود نہیں بنایا۔

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ ﴿۳۰﴾ پس (آدم کی طرف رخ کر کے) فرشتوں نے سجدہ کیا اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ فرشتوں نے آدم کے اندر معیت کا ادراک کر لیا، محض تعمیلِ حکم غرض تھی (استحقاقِ سجود کی وجہ ان کو معلوم نہیں ہوئی) کَلِمَةً أَجْمَعُونَ ﴿۳۰﴾ سب کے سب نے۔ تاکید مزید محض مبالغہ و عموم کے لئے ہے یعنی کوئی بھی سجدہ

سے الگ نہیں رہا سب ہی نے سجدہ کیا۔ مبرّد کا قول ہے کہ کَلِمَةً کے لفظ سے تو عموم کی تاکید ہو گئی، یعنی سب نے سجدہ کیا اور اَجْمَعُونَ کے لفظ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ یکدم اجتماعی حالت میں سب نے سجدہ کیا۔ مگر یہ توجیہ غلط ہے اگر لفظ اَجْمَعُونَ سے اجتماعی حالت ظاہر کرنی مقصود ہوتی تو اَجْمَعُونَ (نصب کے ساتھ) کہا جاتا (کیونکہ حال منصوب ہوتا ہے)

إِلَّا إِبْلِيسَ ط أَبِي أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ﴿۳۱﴾ مگر ابلیس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے ابلیس معیت کو نہ سمجھ سکا اور نہ اس نے اس امر کا لحاظ کیا کہ حکیم کا حکم حکمت سے خالی

نہیں ہوتا۔

ابلیس چونکہ ملائکہ میں سے نہ تھا جنات میں سے تھا اللہ نے فرمایا كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ اس لئے بعض علماء نے کہا کہ استثناء منقطع ہے (متصل نہیں ہے استثناء متصل میں مابعد الا کا ما قبل الا میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے) اور الا بمعنی لکن کے ہے (اسی کے موافق آیت کا ترجمہ ہم نے کیا ہے) بعض علماء کے نزدیک استثناء متصل ہی ہے کیونکہ ابلیس ملائکہ کی اس صنف کا ایک فرد تھا جس کو جن کہا جاتا ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہو گا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل رہنے سے انکار کر دیا۔

اللہ نے فرمایا اے ابلیس تیرے سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہونے کا کیا سبب ہے یعنی تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا باوجودیکہ حاکم کے حکم کی تعمیل تجھ پر واجب تھی اور آدم کی فضیلت اور استحقاق سجدہ اللہ کے بیان کرنے سے تجھے معلوم ہو گیا تھا۔

قَالَ لِمَ اَكُنَّ لِرَبِّكَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿۳۲﴾

ابلیس نے (اپنی بے وقوفی کی وجہ سے) کہا میں تو ایک ایسے کثیف انسان کو سجدہ کر ہی نہیں سکتا تھا جس کو تو نے کھنکھاتی ہوئی سڑی کیچڑ سے بنایا ہے، مٹی کا درجہ تو تمام عناصر سے نچلا ہے، مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے اور آگ تمام عناصر سے لطیف اور سب سے اعلیٰ و اشرف ہے سورہ اعراف میں اسکی مزید تشریح آچکی ہے۔

قَالَ فَاخْرِجْهَا مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۳﴾ (اللہ نے) فرمایا (جب تو نے میرا فرمان نہیں مانا) تو (جنت یا آسمان یا ملائکہ کے گروہ سے) نکل جا بلاشبہ تو مردود ہے یعنی بھلائی اور اعزاز سے نکالا اور دھتکارا ہوا ہے۔ رجم سنگسار کیا ہوا پتھروں سے مارا ہوا جو (اللہ کی بارگاہ سے) مطرود ہو جائے گا وہ سنگسار کیا جائے گا یہ مطلب ہے کہ آئندہ اگر تو آسمان سے قریب آیا تو تجھ پر انگارے برسائے جائیں گے، ٹوٹے ہوئے تارے تجھ پر (پتھروں کی طرح) پڑیں گے۔ شیطان کے لئے اس آیت میں وعید بھی اور اس کے اعتراض کا در پر وہ جواب بھی ہے ابلیس کا اعتراض یہ تھا کہ میں تخلیقاً افضل ہوں آدم مجھ سے ادنیٰ ہے اور ادنیٰ کے سامنے افضل کو سر بسجود ہو جانے کا حکم مناسب نہیں جو اب یہ ہے کہ فضیلت اور برتری کا مدار اللہ کے حکم کی تعمیل پر ہے (اجزاء تخلیقی پر نہیں) جو نافرمان ہو گا وہ بھلائی سے محروم ہو جائے گا اور نکالا جائے گا۔

وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ﴿۳۴﴾ اور روز جزا تک تجھ پر لعنت یعنی ہے روز جزا پر پھٹکار اور لعنت کی انتہا ہے اس کے بعد اعمال کی (آخری) سزا جزا ہوگی اور لعنتِ اخروی کے عذاب کا وقت آجائے گا یہ مطلب ہے کہ روز جزا تک تو لعنت ہوگی اور اس کے بعد ایسی سخت سزا دی جائے گی کہ اس کی موجودگی میں دنیوی لعنت بھول جائے گا۔

بعض نے کہا (لعنت کو یوم الدین تک جاری رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ یہ ایک محاروہ کی بات ہے) طویل ترین مدت کے لئے کہا جاتا ہے کہ قیامت تک یہ بات ہوتی رہے گی یا نہ ہوگی (اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قیامت کے بعد اس کے خلاف ہو گا بلکہ کسی کام کے ہونے نہ ہونے کی ایک طویل ترین مدت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے) بغوی نے کہا آسمان پر بھی ابلیس ملعون ہے اور زمین پر بھی، آسمان والے بھی اس پر ایسی ہی لعنت کرتے ہیں جیسے زمین والے۔ میں کہتا ہوں (آسمان و زمین والے کیا) آسمان اور زمین کے خالق نے اس پر لعنت کی ہے اور فرمایا: وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ

إِلَى يَوْمِ الدِّينِ

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي ﴿۳۵﴾ ابلیس نے کہا اے میرے رب (جب تو نے مجھے نکال دیا اور مجھ پر لعنت کر دی ہے) تو مجھے مہلت عطا کر (یعنی زندگی کی مدت باقی رکھ اور موت نہ دے)

إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ ﴿۳۶﴾ اس روز تک جب کہ لوگ (قبروں سے دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ ابلیس نے اغوا کرنے کی مہلت مانگی اور بالکل موت سے محفوظ رہنے کی بھی درخواست کی کیونکہ (وہ جانتا تھا) کہ یوم بعثت تک مہلت مل جائے

گی اور دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد تو موت آئے گی نہیں اس لئے موت سے چھوٹ مل جائے گی اللہ نے اول درخواست تو قبول فرمائی اور یہ قبولیت دعا اس کی عزت افزائی کے لئے نہیں بلکہ بد بختی اور مصیبت میں اضافہ کرنے کے لئے فرمائی، اور دوسری درخواست (الی یوم یبعثون) کو رد کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۳۸﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۳۹﴾
تو مہلت یافتہ گروہ میں سے تو بے شک ہوگا (لیکن یہ مہلت زندگی) معلوم وقت کے دن تک ہوگی یعنی اس وقت تک مہلت زندگی ہوگی جو اللہ کو معلوم ہے مراد یہ ہے کہ پہلی مرتبہ صور پھونکنے تک جس سے سب مخلوق مر جائے گی تجھے مہلت ہے دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت تک جس سے لوگ اٹھائے جائیں گے مہلت نہیں دی جاسکتی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کے درمیانی مدت چالیس سال ہوگی اسی مدت میں ابلیس کی موت ہوگی۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُنزِلَنَّ فِي الْأَرْضِ وَلَا أُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۳۹﴾
ابلیس نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے اس لئے میں بھی ضرور ضرور دنیا میں (گناہوں کو) آراستہ کر کے ان کے سامنے لاؤں گا اور سب کو گمراہ بناؤں گا۔ یا ہمکام میں بے قسمیہ اور کامصدری ہے ترجمہ اس طرح ہوگا: اے رب (تو نے مجھے گمراہ کر دیا) تیرے اس گمراہ کرنے کی قسم کہ میں ان انسانوں کی نظر میں دنیا کو آراستہ کر دوں گا (جاذب توجہ کر دوں گا) مگر ان میں سے تیرے جو چُٹے ہوئے بندے ہوں گے اور تو نے ان کو تمام کدورتوں سے پاک کر دیا ہوگا (ان کو میں نہیں بہکا سکوں گا) جن کو تو نے ہدایت کر دی ہوگی ان پر میری فریب کاری کوئی اثر نہ ڈال سکے گی۔

قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ﴿۴۰﴾
اللہ نے فرمایا، یہ (اخلاص ہی) مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، اس میں کوئی کجی نہیں۔ حسن نے کہا حق کاراستہ سیدھا ہے مجاہد نے کہا حق کارجوع اللہ کی طرف ہے۔ راہ حق بھی اللہ تک پہنچتی ہے کسی اور طرف نہیں مڑتی۔ انخس نے کہا سیدھا راستہ بتانا مجھ پر ہے (یعنی میرے ذمہ ہے اس مطلب پر علیٰ کو الیٰ کے معنی میں لینے کی ضرورت نہ ہوگی) اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اپنے منتخب بندوں کو گمراہ نہیں ہونے دے گا۔ منتخب بندوں کو شیطانی اغوا سے بچانے کا ذمہ اللہ کا ہے اور براہ راست ان کو محفوظ رکھنا اللہ کا کام ہے۔

کسانی نے کہا، ہَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ وعید آمیز تہدید کی کلام ہے جیسے کوئی شخص اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ تیرا راستہ مجھ پر ہے یعنی تو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ لَبَلِّغُكَ لِبَالِ الْمِرْصَادِ آپ کا رب گھات میں ہے۔ کسانی کی تفسیر پر ہذا سے اشارہ ابلیس کے راستہ کی طرف ہوگا جو اس نے اپنے لئے اختیار کیا تھا یعنی اغوا اور گمراہ کرنے کا راستہ۔

اِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۱﴾
بے شک میرے بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے۔

عبادی سے مراد عام بندے ہیں مؤمن ہوں یا کافر۔ عباد کی اضافت یا متکلم کی طرف استغراق ہے اگر عبادی کو صرف ایمان کے ساتھ مخصوص کیا جائے تو من اتبعک کا استثناء صحیح نہ ہوگا (گمراہوں کو لفظ عباد میں داخل ہونا چاہئے اس کے بعد استثناء کر کے نکالنا چاہئے) مقصد آیت یہ ہے کہ اللہ نے صرف گمراہوں پر تجھے تسلط عطا کیا ہے تو ان پر غلبہ یا سلطنت سے مؤمنوں تک تیری دست رسی نہ ہوگی۔ ابلیس نے بھی مخلص بندوں کا استثناء اپنے قول میں کر دیا تھا اللہ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوگی دوسری آیت میں یہ مضمون آیا ہے فرمایا ہے اِنَّ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلٰی الَّذِيْنَ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ مخلص بندوں کو اللہ شیطاں کے پنچہ سے محفوظ رکھے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استثناء منقطع ہو (متصل نہ ہو اور مستثنیٰ منہ میں داخل ہی نہ ہو اس صورت میں عبادی سے مراد ہوں گے خاص

بندے یعنی مؤمن۔ کافروں کو یہ لفظ شامل ہی نہ ہوگا) اور لَّا اسْتِثْنَاءُ نہ ہو بلکہ لکن کے معنی میں ہو اور خبر محذوف ہو مطلب اس طرح ہو گا ہاں جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ ان کو جہنم میں لے جائے گا۔ شیطان نے اپنے کلام سے یہ وہم پیدا کر لیا تھا کہ جو مخلص بندے نہ ہوں گے میں ان کو ضرور گمراہ کر دوں گا اللہ نے اس کی تکذیب کر دی یعنی تیرا تسلط گمراہوں پر بھی نہ ہوگا گمراہ کرنا بھی تیرے قبضہ میں نہیں زیادہ سے زیادہ تیرا کام گناہ کی ترغیب دینا اور بہکانا ہے۔ قیامت کے دن ابلیس خود کہے گا مَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي مِثْرًا كُنْتُمْ كَافِرِينَ (یعنی میرا تسلط اور جبر نہ تھا صرف ترغیب اور بہکانا تھا)

اور جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ اَجْمَعِينَ ہم کی تاکید ہے یا حال ہے موعدا مصدر ہے اور اجمعین میں عامل ہے۔ موعدا اسم مکان بھی ہے (وعدہ مقررہ کی جگہ) اس وقت موعدا عامل نہ ہوگا۔

لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ (جہنم) کے سات دروازے ہیں۔ ہناد، ابن المبارک اور امام احمد نے الزہد میں اور ابن جریر و ابن ابی الدنیانے صفت النار (دوزخ کی حالت کا بیان) میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے اوپر اور انگلیوں کو الگ الگ کر کے فرمایا، دوزخ کے دروازے اسی طرح ہوں گے یعنی ہر دروازہ کے اوپر دروازہ ہوگا (اس طرح دوزخ کی سات منزلیں اور درجات ہوں گے) اول پہلی منزل بھر دی جائے گی، پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں، پھر چھٹی، ساتویں۔

بغوی نے حضرت علیؑ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے جنت کو پھیلاؤ میں رکھا ہے (یعنی جنت کے اوپر جنت نہیں ہے) اور دوزخ کو ایک کو دوسرے کے اوپر بنایا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی الدنیانے صفت النار میں اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ اول دروازہ (یعنی طبقہ) جہنم ہے، پھر کظی، پھر حطمہ، پھر سعیر، پھر سقر، پھر حجیم، پھر ہادیہ۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ (ہر طبقے کے لئے گمراہوں کا ایک حصہ بانٹا ہوا ہوگا یعنی ہر درجہ میں گمراہوں کا ایک مقررہ جماعت ہوگی جو اس درجہ کے اندر رہے گی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک نے کہا، پہلے درجہ میں وہ اہل توحید ہوں گے جن کو گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل کیا جائے گا اور گناہوں کے بقدر وہ دوزخ میں رہیں گے، پھر نکال لئے جائیں گے دوسرے درجہ میں نصاریٰ تیسرے میں یہودی۔ چوتھے میں صابی پانچویں میں مجوسی چھٹے میں مشرک اور ساتویں میں منافق ہوں گے۔ (یعنی دور مسیحی ختم ہونے کے بعد نصاریٰ عیسائیت پر قائم رہے اور کسی پیغمبر کا انکار کیا یا بعد کو آنے والے پیغمبر کی شریعت کا انکار کیا۔ اسی طرح شریعت موسوی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو یہودی یہودیت پر قائم رہے اور حضرت عیسیٰؑ یا رسول اللہ ﷺ یا کسی اور پیغمبر کا انہوں نے انکار کیا۔ صابی جو اپنے کو موجد کہتے ہیں اور کسی پیغمبر کی شریعت کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صابی صرف حضرت نوحؑ کا شیخ اپنے کو قرار دیتے ہیں۔ مجوسی آتش پرست اور ستارہ پرست) اللہ نے منافقوں کے متعلق فرمایا إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے (یعنی درجے) ہیں ان میں سے ایک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے میری امت پر تلوار سوئی یا فرمایا محمدؐ کی امت پر تلوار کھنچی۔ قرطبی نے کہا پہلا طبقہ جہنم ہے یہ تمام دوسرے درجات سے سہل ترین عذاب کا درجہ ہے اس امت کے گناہ گاروں کے لئے مخصوص ہے۔ جہنم کو جہنم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آگ مردوں اور عورتوں کے چہرے بگاڑ دے گی اور ان کے گوشت کو کھالے گی۔

ہادیہ کا درجہ سب سے نچلا ہے یہ سب سے گمراہ ہے بزار نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخ کا ایک ایسا درجہ ہے جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے اللہ کا غضب لے کر اپنے غصہ کو تسکین دی

ہوگی (اللہ کے غضب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے غصہ کی آگ بجھائی)

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں سب سے زیادہ غم آگیں کرپے آفریں اور حزن آلود اور متعفن ترین دروازہ ان زناکاروں کے لئے ہوگا جنہوں نے جانتے ہوئے زنا کا ارتکاب کیا ہوگا۔ بیہتی نے خلیل بن مرہ کی مرسئل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بغیر تبارک الذی اور حم السجدہ پڑھے نہیں سوتے تھے اور فرماتے تھے حم والی سورتیں سات ہیں اور دوزخ کے بھی سات طبقات ہیں، جہنم، حطمہ، لظی، سقر، سعیر، ہادیہ، جحیم۔ قیامت کے دن ان (حم والی سورتوں) میں سے حم السجدہ آکر ان طبقات کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے گی اور عرض کرے گی اے اللہ جو مجھ پر ایمان رکھتا اور مجھے پڑھتا تھا وہ اس میں داخل نہ ہو۔

ثعلبی کی روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے جب آیت **وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ** سنی تو بدحواس ہو کر بھاگے اور اسی حالت میں تین روز بھاگتے رہے آخر (پکڑ کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ حضور ﷺ نے (فرار کا سبب) دریافت فرمایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آیت **وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ** نازل ہوئی۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو سچ کا حامل بنا کر بھیجا ہے میرا دل اس سے پارہ پارہ ہو گیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ أَدْخُلُوهَا بِسَلَامٍ أُمْسِنِينَ ۖ (۳۹)

لوگ (جنہوں نے شیطان کے اغوا میں آکر شرک نہیں کیا ہوگا، شرک سے پرہیز رکھا ہوگا جنتوں اور (جنتی) چشموں میں ہوں گے) ہر شخص کی ایک جنت اور ایک چشمہ یا ہر ایک کی متعدد جنتیں اور متعدد چشمے ہوں گے ان سے کہا جائے گا (ان جنتوں اور چشموں کے اندر سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یعنی آئندہ موت ہر آفت اور یہاں سے نکالے جانے کے اندیشے سے تم محفوظ ہو۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا

اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ بالکل دور کر دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح ہو جائیں گے۔ یعنی دنیا میں ان کے آپس میں جو کینہ کشیدگی دلوں میں ہوگی (جنت میں داخل کرنے کے وقت) ہم دور کر دیں گے وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے) غل کینہ چونکہ ایسا واقعہ آئندہ یقینی طور پر ہوگا اس لئے بصیغہ ماضی اس کو بیان فرمایا۔

ابو نعیم نے الفتن میں اور سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ انہی میں سے ہوں گے (یعنی جنت میں داخلہ سے پہلے اللہ ہماری آپس میں کشیدگیوں کو دور کر دے گا۔ میں کہتا ہوں یہ کشیدگی اس وقت تھی جب حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کیا گیا یہاں تک کہ آپ شہید کر دیئے گئے اور حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ عبد اللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں عبد الکریم بن رشید کی روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت جنت کے دروازے تک پہنچیں گے تو ایک دوسرے کی طرف غصہ کی نظر سے دیکھتا ہوگا لیکن اندر داخل ہوتے ہی اللہ ان کے سینوں سے کینہ نکال دے گا اور وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے۔

یا (غل سے مراد دنیوی کینہ نہیں بلکہ اس سے) مراد یہ ہے کہ اہل جنت کے اندر جو درجات اور مراتب قرب کے لحاظ سے تفاوت ہوگا اس پر کوئی کسی سے حسد نہیں کرے گا اللہ (جذبہ) حسد کو ان کے دلوں سے نکال دے گا۔

عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ۖ (۴۰) مسہریوں پر (بیٹھے) ہوں گے آمنے سامنے۔ ہناد نے مجاہد کا قول اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ کسی کی پشت کسی کی طرف نہ ہوگی بلغوی نے لکھا ہے بعض اخبار میں آیا ہے کہ جنتی جب جنت کے اندر اپنے مؤمن بھائی سے ملنا چاہے گا تو مسہری اس کو لے کر وہاں پہنچ جائے گی اس طرح دونوں کی ملاقات اور بات چیت ہو جائے گی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت علی بن حسین کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ كَانَزُولَ اَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ فِي حَقِّ مِثْلٍ ہوا۔ سوال کیا گیا ان دونوں میں کون سا کینہ تھا فرمایا دور جاہلیت کا کینہ، بنی تمیم اور بنی عدی اور بنی ہاشم کے درمیان جاہلیت کے زمانہ میں کینہ تھا۔ جب یہ قبائل مسلمان ہو گئے تو باہم محبت کرنے لگے (ایک بار) حضرت ابو بکرؓ کو کمر کی کچھ تکلیف ہو گئی تو حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے گدی گرم کر کے حضرت ابو بکرؓ کی کمر کو سینکا، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔
اس قول پر آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ دور جاہلیت میں لوگوں کے سینوں میں جو عداوتیں تھیں جب وہ اسلام لے آئے تو ہم نے وہ باہمی عداوتیں دور کر دیں۔

لَا يَسْتَهْزِئُ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۳۸﴾
جنت کے اندر اہل جنت کو تھکان چھوئے گی بھی نہیں اور نہ جنت سے کبھی ان کو نکالا جائے گا دوامِ نعمت ہی تکمیلِ نعمت ہے۔

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ چند صحابی باہم ہنس رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کا ادھر سے گذر ہوا صحابہؓ کو ہنستے دیکھ کر فرمایا دوزخ تم لوگوں کے سامنے ہے پھر بھی ہنس رہے ہو۔ فوراً جبریل نازل ہو گئے اور کہا محمد ﷺ آپ کا رب فرماتا ہے تم کیوں میرے بندوں کو میری رحمت سے ناامید کرتے ہو اس پر آیت ذیل نازل ہوئی

نَبِيٌّ عِبَادِيْ اَفْتَى اَنْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۹﴾ وَاَنْ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۴۰﴾
(اے نبی) میرے بندوں کو اطلاع دے دو کہ بلاشبہ میں ہی بہت بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اور یہ بھی خبر دے دو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔

ابن مردویہ نے دوسری سند سے کسی صحابی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باب بنی شیبہ سے برآمد ہوئے اور فرمایا کیا میں تم کو ہنسی میں مشغول نہیں پارہا ہوں (یعنی تم اللہ کے عذاب کی طرف سے غافل ہو اور ہنس رہے ہو) پھر پشت پھیر کر چل دیئے پھر پچھلے قدم لوٹے اور فرمایا میں یہاں سے نکل کر حجر (سنگِ اسود) تک ہی پہنچا تھا کہ جبریل آگئے اور انہوں نے کہا محمد اللہ فرماتا ہے میرے بندوں کو تم کیوں ناامید کرتے ہو نَبِيٌّ عِبَادِيْ اَفْتَى اَنْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۹﴾ اور وعدہٴ مغفرت و رحمت بھی ہے اور وعیدِ عذاب بھی گویا گزشتہ مضمون کا خلاصہ اس آیت میں مذکور ہے اور لفظ غفور رحیم بتا رہا ہے کہ آیت سابقہ میں الْمُتَّقِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے پرہیز کرنے والے ہیں، صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنے والے مراد نہیں ہیں (ورنہ مغفرت کا مفہوم ہی کیا ہو گا کس چیز کی مغفرت ہو گی)

بغوی نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ قتادہ نے کہا ہم کو معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بندہ اللہ کی مقدارِ عفو کو جان لیتا تو حرام سے پرہیز نہ کرتا اور اگر اللہ کی مقدارِ عذاب کو جان لیتا تو خوف کے مارے (گویا) اس کی جان ہی نکل جاتی ترمذی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر مؤمن بندہ کو اللہ کے عذاب کا علم ہو جاتا تو پھر جنت کی امید ہی کسی کو نہ رہتی اور اگر کافروں کو اللہ کی رحمت کی مقدار معلوم ہو جاتی تو جنت سے مایوس نہ ہوتا۔

صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں نے سنا ہے رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے تخلیقِ رحمت کے دن اللہ نے سورِ حمّیں پیدا کیں، ننانوے رحمتیں اپنے پاس روک لیں اور ایک رحمت ساری مخلوق میں پھیلا دی جو رحمتیں اللہ کے پاس ہیں اگر ان سب سے کافر واقف ہو جائے تو جنت سے ناامید نہ ہو اور جو عذاب اللہ کے پاس ہے اگر مؤمن کو اس کا علم ہو جائے تو دوزخ سے بے خوف نہ ہو۔

احمد اور مسلم نے حضرت سلمانؓ کی روایت سے اور احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمان وزمین کی پیدائش کے دن اللہ نے سورِ حمّیں پیدا کیں ہر رحمت آسمان وزمین کے درمیانی فاصلہ کے مطابق۔ ان میں سے ایک رحمت زمین پر قائم کی جس کی وجہ سے ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی اور چرندے پرندے باہم محبت کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں پیچھے رکھ چھوڑی ہیں قیامت کا دن ہو گا تو ان رحمتوں کو اس رحمت سے ملا کر پورا کر دے گا۔

اس آیت میں اللہ نے اپنی صفت غفور و رحیم بیان فرمائی، عذاب دینے والا نہیں فرمایا (حالانکہ عذاب دینا بھی اسی کی صفت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ کا پہلو و عید پر راجح ہے مغفرت و رحمت غضب پر غالب ہے۔

اور ان کو ابراہیمؑ کے مہمانوں کے واقعہ کی اطلاع دے دو اس جملہ کا وَنَبَّأَهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿۵۱﴾ عطف امر سابق نبی عبادی پر ہے۔ یہ تائید ہے اس امر کی کہ اللہ کا وعدہ رحمت اور عید عذاب آخرت کی طرح دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں (دیکھو ابراہیمؑ پر اللہ نے رحمت کی، پیرانہ سالی کے باوجود ان کو اولاد عطا کی اور قوم لوط کو ہلاک کر دیا) ضیف کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے یہاں "ضيف" سے مراد ملائکہ ہیں جو ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت دینے اور قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهَا فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿۵۲﴾ جب مہمان ابراہیمؑ کے پاس آئے اور انہوں نے سلام (یعنی ہم سلام کرتے ہیں۔ سلاماً فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے) ابراہیمؑ نے کہا، ہم تم سے خوف زدہ ہیں۔ یعنی تم بخیر اجازت کے یا بے وقت آئے ہو اس لئے ہم تمہاری طرف سے ڈر رہے ہیں یا خوف کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے پیش کیا ہوا طعام مہمانی مہمانوں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا (جس سے حضرت ابراہیمؑ کو اندیشہ ہوا کہ شاید دشمن ہیں) کو جل کا معنی ہے کسی مصیبت کے آنے کے خوف سے دل کا بے چین ہو جانا۔

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلَيْكَ ﴿۵۳﴾ مہمانوں نے کہا آپ کچھ خوف نہ کریں ہم ایک ذی علم لڑکے کی آپ کو بشارت دیتے ہیں یعنی آپ کا ایک لڑکا ہو گا جو بالغ ہو کر بڑا عالم ہو گا۔ حضرت ابراہیمؑ چونکہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور بیوی بھی بوڑھی تھیں اس لئے آپ کو تعجب ہو اور

قَالَ أَبَشِّرُكُمْ بِبَشَارٍ لَّيْسَ بِمَعْمُولٍ ﴿۵۴﴾ کہا میرا تو بڑھاپا آ گیا اس کے باوجود تم بشارت دے رہے ہو کس سبب سے بشارت دے رہے ہو۔ یعنی ایسی بات کی خوش خبری دے رہے ہو جس کا معمولاً واقع ہونا ناقابل فہم ہے۔

قَالُوا بَشِّرْنَاكَ بِالْحَقِّ ﴿۵۵﴾ فرشتوں نے کہا ہم نے آپ کو سچی (یا یقین کے ساتھ یا سچے طریقے سے) خوش خبری دی ہے "حق" سے مراد ہے اللہ کا قول اور حکم جس کو ٹالنے والا کوئی نہیں۔ کسی طرح اس کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَاطِئِينَ ﴿۵۶﴾ پس آپ اس توڑنے والوں میں سے نہ ہوں (یقینی امید رکھیں) اللہ بغیر ماں باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ بوڑھے ماں باپ کو بچہ عطا فرمادے۔ حضرت ابراہیمؑ کو قدرت خدا کا انکار نہ تھا بلکہ ایسا ہونا چونکہ معمول خداوندی کے خلاف تھا اس لئے آپ کو تعجب ہوا۔

قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۷﴾ ابراہیمؑ نے کہا اگر اہوں کے سوال نے رب کی رحمت سے اور کوئی ناامید نہیں ہوتا۔ یعنی جو رحمت سے واقف نہیں، معرفت سے بے بہرہ ہیں اللہ کی رحمت، علم اور قدرت کی وسعت کا ان کو پتہ نہیں وہ ہی اس توڑ لیتے ہیں اور ناامید ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسا غضب سے بے فکر ہو جانا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۸﴾ ابراہیمؑ نے کہا، اے فرستادگان (الہی) تمہارا آنے کا معاملہ کیا ہے۔ یعنی اس بشارت کے علاوہ اصل سبب تمہارے نازل ہونے کا کیا ہے وہ کیا بڑا کام ہے جس کے لئے تم کو بھیجا گیا ہے شاید حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ متعدد فرشتوں کے آنے کی غرض یہ خوش خبری تو ہو نہیں سکتی بشارت دینے کے لئے تو ایک بھی کافی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زکریا اور حضرت مریمؑ کو ایک ہی فرشتہ نے بشارت دی تھی یا حضرت ابراہیمؑ یہ سمجھے کہ ان کے آنے کی اگر اصل غرض اگر خوش خبری پہنچانی ہوتی تو آتے ہی بشارت سنا دیتے۔ بشارت تو انہوں نے خوف کو دور کرنے کے لئے ذیلی اور ضمنی طور پر دے دی (شروع میں تو مہمان بن کر آئے تھے)

قَالُوا إِنَّا ارْتَبْنَا إِلَىٰ تَوْمٍ مَّجْرُمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ
 ہلاک کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو لوط کے پیرو ہیں (ان کو ہلاک کرنے کا ہم کو حکم نہیں) کیا اس طرح
 ترجمہ ہو گا کہ ہم کو تمام مجرموں یعنی مشرکوں کی طرف بھیجا گیا مگر آل لوط کے پاس نہیں بھیجا گیا تاکہ ہم مجرموں کو ہلاک کر
 دیں اور آل لوط کو ہلاک نہ کریں۔

ہم لوط کی بیوی کے سوا باقی تمام آل لوط کو بلاشبہ بچالیں گے۔
 ہم نے طے کر دیا ہے کہ وہ (عذاب میں) باقی رہنے والوں (یعنی کافروں)
 میں شامل ہوگی۔

تقدیر، بمعنی قضا کے ہے یعنی ہم نے کہہ دیا ہم نے طے کر دیا۔ لغت میں تقدیر کا معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے اندازہ کے
 موافق بنا دینا یا کر دینا۔ حقیقت میں یہ فعل اللہ کا ہے، لیکن فرشتوں کو اللہ سے خصوصی قرب حاصل تھا اس لئے فعل "تقدیر" کی
 نسبت فرشتوں کی طرف کر دی گئی یا ملائکہ کی طرف فعل "تقدیر" کی نسبت کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ تو محض قاصد جو نامہ بر تھے
 ان کا ہر قول و فعل اللہ کا قول و فعل تھا۔

فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾ قَالَ إِنَّكُمْ قومٌ مُّبْکَرُونَ ﴿۶۲﴾
 جب لوط کے گھر والوں
 کے پاس فرشتے پہنچے تو لوط نے ان سے کہا بلاشبہ تم اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یعنی میں نے تم کو نہیں پہچانا تم سے مجھے اندیشہ
 ہے نہ تو تم پر کوئی سسر کی علامت ہے کہ میں تم کو مسافر سمجھوں اور نہ تم اس بستی کے رہنے والے ہو کہیں تمہاری طرف سے
 مجھے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔

قَالُوا بَلْ جَعَلْنَاكَ بَہَا كَانُوا فِيہِ يَمْتَرُونَ ﴿۶۳﴾
 فرشتوں نے کہا ہم آپ کے پاس (کافروں
 کے لئے) وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں ان کو شک رہتا تھا یعنی آپ کو دکھ پہنچانے والی کوئی چیز لے کر نہیں
 آئے بلکہ آپ کے لئے خوش کن بات لائے ہیں، جس عذاب سے آپ ان کو ڈراتے تھے اور وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو
 عذاب کا خوف ہی نہ تھا وہی عذاب ان کے لئے لائے ہیں۔

وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ
 اور آپ کے پاس عذاب کی یقینی اطلاع (یا وہ عذاب جو اللہ کے علم میں محقق ہو چکا
 ہے) لے کر آئے ہیں۔

وَإِنَّا لَصِدْقُونَ ﴿۶۴﴾
 اور ہم (اپنے اس قول میں) یقیناً سچے ہیں۔
 فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ
 کسی حصے میں (یہاں سے) چلے جانا اور آپ ان سب کے پیچھے رہنا اور نہ دیکھے پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی۔
 قِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ پارہ شب، بعض نے کہا آخر شب۔ سب کے پیچھے چلنے سے مراد یہ ہے کہ تم ان کو اپنے آگے آگے
 تیزی سے نکال لے جاؤ اور ان کے احوال پر مطلع رہو۔ پیچھے پھر کر دیکھنے کی ممانعت اس لئے کی کہ ہولناک عذاب کا منظر ان سے
 دیکھنا نہ جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قوم کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر ان کے دلوں میں نرمی اور رقت پیدا ہو جائے اور اس قلبی ہمدردی
 کی پاداش میں ان پر بھی وہی عذاب آجائے۔

لَا يَلْتَفِتْ کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کوئی کسی کام کے لئے ساتھ جانے سے رہ جائے ورنہ وہ بھی ہمہ گیر عذاب میں مبتلا
 ہو جائے گا۔ بعض نے کہا، التفات کی ممانعت اس لئے کی گئی کہ دل کے جماؤ کے ساتھ وہ ترک وطن کر سکیں۔ (وطن اور احباب و
 اقارب کی طرف ان کی رغبت خاطر ہی پیدا نہ ہو پائے) بعض علماء کے نزدیک عدم التفات سے مراد لفظی ترجمہ نہیں بلکہ کتناہی
 معنی مراد ہیں یعنی سرپٹ نکل جاؤ، سستی نہ کرو، کہیں دم نہ لو، تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جاؤ۔ التفات (رخ کرنے کے لئے) کو ادنیٰ
 وقفہ اتنا وقفہ کہ منہ موڑ کر دیکھ لے) کرنا ہی پڑتا ہے گویا عدم التفات سے مراد ہے وقفہ نہ کرنا دم نہ لینا، تیزی کے ساتھ بھاگتے

چلا جاتا۔

اور جہاں جانے کا (اللہ کی طرف سے) تم کو حکم دیا جا رہا ہے وہاں چلے جاؤ
 یعنی شام کو چلے جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ مقاتل کے نزدیک زعر مراد ہے بعض نے اردن کہا ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَهُمْ لَآءٍ مَّقْطُوعٍ مُّصْبِحِينَ ﴿۶۶﴾
 اور ہم نے لوطؑ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ بالکل کٹ جائے گی سب ہلاک کر دیئے جائیں گے یعنی لوطؑ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ بالکل کٹ جائے گی۔ دابِرُ جڑ، یعنی ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا سب کے سب بالکل ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

اور شہر والے باہم خوش خبریاں سناتے آئے یعنی سدوم
 بستی کے رہنے والے نووارد خوب صورت لڑکوں کی آمد کی اطلاع خوشی خوشی باہم دینے لگے، امرِ پرست تھے
 خوب صورت نووارد لڑکوں کی آمد سے ان کا شیطانی جذبہ جوش میں آیا اور خوش خبری دینے لگا۔ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے گھر پہنچے تھے۔

وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿۶۷﴾
 لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں مجھے رسوا نہ کرو۔ مہمان
 کی رسوائی میزبان کی رسوائی ہے۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ ﴿۶۸﴾
 اور اللہ سے ڈرو (ایسی بے حیائی کی حرکت نہ کرو) اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ تختزون
 خزی سے ماخوذ ہے خزی کا معنی ہے ذلت یا خنایۃ سے ماخوذ ہے۔ خزیۃ کا معنی ہے شرمندگی، حیا، یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔
 وہ کہنے لگے، کیا ہم تم کو دنیا بھر کے لوگوں کی (ذمہ داری لینے اور ہمارے معاملے میں دخل دینے) سے منع نہیں کر چکے تھے۔

قَالُوا آؤكَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۶۹﴾
 پورا کلام اس طرح تھا کیا ہم ان کو تمہارے کہنے سے چھوڑ دیں باوجودیکہ
 ہم نے تم کو منع کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تم ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دخل نہ دو اور ہمارے خلاف کسی کو اپنے پاس
 پناہ میں نہ رکھو ہم تو ان سے جو کچھ چاہتے ہیں کریں گے۔ قوم لوطؑ والے (علاوہ امرِ پرست ہونے کے) راہزن بھی تھے راہگیروں
 کو لوٹا کرتے تھے حضرت لوطؑ بقدر امکان اس فعل سے ان کو منع کرتے تھے۔

قَالَ هُوَ لَآءٌ بَنِيَّ إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ﴿۷۰﴾
 لوطؑ نے کہا یہ میری لڑکیاں (موجود) ہیں (تم اپنی خواہش
 ان سے پوری کر سکتے ہو ان سے نکاح کر لو) اگر خواہش پوری کرنی چاہتے ہو تو ایسا کر لو یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم میرے کہنے پر
 عمل کرنے والے ہو تو ان سے نکاح کر لو۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۷۱﴾
 (اللہ نے فرمایا، اے محمد ﷺ) تمہاری زندگی کی قسم یہ
 لوگ درحقیقت اپنے نشہ میں سر مست ہیں عمر اور عمر ہم معنی ہیں۔ عمر کا لفظ خفیف بھی ہے اور قسم کے موقع پر یہی لفظ بولا جاتا
 ہے (عمر کا لفظ قسم کے موقع پر نہیں آتا) بغوی نے ابوالجوزاء کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ محمد ﷺ
 کی جان سے زیادہ عزیز اللہ نے کسی اور کی جان نہیں پیدا کی اور آپ کی زندگی کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔ عزیز
 ترین چیز ہی کی قسم کھائی جاتی ہے تمام جانوں میں حضورؐ کی جان اللہ کے نزدیک عزیز تھی اسی کی قسم کھائی۔ يَعْمَهُونَ کا معنی ہے
 سرگرداں ہیں، متحیر ہیں یعنی جب یہ کافر اپنے نشہ میں سر مست ہیں تو آپ کی نصیحت کیسے سن سکتے ہیں، یا یہ کلام ملائکہ کا ہے جو
 حضرت لوطؑ کو خطاب کر کے انہوں نے کہا تھا مطلب یہ ہے کہ اے لوطؑ تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ اپنے نشہ میں سر مست
 ہیں (تمہاری نصیحت نہیں سنیں گے یا اللہ کا قول سے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہی ہے اور اللہ نے قوم لوطؑ کی حالت بیان کی ہے
 مطلب اس طرح ہو گا کہ اے محمد ﷺ آپ کی زندگی کی قسم قوم لوطؑ درحقیقت اپنے نشہ میں مست تھی اور لوطؑ کی نصیحت نہیں

سن سکتے تھے۔ مترجم)

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّبْحَةُ مُشْرِقِينَ ﴿۴۷﴾

پس سورج نکلنے نکلنے ان کو ایک سخت آواز نے آدبایا۔ (پکڑ لیا کہ جہاں تھے وہیں رُک گئے، کوئی بچنے نہ پایا۔ مترجم) الصبحۃ یعنی ہولناک ہلاکت انگیز چیز چینچ۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ چینچ حضرت جبرئیل کی تھی شروق الشمس سورج کا نکلنا اور روشن ہونا۔ مراد یہ ہے کہ عذاب کا آغاز تو فجر سے ہی ہو گیا تھا اور تکمیل عذاب، سورج نکلنے کے وقت ہوئی۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

سو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا۔ حضرت جبرئیل نے اس بستی کو اٹھا کر الٹ دیا۔

اوپر کو نیچے کر دیا۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسائے۔ سبیل وہ مٹی جو سخت ہو کر پتھر ہو جاتی ہے (کنکر) یا وہ کنکر جو (ہر ایک کے لئے جدا جدا) نام زد تھا اس ترجمہ پر سبیل کے لفظ اور اس واقعہ کی تفصیل سورہ ہود میں گذر چکی ہے فَجَعَلْنَا فِيهَا (پھر) کا لفظ بتا رہا ہے کہ پہلے چینچ اور سخت آواز آئی تھی پھر بستی الٹی تھی اور پتھروں کی بارش ہوئی تھی۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّمَن تَوَسَّعَ عَيْنَيْهِ ﴿۴۹﴾

اس واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اہل بصیرت کے لئے۔ حضرت ابن عباس نے تَوَسَّعَ عَيْنَيْهِ کا ترجمہ کیا ہے۔ دیکھنے والے مجاہد نے کہا شناخت کرنے والے قیادہ نے کہا عبرت حاصل کرنے والے۔ مقاتل نے کہا غور کرنے والے میں کہتا ہوں وشم کا معنی ہے اثر کرنا، نشان پیدا کرنا اور سمتہ کا معنی ہے اثر، نشان یعنی جو لوگ ظاہر علامات و آثار کو دیکھ کر اندرونی نتائج و معانی کی شناخت کرنے والے ہیں ان کے لئے اس واقعہ میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

وَأَنَّهَا كِبْئِيلٌ مُّقِيمٌ ﴿۵۰﴾

اور وہ (یعنی الٹی ہوئی بستی) اس راستہ پر موجود ہے جو (اب بھی) آباد ہے یعنی اب بھی موجود ہے اس کے نشانات مٹے نہیں ہیں لوگ اس پر چلتے ہیں مقیم بمعنی قائم موجود (جس کے نشان مٹے نہ ہوں!) بلاشبہ اس بیان میں مؤمنوں کے لئے نشانی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ بیان اللہ کی طرف سے ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَن مَّوَدَّعَيْنَ ﴿۵۱﴾

وَأَنَّ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لظَالِمِينَ ﴿۵۲﴾ اور بلاشبہ ایکہ والے بھی ظالم تھے۔ انہوں نے شعیب کی تکذیب اور اللہ کی توحید کا انکار کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور دوزخ کے مستحق بنے تھے۔ الایکۃ گھنے درخت، جھاڑی۔ اصحاب الایکہ سے مراد حضرت شعیب کی قوم ہے جو گھنے جنگل میں رہتی تھی وہاں عموماً درخت گوگل کے تھے۔

وَأَنَّ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لظَالِمِينَ ﴿۵۲﴾

پس ہم نے ان سے انتقام لیا (ان کو ان کے جرم کی سزا دی) اللہ نے سات روز تک ان پر سخت گرمی کو مسلط کر دیا۔ سات روز کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آیا لوگ آرام لینے اور کچھ سکھ پانے کے لئے اس کے سایہ میں آگئے لیکن اللہ نے اس بادل سے ان پر آگ برسانی اور سب جل بھن کر خاک ہو گئے اس عذاب کو عذاب یوم الظلہ (سایہ کے دن کا عذاب) کہا گیا ہے۔

وَأَنَّ هُمَا لِبِئْسَ مَآبٍ مُّبِينٍ ﴿۵۳﴾

اور دونوں (قوموں کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں ہما (دونوں) سے مراد ہیں قوم لوط کی بستی سدوم اور قوم شعیب کی بستی ایکہ۔ بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ ایکہ اور مدین مراد ہیں کیونکہ ان دونوں شہروں کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اوپر کی آیت میں ایک کا ذکر کر دیا گیا (اصحاب الایکۃ کا ذکر کر دیا، دوسری بستی کا ذکر اس جگہ ضروری نہ تھا)

رَامَا بِسَبِينٍ كَهَلَا هُوَ رَاسْتَهُ، طَرِيقٌ وَاضِحٌ۔

جس کو دیکھ کر مکہ والے عبرت حاصل کر سکتے تھے (سفر میں اس راستہ پر جاتے تھے امام، ہر وہ چیز جس کی پیروی کی جائے (یعنی اس کو نمونہ برعمل یا پیشوا یا دستور کار بنا لیا جائے) لوح محفوظ کو اور معمار کی گنیا کی ڈور کو اور راستہ کو بھی اسی مناسبت سے امام کہا جاتا ہے (جہاں کے تمام واقعات لوح محفوظ کی تحریر کے موافق ہوتے ہیں۔ معمار اپنی

گنیا کے ڈورے سے تعمیر کو ناپتا اور اندازہ کرتا ہے اور راستے پر بھی سبھی لوگ چلتے ہیں راہ سب کے لئے راہ نما ہوتی ہے)

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۰﴾
یعنی حضرت صالحؑ کی اور ان پیغمبروں کی تکذیب کی جن کو حضرت صالحؑ نے سچا بتلایا تھا۔ اصحاب الحجْر سے مراد ہے قوم ثمود۔ حجر ایک وادی کا نام ہے جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی۔

وَأَتَيْنَهُمُ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۸۱﴾
اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں لیکن وہ نشانوں سے کتر گئے۔ آیات سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے نبی پر اتاری گئی تھی (یعنی حضرت صالحؑ کے صحیفے) یا پیغمبر کے معجزات مراد ہیں پتھر سے اونٹنی اور اس کے بچے کا برآمد کرنا، اس اونٹنی کا دودھ بکثرت ہونا اور تالابوں کا سار لپانی پی جانا۔

وَكَانُوا يَنْجِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا أَمِينِينَ ﴿۸۲﴾
وہ لوگ پہاڑ تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ امن میں رہیں یعنی نہایت مضبوط مکان بناتے تھے نہ ان کے گرنے کا اندیشہ ہوتا تھا نہ نقب زنی کا خوف، نہ دشمنوں کی طرف سے ڈھادینے کا ڈر، یا امینین کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ انتہائی عقلمندی کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی طرف سے بے خوف تھے ان کا خیال تھا کہ ہر طرح کے عذاب سے پہاڑوں کے اندر وہ اپنی حفاظت کر سکیں گے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿۸۳﴾
پھر انکو بھی (عذاب کی) ایک سخت آواز نے صبح ہوتے ہی پکڑ لیا (یعنی صبح شروع ہوتے ہی عذاب آگیا)

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَتَاعُهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۴﴾
سوان کے (دنیوی) گھر ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے یعنی مضبوط مکانوں کی تعمیر اور مال کی فراوانی اور تعداد کی کثرت ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکی۔ ہم نے سورہ توبہ میں غزوہ تبوک کے بیان کے سلسلہ میں لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تبوک کو جاتے ہوئے حجر میں سے گزرے تھے اور صحابہؓ سے فرمایا تھا جن لوگوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا تم ان کے گھروں اور بستی میں داخل ہو تو روتے ہوئے جانا کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا۔ حضور ﷺ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے چادر سے منہ چھپا کر تیزی کے ساتھ اونٹنی کو دوڑاتے ہوئے وادی سے گزر گئے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ
اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے نہیں پیدا کیا۔ یعنی ہم نے آسمان و زمین کی تخلیق حق کے ساتھ کی ہے تاکہ صالح اور اس کی صفات پر اس سے استدلال کیا جاسکے۔ اور منکروں کے خلاف دلیل قائم ہو سکے اور ان کی جہالت کے عذر کا ازالہ ہو جائے، یا یہ مطلب ہے کہ یہ کائنات (ہم نے اس طرح صحیح بنائی ہے کہ یہ) شر اور فساد کی مقتضی نہیں ہے بلکہ حکمتِ تخلیق کا تقاضا ہے کہ ایسے مفسد اور بربادی آفریں لوگوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ان کی فساد انگیزی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

وَلَا تَسْأَلُ السَّاعَةَ لَأْتِيَهُ
اور بلاشبہ قیامت آنے والی ہے۔ اس روز اللہ مشرکوں اور پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں سے انتقام لے گا۔

فَأَصْفَحَ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿۸۵﴾
سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کریں، یعنی آپ ان سے کوئی تعرض نہ کریں اور ان سے انتقام لینے کی جلدی نہ کریں۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلْقُ
کوئی شبہ نہیں کہ آپ کا رب ہی بہت بڑا خالق ہے، اسی نے آپ کو بھی پیدا کیا اور آپ کے دشمنوں کو بھی۔ اسی کے ہاتھ میں تمام امور ہیں۔

الْعَلِيِّ ﴿۸۶﴾
وہی (نیک و بد اور نیکو کار و بدکار کو) خوب جاننے والا ہے پس ہر ایک کو اس کے اعمال کے موافق جزا و سزا دے گا، یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے مخالفوں کو خوب جانتا ہے لہذا آپ کو اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کر دینا چاہئے، یا یہ مطلب ہے کہ اسی نے آپ کو پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ آپ کے لئے کیا مناسب اور مفید ہے۔ پس اس

وقت در گذر کرنا ہی مناسب ہے آپ در گذر کیجئے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۱۵﴾

اور ہم نے آپ کو سات

آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

المَثَانِي مَثَانَةٌ کی جمع ہے اور مَثَانَةٌ اسم ظرف ہے یا مَثْنِيَّة کی جمع ہے اور مَثْنِيَّة اسم فاعل ہے بہر حال اس کا موصوف محذوف ہے یعنی آیات یا سور (سور میں)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا سات مثنائی سے مراد ہے سورہ فاتحہ جس کی سات آیات ہیں۔ قتادہ، حسن بصری، عطاء اور سعید بن جبیرؓ کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّ الْقُرْآنَ (سورہ فاتحہ) سات (آیات) ہیں مَثَانِي (نماز میں بار بار پڑھی جانے والی) اور (یہی) قرآن عظیم ہے مَثَانِي کہنے کی وجوہ متعدد بیان کی گئی ہے حضرت ابن عباسؓ، حسن اور قتادہ کے نزدیک نماز میں بار بار یعنی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس لئے مثنائی کہا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورت فاتحہ کے دو حصے ہیں نصف تو اللہ کے لئے جس میں اللہ کی ثنا کی گئی ہے اور نصف دعا ہے جو بندہ کے لئے ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے، میں نے (سورہ) صلوٰۃ (یعنی سورہ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے لئے آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اِلیٰ آخر الحدیث۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

حسین بن فضل نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ سورہ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ایک بار مکہ شریف میں اور دوسری بار مدینہ پاک میں، ہر مرتبہ ستر ہزار فرشتے سورہ فاتحہ کے جلو میں تھے۔ مجاہد نے کہا، مثنائی کا معنی ہے منتخب، چھانٹی ہوئی۔ اللہ نے یہ سورہ اس امت کے لئے چھانٹ کر رکھ لی تھی، کسی دوسری امت کو عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید بلخی نے کہا ثَنِيْتُ الْعِنَانِ کا معنی ہے میں نے لگام کو پھیر دیا، موڑ دیا یہ سورہ بھی شریروں اور بدکاروں کو بدکاری سے پھیر دیتی ہے۔ بعض نے کہا مثنائی ثناء سے ہے اس سورہ میں اللہ کی ثناء کی گئی ہے یعنی اللہ کی عظیم صفات کا بیان ہے۔

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سَبْعًا سے مراد ہیں سات سورتیں اور مِّنَ الْمَثَانِي میں مثنائی بیان ہے (سات سورتیں یعنی مثنائی) اور سات سورتوں سے مراد سبع طوال ہیں جن میں سب سے اول سورہ بقرہ ہے اور انفال و توبہ کا مجموعہ ہے یہ دونوں سورتیں ایک سورت کے حکم میں ہیں اسی لئے دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی جاتی، سطر خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ بعض نے کہا سبع طوال میں آخری سورہ صرف سورہ توبہ ہے۔ بعض کے نزدیک آخری سورت یونس ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے مثنائی کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ ان ساتوں سورتوں میں فرائض، حدود، امثال، خیر و شر اور عبرت آفریں الفاظ (وقصص) کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔^{۱۵} یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ مثنائی ثناء سے مشتق ہے قرآن بلا غت اور اعجاز کے لحاظ سے ثناء کردہ بھی ہے اور اللہ کی صفات کو اس نے بیان بھی کیا ہے۔ اس لئے ثناء کرنے والا بھی ہے۔

محمد بن نصر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تورات کی جگہ مجھے سبع طوال

۱۵ حضرت عمر بن خطابؓ نے آیت لَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي کے ذیل میں فرمایا یہ یعنی سبع مثنائی سبع طوال و سات طویل سورتیں ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور سفیان وغیرہم کی طرف بھی یہ قول منسوب ہے میں کہتا ہوں مثنائی (بایں معنی) تو سارا قرآن ہے پورے قرآن میں ایک ہی قصہ بار بار ذکر کیا گیا ہے، مفسر۔

عطا فرمائی ہے اور انجیل کی جگہ آلہ والی سورتیں طس والی سورتوں تک عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ طس سے حم والی سورتوں تک عنایت کی ہیں اور حم والی سورتیں مزید عطا فرمائی ہیں اور مفصلات کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا (یعنی مجھے خاص طور پر مفصلات عطا فرمائی ہیں) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سبع طوال عطا کی گئیں (سات طویل سورتیں عطا کی گئیں) اور حضرت موسیٰ کو چھ عطا کی گئیں پھر جب حضرت موسیٰ نے تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں تو دو سورتیں اٹھالی گئیں چار باقی رہ گئیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبع مثانی سے حم والی سورتیں مراد ہیں یعنی نے اپنی سند سے حضرت ثوبان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے توریت کی جگہ مجھے سبع طوال عطا فرمائی اور انجیل کی جگہ مین عطا فرمائی اور زبور کی جگہ مثانی اور میزے رب نے مفصلات مزید عنایت کیں۔

طاؤس کا قول ہے کہ مثالی سے مراد پورا قرآن ہے آیت میں آیا ہے اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابہاً مثانی قرآن کو مثالی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں واقعات و قصص کا بیان کوٹ کوٹ کر بار بار کیا گیا ہے۔ اس قول پر من المثانی میں من تبعیض کے لئے ہو گا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی (یعنی قرآن کی سات سورتیں ہم نے تم کو دیں) بعض کے نزدیک "مثانی" سے مراد پورا قرآن ہے اور سبع سے مراد ہیں ساتوں اجزاء (یعنی قرآن کو سات حصوں پر تقسیم کیا جائے تو ساتوں حصے یعنی پورا قرآن مراد ہے اس قول پر والقرآن العظیم کا عطف صرف اختلاف صفت کی وجہ سے ہو گا (جیسے کہا جاتا ہے زید عالم ہے اور نیک مالدار ہے اور شریف النسب ہے)

بہر حال اقوال مذکورہ بالا کے لحاظ سے القرآن العظیم کا عطف ایسا ہو گا جیسا کل کا اس کے جز پر کر دیا جاتا ہے یا ایسا ہو گا جیسا عام کا خاص پر عطف ہوتا ہے۔

آب اس چیز کو نظر اٹھا کر بھی نہ
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ
دیکھیں جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لئے دی ہے۔ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آنکھیں اٹھانے سے مراد ہے لالچ اور رغبت کے ساتھ نظر اٹھا کر دیکھنا۔ ازواج کا معنی ہے اصناف یعنی قسم قسم کے کافروں کو جو ہم نے دنیا کی نعمتیں عطا کی ہیں آپ ان کی طرف رغبت اور طمع کی نظر سے نہ دیکھیں۔ آپ کو جو قرآن دیا گیا ہے اس کے مقابلے میں یہ ساری نعمتیں حقیر ہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اللہ نے کسی کو قرآن عطا فرما دیا ہو اور کسی دوسرے شخص کو دنیا عطا کی ہو اور حامل قرآن مالدار کی دنیا کو اس نعمت سے بہتر خیال کرے جو اسے دی گئی ہے تو اس نے بڑی نعمت کو چھوٹی اور چھوٹی کو بڑی قرار دے دیا (یعنی نعمت قرآن اعلیٰ ہے اور نعمت دنیا ادنیٰ)۔ جو شخص نعمت دنیا کو نعمت قرآن پر ترجیح دے اس نے ادنیٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ادنیٰ بنا دیا)

بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَّعِنَ بِالْقُرْآنِ کا مطلب سفیان بن عیینہ نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص قرآن کی نعمت پا کر (ساری دنیا کی دولت سے) بے نیاز نہ ہو جائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

بخاری اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اور امام احمد و ابو داؤد، وابن حبان و حاکم نے حضرت سعد کی روایت سے

اور ابو داؤد ابولبابہ کی وساطت سے عبدالمزدر کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن عباس و حضرت عائشہ کی روایت سے بیان کیا

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ بغوی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں، کسی فاجر پر (اس کی) نعمت کی وجہ سے رشک نہ کرو تم کو نہیں معلوم کہ مرنے کے بعد اس کو کیا پیش آئے گا اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ وہب بن منبہ کو جب اس حدیث کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے ابو داؤد اعمور کو بھیج کر دریافت کر لیا کہ نہ مرنے والے قاتل کا کیا مطلب ہے۔ عبد اللہ بن مریم نے کہا، اس سے مراد ہے دوزخ۔ امام احمد، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اوپر والے کو نہ دیکھو اللہ کی جو نعمت تم کو حاصل ہے اس کو حقیر نہ سمجھنے کے لئے یہی (تدبیر) زیادہ مناسب ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
اور کافروں کا کچھ غم نہ کیجئے کہ یہ ایمان نہیں لائے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو جو کافروں کی طرح دنیا نہیں ملی اس کی وجہ سے کافر کی نعمت پر کچھ رنج نہ کرو۔

وَإِخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾
اور مسلمانوں پر شفقت رکھیے۔ یعنی مومنوں سے نرمی کیجئے ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ رکھیے۔

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾
اور (کافروں سے) کہہ دو کہ میں واضح طور پر (تم کو اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) ڈرانے والا ہوں کھول کھول کر واضح دلائل کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تم ایمان نہ لائے تو اللہ کا عذاب تم پر آجائے گا۔

كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹۰﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾
(ایسا ہی عذاب) جیسا عذاب ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے حصے کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے (بعض حصوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے تم پر بھی نازل کریں گے)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا آیت کَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ (میں مُقْتَسِمِينَ) سے مراد کیا ہے فرمایا، یہودی اور عیسائی۔ سائل نے دریافت کیا عِضِينَ کا کیا مطلب ہے فرمایا، بعض حصہ پر ایمان لائے بعض کا انکار کر دیا۔

عِضِينَ عِضَّةً کی جمع ہے عِضَّةً کا معنی ہے ٹکڑا، ایک پارہ (قاموس) عِضَّةً کی اصل عِضْوَةٌ تھی۔ عِضِّي الشَّاةُ اس نے بکری کے اعضاء جدا کر دیئے یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے ایک کو حق اور دوسرے کو باطل کہتے تھے۔ جس کو حق کہتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے یہ توریت و انجیل کے موافق ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور جس حصہ کو باطل قرار دیتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے، یہ توریت و انجیل کے خلاف ہے اس لئے غلط ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض اہل کتاب بطور استہزاء کہتے تھے سورہ بقرہ میری ہے، دوسرا کہتا تھا آل عمران میری ہے۔

مجاہد نے کہا، الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور قرآن سے مراد وہ (عیسائی مذہب کی) کتابیں ہیں جو اہل کتاب پڑھتے تھے یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتاب کو پہچان تو لیا تھا (یعنی اقرار تو کرتے تھے) مگر اس کو چھوڑ دیا تھا۔ بعض علماء نے کہا الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد ہیں قرآن کے متعلق مختلف خیالات رکھنے والے کافر کوئی قرآن کو جادو کہتا تھا کوئی شاعری کوئی کہانت اور کوئی داستان پارینہ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اِقْتِسَام سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ان کے اقوال بٹے ہوئے تھے کوئی آپ کو جادو گر کہتا تھا، کوئی شاعر، کوئی کاہن۔

مقاتل کی روایت ہے کہ حج کے زمانہ میں ولید بن مغیرہ نے سولہ آدمی مکہ کی گھاٹیوں، مختلف راستوں اور مورچوں پر اس غرض سے مقرر کر دیئے تھے کہ جو کوئی باہر سے محمد ﷺ کے پاس آئے اس سے کہہ دیں کہ تم اس کے فریب میں نہ آجانا۔ مقرر کردہ لوگوں میں سے کچھ لوگ تو کہیں یہ شخص دیوانہ ہے، کچھ کہیں کاہن ہے، کچھ شاعر کہیں۔ خود ولید کعبہ کے دروازے پر جا کر بیٹھ گیا تھا جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کچھ لوگ ساحر، کچھ شاعر، کچھ مجنون کہتے ہیں تمہارا کیا فیصلہ ہے، ولید نے کہا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں سب لوگ سچ کہتے ہیں۔

اب اگر مُقْتَسِمِينَ سے مراد یہودی لئے جائیں تو اللہ کی طرف سے جو عذاب ان پر آیا وہ بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر

کے ملک بدر کئے جانے کی صورت میں نمودار ہوا اور اگر مُقْتَسِمِین سے مراد قریش (ولید کے مقرر کئے ہوئے اشخاص) ہوں تو بدر کی شکست کی شکل میں ان پر اللہ کا عذاب آیا، بعض اہل تفسیر کے نزدیک مُقْتَسِمِین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت صالحؑ کو رات میں قتل کر دینے کا مشورہ کیا تھا اور اس پر قسمیں کھائی تھیں (اس صورت میں المُقْتَسِمِین کا ترجمہ ہوگا، قسمیں کھانے والے)

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ عِضْنٌ عِضَّةٌ کی جمع ہے اور عِضَّةٌ کی اصل عِضَّةٌ تھی جیسے شَفَّةٌ اصل میں شَفْهَةٌ تھا عِضَّةٌ جھوٹ اور بہتان کو کہتے ہیں صاحب قاموس نے عِضَّةٌ کا معنی کذب لکھا ہے حدیث بیعت میں آیا ہے کہ اِنَّا كُفْرًا وَالْعِضَّةُ بَهْتَانٌ تَرَاثَى سَ بچو۔ زحشری نے کہا کہ عِضَّةٌ اصل میں عِضَّةٌ بَرُوذَانٌ فَعَلَةٌ تَهَاوُرَ عِضَّةٌ کا معنی ہے بہتان۔ کذافی النہایۃ للجزری۔

بعض اہل لغت کا قول ہے کہ الْعِضَّةُ کا معنی ہے جادو صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ الْعِضُونُ بمعنی جادویہ عِضَّةٌ کی جمع ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے لَعْنُ اللّٰهِ النَّاسِ الْفٰسِقِیْنَ وَالْمُسْتَعْضِیَةَ جَادُو كِرْنِے وَالِی اور جادو کرانے والی پر اللہ کی لعنت (النہایت) یہ بھی ممکن ہے کہ كَمَا اَنْزَلْنَاكَ تَلْعُقَ وَلَقَدْ اَتَيْنَاكَ سَ ہو اور اَتَيْنَاكَ كَا معنی ہو اَنْزَلْنَا اور اَنْزَلْنَا عَلٰی الْمُقْتَسِمِیْنَ سے مراد (عذاب نازل کرنا ہو بلکہ) توریت و انجیل نازل کرنا ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا ہم نے آپ پر سبعہ مثالی نازل کیں جیسے یہود و نصاریٰ پر توریت و انجیل اتاری۔

اس صورت میں آیت لَا تَمُدَّنَّ سے آخر آیت تک جملہ معترضہ ہوگی۔ اور الَّذِیْنَ جَعَلُوا اَنْتُرَانِ عِضِیْنَ الْمُقْتَسِمِیْنَ کی صفت ہوگی۔ لیکن اگر الْمُقْتَسِمِیْنَ سے مراد وہ لوگ ہوں جنہوں نے صالحؑ کو قتل کرنے کا باہم مشورہ کیا تھا تو الَّذِیْنَ جَعَلُوا مَبْتَدَاً ہوگا اور آئندہ آیت خبر۔

فَوَرَبِّكَ لَنْسْأَلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۶﴾ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾
 پس قسم ہے آپ کے رب کی (یعنی ہم کو اپنی ذات کی) کہ ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔ اعمال میں گناہ بھی داخل ہیں اور کفر بھی اور قرآن کی تکذیب بھی اور اس کو جادو قرار دینا بھی سوال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم ان سے باز پرس کریں گے اور ان کو ان کے کئے کی سزا بھی دیں گے۔

بغوی نے محمد بن اسماعیل بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ متعدد علماء کے نزدیک عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ سے مراد ہے لا الہ الا اللہ (یعنی لا الہ الا اللہ کی ہم ان سے باز پرس کریں گے)

ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، اور ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم ان سے باز پرس کریں گے کلمہ لا الہ الا اللہ کے متعلق۔

مسلم نے حضرت ابو بزرہ اسلمیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (پل) صراط سے کسی بندہ کے قدم اس وقت تک نہیں ہٹیں گے (یعنی کوئی شخص اس وقت تک پل صراط سے پار نہیں ہوگا) جب تک اس سے چار باتیں نہ پوچھ لی جائیں گی۔ اس وقت سوال کیا جائے گا عمر کے متعلق کہ کس کام میں ختم کی اور (سوال ہوگا) جسم کے متعلق کہ کس کام میں اس کو چرانا کیا (یعنی جسمانی طاقتیں کس کس کام میں صرف کیں) اور (سوال ہوگا) علم کے متعلق کہ علم کے بعد کیا عمل کیا اور (سوال ہوگا) مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ ترمذی اور ابن مردویہ نے حدیث اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

اصہبانی نے ترمذی میں اور طبرانی نے (الاوسط میں) حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، علم (سکھانے) میں باہم خیر خواہی سے کام لو، کوئی کسی سے علم پوشیدہ نہ رکھے، علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے

سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ اس کی بھی تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔

ابو نعیم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بندہ جو قدم بھی (کسی مقصد کے لئے) اٹھاتا ہے اللہ اس مقصد کی اس سے ضرور باز پرس کرے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص لوگوں کی امامت کرے اس کو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور یہ جان لینا چاہئے کہ وہ (مقتدیوں کا) ذمہ دار ہے۔ اور اس ذمہ داری کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی اگر اس نے امامت اچھی (طرح، صحیح) کی ہوگی تو اس کو پیچھے والوں کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا اور اگر کچھ کمی ہوگی (یعنی نماز میں کچھ نقص ہوگا) تو اس کا گناہ بھی امام پر پڑے گا۔ ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، معاذ مؤمن سے قیامت کے دن اس کے تمام کاموں کی باز پرس ہوگی یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ (لگانے) کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔

بیہقی اور ابن ابی الدنیانے حسن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو بندہ کوئی خطبہ دیتا ہے اللہ اس سے اس خطبہ اور خطبہ کی اصل مراد کے متعلق ضرور باز پرس کرے گا۔ یہ حدیث مرسل ہے (حسن بصری تابعی ہیں صحابی کا نام روایت میں نہیں ہے)

ابن ابی حاتم نے انفع بن عبد اللہ کلاعی کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے سات پل ہیں اور صراط ان کے اوپر ہے۔ تمام مخلوق کو پہلے پل پر روک لیا جائے گا حکم ہوگا ان کو ٹھہرا لو، ان سے باز پرس کی جائے گی، یہاں نماز کی حساب فہمی اور باز پرس ہوگی ہلاک ہونے والا ہلاک ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا، دوسرے پل پر پہنچیں گے تو امانت کی بابت سوال ہوگا کہ کسے ادا کی اور کیسے اس میں خیانت کی یہاں بھی تباہ ہونے والا تباہ ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا، پھر تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ سلسلہ قرابت کو جوڑ لیا توڑا۔ یہاں بھی مرنے والا مرے گا اور بچنے والا بچ جائے گا۔ گارحم اس روز نیچے کی طرف آویختہ ہوگا اور عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا ہو تو بھی اس کو اپنے سے ملا لے اور جس نے مجھے توڑا ہو تو بھی اس سے قطع تعلق کر لے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن اللہ بندہ سے سوالات کرے گا یہاں تک کہ فرمائے گا جب تو نے بری بات دیکھی تو اس کا رد کیوں نہیں کیا۔ اس وقت اللہ خود اس کے دل میں صحیح جواب ڈال دے گا۔ بندہ عرض کرے گا، میرے رب میں تجھ سے امید لگائے ہوئے تھا اور لوگوں سے مجھے ڈر تھا (اس لئے خاموش رہا اور اس کام کو دل سے بڑا جانتا رہا)۔

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک (ذمہ دار) نگرال ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق باز پرس اس سے کی جائے گی حاکم سب لوگوں کا ذمہ دار اور نگرال ہے اس سے اس کی رعیت کی باز پرس کی جائے گی۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔ اس سے گھر والوں کے متعلق باز پرس ہوگی عورت اپنے شوہر کے گھر والوں کی اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہوگی اس سے (اس کے حلقہ اثر مال کے متعلق باز پرس ہوگی۔ غلام (یعنی خادم) اپنے آقا کے مال کا نگرال ہے اس سے آقا کے مال کے متعلق باز پرس ہوگی غرض تم میں سے ہر ایک نگرال (یعنی ذمہ دار) ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی اس موضوع کی احادیث حضرت انسؓ کی روایت سے ابن حبان، ابو نعیم اور طبرانی نے بھی بیان کی ہیں۔

طبرانی نے الکبیر میں حضرت مقدم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت مقدمؓ نے فرمایا، میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے جو شخص بھی کسی قوم پر (مسلط، پیشوا، حاکم، لیڈر وغیرہ) ہوگا قیامت کے دن وہ اس قوم کے آگے آگے جھنڈا اٹھائے ہوگا اور وہ لوگ اس کے پیچھے ہوں گے۔ قوم کے متعلق اس سے باز پرس کی جائے گی اور قوم والوں سے اس

کی بابت پوچھا جائے گا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو امیر دس آدمیوں کا بھی حاکم ہو گا قیامت کے دن اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق باز پرس ہوگی (سوال کے سلسلہ کی احادیث بکثرت آئی ہیں) ایک شبہ: آیت لَنْسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ اور اس کے ہم معنی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک سے اس کے اعمال کی باز پرس ضرور ہوگی لیکن آیت فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ سے سوال کی نفی ہوتی ہے بظاہر دونوں میں تضاد ہے۔

ازالہ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ سوال نہ ہوگا کہ تم نے یہ عمل کیا یا نہیں۔ اللہ کو اس سوال کی ضرورت نہیں اس کو کسی عمل کے کرنے نہ کرنے کا کامل علم ہے بلکہ باز پرس اس بات کی ہوگی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ بیہقی نے ابو طلحہ کی سند سے بھی حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قطرب نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا ہے کہ سوال کی دو قسمیں ہیں:

(۱) علم حاصل کرنے کے لئے جس کو استفہامیہ سوال کہا جاتا ہے۔
(۲) زجر و توبیح کے لئے۔ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ میں استفہامیہ سوال کی نفی کی گئی ہے اور لَنْسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ میں زجر و توبیح کے لئے سوال کرنے کی صراحت کی ہے۔ مگر وہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، قیامت کا دن بہت طویل ہوگا جس میں متعدد مواقعِ راہ اور روکے جانے کے مقامات ہوں گے بعض مقامات پر اعمال کی باز پرس ہوگی، بعض مقامات پر کوئی سوال نہ ہوگا۔ یہی تاویل ان آیات کی ہے جن میں بولنے اور نہ بولنے کا تضاد معلوم ہوتا ہے ایک آیت ہے هَذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُونَ یہ ایسا دن ہوگا کہ لوگ کچھ نہ بول سکیں گے دوسری آیت ہے يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ قیامت کے دن تم رب کے پاس جھگڑا کرو گے (کذا اخرج الحاكم) فاصداعُ بِمَا تَوَمَّرَ جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اس کو علی الاعلان بیان کر دیجئے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اِصْدَعْ کا ترجمہ کیا ہے ظاہر کر دو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اظہارِ دعوت کا حکم دیا ہے۔ عبد اللہ بن عبیدہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ اسلام و ایمان کی دعوت پوشیدہ طور پر دیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کھل کر سامنے آگئے۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ اِصْدَعْ بِمَا تَوَمَّرَ کا ترجمہ ہے ”دعوت جاری رکھو۔ ضحاک نے ترجمہ کیا ”اطلاع دے دو اعلان کر دو“ احنف نے کہا قرآن کے ذریعہ سے حق کو باطل سے جدا کر دو ویسبویہ نے کہا جیسا تم کو حکم دیا جا رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ کرو۔ لغت میں صَدَّعَ کا معنی ہے الگ الگ کر دینا (پھاڑ دینا) جِدَّ اَجِدَّ کر دینا۔ فضل کر دینا (لغوی معنی کی مناسبت سے علماء نے مراد ہی معنی جدا جِدَّ ابیان کئے ہیں) وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۷﴾

اور مشرکوں کی طرف کوئی توجہ نہ کرو (یعنی مشرکوں کی پروا نہ کرو مترجم) بعض علماء نے کہا آیتِ قتال سے یہ آیت منسوخ ہوگئی۔

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۵﴾ یہ لوگ (جو آپ پر) استہزاء کرتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے ہم کافی ہیں یعنی ان کی جڑ اکھاڑ دیں گے ان کو تباہ کر دیں گے بغوی نے لکھا ہے اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم اللہ کا حکم پکار کر سناؤ۔ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ تمہارے لئے اللہ کافی ہے مذاق اڑانے والوں اور تم سے ٹھٹھول کرنے والوں کے مقابلے میں بھی اللہ نے تمہاری مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ سے استہزاء کرنے والے اور آپ کی ہنسی اڑانے والے قریش کے پندرہ سردار تھے۔ (۱) ولید بن مغیرہ مخزومی یہ سب کا سرگروہ تھا۔ (۲) عاص بن وائل سہمی۔ (۳) اسود بن مطلب بن حارث بن اسد بن عبد العزیٰ رسول

اللہ ﷺ نے اس کو بدو عادی بھی اور فرمایا تھا اے اللہ اس کو اندھا کر دے اس کو لاؤلد کر دے۔ (۴) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن مناف بن زہرہ (۵) حارث بن قیس بن الطلالہ رسول اللہ ﷺ سے استہزاء کر نیوالے کعبہ کا حواف کر رہے ہیں۔ ولید بن مغیرہ آپ کی طرف سے گزرا تھے میں جبرئیل آئے اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو کھڑے ہو گئے اور کہا محمد تمہارے نزدیک یہ کیسا ہے رسول اللہ نے جواب دیا بڑا بندہ ہے جبرئیل نے کہا آپ کا کام اللہ کی طرف سے پورا کر دیا گیا پھر جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا بنا پوائے زولید کسی خزاعی آدمی کی طرف سے ہو کر نکلا وہ شخص اپنے تیروں کے پر ٹھیک کر رہا تھا ولید اس وقت یمنی چادر اوڑھے (غرور سے) تہہ بند زمین میں کھینچتا ہوا چل رہا تھا۔ خزاعی شخص کے تیر کی بوری ولید کے تہہ بند سے الجھ گئی انتہائی غرور کی وجہ سے نیچے جھک کر بوری کو تہہ بند سے نکالنا گوارا نہ کیا اور زور سے اپنی پنڈلی کو دے پڑکا۔ بوری سے پنڈلی میں خراش لگ گئی اور اسی خراش سے یہ مر گیا۔ عاص بن اوائل بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرا اور جبرئیل نے دریافت کیا تھا یہ کیسا آدمی تھا رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا تھا بڑا بندہ ہے۔ جبرئیل نے عاص کے پاؤں کے تلوؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ کا کام ہو گیا (اب آپ کو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں کرنا پڑے گا) چنانچہ ایک روز عاص تفریح کر کے لئے اونٹنی پر سوار ہو کر اپنے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر مکہ سے باہر نکلا اور کسی گھائی پر جا کر اترا وہاں کپڑے کا کوئی ٹکڑا تھا عاص نے اس پر قدم رکھا کپڑے میں کوئی کاٹا تھا کاٹا اس کے تلوے میں چبھ گیا عاص فوراً چلایا مجھے کسی کیڑے نے ڈس لیا، لوگوں نے تلوے کو دیکھا لیکن ڈھونڈنے کے بعد کوئی چیز نظر نہ آئی، ٹانگ سوچ کر اونٹ کی گردن کی طرح ہو گئی آخر وہیں اسی وقت مر گیا۔

اسود بن مطلب بھی (جبرئیل کی موجودگی میں) رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گذرا اور جبرئیل کے سوال و جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا یہ بڑا بندہ ہے اور جبرئیل نے حسب سابق کہا آپ کا کام کر دیا گیا اور اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تھا چنانچہ اسود نابینا ہو گیا حضرت ابن عباس نے فرمایا جبرئیل نے ایک سبز پتہ اسود پر مارا تھا جس سے اس کی نگاہ جاتی رہی اور آنکھوں میں اتنا درد ہوا کہ دیوار سے سر پٹکنے لگا آخر اسی میں مر گیا۔ کلبی کی روایت میں آیا ہے کہ اسود اپنے غلام کے ساتھ کسی درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جبرئیل وہاں پہنچ گئے۔ اور اس کا سر پکڑ کر درخت سے ٹکرانے اور منہ پر کانٹے مارنے لگے۔ اسود نے واویلا مچادی اور غلام سے مدد کا خواستگار ہوا۔ غلام نے کہا، مجھے تو اور کوئی نظر نہیں آتا آپ خود ہی یہ حرکت کر رہے ہیں۔ کہنے لگا، مجھے محمد کے رب نے قتل کر دیا یہ لفظ کہتے کہتے مر گیا۔ اسود بن عبد یغوث بھی گذرا تھا اور جبرئیل کے سوال کے جواب میں حضور نے فرمایا، یہ بڑا بندہ ہے باوجودیکہ میرے ماموں کا بیٹا ہے جبرئیل نے کہا اب آپ کو (اس کی دفاع کی) کوئی ضرورت نہیں یہ کہتے ہوئے اسود کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا جس سے اس کو استسقاء بطن ہو گیا اور مر گیا۔ کلبی کی روایت میں آیا ہے کہ اسود (ایک روز) گھر سے نکلا، باہر لوگ گئی لو لگنے سے اس کا رنگ (جل کر) کالے جیشی کی طرح ہو گیا گھر کو لوٹا تو گھر والوں نے اسے پہچانا بھی نہیں اور باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا اسی حالت میں وہ مر گیا اور مرتے مرتے کہتا رہا، مجھے محمد کے رب نے قتل کیا ہے۔ حارث بن قیس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے کہا تھا یہ بڑا بندہ ہے۔ جبرئیل نے حارث کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا آپ کا کام کر دیا گیا آپ کو ضرورت نہیں چنانچہ اس کی ناک سے پیپ کی ریزش ہونے لگی اسی سے مر گیا حضرت ابن عباس نے فرمایا، حارث بن قیس نے نمکین مچھلی کھائی تھی جس سے پیاس کی شدت ہو گئی اور برابر پانی پیتا رہا، آخر پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا آیت اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ کا مطلب یہی ہے جو آپ کے ساتھ اور قرآن کے ساتھ استہزاء کرتے تھے ہم نے (ان کے شر سے آپ کو محفوظ رکھا اور) آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دیا۔

طبرانی، ابو نعیم اور بیہقی نے (دلائل میں) حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ (رسول اللہ ﷺ کی ہنسی بنانے والے) پانچ قریشی سردار تھے ولید بن مغیرہ، عاص بن اوائل، عدی بن قیس، اسود بن عبد یغوث اور اسود بن مطلب۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچانے اور آپ کا مذاق اڑانے میں بہت آگے بڑھ چکے تھے حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دوں۔ چنانچہ جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی شخص تیر درست کر رہا تھا ولید ادھر سے گذرا اور اس کا کپڑا تیر سے الجھ گیا۔ اس نے غرور کی وجہ سے جھک کر

تیر نہیں نکالا آخر تیر کی بوری کسی رگ میں لگ گئی اور اسی زخم سے وہ مر گیا حضرت جبرئیلؑ نے عاص کے تلوے کی طرف اشارہ کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تلوے میں کوئی کانٹا چبھ گیا ٹانگ سوچ کر چھلکی کی طرح ہو گئی اور وہ مر گیا۔ عدی بن قیس کی ناک کی طرف اشارہ کیا ناک سے پیپ بننے لگی اور اسی سے اس کا انتقال ہو گیا! اسود بن عبد بعتوث کے سر کی طرف اشارہ کیا تھا ایک روز یہ شخص کسی درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سر کو درخت سے ٹکرانے اور منہ کو کانٹوں (والی سنی) سے سینے لگا آخر مر گیا اسود بن مطلب کی آنکھوں کی جانب اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اندھا ہو گیا۔

بزار اور طبرانی نے حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں کی طرف سے گزرے ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی پشت کی طرف طعن آمیز اشارہ کر کے کہا یہی وہ شخص ہے جو اپنے کو نبی کہتا ہے اس وقت جبرئیلؑ حضور ﷺ کے ساتھ تھے جبرئیلؑ نے ان کی طرف اشارہ کیا جس کی وجہ سے ناخن کے نشان کی طرح ان کے جسموں پر نشان ہو گیا آخر وہ نشان پھوڑا بن گیا اور سر گرا گیا اور ایسا سر گیا کہ کوئی پاس بھی نہیں جاتا تھا انہیں لوگوں کے متعلق آیت اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ نازل فرمائی۔

الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ، فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۹۱﴾
 شریک (شریک) قرار دیتے ہیں یقیناً انکو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کار کیا ہوا۔
 اور ہم یقیناً واقف ہیں کہ ان کے قول سے
 وَلَقَدْ نَعَلْنَاكَ يٰصِدِّيقُ صَدْرًا كَبِهٰٓءِ يٰقُوْلُوْنَ ﴿۹۲﴾
 آپ کے دل کو کوفت ہوئی ہے یعنی آپ کے سینہ میں غصہ کا ابال ہوتا ہے اور آپ اس کو پورا نہیں کر سکتے۔

آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیں۔ یعنی ہر چیز سے دل کو خالی کر کے اللہ کی حمد و تسبیح (اللہ کی پاکی کے) اعتراف و اظہار میں مشغول ہو جائیے اللہ آپ کی کار سازی کرے گا۔ حمد و تسبیح میں مشغول ہونے سے دل کو کوفت اور سینہ کی بندش دور ہو جائے گی اور شدت غضب جاتی رہے گی یا یہ مطلب ہے کہ ان کے (مشرکانہ اور کافرانہ) اقوال سے اللہ کے پاک ہونے کا اظہار کیجئے اور اسی کے ساتھ اللہ کا شکر کیجئے کہ اللہ نے حق کا راستہ آپ کو دکھایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے (تسبیح و حمد سے مراد وہی ہے نماز اور آیت کی تشریح میں) فرمایا آپ اپنے رب کے حکم کے موافق نماز پڑھیے۔

وَ كُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿۹۳﴾
 اور نماز پڑھنے والوں میں رہیں ساجدین سے مراد ہیں تواضع اور اظہارِ فروتنی کرنے والے۔ سخاک کے نزدیک نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ امام احمد، ابوداؤد، ابن جریر نے حضرت حذیفہ بن یمان کے بھائی حضرت عبدالعزیز کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی امر ثقیل پیش آتا تھا تو آپ (گھبرا کر) نماز کی طرف رجوع کرتے تھے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿۹۴﴾
 اور وقت موت آنے تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں۔
 یقین سے مراد ہے موت۔ ہر زندہ کے لئے موت کا آنا یقینی ہے یعنی جب تک آپ زندہ ہیں۔ رب کی عبادت میں مشغول رہیں، عبادت کو ترک نہ کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کا قول بھی اسی مضمون کا نقل فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے کہا تھا:
 اَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔

بغوی وغیرہ نے حضرت جبیر بن نصیر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے مال جمع کرنے اور تاجر بن جانے کا حکم بذریعہ وحی نہیں دیا گیا بلکہ میرے پاس تو وحی بھیجی گئی کہ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ۔ حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مینڈھے کی کھال اوڑھے اور اسی کا نطق باندھے سامنے سے آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا اس کو دیکھو اللہ نے اس کے دل کو نورانی کر دیا میں نے وہ وقت بھی اس کا دیکھا تھا کہ اس کے ماں باپ اس کو اعلیٰ قسم کی غذا کھلاتے پلاتے تھے۔ ایک جوڑا اس کے بدن پر دو سو درہم کا تھا۔ لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نے اس کی یہ حالت کر دی جو تمہارے سامنے ہے۔ (۲۶ ربیع الثانی ۱۲۰۲ھ کو سورۃ الحجرت کی تفسیر ختم ہوئی بحمد اللہ ۱۹ شعبان ۱۳۸۷ھ کو صبح چار بجے اس سورت کا ترجمہ ختم ہوا)

سُورَةُ النِّحْلِ

اس سورۃ کی ۱۲۸ آیات ہیں اور آخری تین آیات کو چھوڑ کر باقی سورت مکی ہے ابن اسحاق و ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ اس سورت کے آخر کی تین آیات تو مدینہ میں جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں باقی سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ جنگ اُحد میں حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے تھے اور کافروں نے آپ کو مثلہ بھی کیا تھا اور (شدت غضب میں) حضور ﷺ نے فرمایا تھا اگر ہم ان پر غالب آئے تو ہم بھی ان کو ایسا مثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی عرب کو نہیں کیا ہو گا۔ اسی پر اللہ نے آیت **وَإِنْ عَاقَبْتُمْ نَازِلٌ فَرَمَانِي**۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَتَىٰ اَمْرًا لِلّٰهِ اللّٰہ کا حکم آپہنچا۔ یعنی قریب آگیا ابن عرفہ نے کہا جس چیز کی (یقینی) توقع ہو، عرب اس کے لئے کہتے ہیں وہ چیز ہو گئی۔ آیت میں امر الہی کے قریب الوقوع یا یقینی الوقوع ہونے کی وجہ سے مجازاً ماضی کا صیغہ استعمال کیا جو بات آئندہ یقینی طور پر ہونے والی ہو اور اس کا ہونا لازم ہو اس کو بصیغہ ماضی بیان کر دیتے ہیں (صیغہ ماضی سے اشارہ اس امر کی طرف ہوتا ہے کہ یہ کام ضرور ہو گا اور عنقریب ہو گا مترجم) امر اللہ سے مراد ہے قیامت کا آنا (کلبی وغیرہ) مراد یہ ہے کہ قیامت کا آنا ضروری ہے تم اس کا یقین رکھو اور یہ سمجھو کہ گویا آگئی اس لئے تیاری کرو۔

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ط
اس کے جلد آجانے کی مانگ نہ کرو (وہ تو بہر حال آئے گی اور تمہارے لئے اس کے آنے میں کوئی فائدہ نہ ہو گا اس لئے جلد آنے کی خواہش تمہارے لئے ضرر رساں ہے)

بغوی نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت **اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ** نازل ہوئی تو بعض کافروں نے کہا یہ شخص کہتا ہے کہ پھیلی گھڑی قریب آگئی اچھا تم (کچھ دنوں کے لئے) اپنے موجودہ مشاغل و اعمال ترک کر دو ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر کیا ہونے والا ہے لیکن جب کچھ مدت تک انتظار کرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا (اور قیامت نہ آئی) تو کہنے لگے تم جس چیز سے ہم کو ڈرا رہے ہو اس کا تو نام و نشان بھی نہیں پیدا ہوا اس پر آیت **اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ** نازل ہوئی۔ یہ آیت سن کر کافر خوف زدہ ہو گئے اور کچھ مدت تک مزید انتظار کیا لیکن طویل انتظار کے بعد بھی کچھ نہ ہوا تو کہنے لگے محمد! تم ہم کو ڈراتے ہو اور ہوا کچھ بھی نہیں ہے اس وقت اَتَىٰ اَمْرًا لِلّٰهِ نازل ہوا۔ اس جملہ کے نزول پر رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے اٹھ پڑے اور لوگوں نے اپنے سر اوپر اٹھا کر دیکھا اور خیال کیا کہ قیامت حقیقت میں آہی گئی اس پر (آخری فقرہ) **فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ** نازل ہوا اس وقت لوگوں کو اطمینان ہوا اور (گھبراہٹ رفع ہوئی)

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب اَتَىٰ اَمْرًا لِلّٰهِ نازل ہوا تو صحابہ خوف زدہ ہو گئے اس پر **فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ** نازل ہوا۔ اِسْتَعْجَال کا معنی ہے وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (سبّابہ اور وسطیٰ) سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا میں اور قیامت ان دونوں کی طرح (متصل) بھیجے گئے ہیں (شاید حضور ﷺ کی یہ مراد ہو کہ میرے بعد قیامت تک اور کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور میری نبوت کا دور قیامت تک باقی رہے گا۔ مترجم)

ترمذی نے حضرت مستورد بن شداد کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے عین قیامت کے وقت میں ہی بھیجا گیا مگر میں قیامت سے آگے آ گیا جیسے یہ (انگلی) اس (انگلی) سے پہلے ہے (اگرچہ دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں) حضور ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں سبّابہ اور وسطیٰ سے اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قیامت کی علامات میں سے ہے ہر رسول اللہ ﷺ کے پاس جب (پیام بعثت لے کر) حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا گیا اور اثناء راہ میں آپ آسمان والوں کی طرف سے گزرے تو اہل سماوات نے کہا، اللہ اکبر قیامت بپا ہو گئی۔

بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ امر اللہ سے مراد ہے سزا اور عذابِ قتل۔ واقعہ یہ ہوا کہ نصر بن حارث نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے پس کافروں نے وقت سے پہلے عذاب کی مانگ کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نصر کو بدر کے دن قتل کیا گیا۔

سُبْحٰنَہٗ ۱ میں اللہ کی پاکی کا اظہار کرتا ہوں (جیسی پاکی اس کے لائق ہے مترجم)

وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ① اور وہ اپنی (صفاتِ قدسیہ میں) ان کے شرک سے بزرگ و بالا ہے یعنی یہ جو خیال کرتے ہیں کہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور وہ ان کو اللہ کے عذاب سے بچالے گا اللہ اس سے اعلیٰ اور بالا ہے یا یہ مراد ہے کہ اللہ ان کے شرک سے بیان سے بالا ہے۔

یُنزِلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ وہ روح دے کر فرشتوں کو اتارتا ہے ہر روح سے مراد ہے وحی یا قرآن قرآن سے

مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں (جیسے روح کے تعلق سے بے جان جسم زندہ ہوتے ہیں)

مِنْ اَمْرِ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادَہٗ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے یعنی جن کو

رسول بنانا چاہتا ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْا اِنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاتَّقُوْنَ ② کہ خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں سو

مجھ سے ڈرتے رہو۔

اَنْذِرُوْا (مثلاً مزید متعدی) بتادو، اطلاع دے دو۔ نَذَرْتُ ہٰکِذَا (مثلاً مجرد لازم) میں نے ایسا جانا مجھے ایسا علم ہوا۔

اَنْ تفسیر یہ ہے کیونکہ روح سے مراد وحی ہے یعنی ملائکہ کو ہم اپنے منتخب بندوں کے پاس وحی دے کر بھیجتے ہیں کہ لوگوں کو بتادو یا

اَنْ مصدر یہ ہے اور حرفِ جر محذوف ہے بِاَنْ اَنْذِرُوْا تھا اَنْذِرُوْا کا ترجمہ ڈراؤ، خوف دلاؤ بھی ہو سکتا ہے یعنی مشرکوں اور

نافرمانوں کو عذاب سے ڈراؤ اور یہ بتاؤ کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں لہذا مجھ سے ڈرو۔

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ وحی کا تعلق دو چیزوں سے ہے ایک تو توحید پر تنبیہ جو علمی قوت کے کمال کا انتہائی درجہ

ہے دوسرا تقویٰ جو عملی قوت کا آخری تکمیلی مرتبہ ہے توحید کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے ذیل کی آیات میں اپنی خود مختار، پُر

حکمت، مصلحت آگے خلافت کو بیان کیا ہے اگر کوئی دوسرا شریک ہو تا تو اس میں بھی خلافت اور ایجاد کی قدرت ہوتی اور وہ خود

مختار کامل قدرت رکھنے والوں میں نکر او ممکن ہوتا۔

اَسْخَرْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بِالْحَقِّ ۲ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا۔ یعنی خاص مقدر

، خاص شکل و وضع اور مختلف صفات کے ساتھ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو نیست سے ہست کیا۔ اس کی ایجاد بتا رہی ہے کہ اس

کو بنانے والا واحد، بے مثال، قادرِ مطلق اور حکیمِ کامل ہے۔

تَعْلَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۵﴾ اللہ بالا ہے ان کے شرک سے۔ یعنی زمین و آسمان میں سے کسی کو اللہ کا شریک قرار دیا جائے اس سے اللہ بزرگ و برتر ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ برتر ہے اس بات سے کہ وہ اپنی ہستی یا بقاء ہستی میں زمین و آسمان میں سے کسی چیز کا محتاج ہو زمین و آسمان کو تو خود اپنی تخلیق پر بھی قدرت نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ کے غیر جسمانی ہونے پر تنبیہ ہے۔

خَاقِ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اللہ نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا یعنی ایسی سیال بے جان بوند سے انسان کو پیدا کیا جس میں نہ حس ہے نہ حرکت نہ وہ اپنی ہیئت و وضع کو محفوظ رکھ سکتی ہے نہ شکل کو۔ (رفتہ رفتہ انسان) جب خوب طاقت ور ہو گیا تو

فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿۶﴾ پھر یکدم وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔
خَصِيمٌ تیز زبان جھگڑالو۔ مُّبِينٌ یعنی نفی قیامت کی دلیل بیان کرنے والا جو بطور دلیل کہتا ہے مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا یا خَصِيمٌ مُّبِينٌ سے مراد ہے خالق سے کھل کر جھگڑا کرنے والا۔ بغوی نے لکھا ہے، اس آیت کا نزول اُبی بن خلف جمحی کے متعلق ہوا ابن خلف منکر قیامت تھا ایک روز وہ ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور بولا کیا تم کہتے ہو کہ خدا اس کو زندہ کرے گا یہ تو بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو گئی (یہ کیسے زندہ ہوگی) اس کی بابت آیت وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ بھی نازل ہوئی تھی۔

سدی نے آیت اُولَئِكَ يَرِ الْإِنْسَانَ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ كَانَزُولُ بھی اسی قصہ کے متعلق بیان کیا ہے (رواہ ابن ابی حاتم) آیت کا نزول کا خواہ خاص شخص کے متعلق ہوا ہو لیکن الفاظ میں عموم ہے (ہر منکر قیامت جو دوسری زندگی کا قائل نہ ہو اسی حکم میں داخل ہے) مطلب یہ ہے کہ منکر قیامت اتنا نہیں سمجھتا کہ جب اللہ نے بے جان نطفہ سے اس کو پیدا کر دیا تو بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اسکے لئے کیا دشوار ہے۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ اور اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ الْأَنْعَامُ سے مراد ہیں اونٹ، گائے، بھینس، بکری، بھیڑ وغیرہ۔ لَكُمْ تمہارے فائدے کے لئے جس کی تفصیل فِيهَا دِفْءٌ میں بیان کی ہے گویا لَكُمْ میں اجمال منفعات سے اور اس کے بعد تفصیل کی گئی ہے۔ دِفْءٌ سردی کی شدت کا دور ہو جانا (قاموس) یعنی جانوروں کے بالوں اور اون سے تم سردی کی سختی دور کرتے ہو گونی لباس اور کمپل وغیرہ استعمال کرتے ہو منافع سے دوسرے فائدے مراد ہیں۔ افزائش نسل، دودھ، سواری، بار برداری، کھیتی باڑی، خرید و فروخت، وغیرہ۔

وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۷﴾ اور انہی سے تم کھاتے بھی ہو گوشت، چربی، گھی، دودھ، پنیر، مکھن، وغیرہ کھاتے ہو۔ عموماً غزل حیوانی انہی جانوروں سے حاصل کی جاتی ہے اس لئے مِنْهَا تَأْكُلُونَ سے پہلے ذکر کیا دوسرے جانوروں کا گوشت تو محض لذت یا دوا کی خاطر کھایا جاتا ہے۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿۸﴾ اور جب شام کو (جنگل سے جانوروں کو) واپس لاتے ہو اور (صبح کو) چرانے کے لئے لے کر جاتے ہو تو ان سے تمہاری ایک شان بنتی ہے۔ کیونکہ دونوں وقت گھر سے باہر صحن میں ان کے جمع ہونے سے ایک رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں تمہاری عزت اور ساکھ ظاہر ہوتی ہے۔

وَتَحْمِلُ أُنْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّكُمْ تَكُونُوا بِلِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ﴿۹﴾ اور (بجائے اس کے کہ سفر میں تم اپنے سامان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلو) یہ جانور تمہارے سامان کے بوجھ اپنے اوپر لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک لے جاتے ہیں کہ بغیر سخت تکلیف اٹھانے کے تم وہاں تک خود پہنچ بھی نہیں سکتے ہو (بوجھ اٹھانے کا تو ذرا ہی

کیا ہے) شبق اور شق دونوں ہم معنی ہیں جیسے رطل اور رطلے

ان ربکم کرؤ ووف رحیم ﴿۷﴾
حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحمت والا ہے کہ اس نے ان جانوروں کو تمہارے فائدے کے لئے پیدا کر دیا۔

وَالْخَيْلِ وَالْبِغَالِ وَالْحَمِيرِ لَتَكُونُنَّ

اور اس نے تمہاری سواری اور شان

بنانے کے لئے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے گھوڑے کے گوشت کے حرام یا مکروہ ہونے پر استدلال کیا ہے صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے کہ اللہ نے اس آیت میں اپنی نعمت کا اظہار کیا ہے اور اپنی نعمت کی یاد دہانی کی ہے اور دو فائدوں کی صراحت کی ہے۔ سواری اور زینت اور ظاہر ہے کہ غذائیت سب سے بڑی نعمت ہے اس لئے ممکن نہیں کہ جو اصل منفعت ہے اس کی تو یاد دہانی نہ کی جائے اور نیچے درجے کے فائدوں کا اظہار کیا جائے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان جانوروں کو فراہمی غذا کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ورنہ سواری اور زینت سے پہلے ان سے غذائیت فراہم کرنے اور ان کا گوشت یاد دہدھ کھانے پینے کا ذکر کیا جاتا)

میں کہتا ہوں، غذائیت تو بھیڑ، بکری، مرغی وغیرہ کے گوشت سے بہترین حاصل ہو جاتی ہے اور اس کا حصول آسان بھی ہے گھوڑے، گدھے وغیرہ کا گوشت نہ اچھا ہوتا ہے نہ اس کا حصول زیادہ سہل ہے، ہاں سواری یا برداری اور شان بان کے جو فوائد ان سے وابستہ ہیں وہ دوسرے چھوٹے جانوروں سے حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے صاحب ہدایہؒ کا یہ قول غلط ہے کہ گھوڑوں اور گدھوں کا گوشت بطور غذائیت سب سے بڑی منفعت ہے۔ ان جانوروں کا سب سے بڑا فائدہ تو سواری وغیرہ ہی ہے جو دوسرے جانوروں سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت مکی ہے جب کہ گدھے کا گوشت بھی حلال تھا۔ اس کی حرمت تو خیر کی فتح کے موقع پر لاہجری میں ہوئی (ایسی صورت میں اس آیت سے گھوڑے کے گوشت کی حرمت پر استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے) اس مسئلہ کی پوری تشریح آیت اِحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُؒ کی تفسیر کے ذیل میں سورہ مائدہ میں گزر چکی ہے

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸﴾

اور ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جنکی تمہیں خبر نہیں ہے۔ (حضرت مفسر نے

اس آیت کا تعلق آخرت سے قرار دیتے ہوئے حسب ذیل تفسیری مطلب بیان کیا ہے) یعنی جنت میں مومنوں کے لئے اور دوزخ میں کافروں کے لئے ایسی ایسی راحتیں اور تکلیفیں پیدا کی ہیں جن کا تمہیں پتہ بھی نہیں نہ کسی آنکھ نے ان کو دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی شخص کے دل میں ان کا تصور آیا۔

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ
اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے (اس ترجمہ پر علی بمعنی الٰہی ہوگا) اور کچھ راستے ٹیڑھے بھی ہیں (جو اللہ تک نہیں پہنچتے۔ مترجم) یعنی سیدھا راستہ جو حق تک پہنچتا ہے (وہ راستہ دکھانا اور بتانا اللہ کے ذمے ہے) اس نے مہربانی اور کرم سے یہ ذمہ داری لی ہے۔

يَا قَصْدُ السَّبِيلِ سے مراد ہے اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ، کہ جو شخص اس راہ پر چلے گا اللہ تک پہنچ جائے گا۔ سَبِيلٌ قَصْدٌ یا قَصْدٌ سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔

جَائِرٌ کا معنی ہے ٹیڑھا یعنی راہ مستقیم سے یا اللہ کے رخ سے کٹا ہوا۔ اس کلام کا مقصود صرف راہِ خدا کا بیان ہے۔ مِنْهَا جَائِرٌ کا جملہ بالعرض ذکر کیا گیا ہے۔ "قَصْدُ السَّبِيلِ" صرف راہِ سنت ہے اور ٹیڑھا راستہ تمام مذاہب کفر اور بدعات و خواہشاتِ نفس کا۔

وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹﴾

اور اگر اللہ (تم سب کو ہدایت کرنا) چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا۔ ہدایت سے مراد اس جگہ منزلِ مقصود پر پہنچا دینا ہے اور عَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ میں مراد ہے راہِ حق دکھانا اور بتانا (راہِ مستقیم اللہ نے تمام انسانوں کو بتا دی ہے اپنی کتابیں بھیج دی ہیں اور پیغمبروں کو بھی بھیج دیا ہے لیکن منزلِ مقصود پر پہنچایا کم لوگوں کو ہے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے) (مترجم)

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝

وہ ایسا ہے جس نے تمہارے واسطے بادل سے پانی برسایا جس سے (کچھ) تم کو پینے کو ملتا ہے اور کچھ حصے سے درخت (پیدا) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشی (چرنے) چھوڑتے ہو۔

مِنْهُ شَرَابٌ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آدمیوں کو پینے کا پانی بارش سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ چشموں اور کنوؤں (اور دریاؤں) میں لوٹ پھر کر بارش ہی کا پانی آتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے فَسَلَكَهُ يَنْبَاعٌ - دوسری آیت ہے فَاسْكَنْتَاهُ فِي الْأَرْضِ - مِنْهُ شَجَرٌ کا یہ مطلب ہے کہ درختوں کی زندگی بھی پانی سے ہے۔ درخت بھی بارش کا پانی پیتے ہیں۔

تُسِيمُونَ کا ترجمہ ہے تم جانوروں کو چراتے ہو۔ سَامَتْ الْمَاشِيَةَ (مجرد) مویشی چرے۔ أَسَامَهَا صَاحِبَهَا (مزید) مالک نے جانوروں کو چرایا۔ مصدر سومة مسومة کا اصل لغوی معنی ہے "علامت"۔

يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالتَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ط

اللہ پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور نہیتوں اور کھجور کے درخت اور انگور اور تمام پھل پیدا کرتا ہے۔

مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ میں مِنْ تبعضیہ ہے یعنی تمام ممکنہ پھلوں میں سے بعض پیدا کرتا ہے۔ کل پھل تو صرف جنت میں ہوں گے یہاں تو جنت کے پھلوں کی یاد دہانی کے لئے بعض پھل پیدا کئے گئے ہیں۔ مویشیوں سے پہلے ان کی چراگاہوں کا ذکر اور مویشیوں کے بعد کھیتی اور پھلوں کا تذکرہ ترتیب واقعی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سب سے پہلے درخت ہی حیوانات کی غذا بنتے ہیں اور حیوانات سے پیدا ہونے والی غذا سب سے اعلیٰ غذا ہے۔ پس درختوں کی پیدائش کا ذکر پہلے پھر حیوانات اور ان کی پیداوار کا تذکرہ اور پھر کھیتی کا بیان ہونا مناسب تھا اور ایسا ہی کیا گیا۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً

لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے صالح کے وجود، علم اور حکمت کا اس میں کھلا ہوا ثبوت ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے۔ ایک دانہ زمین میں گرتا ہے زمین سے کچھ نمی اس میں کھینچ کر آئی ہے پھر دانہ کا بالائی حصہ پھٹ کر اس میں سوئی جیسا تانکلتا ہے اور نچلا حصہ پھٹ کر نیچے کی طرف جڑوں کے سونٹے نکلتے ہیں پھر یونہی نمو ہوتا رہتا ہے۔ تا بڑھتا ہے اس میں شاخیں پتیاں پھول، شگوفے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھول پھل کی بھی ایک خاص فصل ہوتی ہے ہر پھل کا ایک مخصوص موسم ہوتا ہے۔ سفلی طبیعت (یعنی زمین اور پانی کی طبیعت) اور علوی موثرات (دھوپ ہو اور روشنی تاثیر کو اکب وغیرہ) ہر طرح کے درختوں کے لئے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن ہر درخت اپنی جدا جسمانی شکل اور طبیعت و خاصیت رکھتا ہے۔ مبادی کا اتحاد اور نتائج کا اختلاف بتا رہا ہے کہ یہ سب کرشمہ سازی کسی فاعل مختار کی ہے جو وحدہ لا شریک ہے اور وہی جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط

اور اس نے تمہارے فائدے کے لئے رات اور دن بنا لئے ہیں۔

وَالنَّجْمَ وَمَسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ط

اور ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔

بِأَمْرِهِ میں امر سے مراد ہے ایجاد اور اندازہ مقرر کرنا یا حکم مراد ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ جو لوگ تخلیق نبات کو صرف تاثیر کو اکب سے وابستہ قرار دیتے ہیں اور ستاروں کی حرکات و أوضاع کو موثر حقیقی جانتے ہیں ان کا خیال غلط ہے اگر ایسا فرض بھی کر لیا جائے تب بھی کیا جواب ہے اس بات کا کہ تمام ستارے اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے ممکن ہیں (اور ممکن وہ ہوتا ہے جس کا اپنا وجود بھی اپنا نہیں ہوتا وہ اپنی ذات و صفات میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے) تو لا محالہ ان کا اپنا وجود بھی ایسی ذات کا ممنون کرم ہے جو واجب الوجود ہے اور کسی کا محتاج نہیں اسی نے ممکنات کو نسبت سے ہست کیا اگر ذات واجب الوجود آخری درجہ پر نہ مانی جائے تو جانب مبداء میں تسلسل لازم آئے گا یا پھر گھوم کر لوٹنا پڑے گا اور ہر ممکن بلا واسطہ یا بالواسطہ خود اپنی نفس کی علت ہو جائے گا گویا انکار واجب الوجود سے تسلسل یا دور لازم آجائے گا اور چونکہ تسلسل بھی محال ہے اور دور بھی۔ اس لئے تمام ممکنات

کی ہستی کے لئے ذات واجب الوجود کا ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات سماوی کی تاثیرات ہوں یا عناصر کی انکی حیثیت ایک ضابطہ اور دستور کی ہے اللہ کا ضابطہ اور عادت یہی ہے کہ اس نے بعض نتائج کو بعض اسباب سے وابستہ کر دیا ہے اور اسباب کو علت نتائج بنا دیا ہے خود یہ اسباب نتائج کے موجد نہیں ہیں، اسباب کا اپنا وجود ہی اپنا نہیں خدا داج ہے، جو چیز معدوم الذات ہو وہ دوسرے کو وجود کیسے دے سکتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُعْقِلُونَ ﴿۱۲﴾
بے شک اس میں سمجھ والوں کے لئے بکثرت (توحید و قدرت کی) نشانیاں ہیں۔ سلیم اور سادہ دانش والوں کو ہر چیز میں اللہ کی تخلیق و حکمت کی گونا گوں نشانیاں نظر آتی ہیں یہ واضح نشانیاں ہیں اسی لئے آیات بصیغہ جمع ذکر فرمایا اور اصحاب عقل کے ساتھ آیات فہمی کو وابستہ کیا۔

وَمَا ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانًا
اور ان چیزوں کو بھی تمہارے لئے اس طور پر پیدا کیا کہ ان کے اقسام مختلف ہیں "ألوان" سے اقسام و اصناف مراد ہیں رنگ کے اختلاف سے اکثر صنف بدل جاتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَكْفُرُونَ ﴿۱۳﴾
بلاشبہ نصیحت اندوز لوگوں کے لئے اس میں بڑی نشانی ہے۔ طبیعت، ہیئت اور صورت کا اختلاف دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ محض ایک صانع حکیم کی کرشمہ سازی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ
اور اسی نے سمندر کو تمہاری خدمت پر لگا دیا ہے یعنی ایسا بنایا ہے کہ تم اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کرتے ہو۔ اس میں جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو، مچھلیاں پکڑتے ہو اور موتی مونگے حاصل کرتے ہو۔

لِيَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
اس میں سے تازہ تازہ گوشت کھاؤ۔ طَرِيًّا تروتازہ یعنی مچھلیاں مچھلی میں ہر گوشت سے زیادہ رطوبت ہے اسی لئے مچھلی کا گوشت بہت جلد خراب ہو جاتا ہے چونکہ (لُحْمًا طَرِيًّا) مچھلی کا گوشت آنتوں سے چسپاں ہو جاتا ہے اس لئے اس کو کھانے کے بعد پیاس زیادہ لگتی ہے۔ گوشت کی گرمی یا خشکی موجب تشنگی نہیں ہوتی۔ اللہ کی عجیب حکمت ہے تلخ، نمکین اور غلیظ پانی سے ایسی تروتازہ شیریں لطیف چیز اس نے پیدا کی۔

امام مالک و امام ثوری نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مچھلی پر شرعاً گوشت کا اطلاق ہوتا ہے اگر کسی نے قسم کھانی کہ گوش نہیں کھاؤ گا تو مچھلی کھانے سے بھی اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ احناف کہتے ہیں قسم میں عرف عام کا اعتبار کیا جاتا ہے اور عرف عام میں مچھلی پر گوشت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دیکھو اللہ نے کافروں کو شر الدواب (بدترین چوپایہ) قرار دیا ہے پس اگر کسی نے قسم کھانی کہ میں چوپایہ پر سوار نہ ہوں گا اور کسی کافر کے اوپر سوار ہو گیا تو کیا اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔

وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حَبْلًا مِّنْ قَبْضَتِنَا
اور اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جسکو تم پہنتے ہو
تَلْبَسُونَ (جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے لیکن اس) سے مراد یہ ہے کہ تمہاری عورتیں یہ زیور پہنتی ہیں حَبْلًا مِّنْ قَبْضَتِنَا بمعنی زیور، مراد موتی، مونگا وغیرہ۔

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرًا فِيهِ
اور تم کشتیوں کو دیکھو کہ اس میں پانی کو چیرتی چلی جا رہی ہے۔ مَوَاجِرًا فِيهِ سمندر میں چلنے والی۔ قنادہ نے ترجمہ کیا ہے "آنے جانے والیاں" ایک جاتی ہے دوسری آتی ہے باوجودیکہ ہوا کی رفتار ایک ہی ہے۔ حسن نے کہا، بھری ہوئی۔ فراء اور اخفش نے کہا، پانی کو اپنے دونوں بازوؤں سے پھاڑنے والیاں۔ مخر کا معنی ہے پانی کو پھاڑنا یا کشتی کی رفتار کی آواز۔ ابو عبیدہ نے کہا تیز ہوا چلنے کے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو مخر کہا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہواؤں کی رفتار کے سامنے سے کشتیاں آتی ہیں اور ہواؤں کو پھاڑتی ہیں۔ قاموس میں مخر اور مخرور کا معنی بیان کیا گیا ہے کشتی کا چلنا اور ہوا کی رفتار کے سامنے آنا۔ مخرور السفینۃ کا یہی مطلب ہے مخر الساج تیرنے والے نے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا۔ مَوَاجِرًا کشتیاں وہ ہوتی ہیں جن کی رفتار کی آواز سنی جائے یا وہ کشتیاں جو اپنے سینہ کے زور سے پانی کو چیرتی ہیں یا ایک ہی ہوا سے آنے جانے والی

کشتیاں حدیث میں ہے: اذا اراد احدكم البول فليتمخره الريح ایاہے کہ استمخرو الريح جب کسی کا پیشاب کرنے کا ارادہ ہو تو ہوا کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے۔ ہوا کی طرف پشت کرو۔ گویا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی پشت ہوا کے مقابل کر دو تاکہ ہوا پھٹ کر دائیں بائیں سے نکل جائے۔

اور تاکہ تم خدا کی دی ہوئی روزی تلاش کرو یعنی جہازوں اور کشتیوں پر سوار ہو کر اللہ کے فضل یعنی وسیع رزق کو تلاش کرو۔

اور تاکہ (ان چیزوں کو اپنا تابع دیکھ کر اور اپنے کام پر لگا ہوا پا کر) تم اللہ کا شکر کرو۔ جو مقام ہلاکت آگیاں ہیں انہی کو اللہ نے تحصیل معاش کا ذریعہ بنایا ہے یہ اس کا عظیم الشان احسان ہے جس کا شکر ادا کرنا لازم ہے اسی لئے آیت کے آخر میں تشکون فرمایا۔ میں کہتا ہوں، مذکورہ بالا اشیاء کو دیکھ کر اور ان کے فوائد پر غور کر کے شکر نعمت کے درجہ تک پہنچنا یہ بجائے خود بڑا انعام ہے اس سے دنیا میں مزید نعمت اور آخرت میں ثواب عظیم حاصل ہوتا ہے گویا شکر تمام نعمتوں کی تکمیلی درجہ ہے۔

اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ لئے تاکہ تم کو لے کر زمین ڈگمگانے نہ لگے۔

رواوسی: ایک جگہ قائم رہنے والے پہاڑ، المید، کرزہ، اضطراب۔ پہاڑوں کی تخلیق، زمین بالکل گول تھی ادنی سبب سے اس میں لرزہ آجاتا تھا۔ جب پہاڑوں کو پیدا کر دیا گیا تو ان کا باؤ مرکز نقل کی طرف پڑا اور زمین کا ادھر ادھر ہلنا بند ہو گیا۔ گویا پہاڑوں کی میخیں ٹھونک دی گئیں جو زمین کو حرکت و اضطراب سے روک رہی ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے اللہ نے جب زمین کو پیدا کیا تو وہ لرزاں تھی۔ فرشتے کہنے لگے یہ اپنی پشت پر کسی کو ٹھہرنے نہ دے گی پھر اللہ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیئے اور فرشتوں کو معلوم نہ ہوا کہ پہاڑ کس چیز سے بنائے گئے۔ عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم نے بوساطت قتادہ بروایت حسین، قیس بن عبادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ (گول ہونے کی وجہ سے) لرزاں تھی فرشتے کہنے لگے یہ تو اپنی پشت پر کسی کو قرار نہیں پکڑنے دے گی لیکن جو نہی صبح ہوئی تو (رات بچ میں) زمین کے اندر پہاڑ قائم ہو گئے اور فرشتوں کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کہاں سے پیدا ہو گئے۔ کہنے لگے، اے ہمارے رب کیا تیری مخلوق میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو ان سے زیادہ سخت ہو، اللہ نے فرمایا، ہاں لوہا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا لوہے سے بھی سخت تیری کوئی اور مخلوق ہے فرمایا ہاں آگ ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا آگ سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز ہے فرمایا ہاں پانی ہے فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا تو نے پانی سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز پیدا کی ہے۔ فرمایا ہاں ہوا ہے فرشتوں نے عرض کیا ہوا سے بھی سخت کوئی چیز تو نے بنائی ہے فرمایا ہاں مرد (ہوا سے زیادہ سخت ہے) عرض کیا کیا تیری کوئی مخلوق مرد سے بھی زیادہ سخت ہے فرمایا عورت ہے۔ انتہی۔

اگر دریافت کیا جائے کہ یہ سوال کہیں جا کر ختم بھی ہو سکتا ہے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ قوی اور بڑی طاقت والا ہے اور تمام ممکنات اس کے مقابلہ میں عاجز بلکہ بچ ہیں۔ اللہ کی قوت کا جس پر تو پڑ جاتا ہے وہ چیز دوسروں کے مقابلہ میں قوی ہو جاتی ہے۔ ہاتھی پر قوت کا پڑ گیا تو وہ چیونٹی سے قوی ہو گیا لیکن اگر اللہ چاہے تو چیونٹی پر اپنی قوت کا پڑ تو ڈال کر ہاتھی سے زیادہ قوی بنا دے، کسی کی قوت و شدت بہمہ جہات دوسروں سے زائد نہیں۔ بعض اعتبارات سے ہے (ایک چیز دوسری چیز سے ایک اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور وہ دوسری چیز پہلی چیز سے کسی دوسرے اعتبار سے قوی ہے بہمہ جہات تو اللہ ہی سب سے قوی ہے)

اور زمین میں دریا اور (حصول مقصد کے راستے بنائے تاکہ تم اپنے مقصد یا اللہ کی معرفت کے راستے پر چلو۔ یعنی اللہ کی معرفت حاصل کرو۔

وَأَنْهَضُوا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

وَعَلَّمْتُمْ قافلے ان سے اپنے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ شرعی اسباب و علل بھی (احکام کے لئے) راہنما ہیں و جوہ صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ کے لئے وقت سبب ہے اشیاء ماکولہ و مشروبہ کی حرمت کی علت نشہ ہے طبعی اور عقلی دلائل بھی راہنمائی کرتی ہیں۔ نبض کی تیزی بخار کو ظاہر کرتی ہے اس عالم کا وجود اس کے بنانے والے کی ہستی کو ثابت کر رہا ہے۔ معجزہ پیغمبر کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۱۶﴾ اور تاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں یعنی رات کی تاریکی میں جنگلوں اور سمندروں میں ستاروں سے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ ”النجم“ سے مراد ہے عام ستارے۔ محمد بن کعب نے کہا علامات سے مراد پہاڑ ہیں۔ دن کے وقت پہاڑوں سے راستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور رات کے وقت ستاروں سے (کلبی نے کہا سب (علامات) سے مراد ستارے ہیں، کچھ ستارے علامات اور نشانات ہیں اور کچھ ستاروں سے لوگ راستے معلوم کرتے ہیں سدی نے کہا ”النجم“ سے مراد ہے ثریا اور بنات النعش اور دونوں فرقہ اور جدی ان سے لوگ راہ بھی معلوم کر لیتے ہیں اور جہت قبلہ بھی۔ میں کہتا ہوں اس (مرادی) تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ ستارے قطب شمالی کے قریب ہیں ان کے دائرے چھوٹے ہیں اس لئے اپنی جگہ سے بہت ہی کم حرکت کرتے ہیں۔

يَسْتَدُونَ کی فاعلی ضمیر ”قریش“ کی طرف لوٹ رہی ہے قریش عام طور پر تجارت کے لئے رات کو سفر کرتے تھے اور رات میں چلتے تھے اور ستاروں سے جہت سفر کو معلوم کرنے میں بہت مشہور تھے۔ علامات کے لفظ کے بعد ”النجم“ کا ذکر خصوصیت کو ظاہر کر رہا ہے (گویا) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نجم سے خاص طور پر راستہ کی شناخت کرتے اور راہ پر چلتے ہیں اس لئے ان پر اللہ کا شکر لازم ہے کہ اس نے ستاروں کو ان کے لئے دلیل راہ بنا دیا۔

سُو كِيَا جُو پِيْدَا كِرْتَا سِ اس كِي طِرْح هُو جَا ئَ كَا جُو پِيْدَا نِهِي س كِرْتَا مَن
اَفَمِنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ط
لا يَخْلُقُ سے مراد ہیں معبودانِ باطل (خواہ اہل عقل ہوں یا بے عقل) اہل عقل کو بے عقل پر تغلیب دے کر (بجائے مَن کے) مَن استعمال کیا ہے یا صرف بُت مراد ہیں چونکہ مشرک بتوں کو الہمہ (اپنے معبود) مانتے تھے اور الہ کو اہل علم ہونا ہی چاہئے (تو گویا مشرکوں کے مفروضے کے مطابق بتوں کے لئے مَن کا صیغہ استعمال کیا) اَفَمِنْ میں ہمزہ انکار یہ اور قار تعقیبہ ہے یعنی جب روشن و کثیر دلائل سے اللہ علمی کمال اور قدرت کا احاطہ اور حکمت کی ہمہ گیری ثابت ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تنہا اللہ ہی خالق کائنات ہے کوئی دوسرا خالق نہیں ہے یہاں تک کہ کوئی بھی نہ مکھی کو اڑا سکتا ہے نہ روک سکتا ہے اگر مکھی ان بتوں سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ واپس نہیں لے سکتے تو پھر ایسا خلاقِ کل اس چیز کی طرح کیسے ہو سکتا ہے جو خالقت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾ تو کیا (ان مشاہداتِ برہانی کے بعد بھی) نصیحت پذیر نہیں ہو گے یعنی جب ایسی چیزیں تمہارے سامنے ہیں جو نصیحت اندوزی کی مقتضی ہیں تو پھر عبرت اندوز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَلَا تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا ط
اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کی گنتی کرو تو گن بھی نہیں سکتے۔ تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے اللہ کی نعمتوں کی کوئی حد ہی نہیں ہے کہ گن سکو لہذا اس کے معبود ہونے کا حق بھی محدود نہیں ہے (ہر نعمت اس کو مستحقِ عبادت بنا رہی ہے) پس تم پورا حقِ عبادت تو ادا ہی نہیں کر سکتے یہی کافی ہے کہ تم اپنی عاجزی کا اقرار کرو اور ظاہر باطن ہر طور پر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ ط
اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ (تمہارے قصور اور پورے شکر کو ادا کرنے سے عاجزی کو) معاف کرنے والا ہے۔

رَحِيمٌ ﴿۱۸﴾ (تم پر) مہربان ہے کہ تمہارے استحقاق کے بغیر اس نے اپنی وسیع نعمتیں تم کو عطا فرمائی ہیں اور تمہارے گناہوں کی پاداش میں اپنے انعامات کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور نہ ناشکری کی سزا تم کو فوراً دی۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿۱۹﴾ اور اللہ تمہارے سب پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے پوشیدہ احوال سے مراد ہیں عقائد، ارادے، دل کا شکر، کامل طور پر حقوقِ عبدیت کو ادا کرنے سے قاصر رہنے کا علم، غفلت، غرور وغیرہ اور ظاہری احوال سے اچھے برے اعمال مراد ہیں اللہ کے واقف ہونے کے اظہار کا یہ مقصد ہے کہ اللہ تم کو تمہارے اندرونی و بیرونی احوال کی سزا جزا دے گا۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾ اور اللہ کے سوا مشرک جن کو پکارتے (یعنی عبادت کرتے) ہیں وہ کوئی چیز نہیں پیدا کرتے بلکہ خود (دوسرے کے ہاتھوں سے) پیدا کئے جاتے ہیں یعنی آسمان و زمین تو بڑی چیزیں ہیں ان کے معبود تو ادنیٰ اور حقیر ترین چیز کے بھی خالق نہیں۔ کوئی چیز پیدا کرنے کی انہیں قدرت ہی نہیں بلکہ خود اپنی ہستی بھی ان کی اپنی نہیں۔ نہ ذات اپنی ہے نہ وجود اپنا بلکہ ان کی ہستی دوسرے کی ممنون کرم اور عطا کردہ ہے پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ شریک خدا ہو سکیں اور کیسے جائز ہے کہ ان کو الہ قرار دیا جائے۔

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۲۱﴾ وہ (بت) بے جان ہیں زندہ نہیں (ان میں کبھی زندگی پیدا ہی نہیں ہوئی) کیا یہ مطلب ہے کہ وہ (معبود) بذاتِ خود مردے ہیں زندہ نہیں ہیں ان کی زندگی خود بخود نہیں بلکہ ایک حی و قیوم کی عطا کردہ ہے۔ اور ان کو خبر ہی نہیں کہ وہ مردے کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی ان کا دوبارہ اٹھایا جانا ان کے اختیار میں ہے نہ ان کے پرستاروں کا دوبارہ زندہ کیا جانا ان کے بس میں ہے نہ اپنا اور نہ اپنے پوجاریوں کا زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کو معلوم ہے پھر اپنے پرستاروں کو وہ جزا کیسے دے سکتے ہیں اور ان کی پرستش کا کیا فائدہ ہے اور کس طرح وہ معبودیت کے مستحق قرار پاسکتے ہیں۔

إِلَهُكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ تمہارا معبود ایک معبود ہے یعنی دلائل سے ثابت ہو گیا کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ دل (اللہ کی آن گنت نعمتوں کا) انکار کرتے ہیں باوجودیکہ خدا داد نعمتیں بالکل ظاہر ہیں بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو نور معرفت سے محروم کر دیا ہے اسی کی وجہ سے وہ کور بصیرت اور نابینا ہو گئے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ اللہ نے مخلوق کو تاریکی (کثیف مادیت اور حیوانی جہالت) میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور (یعنی اس کا ایک چھینٹا ڈال دیا۔ جس شخص پر نور کا کچھ حصہ (کوئی چھینٹا) پڑے گیا اس کو راستہ مل گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس پر نہ پڑا وہ بھٹکتا رہا ہدایت یاب نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قلم (الہی) علم خداوندی پر خشک ہو گیا (یعنی اللہ کے علم میں جس کا ہدایت یاب ہونا تھا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور اللہ کے علم میں جس کا گمراہ ہونا تھا وہ گمراہ ہو گیا اس فیصلہ کی تحریر ہو چکی فیصلہ لکھنے والا قلم خشک ہو گیا اب تحریر کردہ فیصلہ میں تغیر ممکن نہیں۔ مترجم) (رواہ احمد و الترمذی)

وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ اور وہ (قبولِ حق سے) تکبر کرتے ہیں یعنی اللہ کی عبادت سے غرور کرتے ہیں اللہ کی نعمتوں ہی کا انکار کرتے ہیں اس لئے اللہ کو مستحقِ عبادت نہیں جانتے اور بتلے رسول سے بھی غرور کرتے ہیں اگر ان کو اللہ کی نعمتوں کا اقرار ہوتا اور اللہ کو مستحقِ عبادت جانتے تو آخرت پر ایمان رکھتے اور آخرت کی جزا و سزا کو مانتے اور رسول اللہ ﷺ کے اتباع سے سرتابی نہ کرتے۔

لَا جْرَمَ أَنْ اللَّهُ يَعْلَمَ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ط اور ظاہر احوال سے واقف ہے یعنی اللہ کی ربوبیت اور معبودیت سے انکار دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور اللہ کی عبادت اور اللہ کے رسول کے اتباع سے تکبر جو وہ ظاہر کرتے ہیں اللہ سب سے واقف ہے۔

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۱۳﴾ (اور) یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھوٹی سرخ چوٹی کے برابر غرور (والا) جنت میں نہیں جائے گا۔ اور چھوٹی سرخ چوٹی کے برابر ایمان (والا) دوزخ میں نہ داخل ہو گا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا لباس خوب صورت ہو (اور یہ غرور کی علامت ہے پھر ان کا نتیجہ کیا ہو گا) فرمایا اللہ جمال والا ہے جمال کو پسند کرتا ہے (غرور کپڑوں کی پسندیدگی کا نام نہیں۔ خوش لباسی کی خواہش تکبر نہیں بلکہ) تکبر حق سے تکبر کرنے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے سے ہوتا ہے۔ اس حدیث میں الکبر من بطن الحق آیا ہے جس کا مطلب علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ نہایت میں یہ بطن الحق کا یہ معنی ہے کہ اللہ کی توحید اور عبادت کو باطل سمجھے باوجودیکہ اللہ نے اس کو حق قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ بطن الحق کا معنی ہے حق کے مقابلہ میں مغرور ہو جانا، حق کو حق نہ ماننا۔ بعض نے کہا حق کو قبول نہ کرنے کا نام ہے بطن الحق۔ ان تمام اقوال کا حاصل ایک ہی ہے وہ یہ کہ اللہ کی عبادت کو لازم نہ سمجھے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کا احسان اور مہربانی نہ قرار دے بلکہ خدا پر اپنا حق سمجھے۔ میں کہتا ہوں حدیث مذکورہ میں جو تکبر کے مقابلہ میں ایمان کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤمن اپنے وجود اور تمام کمالات کو خدا داد سمجھتا ہے یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی اللہ کی امانت اور عاریت جانتا ہے اس لئے اپنے کمالات پر غرور نہیں کرتا اور کافر اپنی ہستی اور اپنے کمالات کو خود آوردہ جانتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے تصوف میں جو لفظ فنا آتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے وجود کو بجائے خود معدوم سمجھے خود اپنی ہستی کو اپنی نہ سمجھے بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایک عاریت جانے (اور ہر چیز میں ہر کمال مادی و علمی میں یہاں تک کہ اپنی وجود و ذات کے لحاظ سے بھی اپنے کو اللہ کا محتاج سمجھے۔) (مترجم)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۴﴾ اور جب ان (منکرینِ آخرت) سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا تو انہوں نے جواب دیا (رب نے کچھ نہیں اتارا) یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی (داستانیں) ہیں۔ قبائل عرب کو جب پتہ چلا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو انہوں نے یام حج میں تحقیق احوال کے لئے کچھ آدمیوں کو مکہ بھیجا۔ یہ نمائندے آئے اور مکہ کی گھاٹیوں میں جو مشرک بیرونی لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے سے روکنے کے لئے معمور تھے ان سے مل کر دریافت کیا کہ اللہ نے کیا کلام اتارا ہے ان لوگوں نے جواب دیا، یہ اللہ کا بھیجا ہوا کلام نہیں ہے بلکہ وہی حکایتیں ہیں جو پچھلوں نے لکھی ہیں۔

سطور ان کتاب کی ہو یا درختوں کی یا آدمیوں کی سطور کی جمع اسطر و سطور اور اسطر آتی ہے اور جمع اسطیر اور اسطیر ہے۔

لِيَحْمِلُوا أَوْسَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَهُمْ حَامِلُوا وِجْرَتِهِمْ أَوْسَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ وَإِنَّ لَهُمْ فِي ذَلِكَ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۵﴾ نتیجہ اس کہنے کا یہ ہو گا کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھائیں گے یعنی یہ مشرک ایسا جواب اس لئے دیتے تھے کہ لوگوں کو گمراہ کر دیں اور قیامت کے دن اپنی گمراہی کے گناہوں کا بار پورا پورا اپنے اوپر اٹھائیں۔ کیونکہ گمراہ کنی علامت سے کامل گمراہی کی دوسروں کو گمراہ بنانے سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہ کرنے والوں میں گمراہی جم گئی ہے (اسی وجہ سے تو وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔

وَمِنْ أَوْسَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ وَإِنَّ لَهُمْ فِي ذَلِكَ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۶﴾ اور ان لوگوں کا بار (گناہ) بھی جن کو گمراہ کرتے ہیں یعنی کچھ گناہ ان لوگوں کا بھی اپنے اوپر اٹھائیں جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ (دین) کہنے کی یہ وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والوں کے گمراہ کرنے کی وجہ سے جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے کچھ گناہ تو وہ ہوں گے جو گمراہ کرنے والوں کی گمراہ کنی کا نتیجہ ہوں گے اور کچھ اپنے خصوصی گناہ ہوں گے۔ اول الذکر گناہوں کا بار گناہ کرنے والوں کے برابر گمراہ کرنے والے پر بھی پڑے گا اور مؤخر الذکر گناہوں کے مجرم صرف گناہ گار ہی ہوں گے گمراہ کنی کو ان میں کوئی دخل نہ ہو گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گمراہ کرنے والوں کے گناہوں کا کچھ بار گمراہ کرنے والے بھی اٹھائیں گے۔ امام احمد، مسلم، اور اصحاب السنن نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے

بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا اس کو بھی نیکی کرنے والے کی نیکی کے برابر اجر ملے گا اور نیکی کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی طرف بلائے گا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا گناہ کرنے والے پر اور گناہ کرنے والے کے (ہاں) گناہ میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔

بَغْيِرٍ عَلَيْهِ
بغیر جاننے کے یعنی وہ گمراہ کرتے ہیں بغیر دلیل کے یا یہ مطلب ہے کہ گمراہ ہونے والے نادانستگی کی حالت میں گمراہ ہو جاتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ گمراہ کرنے والے ان کو گمراہ کر رہے ہیں۔

آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ کمر ہونے کو نہ جاننا گمراہ ہونے والوں کے لئے کوئی عذر نہیں ہو سکتا ان کے لئے خود حق و باطل میں تمیز کرنا یا تحقیقات کرنا لازم تھا۔ **الْأَسَاءَ مَا يَزِيْرُ عَمَلُونَ ۝۱۵ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ**

خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ بُر ابو جھ ہے۔ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں، یعنی اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ فریب کرنے کی بڑی تدبیریں کیں۔

فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ

الْعَدَاةُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝۱۶ پس اللہ نے ان کا بنا بنایا گھر (بنیاد) سے ڈھا دیا پھر اوپر سے ان پر چھت آپڑی اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر اللہ کا عذاب ایسی طرح آگیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا، یعنی ان کی تدبیروں کی جڑیں اکھاڑ دینے کے لئے اللہ کا حکم آگیا اور ہلاکت آفریں عذاب ایسے راستوں پر ان پر آپہنچا جن کا ان کو گمان بھی نہ تھا ان کی تدبیریں ہی اسبابِ ہلاکت بن گئیں جیسے کوئی قوم اپنے بچاؤ اور دشمنوں کو روکنے کے لئے اگر کوئی عمارت بنائے پھر عمارت میں زلزلہ آجائے بنیادیں ہلنے لگیں اور ستون نیچے گر جائیں اور چھت اوپر سے آجائے اور سب دب کر مر جائیں یہی حالت ان لوگوں کی ہوئی ان کی تدبیریں خود ان ہی کے لئے تباہ کن ہو گئیں آیت مذکورہ بالا میں کافروں کی حالت کی تصویر کشی بطور تمثیل کی گئی ہے (یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی کوئی عمارت انہوں نے بنائی تھی اور وہ ڈھ گئی اور سب اس کے نیچے دب گئے)

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نیز بغوی نے وہب (بن منبہ) کا بیان نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں نمرود بن کنعان مراد ہے جس نے حضرت ابراہیم سے اللہ کے متعلق مناظرہ کیا تھا اور آسمان کی طرف چڑھنے کے لئے بابل میں ایک اونچی عمارت بنوائی تھی اس عمارت کی بلندی پندرہ ہزار ہاتھ تھی۔ کعب کا اور مقاتل کا قول ہے کہ اس کی بلندی دو فرسخ تھی لیکن تیز آندھی کی وجہ سے وہ عمارت گر کر سمندر میں جا پڑی اور اس کا کچھ حصہ ان لوگوں پر گڑ پڑا جس کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ
پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا۔ یعنی ان کو ذلیل کرے گا اور دنیوی عذاب کے علاوہ ان کو رسوائی کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ دوسری آیت میں آیا ہے رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تَدْخُلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْرَجْتَهُ

وَيَقُولُ آيُنْ شُرَكَاءِي الَّذِينَ كَفَرُوا قَدْ قَاتُوا فِي سَبِيلِي
اور فرمائے گا (آج) میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کی بابت تم (رسول خدا اور مسلمانوں کی) مخالفت کرتے تھے۔

قَالَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْعِلْمَ
اہل علم کہیں گے۔ یعنی انبیاء اور ملائکہ اور مؤمن نعمت ہدایت کا شکر ادا کرنے اور مشرکین کی توہین میں اضافہ کرنے اور کافروں کے دکھ پر مسرت ظاہر کرنے کے لئے کہیں گے۔ اللہ نے قیامت میں ہونے والے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس میں سننے والوں کے لئے ایک خاص مہربانی کا اظہار ہے۔

إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۱۷
آج بلاشبہ ذلت اور عذاب کافروں پر ہو گا۔ الْيَوْمَ سے مراد ہے روز قیامت الخیزی ذلت توہین۔ السُّوءُ عذاب۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّوهُمْ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ
جن کی جان فرشتوں نے حالت کفر پر قبض کی

تھی (یعنی آخر وقت تک کافر تھے) اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے۔ نفسوں پر ظلم کرنے سے مراد کفر کرنا۔ نفس کو دوامی عذاب میں مبتلا کرنے کا سامان کرنا نفس پر ظلم ہے۔

پھر کافر لوگ صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) ہم

فَالْقَوْمَ السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ
تو کوئی بُرا کام نہیں کرتے تھے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ سَلَامَ کی تشریح ہے اور استسلام سے مراد ہے پیغام صلح (ترجمہ میں اسی تفسیر کا لحاظ کیا گیا ہے) يَا الْقَوْمَ السَّلَامَ کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر منطرح ہو جائیں گے۔ اطاعت کا اظہار کریں گے سُوءٍ سے مراد ہے کفر اور سرکشی۔

بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۸﴾
(فرشتے کہیں گے) کیوں نہیں (تم بُرے کام کرتے تھے) بے شک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے پس وہ تم کو تمہارے اعمال کی یاد دہانی ضرور دے گا۔ انکار سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ عکرمہ نے کہا اس سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کئی سے آخر تک اللہ کا قول ہو۔ (فرشتوں کا نہ ہو)

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَئِمَّسَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿۲۹﴾
پس جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ کے لئے رہو۔ غرض تکبر کرنے والوں کے لئے جہنم بُرا ٹھکانا ہے۔ یعنی تم میں سے ہر صنف جہنم میں اس مخصوص دروازہ میں داخل ہو جو اس صنف کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا ابواب جہنم سے مراد ہیں عذاب جہنم کی مختلف قسمیں۔

..... ضروری توضیح از مترجم ❁

بظاہر خَالِدِينَ فِيهَا، اُدْخُلُوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور حال و ذوالحال کا زمانہ حسب قاعدہ نحو ایک ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت خلود نہیں ہو سکتا۔ داخل ہونا محدود وقت میں ہو گا اور اندر رہنا ہمیشہ ہو گا اور اس لئے حضرت مفسر نے خَالِدِينَ کی تفسیر میں مُقَدَّرِينَ اَلْخُلُودَ فرمایا یعنی خَالِدِينَ سے مراد یہ ہے کہ داخلہ کے وقت تمہارے لئے خلود مقرر کر دیا گیا ہے اور حکم دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے اندر ہمیشہ رہو گے۔ ترجمہ میں مفسر کی اس توجیہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا
اور جو لوگ (گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے) بچے رہے ان سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا تو انہوں نے کہا، بڑی بہتر چیز نازل کی۔ یعنی ایسا کلام نازل کیا جس میں دنیا و دین کی بھلائی ہے۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ﴿۳۰﴾
جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام (افکار و اعمال) کئے ان کے لئے (اس دنیا میں بھی) بھلائی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک حَسَنَةٌ سے مراد ہے ثواب کو دس گناہ تک بڑھا دینا۔ ضحاک نے کہا اس سے فتح و نصرت مراد ہے۔ مجاہد نے اچھی روزی مراد لی ہے میں کہتا ہوں حَسَنَةٌ سے مراد ایسی پاکیزہ زندگی ہے جو خالق کی نظر میں بھی پسندیدہ ہو اور دانش مند صحیح ذوق رکھنے والے آدمیوں کی نظر میں بھی یعنی مخلوق کی پرستش نہ کرے صرف اللہ واحد و بے نیاز کی عبادت کرے اور اسی کی معرفت و قرب کا طلب گار ہو، پاکیزہ (حلال) چیزوں کو حلال سمجھے اور گندی (حرام) چیزوں کو حرام جانے، کسی کو ناحق دکھ نہ دے اور ایسے عمل کرے جن کا اچھا پھل اس کو آخرت میں ملے۔
وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ
اور بلاشبہ آخرت (کی زندگی) کا گھر دنیا (کی زندگی) کے گھر سے اہل تقویٰ کے لئے بہتر ہے، دنیوی زندگی میں جو نیک اعمال انہوں نے کئے ہوں گے ان کا اچھا پھل ان کو آخرت میں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ ان کو اللہ

آخر ان کے اعمالِ بد کی سزائیں ملیں اور جس عذاب (کے بیان) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی نے آگھیرا۔ سَنِيَاتٍ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی بڑے اعمال کی سزا ان پر آگئی یا سَنِيَاتٍ سے مراد ہیں سزائیں اور مَا عَمِلُوا سے مراد ہے کفر و معصیت یعنی کفر و معصیت کی سزائیں ان کو ملیں۔ حَاقٍ بِسِهْمِ ان پر نازل ہو گیا یا ان کو گھیر لیا۔ مَا كَانُوا فِيهَا مَصْدَرِي ہے یعنی استہزاء (کی سزا) نے ان کو گھیر لیا (اس وقت مضاف محذوف ہوگا) یا ما موصولہ ہے اور اس سے مراد عذاب ہے۔ کفار بطور مذاق کہتے تھے لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ہمارے کہنے پر اللہ ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ

اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے سوا کسی چیز کی

عبادت نہ ہم کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے (حکم کے) بغیر ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے پھر بعثت پیغمبر اور احکامِ تکلیفیہ کا فائدہ ہی کیا ہے، یا یہ کلام سنجیدگی سے کہتے تھے اور مرضی و مشیت میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہ تھا ہر کام چونکہ اللہ کی مشیت سے ہونا مسلمہ حقیقت ہے اس لئے وہ سمجھے کہ ہمارا اور ہمارے باپ دادا کا شرک کرنا اور حلال کو حرام خود بنا لینا بھی اللہ کی مرضی ہے اور ہمارا یہ فعل اللہ کو ناپسند نہیں ہے۔

كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ شرک کرنے اور حلال کو

فَهَلْ عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ۝۳۵

سو پیغمبروں کا فریضہ تو واضح طور پر اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے۔ اس

کے سوا ان کا اور کوئی کام نہیں ہدایت یاب کرنا تو اللہ کے قبضہ میں ہے اور اسی کی مشیت پر موقوف ہے، البتہ اللہ کی خوشنودی کا راستہ بتا دینا پیغمبروں کا فریضہ ہے اس سے آگے آیاتِ ذیل میں بیان فرمایا ہے کہ پیغمبر بھیجے ہیں اور بعثتِ انبیاء کو ذریعہ ہدایت اور سببِ خلافت قرار دیا ہے جس کو اللہ نے ہدایات یاب بنانا چاہا پیغمبر کی بعثت اس کے لئے سببِ ہدایت بن گئی اور جس کو اللہ نے گمراہ بنا دینا چاہا پیغمبر کی بعثت سے اس کی گمراہی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ پیغمبر کی بعثت تو اعلیٰ نفسِ غذا کی طرح ہے۔ مناسب مزاج والے کو نفسِ غذا طاق پہنچاتی ہے اور بگڑے ہوئے مزاج والے کے مزاج میں مزید بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۝

اور ہم نے ہر امت میں یہ پیام پہنچانے کے لئے پیغمبر کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچتے رہو یعنی شیطان کی

پیروی نہ کرو۔ وہ طاغوت ہے اللہ کی عبادت سے بہت بڑا طاغی (سرکش)

فِيهِمْ مَن هَدَى اللَّهُ

پس ان میں سے بعض کو تو اللہ نے ہدایت یاب کر دیا جس کو ہدایت یاب کرنا چاہا اس کو پیغمبروں کی رہنمائی سے ایمان کی توفیق دے دی۔

وَمِنْهُمْ مَن حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۝

اور ان میں سے بعض لوگوں کے لئے (بقضاءِ ازلی حسبِ

مشیتِ الہی) گمراہی محقق ہو گئی (مضبوط ہو گئی) اللہ نے ان کو ایمان کی توفیق نہیں دی اور ان کو ہدایت یاب کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفر کی ہی حالت میں ان کو ہلاک کر دیا ان کی بستیوں کو اجاڑ دیا ان کے محلِ دیر ان ہو گئے اور ان کے (جاگیری) کنویں بغیر مالکوں کے خالی پڑے رہ گئے۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِبِينَ ۝۳۶

(اے گروہ قریش) ذرا ملک

میں چل پھر کر دیکھو کہ پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا (بڑا) انجام ہوا۔ عاد، ثمود، قوطِ لوط اور بنِ والوں (یعنی قومِ شعیب) کی بستیاں دیکھو۔ کافروں نے اللہ کی مشیت اور مرضی کو ایک سمجھ رکھا تھا۔ اس خیال کا ازالہ اس آیت میں کر دیا کیوں کہ ان اقوام کی طرف سے تکذیب کا ارتکاب تو مشیتِ خدا تھا اب اگر تکذیب ہی میں اس کی مرضی ہوتی تو ان پر عذاب نازل نہ

فرماتا۔

اس سے آگے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کفارِ قریش پر گمراہی کی مہر اللہ کی طرف سے ثبت ہو چکی ہے آپ اپنے جی کو ہلکان نہ کریں اور ان کو ہدایت یاب بنانے کی حرص نہ کریں۔ فرمایا ہے۔
 اِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هٰذَا بِحُفْرَةٍ مِّنْ اَيْدِيكَ فَلَا يُغْنِيْكَ عَنْهُ اَنْ تُغْنِيْكَ عَنْهَا اِنَّكَ لَكٰفِرٌ مِّنْ اٰيٰتِيْ ۗ وَمَا لَكُم مِّنْ نَّصِيْرِيْنَ ۙ ﴿۱۷﴾
 ان کے راہِ راست پر آنے کی آپ کتنی ہی تمنا کریں اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت یاب نہیں کرتا جن کو گمراہ کرنا اس کو مقصود ہوتا ہے اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

یعنی اللہ جس کو گمراہ رکھنا ہی چاہے اس کو پھر ہدایت یاب نہیں کرتا۔ آیت لِمَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ کا جو مفہوم ہے وہ مَنْ يُّضِلُّ کا مفہوم ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ نَّصِيْرِيْنَ کا یہ مطلب ہے کہ جن کو خدا ہی گمراہ کر دے اُن کی مدد کرنے والا اور حکمِ خدا کو نافذ ہونے سے روکنے والا اور اللہ کے مقرر کردہ عذاب کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ محمد اگر آپ ان کو ہدایت یاب بنانے کی کتنی ہی حرص کریں اور ان کو ہدایت کرنے میں کتنی ہی تکلیف اٹھائیں جب ان کو خدا نے ہی گمراہ کر دیا ہے تو آپ کی اس حرص سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور ان کو ہدایت یافتہ بنانے کی آپ کو قدرت نہ ہوگی، اللہ سب پر غالب اور قوی ہے جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو نہ کوئی ہدایت کرنے والا ہے نہ مددگار کہ عذاب کو دفع کر سکے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی مشرک پر کچھ قرض تھا۔ مسلمان مشرک کے پاس تقاضا کرنے گیا اور اپنے قرض کے متعلق کچھ گفتگو کی اثناء کلام میں یہ بات بھی مسلمان نے کہہ دی کہ مرنے کے بعد مجھے اللہ سے یہ امیدیں ہیں۔ مشرک بولا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا یقین ہے میں اللہ کی پختہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو مر گیا اللہ اس کو دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْْمَانِيْكُمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ط
 اور انہوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا اس جملہ کا عطف وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پر ہے اور یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ جس طرح یہ توحید کے منکر ہیں اسی طرح مضبوط قسمیں کھا کر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا بھی انکار کرتے ہیں اس کی تردید میں اللہ نے فرمایا۔

بَلٰى وَعَدَا عَلٰىهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾
 کیوں نہیں (اٹھائے گا) اس نے اس کا پختہ وعدہ کر لیا ہے اس پر (وعدہ پورا کرنا) ضروری ہے (کیونکہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا اس کی حکمت کا تقاضا ہے اور تقاضائے حکمت کے خلاف ہونا ممکن نہیں اور اس کے وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے) اس نے (قیامت بپا کرنے کا) وعدہ بہت پختہ کر لیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ اللہ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے) یا یہ مطلب ہے کہ اکثر لوگ قیامت کا یقین نہیں رکھتے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ قیامت کا برپا ہونا اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے اس کے علاوہ ان کی نظریں کوتاہ ہیں، محسوسات کی عادی ہیں۔ غیر معمولی حادثہ کے واقع ہونے کو محال جانتی ہیں۔

لِيَّبَيِّنَ لَكُمْ اَلَّذِيْنَ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ
 جس کے متعلق وہ (دنیا میں) اختلاف کرتے تھے۔
 (وہ قیامت قائم کرے گا) تاکہ ان پر وہ امر (حق) واضح کر دے

کسبہم کی ضمیر مرنے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے خواہ کافر ہوں یا مؤمن۔
 وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۱۹﴾
 اور تاکہ (قیامت کے دن) کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

کافر کہتے تھے کہ جو مر گیا اللہ دوبارہ اس کو زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا۔

لِيُبَيِّنَ اور لِيُعَلِّمَ میں قیامت قائم کرنے کی علت اور حکمت بیان فرمائی ہے حق و باطل اور حق پرست و باطل پرست میں تمیز کر دینا اور ہر فریق کو سزا یا جزا دینا تقاضائے حکمت ہے جس کا ظہور قیامت کے دن ہو گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لِيُبَيِّنَ کا تعلق آیت وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا سے ہو یعنی ہر امت میں ہم نے پیغمبر بھیجا تا کہ پیغمبر وہ امر حق ظاہر کر دے جس کی بابت اس امت میں اختلاف تھا اور لوگوں کو بتا دے کہ وہ گمراہی پر ہیں اللہ پر بہتان تراشی اور دورغ بندی کرتے ہیں (اللہ نے ان کو بت پرستی اور حلال کو حرام بنانے کا حکم نہیں دیا)

ہم جس چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَا أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۵۰﴾
اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

إِذَا أَرَدْنَا یعنی جب ہم کسی چیز کو موجود کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ پہلی بار یا دوبارہ۔ اس آیت میں دوسری زندگی کا امکان ثابت کیا گیا ہے۔ خلاصہ بیان یہ ہے کہ اللہ مخلوق کو محض اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے کسی اور چیز پر کسی مخلوق کی ہستی موقوف نہیں ورنہ نتائج و اسباب کا تسلسل کہیں ختم نہ ہو گا اور کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو سکے گا پھر کسی چیز کی تخلیق و تکوین سے اللہ کو کوئی تھکان یا تکلیف نہیں ہوتی ورنہ خدا کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ اور عجز تقاضائے الوہیت کے خلاف ہے پس جب کہ کوئی مادہ نہ تھا نہ سابق میں کوئی نظیر اور مثال تھی بلکہ اللہ نے تمام چیزوں (یہاں تک کہ خود مادہ) کو بغیر مادہ اور مثال کے پہلی مرتبہ پیدا کر دیا تو (اب جبکہ ایک مثال موجود ہو چکی ہے) دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا، میرے بندے نے میری تکذیب کیا اور اس کے لئے یہ زیبا نہ تھا اور میرے بندے نے مجھے گالی دی اور یہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ تکذیب تو یہ کی کہ اس نے کہا اللہ نے جیسا شروع میں مجھے پیدا کر دیا ایسا دوبارہ ہرگز مجھے پیدا نہیں کرے گا۔ حالانکہ ابتدائی تخلیق میرے لئے دوبارہ تخلیق سے آسان نہ تھی اور گالی یہ دی کہ اس نے کہا اللہ نے اپنے لئے اولاد اختیار کر لی ہے حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں، نہ میں کسی کا باپ ہوں نہ کسی کا بیٹا، میری مثل کوئی بھی نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں اس کا گالی دینا تو یہ ہے کہ اس نے کہا میری اولاد ہے، حالانکہ میں پاک ہوں بی بی یا اولاد اختیار کرنے سے۔ رواہ البخاری۔

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن چھوڑ دیا

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا
بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

رفی اللہ، یعنی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے معاملہ میں اللہ (کو ماننے) کی وجہ سے ظلموا بعد اس کے کہ ان کو سخت دکھ دیئے گئے اور ایذا میں پہنچائی گئیں۔ عبد الرزاق اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ اور داؤد بن ہند کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابو جندل بن سہیل کے متعلق ہوا۔ مشرکوں نے مکہ میں آپ کو قید کر رکھا تھا اور دکھ پہنچائے تھے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے اور عبد بن حمید نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول چند صحابہ کے متعلق ہوا جن پر مکہ والوں نے مظالم کئے تھے اور گھروں سے نکال باہر کر دیا تھا انہی مظلوموں میں سے ایک گروہ ملک حبش کو چلا گیا تھا پھر اللہ نے انکو مدینہ میں ٹھکانا دے دیا مدینہ کو ان کے لئے دارالہجرت بنا دیا اور کچھ مؤمنوں (یعنی مدینہ والوں) کو ان کا مددگار کر دیا۔

ہم ضرور دنیا میں ان کا ٹھکانہ

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۗ وَلَا جَزَاءَ الْآخِرَةِ إِلَّا الْبِرُّ
دیں گے اچھی طرح اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہے اچھے ٹھکانے سے مراد ہے مدینہ۔

بنوئی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ جب کسی مہاجر کو کچھ عطا فرماتے تھے تو کہتے تھے یہ لے لو اللہ تم کو مبارک کرے یہ چیز تو وہ ہے جس کے دینے کا اللہ نے تم سے دنیا میں وعدہ کیا تھا اور آخرت میں جو تمہارے لئے رکھ چھوڑا ہے وہ بہت بہتر ہے پھر آپ یہی آیت تلاوت فرماتے تھے۔

بعض علماء کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کریں گے بعض نے کہا، دنیا میں بھلائی سے مراد ہے ایمان کی توفیق اور نیکی کی ہدایت۔

﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ اگر (کفار) جانتے ہوتے (کہ اللہ ان مہاجرین کو دونوں جہان کی بھلائی عطا فرمائے گا تو ان پر ظلم نہ کرتے انکی تائید کرتے) یا یہ مطلب ہے کہ اگر مہاجرین کو معلوم ہوتا (کہ ہمارے لئے اس دکھ پانے کا یہ اجر ہے) تو وہ اور زیادہ کوشش کرتے اور مزید صبر سے کام لیتے۔

وہ ایسے ہیں کہ صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

صَبْرًا كَمَا مَفْعُولٌ مَحذُوفٌ ہے یعنی کافروں کی طرف سے ایذا پانے اور وطن چھوڑنے اور دوسرے مصائب پر صبر کرتے ہیں۔

يَتَوَكَّلُونَ یعنی اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور سب سے (دل کا) تعلق توڑ کر اللہ سے اپنا رابطہ جوڑ لیتے ہیں۔ جب کافروں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور کہنے لگے کوئی آدمی اللہ کا پیغامبر نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہماری ہدایت کے لئے کسی فرشتے کو کیوں نہیں بھیجا۔ اس پر آیت کا نزول ہوا۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ﴾ اور آپ سے پہلے بھی ہم نے (آدمیوں کے پاس) مرد ہی پیغمبر بنا کر بھیجے (ملائکہ کو نہیں بھیجا) ہم ان کے پاس (ملائکہ کے ذریعہ سے) وحی بھیجتے رہے۔

﴿فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ پس اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم سے پوچھ لو۔ یعنی اگر آدمیوں کے پیغمبر ہونے میں تم کو شک ہے تو جن کو کتب سابق کا علم ہے یہودی ہوں یا عیسائی ان سے دریافت کر لو کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے پاس موسیٰ اور عیسیٰ وغیرہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا اور ان سے پہلے آدم اور نوح وغیرہ کو ان کی امتوں کو ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کو علم نہ ہو ان کو علماء سے دریافت کرنا چاہئے اور اگر بتانے والا لائق ہو تو اس کی خبر مفید علم ہوتی ہے اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ (ہم نے مردوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا) کھلے معجزات اور کتابوں کے ساتھ۔

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ اور ہم نے آپ پر بھی ایک نصیحت نامہ (یعنی قرآن مجید) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے کھول کر اسکا اظہار کر دیں جو (آپ کے ذریعہ سے) ان کے پاس بھیجا گیا ہے "ما نزل" سے مراد ہے ثواب کا وعدہ، عذاب کی وعید، احکام اور مجمل قوانین، بیان (جس کا رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے) قولی بھی ہے عملی بھی اور تقریری بھی اس کو تو بیان صریح کہا جاتا ہے بیان کی دوسری قسم غیر صریحی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے قیاس کرنے کا حکم دیا ہے (پس مقیاس علیہ میں تو صریحی بیان ہوتا ہے اور مقیاس میں غیر صریحی)

﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ اور تاکہ وہ غور کریں۔ غور کرنے سے مراد ہے رفتار عبارت اور اقسام

دلالت پر غور کرنا اس طرح کہ شارع کی طرف سے کسی بیان کی ضرورت نہ ہو مثلاً آیت فَاتُوا حَرَّتَكُمْ فِي لَفْظِ حَرَّتٍ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد زمانہ شرمگاہ ہے مبرز مراد نہیں ہے کیونکہ مبرز کھیتی (تخم آفرینی) کا مقام نہیں ہے (مبرز میں تخم ریزی ضیاع تخم ہے) کیا آیت ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ فِي قُرُوءٍ سے مراد حیض ہے۔ طہر مراد نہیں ہے کیونکہ طلاق مسنون طہر کے زمانہ میں ہی ہوتی ہے اب اگر جس طہر کے زمانہ میں طلاق دی ہو اس کو پورا طہر محسوب کر لیا جائے تو تین طہر سے مدت کم ہو جائے گی اور محسوب نہ کیا جائے تو مدت تین سے بڑھ جائے گی بہر حال پورے تین طہر نہ ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قُرُوءٍ سے مراد طہر نہیں ہے بلکہ حیض مراد ہے۔

ہیت کی طرح زمین پر گرتے اور چسپاں رہتے ہیں اور سایہ والی چیزیں بھی عاجز بے بس اور اللہ کے حکم کی تابع ہیں۔
 وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَابَّۃٍ
 چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چلنے والی چیزیں زمین میں ہیں۔

مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مراد ہے چاند، سورج، ستارے۔ اور مِنْ دَابَّۃٍ : مَا فِی الْاَرْضِ کا بیان ہے یا مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ دونوں کا بیان مِنْ دَابَّۃٍ ہے یعنی چلنے والی چیزیں آسمانوں میں ہو یا زمین میں۔ دَبَّیْبٌ جسمانی حرکت کو کہتے ہیں آسمان ہو یا زمین میں۔

وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ اور فرشتے بھی۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ کا عطف مَا فِی السَّمٰوٰتِ پر ہے کیونکہ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے آسمانی چیزیں مراد ہیں چاند، سورج، ستارے اور مَا فِی الْاَرْضِ سے مراد زمین کی حرکت کرنے والی چیزیں ہیں اور ملائکہ کچھ زمین کے ہیں اور کچھ آسمان کے اور کچھ حاملین عرش ہیں جو نہ آسمانی ہیں نہ زمینی اس لئے ملائکہ نہ سماوی جنس سے ہیں نہ آرضی مخلوقات میں سے بلکہ سب سے الگ مخلوق ہیں (اور اگر ملائکہ کو موجودات سماوی و آرضی میں شامل مانا جائے تو پھر) ملائکہ کا عطف خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے ہو گا جیسے آیت تَنْزِیْلُ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوْحِ مِیْنُ رُوْحِ (جبرئیل) کا عطف ملائکہ پر اظہار خصوصیت کے لئے ہے اس صورت میں وَالْمَلٰٓئِکَۃُ کا ترجمہ ہو گا اور بالخصوص ملائکہ بھی۔

سجود سے مراد ہے اطاعت و انقیاد (خواہ طبعی تاثیر کی شکل میں ہو یا ارادہ اور قصد کے ساتھ احکام تکلیفیہ کی تعمیل کی صورت میں۔ انقیاد عمومی میں تمام مخلوق کی ارادی اطاعت یہاں تک کہ شر الدواب یعنی کفار کا طبعی انقیاد بھی شامل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک سجود اشیاء سے مراد ہے ہر چیز میں اللہ کی پر حکمت صنعت کا ظہور جو اہل عقل کو دعوتِ سجدہ دے رہا ہے میرے نزدیک سجود اشیاء سے مراد اطاعت شعوری ہے جاندار ہو یا بے جان، نامی ہو یا جامد، ہر چیز ایک خاص زندگی رکھتی ہے اور کوئی چیز بھی شعور سے خالی نہیں خواہ ہم بعض چیزوں کو بیجان اور بے شعور جانتے ہوں ہم کو ان کے باشعور اور زندہ ہونے کا علم نہ ہو مگر اللہ کے نزدیک وہ باشعور اور زندہ ہیں۔ اسی مضمون کی تائید مختلف آیات سے ہو رہی ہے اللہ نے فرمایا وَ اذِنتُ لِرَبِّہَا وَ حَقَّتْ۔
 قَالَتَا اٰتٰنَا طٰئِعٰتِنِ۔ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَہَا بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَہَا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اَطَّتِ السَّمٰوٰتُ وَ حَقَّ لَہَا اَنْ تَاطَّ اَسْمٰنُ (خوف سے) چڑچڑایا اور چڑچڑانا (یعنی اللہ سے ڈرنا) ہی اس کے لئے مناسب تھا۔

اس توجیہ پر آیت مذکورہ میں کافروں کے علاوہ دوسری مخلوق مراد ہوگی کافر مستثنیٰ ہوں گے۔ اللہ نے سورہ حج کی آیت سجدہ میں وَ کَثِیْرٍ مِّنَ النَّاسِ فَرَمٰیہُ جَسَمٌ مِّنْ کٰفِرُوْنَ کا استثناء ظاہر ہو رہا ہے۔ آئندہ آیت بھی اس تخصیص کو ظاہر کر رہی ہے۔

وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور (اللہ کی عبادت سے) تکبر نہیں کرتے۔

یَخَافُوْنَ رَبَّہُمْ مِّنْ فَوْقِہُمْ

وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان سے بالادست سے یعنی غالب اور قاہر ہے اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَ هُوَ الْقٰہِرُ فَوْقَ عِبَادِہِ یٰۤاٰیہُ مُطَلَبٌ ہُوَ کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں عذاب ان کے اوپر سے نہ نازل ہو جائے۔

وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں یعنی جیسی تعمیل حکم ان کے لئے مناسب ہے وہی کرتے ہیں۔ یہ جملے بتا رہے ہیں کہ لِلّٰہِ یَسْجُدُ سے کفار مستثنیٰ ہیں۔ تکبر نہ کرنا، ڈرنا اور تعمیل حکم کرنا تقاضائے کفر کے خلاف ہے۔ ہاں اگر سجود سے عمومی تکوینی اطاعت اور اللہ کی صنعت کا ظہور مراد لیا جائے تو پھر ہُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ اور یَخَافُوْنَ رَبَّہُمْ اور یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ملائکہ کی صفاتِ خصوصی ہوں گی۔ (عام مخلوق کی صفات نہ ہوں گی)

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے۔ آسمان خوب چرچر لیا اور اس کو خوب چرچرانا چاہئے ہی تھا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آسمان میں کہیں بھی چار انگلی کی جگہ ایسی نہیں کہ اس میں کوئی فرشتہ سجدہ میں پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ خدا کی قسم جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم ہنستے اور زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے، اور میدانوں میں نکل کر اللہ کے سامنے چیختے چلاتے (یہ سن کر) حضرت ابو ذرؓ بولے کاش میں درخت ہو تاکہ اس کو کاٹ دیا جاتا۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والبخاری۔

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا آلَ الْهَيْبِ إِتْمَانًا هُوَ إِلَهُكُمْ وَآلِئِكَ
 کہ دو معبود نہ قرار دو بس اللہ ہی ایک معبود ہے یعنی دوئی الوہیت کے منافی ہے (دو اللہ ہو ہی نہیں سکتے) آخری آیت دلالت کر رہی ہے کہ اس جگہ وحدانیت کو ثابت کرنا مقصود ہے الوہیت کا اثبات مقصود نہیں۔ الوہیت کے لوازم میں سے وحدانیت ہے۔
 قَائِلًا يَا فَارُهَبُونَ ⑤ پس خصوصیت کے ساتھ مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ (ایٹائی فعل محذوف کا مفعول ہے اور

فَارُهَبُوا کا مفعول محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا اِيَّايْ اِرُهَبُوا فَارُهَبُونِي تکرار جملہ تاکید کی حکم کو ظاہر کر رہی ہے) اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ یعنی اللہ ہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کی شان میں ظلم کا تصور بھی نہیں ہو سکتا (وہ اپنی ملک میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اس کے لئے کسی قسم کا تصرف ظلم نہیں ہو سکتا) ظلم تو دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا نام ہے بغیر اجازت کے دوسرے کی چیز میں تصرف جائز نہیں (اپنی ملک میں تصرف تو کسی صورت میں اور کسی بھی حالت میں ظلم ہو ہی نہیں سکتا) فرقہ معترکہ انسان کو اپنے افعال کا خالق کہتا ہے اس کے مسلک کی تردید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَلَهُ الدِّينُ وَاصْبَاءُ اور اسی کو حق ہے کہ اس کی اطاعت لازمی طور پر اور ہمیشہ کی جائے۔ اس کی اطاعت کا حکم کبھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ وہی اللہ واحد ہے اور اسی سے خوف کرنا ضروری ہے فرشتوں کی طرح انسانوں کو بھی ہمیشہ ہر حال میں اسی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ رواہ احمد والحاکم بسند صحیح عن عمران والحکیم بن عمر والغفاری۔

صحیحین اور نسائی اور سنن ابو داؤد میں حضرت علیؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں اطاعت (کا حکم) تو نیکی میں ہے (امر ممنوع کا ارتکاب کسی کے حکم سے درست نہیں) لہ الدین ذاکلفة کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی مالک نہیں مالک اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے غیر مالک مالک کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ دین سے مراد ہے بدلہ یعنی سزا و جزا۔ مطلب یہ ہے کہ دوائی سزا جزا اسی کو زیبا ہے وہی مومنوں کو دوائی ثواب دے گا اور کافروں کو لازوال عذاب۔

بعض نے کہا دین سے مراد عذاب ہے یعنی کافروں کو دوائی عذاب دینے کا اسی کو حق ہے اصل میں واصل بیماری کو کہتے ہیں وصب زید زید دکھی ہو گیا۔ اللہ نے عذاب کی صفت واصل فرمائی ہے۔ ایک آیت میں فرمایا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: اَنَا وَصَبْتُ رَسُولَ اللَّهِ فِي تِيَّارِي دَارِي كِي تَحِي نَهَائِي فِي هِي وَصَب دَوَائِي دَكْهُ هَوْبَاءُ، تَوْصِيْبُ تِيَّادَارِي۔ قاموس میں ہے وصب بمعنی مرض او صبه اللہ اس کو اللہ نے بیمار کر دیا وَصَبُ يَصِبُ وَصُوبًا مَرَضٌ جَمٌّ كِيَا۔ لازم ہو گیا او صب کا بھی یہ معنی آتا ہے وَصَبُ عَلَيَّ الْأَمْرُ كِيَا كِي پابندی سے نگرانی کی اور اچھی طرح اس کا انتظام کیا ہے آیت میں دو معبود ماننے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے سخت اور دوائی عذاب کی وعید ہے۔

کیا تم اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو یعنی کسی دوسرے سے نہ ڈرو سوائے اللہ
 أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ⑥

کے کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نَّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ

مراد ہے صحت، عافیت، دولت، خوش حالی، آرزائی وغیرہ۔

ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْرَوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر جب تم پر (بیماری، ناداری، قحط وغیرہ کی کوئی) مصیبت آتی ہے تو عاجزی اور زاری کے ساتھ اللہ ہی کی طرف تم رجوع کرتے ہو۔ یعنی سوائے اس کے کسی سے دفع مصیبت کے لئے زاری نہیں کرتے جو ار اوچی آواز سے دعا کرتا اور فریاد کرتا۔

ثُمَّ إِذَا كُشِفَ الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فِرْتُمْ مِّنْكُمْ بِرَبِّكُمْ يُشْرِكُونَ ﴿۵۷﴾

پھر جب اللہ مصیبت کو تم سے دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ یکدم (اللہ کی عبادت میں) دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں اگر خطاب تمام انسانوں کو مانا جائے مؤمن ہوں یا کافر تو منکم (تم میں کچھ) سے مراد ہو گا فریق کفار اور اگر خطاب صرف کافروں کو قرار دیا جائے تب کافروں میں سے کچھ لوگوں کا مشرک ہو جانا صحیح ہے کیونکہ مصیبت دور ہونے کے بعد کچھ کافر بھی نصیحت پذیر ہو جاتے ہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے: فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ پھر جب سمندری طوفان سے بچا کر اللہ ان کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ سیدھی چال اختیار کر لیتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ خُصُوصًا وَذَلَّضْنَا لَهُمُ الشِّرْكَ لِيُكْفِرُوا ﴿۵۸﴾
خاص طور پر ان کی ناشکری کرتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جو نعمتیں ہم نے ان کو دی ہیں ان کی ناشکری کرتے ہیں خصوصاً ان کی مصیبت کی نعمت لیکھو اور ان میں لام نتیجہ کا ہے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی، دوسروں کی عبادت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا داد نعمتوں کا منعم دوسروں کو قرار دے لیا۔

فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۵۹﴾
خیر (چند روز) عیش اڑا لو اب جلد ہی خبر ہو جائے گی تم متعوا
امر کا صیغہ ہے لیکن مراد ڈرانا ہے (حکم دینا مقصود نہیں ہے) فسوف تعلمون سے تمہید کی مزید شدت ہو گئی۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ
اور یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان (جھوٹے معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ یعنی جن معبودوں کا حصہ لگایا جا رہا ہے وہ عبادت کے مستحق ہیں اور نفع یا ضرر پہنچانے والے ہیں یہ کافران کو ایسا نہیں خیال کرتے فقط اپنی نادانی کی وجہ سے ان کو معبود اور نفع و نقصان پہنچانے والے کہہ دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ کافران معبودوں کا حق نہیں سمجھتے یونہی حصہ لگادیتے ہیں یا مالا يعلمون سے مراد بت ہیں اور يعلمون کا فاعل بت ہیں یعنی بت بے علم ہیں جماد ہیں اور کافر ایسے پتھروں کا حصہ لگادیتے ہیں۔ مَارَزَقْنَاهُمْ سے مراد ہے کھیتی، مویشی، پھل مشرک کہا کرتے تھے هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا۔

تَاللَّهِ لَئِن سَأَلْتُمْ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿۶۰﴾
خدا کی قسم تم سے تمہاری ان دروغ تراشیوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔ یعنی تم جو ان کو معبود بنا رہے ہو قیامت کے دن اس کی باز پرس ہوگی تم سے ضرور۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحٰنَهُ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ﴿۶۱﴾
اور اللہ کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، سبحان اللہ اور اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے) بنی خزاہ اور بنی کنانہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ سبحانہ، تنزیہ ذات ہے یعنی اللہ کو میں نسبت اولاد سے پاک سمجھتا ہوں اور اس کی پاکی کا اقرار کرتا ہوں یا سبحانہ صرف اظہارِ تعجب کے لئے ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۶۲﴾

اور ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو سارے دن اس کا چہرہ بدر رونق رہتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا ہے۔
مُسْوَدًّا آسپاہ بدر رونق یعنی شرم، رنج اور غم کی وجہ سے اس کا چہرہ بدر رونق ہو جاتا ہے اور دن بھر بدر رونق رہتا ہے باوجودیکہ دن ایسی چیز ہے کہ اس میں خوشی بھی ہوتی ہے اور غم بھی مگر اس پر رنج ہی سوار رہتا ہے نظیم دل میں غم رنج گھٹا ہوا کہ اس کو اندر ہی اندر روکے رکھتا ہے ظاہر نہیں کرتا۔

بِتَوَارِيهِ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ
اور جس چیز (لڑکی) کی اس کو اطلاع دی جاتی ہے اس کی عار
سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ القوم سے مراد ہے اپنے لوگ۔
اَيْسِكُّهُ عَلَى هُوْنٍ اَمْرِيْدُ شَيْءٍ فِي التَّرَابِ ط
(تردد میں پڑ جاتا ہے) کہ اس کو ذلت کی حالت میں (اپنے
پاس) روکے رکھے یا مٹی میں اس کو زندہ گاڑ دے۔

يَدُسُّنَّ جِجَادِي، دَفْنِ كَرْدِي، بَعْنُوِي نِي لَكْهِي هِي كِي قَبِيْلَهٗ مَضْرُورِي بِنِي خِرَزَاعِهٗ اَوْرِي بِنِي تَمِيْمِ لُزِيكِيُوں كُو زَنْدِهٗ دَفْنِ كَر دِيَا كَرْتِي
تھے ایک تو ان کو ناداری کا اندیشہ ہوتا تھا (کہ لڑکیاں تو صرف کھانے پینے کی ہیں لوٹ مار کر کے کہیں سے کچھ لا نہیں
سکتیں) دوسرے یہ کہ (ناداری کو دیکھ کر) غیر کفو کہیں ان سے نکاح کرنے کا لالچ نہ کرنے لگیں عرب کے بعض لوگوں کا دستور
تھا کہ جب لڑکی پیدا ہوتی اور وہ اس کو زندہ رکھنا چاہتا تو اس کو لون کا یا بالوں کا کرتہ پہنا کر جانور چرانے کی خدمت پر لگا دیتا تھا اور اگر
اس کو قتل کر دینا چاہتا تو چھ سال کی عمر تک اس کو چھوڑے رکھتا جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا اس کو بنا سنوار کر
تیار کر دے پھر اس کو کہیں جنگل میں لے جاتا وہاں پہلے ایک گہرا گڑھا کھود کر تیار رکھتا۔ جب لڑکی کو لے کر وہاں پہنچتا تو لڑکی سے
کہتا دیکھ تو اس گڑھے میں کیا ہے لڑکی دیکھنے کو جو نہی جھکتی یہ سنگدل باپ پیچھے سے اس کو دھکا دے دیتا اور اوپر سے مٹی ڈال کر
زندہ دفن کر دیتا اور گڑھے کو ہموار کر دیتا۔

فِرْزُوْقِ كِي دَاوَا صَعَصَعَهٗ كُوَا كَر كِي سُنِ كُنِ مَلِ جَاتِي تُو لُزِيكِي كِي كِي بَاپِ كِي پَا سِ لُزِيكِي كِي عَوْضِ كِي كِي اَوْنِثِ بِيْحِجِ دِي تَا اَوْرِ اِسِ
طرح لڑکی کی گلو خلاصی ہو جاتی فرزدق نے بطور فخر اسی واقعہ کی طرف ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

مِيْرَادَاوَهٗ تَهَا جِس نِي زَنْدِهٗ دَفْنِ كَرْنِي وَا لُوْلُوں كُو زَنْدِهٗ دَفْنِ كَرْنِي سِي رُو كَا اَوْرِ زَنْدِهٗ دَر كُوْر هُوْنِي وَا لِي كُو زَنْدِ كِي عَطَا كِي۔
خوب سن لو، ان کی یہ تجویز بہت ہی بُری ہے اللہ جو ہر طرح کی اولاد سے پاک

اَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾
ہے اس کے لئے تو ایسی اولاد تجویز کرتے ہیں جو صنف اوتی ہے اور اپنے لئے لڑکوں کو پسند کرتے ہیں دوسری آیت میں اس کو
تا انصافی کی تقسیم قرار دیا ہے فرمایا ہے: اَلْكُمُ الدَّكْرُ وَ لَهٗ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذَا قَسَمَ ضِيْرٰى -

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السُّوْءِ
جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کی بُری حالت ہے
مرنے کے بعد بقاء نسل کے محتاج ہیں اپنی قوت بازو بنانے کے لئے لڑکوں کے ضرورت مند ہیں لڑکیاں ہونے کو بُرا جانتے ہیں
لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے ہیں یہ سب ان کی بُری حالت ہے۔
وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ط

اور اللہ کی شان سب سے اونچی ہے وہ واجب الوجود ہے ہر چیز سے بے نیاز ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں علم قدرت بقاء
اور تمام جلالی و جمالی صفات سے متصف ہے مخلوق کی صفات سے پاک ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَثَلُ السُّوْءِ دُوْرَخِ هِي
اور مثل الاعلیٰ لاله الا اللہ کی شہادت ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾
اور وہ (سب پر) غالب اور (اس کا ہر کام) پر حکمت ہے۔ یعنی قدرت و
حکمت میں یگانہ و بے مثال ہے۔

وَلَوْ يُوْاْخِذُ الْبَلٰٓءُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرٰكَ عَلَيْهِمْ مِنْ دَآبِئَةٍ
بے جا حرکتوں کے سبب ان کی فوری گرفت کرتا تو زمین پر کسی جس و حرکت کرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

مُوَاخِذَهٗ كَرْنِي سِي مَرَادِهٖ فُوْرِي سَزَادِيْنَا۔ النَّاسِ سِي مَرَادِ كَفَارِ هِي۔ لَفْظِ مُوَاخِذَهٗ اَوْرِ ظَلْمِ اِسِي كِي طَرَفِ اِسْاَرَهٗ كَر رِهَا هِي
ظلم سے مراد ہے کفر اور معصیت بیضاوی نے لکھا ہے کہ الناس سے مراد سب لوگ ہیں (مؤمن ہوں یا کافر) عبارت کی رفتار اسی
کی غمازی کر رہی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سب ہی لوگ یہاں تک کہ انبیاء بھی ظالم قرار پائیں گے کیونکہ گروہ
انسانی کے اکثر افراد سے چونکہ کفر و معصیت کا صدور ہو رہا ہے اس لئے جماعت کی طرف ظلم کی نسبت کر دی گئی اور جماعت کی
طرف نسبت کرنے سے ہر شخص کی طرف نسبت ضروری نہیں۔ (حضرت مفسر نے کہا میں کہتا ہوں) اس صورت

میں (ماترک علیہا من دابۃ کے لفظ سے) ظاہر ہوتا ہے اکثر افراد کے ارتکابِ جرم کا بدلہ پوری جماعت سے لیا جاتا اور یہ بدلہ قطعاً غلط ہوگا کیونکہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ صریحی نص ہے (مجرم کی سزا میں غیر مجرم کو شریک نہیں کیا جاسکتا)۔
 دابۃ سے مراد ہے گناہ گار دابہ۔ مفسر مدارک نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس تشریح کی نسبت کی ہے یاد ابہ سے مراد ہے جاندار اور سنگنے والا جانور اس صورت میں مؤمنین صالحین مستثنیٰ ہوں گے یعنی نیکو کار مؤمنوں کے علاوہ ہر جاندار کو ہلاک کر دیتا کسی کو نہ چھوڑتا۔ کیونکہ کافروں اور گناہ گاروں کی بے جا حرکتوں پر نیکوں کی پکڑ نہیں ہو سکتی ہاں اگر نیک لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں تو گناہ پر راضی ہونے یا فرض کو ادا نہ کرنے کے سبب ان کو بھی عذاب میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ جب کسی بری بات کو دیکھیں اور اس کو نہ بدلیں؟ یعنی بدلنے کی کوشش نہ کریں، تو ہو سکتا ہے کہ اللہ سب کو عموماً اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے ابو داؤد نے حضرت جریر بن عبد اللہؓ کی روایت سے بھی اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے۔

صالح مؤمنوں کے علاوہ باقی جانداروں کا ظالم اور کافر انسانوں کے ظلم کے بدلہ میں پکڑا جانا ناجائز ہر جانور کی تخلیق انسان کی تخلیق کے تابع ہے جانوروں کی پیدائش آدمیوں کے فائدہ ہی کے لئے ہوئی ہے اللہ نے فرمایا ہے: خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْ سَبْ حَيْثُ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ نَفْسٌ مِّنْ شَيْءٍ مِّنْ دَابَّةٍ مِّنْ دَابَّةٍ مِّنْ الْأَرْضِ مِمَّا يَحْمِلُونَ كُلًّا مِّنْهُنَّ لِيَحْمِلْنَ أَثْقَالَهُنَّ فِي ظُلُمٍ لَّيَالٍ مِّنْهُنَّ لِيَخْرِقْنَ مِنْهُنَّ مَاءً طَيِّبًا لِيَسْقُوا فِيهَا مَاءً غَدَقًا لِيَشْرَبُوا مِنْهُ وَمِنْهُ يَخْرُونَ ۝۱۰۱

قائد نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ ایسا حضرت نوحؑ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی میں جو جاندار چڑھ گئے وہ بچ گئے باقی ہلاک کر دیئے گئے بیہوشی کی روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے ظالم صرف اپنے نفس کو ہی ضرر پہنچاتا ہے (اس کے ظلم کی سزا کسی دوسرے پر نہیں پڑتی) حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کیوں نہیں خدا کی قسم (ضرور ایسا ہوتا ہے) یہاں تک کہ ظالم کے ظلم کی پاداش میں چڑیاں اپنے آشیانوں میں بھوکی مر جاتی ہیں۔

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے (شعب الایمان میں) حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے جنجل (ایک خاص کیرا) اپنے سوراخ میں عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر کافروں کے آباء و اجداد کو ان کے ظلم کی پاداش میں فوراً پکڑ لیتا تو نسل ہی منقطع ہو جاتی ان کی اولاد بھی زندہ نہ بچتی اور زمین پر کوئی باقی نہ رہتا۔ اسی لئے حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے لئے اس وقت تک بددعا نہیں کی جب تک وحی کے ذریعہ سے ان کو معلوم نہ ہو گیا کہ موجودہ کافروں کی نسل بھی کافر ہی پیدا ہوگی۔

وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۱۰۱
 لیکن (اپنے حکم کی وجہ سے) ظالموں کو ایک معیار معین تک اللہ مہلت دے رہا ہے (یعنی توبہ کے لئے اس نے عذاب ٹال رکھا ہے) پھر جب ان کا وقت معین آئے گا اس وقت منٹ بھر نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ (مقررہ وقت سے) آگے بڑھ سکیں گے (یعنی وقت معین سے تھوڑی دیر کی تاخیر بھی نہ ہوگی)۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْفُرُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكٰذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۗ لَا جَرَءَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ۝۱۰۲
 اور اللہ کے لئے وہ باتیں تجویز کرتے ہیں جن کو خود اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں اور اپنی زبانوں سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے ہر طرح کی بھلائی ہے لازمی بات ہے کہ ان کے لئے دوزخ ہے اور بلاشبہ وہ لوگ سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

مَآ يَكْفُرُوْنَ، جو خود پسند نہیں کرتے جیسے لڑکیاں، ریاست اور سرداری میں کسی کی شرکت، حقیر ترین مال میں بھی کسی کا ساجھا وغیرہ۔ الحسنى، ایمان نے کہا الحسنى نے مراد ہے جنت۔ کافر کہتے تھے کہ محمد ﷺ کے قول کے مطابق اگر قیامت ہوئی بھی تو ہمارے لئے جنت ہوگی۔ لَا جَرَءَ کاترجمہ ہے یقیناً قطعاً یقیناً نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا

کیوں نہیں۔

میں کہتا ہوں، اس ترجمہ کی بناء اس امر پر ہے کہ لاجرم کے لاکو نافیہ قرار دیا جائے اور اس سے گزشتہ خیال کی تردید مقصود ہو پہلے بیان کیا تھا کہ کافروں کا خیال ہے کہ ان کے لئے جنت ہوگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اللہ نے اس کی تردید فرمادی اور پھر ان کے دوزخی ہونے کی صراحت فرمادی۔

مُفْرَطُونَ (افراط سے اسم مفعول) قاموس میں ہے دوزخ میں چھوڑے ہوئے گویا دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے یا سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے گئے (ہم نے یہی ترجمہ کیا ہے) مترجم۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا ترجمہ کیا ہے دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے مقاتل نے کہا دوزخ میں چھوڑ دیئے گئے۔ قتادہ نے کہا دوزخ میں جلد بھیج دیئے گئے فراء نے کہا دوزخ میں سب سے پہلے بھیجے گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنَا فَرَطُكُمْ میں تمہارا پیش رو ہوں گا اور حوض پر سب سے پہلے پہنچوں گا۔ سعید بن جبیر نے ترجمہ کیا وہ (نجات و رحمت سے) دور کر دیئے جائیں گے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اٰمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمٰلَهُمْ اٰمَتِيں ہو گزری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا سو ان کو بھی شیطان نے ان کے (کفریہ) اعمال خوبصورت (پسندیدہ) بنا کر دکھائے لیسہم یعنی اکثر امتوں کو۔ اعمال سے مراد ہیں کفریہ اعمال، شرک باللہ اور پیغمبروں کی تکذیب۔ شیطان نے اعمال کفر کو ان کی نظر میں پسندیدہ بنا دیا اس لئے وہ اپنے برے اعمال پر جتھے رہے۔

فَهُمْ وَلِيَهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۳﴾ پس وہی شیطان آج (اس دنیا میں) ان (کفار قریش) کا بھی رفیق ہے اور قیامت کے دن ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ وَلِيَهُمْ کی ضمیر کفار قریش کی طرف لوٹ رہی ہے کلام کی رفتار کا یہی تقاضا ہے کفار قریش کے متعلق کلام کیا جا رہا ہے۔ "ولی" کا معنی ہے مددگار، رفیق، ساتھی، جو قریش کے برے اعمال کو اچھی شکل میں بنا کر دکھا رہا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی میں ان کا ساتھی اور مددگار ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَلِيَهُمْ کی ضمیر اُمم سابقہ کی طرف لوٹائی جائے اور گزشتہ حال کی حکایت قرار دی جائے یعنی شیطان اُمم سابقہ کا اس دنیا میں رفیق تھا اعمال کفریہ کو پسندیدہ بنا کر دکھاتا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ الْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہو اور آنے والے واقعہ کا بیان یعنی قیامت کے دن شیطان ان کافروں کا ساتھی ہوگا اور طوق و زنجیر میں ان کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا، پایہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن بس شیطان ہی ان کا رفیق ہوگا کوئی اور رفیق نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ شیطان اس روز خود اپنی مدد نہیں کر سکے گا تو ان کی مدد کیا کرے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مضاف محذوف ہو یعنی گزشتہ اقوام جیسے لوگوں کا رفیق یہاں شیطان ہی ہے مطلب یہ کہ کفار قریش گزشتہ امتوں کی طرح ہیں اور ان کا رفیق شیطان ہے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے یہ کتاب آپ پر صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ عام لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں اور خاص طور پر ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رحمت (بنا کر ہم نے یہ قرآن نازل کیا ہے۔)

اٰخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی توحید اللہ کی صفات، تقدیر، احوال قیامت، انسانی افعال (کی تخلیق) اور اللہ کے احکام کے بارے میں لوگوں کے جو مختلف خیالات ہیں۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَآحْيَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا۔ الارض سے مراد ہے زمین کا سبزہ زمین کو زندہ کیا، یعنی اس کو سبز اور نامی بنایا۔ زمین کی موت سے مراد ہے زمین کا خشک ہو جانا، روح نباتی سے خالی ہو جانا۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ كَسِبُوا ۖ
 غور و فکر کے کانوں سے سننے والوں کے لئے خشک، بے جان زمین کا پانی سے سرسبز و شاداب ہو جانا، احکامِ قیامت کی بڑی دلیل ہے۔

وَلَقَدْ لَكُمُ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةٌ ۗ
 اور (نیز) تمہارے لئے مویشیوں میں بھی غور درک کا ہے۔ عبرت سے مراد ہے ایسا غور جو جہالت سے نکال کر علم کی طرف لے جائے۔

نَسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَ دَمٍ لَبَنًا خَالِصًا يَتَّخِذُ الْشَّرْبِيبَ ۖ
 (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کامادہ) ہے اس کے درمیان میں سے صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔ بُطُونِهِ میں واحد مذکر کی ضمیر الْأَنْعَامِ کی طرف لوٹ رہی ہے الانعام اسم جمع ہے۔ لفظ کے اعتبار سے مفرد ہے۔ سبویہ نے اس لفظ کا شمار ان مفرد الفاظ میں کیا ہے جو بروزن افعال آتے ہیں جیسے اخلاق اور اکباش وغیرہ فراء، ابو عبیدہ اور اخفش کا بھی یہی قول ہے نعم اور انعام دونوں مفرد کے صیغے ہیں۔ مذکر و مؤنث دونوں طرح سے ان کا استعمال آیا ہے جس نے مؤنث استعمال کیا اس نے ان کے جمعیتی معنی کا لحاظ کیا ہے اور جس نے مذکر قرار دیا ہے اس نے لفظ کا لحاظ کیا ہے۔

کسانی نے بطونہ کی ضمیر کو ماکہ کی طرف راجع کیا ہے یعنی اس چیز کے پیٹ کے اندر سے جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا۔ مؤرخ نے کہا سب انعام کے پیٹ سے تو دودھ نہیں نکلتا اس لئے بعض مراد ہیں اور بعض ہی کی طرف بطور کنایہ ضمیر کار جوع ہے۔ بعض کے نزدیک جنس انعام مراد ہے اور جنس کی طرف ضمیر راجع ہے۔

فَرْثٍ وہ گوبر جو اوجھ کے اندر ہو۔ جب باہر آجاتا ہے تو اس کو فَرْث نہیں کہا جاتا۔ خالصاً سے یہ مراد ہے کہ خون اور گوبر کے اثرات سے خالص ہوتا ہے نہ اس میں خون کا رنگ ہوتا ہے نہ گوبر کی بو۔ باوجودیکہ دودھ کی پیداوار انہی دونوں چیزوں سے ہوتی ہے سائخ حلق میں آسانی سے اتر جانے والا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جانور چارہ گھاس کھاتا ہے تو کھایا ہوا چارہ انتڑیوں میں جا کر ٹھہرتا ہے پھر وہاں اس کی پسائی ہوتی ہے پسنے کے بعد اس کا نچلا حصہ تو گوبر ہو جاتا ہے اور بالائی حصہ خون اور درمیانی حصہ دودھ (دونوں کے درمیان دودھ پیدا ہونے کا یہی مطلب ہے) اور یہ سب کام جگر کے زیر تسلط ہوتا ہے جگر خون کو رگوں میں بہاتا ہے اور دودھ کو تھنوں میں اور گوبر کو وہیں باقی رکھتا ہے۔ جہاں وہ ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے شاید حضرت ابن عباسؓ کے کلام کی مراد یہ ہے کہ درمیانی حصہ دودھ کامادہ ہو جاتا ہے۔ اور بالائی حصہ خون کامادہ جو بدن کی غذا بنتا ہے اور اگر اس غذا کو جو انتڑیوں میں ہوتی ہے اس کا ہضم شدہ خلاصہ (کیلوس) اپنی طرف کھینچ لیتا اور فضلہ وہیں رہتا ہے جہاں ہوتا ہے (یعنی انتڑیوں میں) پھر کیلوس کو روک کر دوبارہ اس کو ہضم کرتا ہے (جس کے جوہر کو کیلوس کہتے ہیں) پھر چار اخلاط تیار کرتا ہے جن کے اندر مائیت ہوتی ہے پھر جگر کی قوتِ ممیزہ (مائیت کو چھانٹ کر الگ کرنے والی قوت) قدرِ ضرورت سے زیادہ پانی کو اخلاط سے الگ کر کے گردوں اور پتے اور طحال کی طرف روانہ کر دیتی ہے پھر باقی اخلاط کو تمام اعضاء کی طرف حسبِ ضرورت تقسیم کر دیتی ہے اس طرح ہر عضو کو قادر، حکیم، علیم کے زیر انتظام اس کا حق مل جاتا ہے پھر اگر حیوان مادہ ہے تو چونکہ اس کے مزاج میں برودت و رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے اس کے اخلاطِ غذائی ضرورت سے زائد ہوتے ہیں اور زائد حصہ جنین کی پرورش کے لئے رحم کی طرف چلا جاتا ہے اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کے بدن کی غذائی ضرورت سے تمام زائد حصہ یا اس کا کچھ حصہ تھنوں کی طرف چلا جاتا ہے اور سفید شیریں گوشت کے قرب کی وجہ سے سفید ہو کر دودھ بن جاتا ہے۔ اخلاط اور دودھ کی پیدائش کیسے ہوتی ہے، کن راستوں سے کس طرح کہاں جا کر یہ ٹھہرتے ہیں، ان کو پیدا کرنے والے اسباب کیا کیا ہیں، مناسب طور پر ہر وقت ان کی حالت کی تبدیلی کون سی قوتوں کی ممنون ہے جو شخص ان امور پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا اس کو صالح حکیم کی حکمتِ کاملہ اور قدرتِ تامہ کا اعتراف کرنا پڑے گا اور رحمتِ شاملہ

کو ماننا پڑے گا۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا

اور (نیز) کھجور اور انگوروں کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو (حضرت مفسر نے لکھا ہے) نُسَقِي فعل محذوف ہے اور ثمرات سے مراد ہے کھجور و انگور کا شیرہ، عرق۔ یعنی ہم تم کو پینے کے لئے شیرہ کھجور و انگور دیتے ہیں۔ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سے جملہ علیحدہ ہے یا مِنْ ثَمَرَاتِ کا تعلق تَتَّخِذُونَ سے ہے (اسی کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے) سُكْرُ نَشْءٍ اور چیز، یا مصدر ہے بمعنی صفت یعنی شراب قاموس میں ہے سَكِرَ (بے ہوش ہو گیا) ہوش کی ضد ہے سَكْرٌ، سَكْرٌ، سَكْرٌ، سَكْرٌ، سَكْرٌ ان یہ سب مصدر ہیں۔ سَكْرٌ بضم تین شراب اور اس نبیذ کو بھی کہتے ہیں جو کھجوروں اور کشمش سے اور ہر نشہ آور چیز سے بنایا جاتا ہے۔ اور سرکہ اور طعام کو بھی سکر کہا جاتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ سُكْرُوہ ہوتا ہے جو کھجوروں کے عرق سے بنایا جاتا ہے شریک بن عبد اللہ نے کہا اس آیت کی وجہ سے سکر کی اباحت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اللہ نے بطور احسان و منت نئی سکر تیار کرنے کا ذکر کیا ہے اور حرام چیز کا ذکر بطور احسان نہیں کیا جاسکتا ہماری دلیل یہ ہے کہ سکر کی حرمت پر صحابہ کا اجماع ہے۔ رہا آیت کا جواب تو (یہ آیت مکی ہے) اس کا نزول اس وقت ہو جب ہر طرح کی پینے کی چیز حلال تھی۔ انتہی کلامہ۔

بغوی نے لکھا ہے کچھ لوگوں کا قول ہے کہ سُكْرُ شَرَابِ ہے اور رزقِ حسن سرکہ، رُب، چھوڑے اور کشمش۔ اور یہ حکم تحریمِ خمر سے پہلے کا ہے (یعنی اس آیت کا نزول حرمتِ شراب سے پہلے ہوا تھا) یہ قول حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، سعید بن جبیر، حسن اور مجاہد کا ہے بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ سُكْرُوہ پھل ہیں جو حرام کر دیئے گئے اور رزقِ حسن سے مراد حلال پھل ہیں (شاید حضرت ابن عباس کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جو عرق یا نبیذ پھلوں کا حرام کر دیا گیا ہے وہ سکر ہے اور جو عرق یا نبیذ حلال رکھا گیا وہ رزقِ حسن ہے، مترجم) ابو عبیدہ نے کہا سکر سے مراد ہے کھانا۔ عرب بولتے ہیں ہذا سکر لک یہ آپ کا کھانا ہے۔ شعبی، سکر سے پینے کی چیز مراد ہے اور رزقِ حسن سے کھانے کی چیز۔ عوفی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب شی زبان میں سکر سرکہ کو کہتے ہیں ضحاک اور نخعی کا قول ہے کہ جب شی زبان میں نشہ آور نبیذ کو سکر کہتے ہیں اور سکر چھوڑوں اور کشمش کے گاڑھے خیسانیدہ اور پکائے ہوئے عرق کا نام تھا۔ سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ آیت تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا مَنْسُوخٌ ہے انتہی کلام ابوغوی۔

ایک اور مقام پر بغوی نے لکھا ہے کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ شراب کے متعلق چار آیات نازل ہوئی تھیں۔ آیت وَ مِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد مسلمان شراب پیتے رہے۔ شراب اس زمانہ میں حلال رہی اس کے بعد مدینہ میں آیت يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ نازل ہوئی اس کے کچھ زمانہ کے بعد آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ نازل ہوئی اور سب سے آخر میں سورہ مائدہ والی آیت نازل ہوئی (جس میں شراب کی قطعی ابدی حرمت ہو گئی) چاروں آیات کے نزول کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیت وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۴۶﴾ بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں یعنی آیات میں غور و فکر کرنے کا کام اپنی عقلوں سے لیتے ہیں۔

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿۴۷﴾

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو بعض پہاڑوں میں گھر بنالے اور بعض درختوں میں بھی اور لوگ جو چھتیں بناتے ہیں ان میں بھی۔ وحی کرنے سے مراد ہے الہام کرنا اور دل میں ڈالنا۔ يعرشون سایہ کے گھروں کی چھتیں بناتے ہیں یا عرش سے مراد ہے انگوروں کی ٹٹیاں۔ عرش کا لغوی معنی ہے چھت۔ من الجبال اور من الشجر اور

مما یرشون میں من تبعیضیہ ہے کیونکہ سب پہاڑوں میں اور سب درختوں میں اور سب چھتوں اور انگوروں کی ٹٹیوں میں شہد کی مکھیوں کے چھتے نہیں لگتے ہیں نہ ہر جگہ چھتا ہوتا ہے نہ بعض پہاڑوں اور بعض درختوں وغیرہ میں بعض جگہ چھتے لگتے ہیں شہد کی مکھی کے چھتے کو مکان کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی مکان کی طرح مکھیوں کے چھتوں میں بھی تمام ضروری حصے ہوتے ہیں ان میں بھی متعدد کمرے، چھتیں اور دروازے ہوتے ہیں اور وہ بھی حسنِ صنعت کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں کہ سوائے کسی ماہر انجینئر کے اور کوئی انسان بھی نہ ایسا نقشہ بنا سکتا ہے نہ ایسی تعمیر کر سکتا ہے۔

ثُمَّ كَلَّمِي مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ فَاسْتَلِكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا
پھر ہر قسم (یعنی ہر ضروری اور مناسب قسم) کے پھلوں کو چوس اور پھر اپنے رب کے راستوں پر چل جو آسان ہیں۔

الشمرات میں الفلام جنسی ہے اور لفظ کل استغراقی نہیں ہے بلکہ ہر مرغوب اور مناسب پھل مراد ہے یعنی ہر قسم کے مناسب پسندیدہ اور میسر آجانے والے پھلوں کا عرق چوس لے خواہ میٹھے ہوں یا کڑوے۔

سُبُلَ رَبِّكِ یعنی ان راستوں پر چل کر شہد تیار کر جو تیرے رب نے تجھے بتادیئے ہیں اور فطری طور پر تجھے سکھا دیئے ہیں اور جب دور دور کے پھولوں کا رس چوس کر اپنے گھر کو لوٹے تو اپنے رب کے بتائے ہوئے راستوں پر لوٹنا، راستہ نہ بھول جانا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے ایسے راستوں پر چلنا کہ تیرے پیٹ کے اندر پھلوں اور پھولوں سے چوسا ہوا عرق شہد بن جائے۔

ذُلُلًا یعنی وہ راستے اللہ نے تیرے لئے آسان کر دیئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت میں لگی رہنا اور حکم کے زیر اثر راستوں پر چلنا کہنے والے کہتے ہیں کہ مکھیوں کے سردار تمام مکھیوں کو ساتھ لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہو جاتے ہیں اور سب مکھیوں کا ایک بادشاہ ہوتا ہے جس کو یعسوب کہا جاتا ہے۔ جب وہ کہیں سے چل دیتا ہے تو سب مکھیاں چل دیتی ہے اور جہاں کہیں وہ رک جاتا ہے تو سب ٹھہر جاتی ہیں۔

بَخْرٍ مِّنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ
اس کے پیٹ میں سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں یعنی سرخ بھی ہوتا ہے سفید بھی زرد بھی اور سبز بھی۔

فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ط
کہ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ مجاہد نے فیہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے یعنی قرآن میں لوگوں کے لئے شفاء ہے، لیکن آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ شہد کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی شہد میں شفاء ہے۔ یعنی بعض امراض کے لئے۔ بعض حالات میں شہد کے اندر شفاء ہے شفاء نکرہ ہے، کلام موجب ہے، اس لئے تم فی الجملہ ہے یعنی بعض امراض کے بعض حالات میں شفاء ہے۔

ایک شبہ

بعض حالات میں بعض امراض کے لئے شفاء تو ہر چیز میں ہے یہاں تک کہ زہر میں بھی بعض امراض کے لئے شفاء ہے شہد ہی کی کیا خصوصیت ہے۔

ازالہ

شفاؤہم میں تنوین عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یعنی شہد میں اکثر امراض کے لئے شفاء عظیم ہے حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو شفاؤں کو اختیار کرو۔ شہد اور قرآن (اول میں شفاء جسمانی ہے اور دوسرے میں شفاء اخلاقی و روحانی) رواہ ابن ماجہ والحاکم بسند صحیح۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ شہد میں شفاء غالب ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض امراض کے لئے تو شہد تنہا شفاء ہے اکثر بلغمی امراض میں مفید ہے اور بعض امراض کے علاج میں دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر شہد مفید صحت ہے، ہر معجون کا جزاً عظیم شہد ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور

عرض کیا میرے بھائی کو اس سال کی شکایت ہے۔ فرمایا شہد پلاؤ۔ حسب الحکم اس شخص نے شہد پلایا (کچھ فائدہ نہ ہوا) وہ پھر خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور میں نے شہد پلایا تھا، شہد سے اور اس سال میں اضافہ ہو گیا۔ فرمایا اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا۔ اس نے جا کر پھر شہد پلایا اور مر یض اچھا ہو گیا اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ (پیٹ کے) بعض امراض کے لئے تنہا شہد شفا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خلوص اور حسن نیت سے جو شخص تنہا شہد کا استعمال کرے گا اللہ اس کو شفا دے گا خواہ کوئی مرض ہو۔ کذا قال السیوطی۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر قسم کے شہد کا ہر مرض کے لئے شفا دینا قرآن میں مذکور ہے نہ حدیث میں۔ ہر فصل کے شہد کی خاصیت جدا ہوتی ہے کس قسم کے پھلوں اور پھولوں کے عرق سے شہد تیار ہوا ہے اس کا لحاظ بھی موسم کے مطابق ضروری ہے۔ شہد کے علاوہ کوئی شفا بخش دوا ایسی نہیں کہ ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں کا خلاصہ کھینچ کر اس میں آگیا ہو ہر دوا کا ایک خاص مزاج اور خاصیت ہے شہد ہی ایک ایسی چیز ہے جو فصل کے اختلاف اور پھلوں پھولوں کے تنوع کے لحاظ سے اپنے اندر مختلف خاصیات رکھتا ہے پس شہد کا ہر مرض کے لئے شفا ہونا بجائے خود صحیح ہے لیکن مرض کی نوعیت کے لحاظ سے شہد کی نوعیت اور جن پھلوں اور پھولوں سے شہد بنا ہوا ان کی دریافت لازم ہے پھر شہد کے طریق استعمال اور مقدار استعمال کا بھی بڑا فرق ہے اگر طریق استعمال اور مقدار ضروری کا علم نہ ہو تو اس سے شہد کے شفا بخش ہونے کی نفی نہیں کی جاسکتی ہر شہد ایک کیفیت کا بھی حامل نہیں ہوتا، کسی میں گرمی زیادہ ہوتی ہے کسی میں کم، بعض شہد فالج، لقوہ، اور بڑے بڑے اعصابی امراض میں بہت مفید ہوتے ہیں اور بعض کم مفید اور بعض بالکل فائدہ نہیں دیتے۔ اس سال کو روکنے کے لئے بھی شہد مفید ہوتا ہے اور جالای کرنے کے لئے بھی۔ فاسد مادہ کو باہر نکال کر پھینک دیتا ہے اور فاسد غذائی مادہ کو نکال پھینکنے کے بعد قبض بھی کر دیتا ہے۔ غرض شہد مقوی بھی ہے مفرح بھی، اچھی غذا بھی ہے اور عمدہ دوا بھی۔ جو اور جتنے فوائد شہد کے اندر ہیں وہ دنیا کی کسی چیز کے اندر نہیں ہیں۔ حقیقت میں شہد مجمع الأضداد ہے)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ﴿۹۹﴾
اس میں بھی ان لوگوں کے لئے (اللہ کی قدرت، حکمت اور وحدانیت والوہیت کی) بڑی دلیل ہے جو غور کرتے ہیں جو شخص مکھیوں کی اس صنعتی مہارت اور عجیب پُر حکمت نظم پر غور کرے گا اس کو صاف نظر آجائے گا کہ یہ سب کار فرمائی اور عجب زانی درپردہ کسی قادر حکیم کی ہے وہی مکھیوں کے دل میں یہ تدبیریں ڈالتا ہے اور ترکیبیں بتاتا ہے۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمِهِ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿۱۰۰﴾

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہ ہی تمہاری جانیں قبض کرتا ہے (بچپن میں یا جوانی میں یا متوسط عمر میں یا بڑھاپے میں) اور بعض تم میں سے وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جاتا ہے بے شک اللہ بڑے علم اور بڑی قدرت والا ہے۔

أَرْذَلِ الْعُمُرِ، بدترین عمر، ناکارہ عمر، انتہائی بڑھاپا۔ قتادہ نے کہا، ارذل عمر نوے سال ہے حضرت علیؑ نے فرمایا پچھتر برس ارذل عمر ہے۔ بعض نے اتنی برس کی عمر کو ارذل عمر کہا ہے، رسول اللہ ﷺ اپنی دعائیں فرماتے تھے اے اللہ! میں بڑی عمر سے تیری پناہ لیتا ہوں، دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اے اللہ میں تیری پناہ کا طالب ہوں کہ مجھے ارذل عمر تک پہنچایا جائے۔ چین وغیرہ میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے باخبر ہونے کے بعد بے خبر ہو جانے کا یہ مطلب ہے کہ تمام معلومات کو بھول جائے اور بچوں کی طرح نادان اور ضعیف الفہم ہو جائے۔ عمر مہ نے کہا جو قرآن (ہمیشہ) پڑھتا ہے وہ اس حالت پر نہیں پہنچتا۔ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ یعنی اللہ لوگوں کی عمروں کی مقداروں سے خوف واقف ہے اور ہر چیز پر قادر ہے پیر فر تو ت کو کبھی چھوڑتا اور جو ان قوی کی جان قبض کر لیتا ہے اس آیت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کے احوال کا اختلاف و تفاوت اللہ حکیم و علیم کے اندازے کے مطابق اور اس کی مشیت کے موافق ہے طبعی اور خود بخود نہیں ہے اگر طبعی اقتضا ہوتا تو اس حد تک نہ

ہوتا (کہ عالم صغیر ہونے کے بعد آدمی قطعاً بے خبر ہو جائے کہ باوجود بیماری نہ ہونے کے محض ترقی عمر کی وجہ سے بچہ کی طرح ہو جائے اور علم و عمل سے بے خبر ہو جائے)

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۗ اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے۔ کوئی مالدار ہے، مالک ہے، بادشاہ ہے، ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرتا ہے کوئی نادار فقیر غلام اور ادنیٰ فوجی ہے۔ ایک روپیہ بھی صرف نہیں کر سکتا۔

فَمَا لِلدِّينِ فَضْلًا وَلَا بَرًا إِلَّا سِيْرًا قَصِدًا عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ

سو وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس مال میں برابر ہو جائیں۔ یعنی مالداروں اور بادشاہوں کو اللہ نے جو زیادہ مال عطا کیا وہ اپنا زائد مال اپنے غلاموں اور خادموں کو اتنا دینے والے نہیں کہ آقا اور غلام اور بادشاہ و فقیر سب مال میں برابر ہو جائیں۔

اس آیت سے مشرکوں کے شرک کی تردید مقصود ہے مشرک اللہ کے ساتھ مخلوق کی الوہیت و معبودیت میں شریک قرار دیتے تھے باوجودیکہ ان کے فرضی معبود کسی چیز میں اللہ کے شریک نہیں بن سکتے تھے اللہ خالق ہے اور اس کے سوا ہر چیز مخلوق، اللہ مالک ہے اور ہر چیز اس کی مملوک، اللہ حاکم ہے اور ہر چیز اس کی محکوم کوئی مخلوق اس کی ہم جنس نہیں۔ اس کے مشابہ نہیں نہ ذات میں نہ صفات میں نہ کسی کیفیت و حالت میں مترجم۔ مشرک خود تو اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اپنے مال میں اپنے غلاموں کو مساویانہ شریک کر لیں باوجودیکہ غلام و آقا دونوں ہم جنس ہوتے ہیں اور آقا کے پاس خدا داد مال ہوتا ہے اور آقا اپنے غلام کا رازق نہیں ہوتا رزق اس کو بھی خدا دیتا ہے۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ زائد رزق عطا فرمادیتا ہے وہ اپنا رزق غلاموں کو نہیں دیتے بلکہ غلام اپنا رزق کھاتے ہیں جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا ہے پس اس رزق میں مالک و مملوک سب برابر ہیں، سب خدا اور رزق کھاتے ہیں۔

أَفِدْنِعْمَةَ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ﴿۱۱﴾ کیا پھر بھی خدا کی نعمت کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ کے شریک قرار دیتے ہیں۔ شرک کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی بعض نعمتوں کا انکار کیا جائے اور ان کو شریکوں کی عطا کردہ قرار دیا جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ایسے واضح دلائل و براہین سے اپنی توحید و الوہیت کو ثابت کر رہا ہے اور یہ دلائل توحید اللہ کی نعمت ہیں تو کیا یہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

أَنْفُسِكُمْ أَسْرًا وَاجِبًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَسْرٍ وَأَجْكُمُ بَنِينَ وَحَفَدًا ۗ اور اللہ ہی نے تم میں سے (یعنی تمہاری جس میں سے) تمہارے لئے تمہاری بیبیاں بنائیں اور بیبیوں سے تم کو بیٹے پوتے عنایت کئے۔ تمہاری جنس سے تمہاری بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان سے اُنس خاطر حاصل ہو اور تمہاری اولاد تمہاری جنس کی ہی ہو (یعنی آدمی ہو)۔

بعض علماء نے جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے حضرت حوا کو حضرت آدم سے پیدا کیا پھر باقی تمام عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے نطفہ سے بنایا۔

حَفَدًا اولاد کی اولاد اور تیز دست خادم۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے حَفَدٌ ماضی حَفَدَ (مضارع) حَفَدًا اور حَفَدَانًا (مصدر) کام میں تیزی کی بسکدستی سے کام کیا۔ اِحْتَفَدَ (باب افعال) کا بھی یہی معنی ہے حَفَدٌ کا معنی خَدَم بھی ہے (خدمت کی) حَفَدَةُ احفاد کی جمع ہے خادم کار گزار۔ حَفَدَةٌ اور حَفِيدٌ اولاد، اولاد کی اولاد، خسر اور لڑکیاں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود اور نخعی نے فرمایا (آیت میں) حَفَدَةٌ سے مراد ہیں دہا دوسری روایت میں حضرت ابن مسعود کا قول آیا ہے کہ حَفَدَةٌ سے مراد ہے خسر۔ اس قول پر آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ اللہ نے تمہاری بیبیوں سے تم کو زماہ اولاد عطا کی اور ان کے نکاح کر دینے سے خسر کا دہا تمہارے لئے مقرر کئے۔ عکرمہ، حسن اور ضحاک نے کہا آیت میں خادم مراد ہیں۔ مجاہد نے کہا کار گزار کا نندے مراد

ہیں عطا نے کہا وہ اولاد مراد ہے جو مددگار اور خادم ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کی بناء پر آیت میں حَفَدَةٌ سے مراد ہیں بیٹے اور بَنِينَ پر حَفَدَةٌ کا عطف و صفی تغایر کی وجہ سے کیا گیا (بَنِينَ میں نسبی حالت اور حَفَدَةٌ میں خدمت کی حالت ملحوظ رکھی گئی) بیضاوی نے متعدد توجیہات میں سے ایک توجیہ (حسب مذکورہ بالا) لکھی ہے۔

مقاتل اور کلبی نے کہا بنین سے چھوٹے بچے اور حَفَدَةٌ سے بڑی اولاد مراد ہے جو چھوٹے بچوں کی خدمت کرتی اور ان کی مدد کرتی ہے قیادہ نے کہا وہ اولاد مراد ہے جو تمہاری خدمت اور کام کاج کرتی ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ حَفَدَةٌ سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اپنی بیوی کے بچے مراد ہیں جو پہلے شوہر سے ہوں۔ میں کہتا ہوں شاید حَفَدَةٌ کہنے کی وجہ تسمیہ اس صورت میں یہ ہو کہ (حَفَدَةٌ لغت میں خادموں کو کہتے ہیں اور) بیوی کے بچوں سے آدمی وہ کام لیتا ہے جو اپنی اولاد سے نہیں لیتا اس لئے بیوی کے بچوں کو حَفَدَةٌ کہا گیا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ مجملہ دوسرے معانی کے آیت میں ایک مراد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حَفَدَةٌ سے مراد ہیں بیٹیاں گھروں کے اندر بیٹیاں ہی زیادہ کام کاج کرتی ہیں۔

وَسَرَفَكُمْ مِنَ الظَّالِمَاتِ
اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے پینے کو دیں۔ طیبات لذیذ چیزیں یا حلال چیزیں۔
مِنْ تَبَعِيضِهِ ہے، دنیا کی نعمتیں، آخرت کی نعمتوں کا نمونہ ہیں یہاں کل نعمتیں موجود نہیں ہیں۔

أَنْبَاءً بَاطِلًا يُؤْمِنُونَ وَبِعَمَلِهِمُ اللَّهُ هُمْ يَكْفُرُونَ ﴿۴۶﴾
مانتے رہیں گے اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہیں گے۔ یعنی بتوں کو نفع رساں سمجھتے رہیں گے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی نسبت بتوں کی طرف کرتے رہے گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا میرا اور کافر جن و انس کا ایک عظیم واقعہ (یعنی

عجیب معاملہ) ہے پیدا میں کرتا ہوں پوجا و سروس کی کی جاتی ہے رزق میں دیتا ہوں شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ "باطل" سے مراد ہے بکیر، سائبہ اور وصیلہ کی از خود باغواں شیطانہ تحریم (یہ تینوں قسمیں بحار انٹوں یا سانڈ ہوں کی عرب میں ہوتی تھیں۔ بعض کا گوشت کھانا اور سواری لینا اور بوجھ لادنا مشرکوں نے حرام کر رکھا تھا)

یعنی بکیر وغیرہ کی حرمت کا تو یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں اور اللہ کے حلال پاکیزہ رزق کی حلت کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نے کہا باطل شیطان ہے اور اللہ کی نعمت رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۴۷﴾
اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو ان کو نہ آسمان میں سے

رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے اور نہ کسی قسم کی قدرت رکھتی ہیں۔ آسمان سے رزق یعنی بارش اور زمین سے رزق یعنی سبزی (غلہ، پھل، ترکاری وغیرہ) اُخفش کے نزدیک شیاً بدل ہے اور رزقاً مبدل منہ اور رزق سے مراد ہے مرزوق (کھانے پینے پہننے کی چیز) یعنی وہ کسی چیز کے مالک نہیں نہ قلیل کے نہ کثیر کے، ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ فراء نے رزقاً کو مفعول مطلق کہا ہے اور شئیئاً کو مفعول بہ۔

لَا يَسْتَطِيعُونَ، کا یہ مطلب ہے کہ مالک بننے کی بتوں میں طاقت ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ بتوں کو کسی قسم کی بھی طاقت حاصل نہیں ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا يَسْتَطِيعُونَ کی ضمیر راجع کی جائے کافروں کی طرف یعنی کافروں میں باوجود زندہ ہونے کے مالک بننے کی طاقت نہیں ہے اور بت تو بے جان پتھر ہیں ان میں طاقت کیسے ہو سکتی ہے۔

فَلَا تَضُرُّوْا اللّٰهَ الْاَمْتَالَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۸﴾

پس تم اللہ کی

مثالیں مت گھرو۔ اللہ بلاشبہ (اشیاء کی حقیقت اور ضرب امثال کو) خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اللہ کی مثال بیان کرنے کی ممانعت اس وجہ سے کی کہ ضرب امثال نام ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینے کا اور اللہ کی ذات و صفات کا کسی کو (کامل) علم نہیں نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ کون کون سی صفات کا اطلاق اللہ پر ہونا درست ہے اور کون

کن صفات کے ساتھ اللہ کا متصف ہونا محال ہے ایسی حالت میں اللہ کو کسی چیز پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے غائب کو حاضر کے سانچے میں ڈھالنا کس طرح زیبا ہے۔ کوئی علت جامع اور وصف مشترک موجود نہیں ہے اللہ یعلم و انتم لا تعلمون کا یہ مطلب ہے کہ اللہ حقائق اشیاء سے واقف ہے اور تم ناواقف ہے اور تم ناواقف ہو یا یہ مطلب ہے کہ تم جو اللہ کی مثالیں بیان کرتے ہو اور قیاس چلاتے ہو اللہ کو اس کی غلطی کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ تمہاری تمثیلات فاسد ہیں اور تم کو اس کا علم نہیں اگر تم کو اپنے قول کی غلطی کا علم ہوتا تو تمثیلات بیان کرنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔

اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے (فرض کرو)

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ

ایک شخص تو غلام ہے جو کسی کا مملوک ہے خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

اللہ نے یہ مثال اپنی ذات اور دوسرے باطل معبودوں (کافرق واضح کرنے) کے لئے بیان کی ہے۔ مملوک سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ آزاد نہیں۔ یوں تو بھی لوگ آزاد ہوں یا غلام، اللہ کے بندے ہیں لایقدر علی شئی کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ غلام مکاتب نہیں ہے اور نہ اس کو لین دین کی آقا کی طرف سے اجازت دی گئی ہے (مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جس نے آقا سے معاہدہ کر لیا ہو کہ اتنا روپیہ کما کر جب میں تم کو دے دوں گا تو آزاد ہو جاؤں گا اور آقا نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہو)۔

وَمَنْ سَرَقْنَاهُ مِمَّا رَزَقْنَاهُ حَسَنًا فَهُوَ يَنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ

اور ایک شخص وہ ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے سو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح اور جتنا چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔

اللہ نے اس مثال میں باطل معبودوں کو اس غلام سے تشبیہ دی جو بے بس اور ہر قسم کا تصرف کرنے سے عاجز ہے کچھ بھی اس کو اختیار نہیں۔ اور اپنی ذات کو آزاد مالدار سخی آدمی سے تمثیل دی جو جیسا اور جتنا چاہتا ہے صرف کرتا ہے ظاہر ہے کہ صرف سے اس کو کوئی نہیں روک سکتا اور پوشیدہ خرچ سے کوئی مانع نہیں ہو سکتا۔ اس تمثیل سے شرک کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ جن بتوں کو اللہ کی اکوہیت میں شریک قرار دیا جاتا تھا وہ تو بے اختیار غلام سے زیادہ عاجز ہیں اور اللہ ہر آزاد یعنی سخی سے زیادہ مالک مال اور عطا کنندہ اور قوی و مختار ہے۔

ساری تعریفیں اللہ کے لائق ہیں۔ (اور یہ لوگ اہل کے

الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

منکر ہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں، یعنی اللہ ہی تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے لہذا وہی ہر ستائش کا مستحق ہے اس کے سوا اور کوئی نعمت دینے والا نہیں اس لئے کوئی دوسرا قابل ستائش نہیں۔ معبودیت کا استحقاق تو بجائے خود رہا۔

اکثر لوگ چونکہ جانتے نہیں نادانی کی وجہ سے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف سے منسوب کر دیتے ہیں اور غلط انتساب کی وجہ سے باطل معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ عبد مملوک کافر کی مثال ہے اللہ نے اس کو توفیق ہی نہیں دی کہ کوئی بھلائی کر سکے یا راہ خدا میں کچھ صرف کرے۔ ہر نقطہ خیر سے عاجز ہے اور مَنْ رَزَقْنَاهُ مِمَّا رَزَقْنَا حَسَنًا مَوْمِنٍ كِي مَثَلٍ هُوَ اللّٰهُ كِي رَاهِ مِيں جِس طَرَحِ چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

ابن جریج نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ عبد مملوک سے مراد ابو جہل ہے اور مَنْ رَزَقْنَاهُ سے مراد حضرت ابو بکر

صدیق ہیں۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ لَأَيْنَمَا يُوَجَّهُهُ لَأَيَاتٍ بَخِيلٍ

اور اللہ ایک (اور) مثال بیان کرتا ہے دو

آدمی ہیں ایک تو ان میں گونگا جو کوئی کام نہیں کر سکتا اپنے سر پرست کے لئے وبال جان ہے، اس کو جہاں بھی بھیجتا ہے کوئی کام ٹھیک کر کے نہیں لاتا۔

ابکم پیدا نئی گونا گوں نہ کچھ سمجھتا ہے نہ بول سکتا ہے لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ کم فہمی کی وجہ سے وہ نہ کسی صنعت پر قادر ہے نہ کسی کام کی تدبیر پر۔ کل بار ہے، وبال ہے مؤلہ یعنی اپنے سر پرست کے لئے (آقا مراد نہیں ہے) لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ یعنی کسی معمولی کام کو بھی ٹھیک کر کے نہیں لاتا یہ تشبیہ بتوں کی ہے جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ کچھ سمجھتے ہیں پوجنے والوں پر خواہ مخواہ کا بار ہے، پجاری خود ان کو اٹھاتے اور رکھتے ہیں اور سب بے سود۔ بت ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

ہَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٤٩﴾
 کیا یہ شخص اور ایسا شخص
 ہا، ہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستے پر چلتا ہو۔ یعنی جو شخص سلیم الطبع اور سمجھدار ہو خوب رواں سلیس گفتگو کر سکتا ہو۔ ہر کام ٹھیک اور پورا پورا کرتا ہو، لوگوں کو تمام اچھی باتیں سکھاتا ہو۔ غرض یہ کہ عدل (جو عفت، شجاعت اور حکمت کا مجموعہ ہے) کی تعلیم دیتا ہو اس گونگے ناکارہ بے وقوف کی طرح ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صراط مستقیم پر ہونے کا یہ معنی ہے کہ ہر مقصد کو سیدھے راستے پر چل کر حاصل کر لیتا ہو۔ مَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ سے اللہ نے اپنی ذات کی تمثیل دی ہے بعض علماء نے کہا اس سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ابکم سے کافر اور مَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مؤمن مراد ہے۔ یہ تمثیل کافر و مؤمن کی ہے۔

عطاء نے اس آیت کے (سبب نزول) کے ذیل میں بیان کیا کہ ابکم سے مراد ابی بن خلف ہے اور مَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد حضرت حمزہؓ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ ہیں۔ مقاتل نے کہا قبیلہ ربیعہ کا ایک شخص تھا جس کا نام ہاشم بن عمرو بن حارث تھا یہ رسول اللہ ﷺ کا سخت دشمن تھا اور بہت ہی شریر تھا اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آیت ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْأَرْضِ
 اور آیت زجلین احد ہما ابکم حضرت عثمان اور ان کے کافر غلام اُسید بن ابوالعیص کے متعلق نازل ہوئی۔ اُسید کو اسلام سے سخت نفرت تھی خود بھی کافر تھا اور دوسروں کو بھی اسلام سے اور ہر بھلائی، حسن سلوک اور خیر خیرات سے روکتا تھا۔ اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی ان سے واقف اللہ ہی ہے بغیر اس کے بتائے ہوئے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں۔ غیب و شہادت کے معنی کی تشریح ہم نے سورہ جن میں ذکر کی ہے۔

وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ
 اور قیامت کا معاملہ بس پلک جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی جلدی۔ یعنی وقوع قیامت کی سرعت اور سہولت پلک جھپکنے کی طرح ہے۔ قاموس میں لمح کا معنی نظر جھپکنا بیان کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ قیامت بس ایسی ہے جیسے بجلی نظر کو جھپک لے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لمح کا معنی ہے نظر کا حدقہ، چشم کے بالائی حصہ سے نچلے حصہ کی طرف لوٹنا۔ پلک جھپکنے سے کم وقت کو ظاہر کرنے کے لئے عرف عام میں کوئی لفظ نہیں اس لئے قیامت کے جلد اور سہولت آجانے کی تشبیہ پلک جھپکنے سے دی گئی۔
 اور ہوا اقرب کا یہ مطلب ہے کہ وقوع قیامت اس سے بھی جلدی ہے اللہ ساری مخلوق کو یکدم زندہ کر کے اٹھادے گا۔ گن کہتے ہی ہر چیز موجود ہو جائے گی دم کی کوئی مدت نہیں بیان کی جاسکتی۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول منکرین کے متعلق ہوا جو قیامت کے منکر تھے اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہوئے جلد سے جلد آجانے کے خواہش مند تھے۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾
 بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قابور رکھتا ہے۔ دنیا میں اس نے مخلوق کو رفتہ رفتہ زندگی عطا فرمائی اور قیامت کے دن سب کو یکدم زندہ کر دے گا دیکھو یہ اس کی قدرت ہی کا کرشمہ ہے کہ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ عَلِيمٌ
 اللہ نے ہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم (بے جان جمادات کی طرح) کچھ بھی نہیں جانتے اور اسی نے تم کو کان دیئے اور آنکھیں اور دل۔

سمیع سے مراد ہیں اسماع (اسم جنس بمعنی جمع) یعنی اللہ نے تم کو آلاتِ علم عطا کئے اول حواس کے ذریعہ سے تم جزئیات کا علم حاصل کرتے ہو پھر بار بار اور پے در پے احساس کرنے کے بعد تم دل سے اشیاء میں امتیاز کرتے ہو اشیاء مشترکہ کے اشتراک اور مجد اجد چیزوں کے اختلاف کو جان لیتے ہو، اس طرح تم کو کچھ بدیہی علوم حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور ان بدیہی علوم پر غور کرنے کے بعد تم کو نظری اور فکری علوم حاصل کرنے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۸﴾

تاکہ تم شکر کرو۔ یعنی آلاتِ علم اس لئے عطا کئے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو

پہچانو اور شکر ادا کرو۔

الْمَيِّرُوا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ

کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے نیچے فضا میں مسخر ہو رہے ہیں ان کو اللہ کے سوا (اس خلا

میں) کوئی نہیں تھامتا۔

مُسَخَّرَاتٍ یعنی بازو، پر وغیرہ اڑنے کے آلات اللہ نے ان کو عطا کئے جن کے ذریعہ سے وہ اللہ کے زیر فرمان اڑتے ہیں۔ جَوِّ السَّمَاءِ آسمان وزمین کی درمیانی ہوا۔ بغوی نے کعب الاحبار کا قول نقل کیا ہے کہ پرندے بارہ میل بلندی تک اڑ سکتے ہیں اس سے اوپر نہیں اڑ سکتے۔ (یعنی مسخر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ صرف بارہ میل کی بلندی تک ہی اڑنے کی ان میں طاقت ہے اس سے اونچا اڑنا ان کے لئے ناممکن نہیں)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ ایمان لانے والے لوگوں کے لئے اس میں بلاشبہ (اللہ کی

قدرت، حکمت اور الوہیت کی) بڑی نشانیاں ہیں یعنی اللہ نے پرندوں کی پیدائش ہی ایسی کی ہے کہ وہ ہوا میں اڑتے ہیں ان کے جسم بھاری ہوتے ہیں۔ نیچے کچھ سہارا اور ستون نہیں ہوتا۔ اوپر کسی چیز سے بندھے نہیں ہوتے پھر بھی ہوا میں رُکے رہتے ہیں طبعی تقاضا ہے کہ نیچے گر پڑیں بیچ میں کوئی ثقل مانع بھی نہیں پھر بھی نہیں گرتے، بس اللہ ہی ان کو تھامے رہتا ہے اور کون ایسا کر سکتا ہے ایمان والے اس پر غور کی نگاہ ڈالیں تو انہی کو اس عملِ تسخیر میں خدا کی قدرت نظر آئے گی اور وہ فائدہ اندوز بھی ہوں گے۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ

وَيَوْمَ رِقَامَتِكُمْ ۝

اور اللہ ہی نے تمہارے واسطے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور

تمہارے واسطے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی چرمی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے سفر اور قیام کے زمانے میں ہلکا پھلکا پاتے ہو۔ کھالوں کے گھروں سے مراد ہیں چرمی ڈیرے، خیمے، چھولدا ریاں یہ بھی ممکن ہے کہ اون اور بالوں سے بنے ہوئے ڈیرے خیمے بھی اس لفظ کے اندر شامل ہوں کیونکہ بال اور اون کھال کی پیداوار ہے لہذا چمڑے ہی کے حکم میں ہے یَوْمَ ظَعْنِكُمْ یعنی سفر کا زمانہ۔ یَوْمَ رِقَامَتِكُمْ یعنی یا کہیں اترنے کا وقت۔

وَمِنَ أَمْوَالِكُمْ وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۶۰﴾

اور ان کے اون

اور ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدے کی چیزیں بنائیں۔ صُوف (اون) بھینٹوں، دنبوں کا ہوتا ہے اور وبر اونٹوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور بال بکری سے۔ اثاث گھر کا سامان، فرش، بستر، چادر، کبیل، لباس، اثاث کا مفرد نہیں آتا۔ اثاث ہر طرح کے مال کو بھی کہتے ہیں کذافی القاموس۔ "متاع" سامان تجارتِ الیٰ حین یعنی اس مدت تک جب تک اللہ اس کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا

اور تمہارے لئے اللہ ہی نے اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں۔ یعنی درختوں پہاڑوں اور مکانوں کے سائے بنائے جو دھوپ کی تپش سے بچاتے ہیں اور پہاڑوں میں چھپنے اور محفوظ رہنے کے مقامات مثلاً غار اور غاروں

”ایک شبہ“ جس کا وہم کیا جاسکتا تھا۔

مشرک تو پہلے ہی سے منکر تھے اور **ثُمَّ يَنْكِرُونَ** میں **ثُمَّ** کا لفظ بتا رہا ہے کہ اعتراف و اقرار کے بعد وہ منکر ہوئے حالانکہ ایسا نہ تھا۔

ازالہ شبہ

ثُمَّ بعد زمان کو ظاہر کرتا ہے لیکن کبھی بعد مرتبہ کے لئے بھی آتا ہے پہچان لینے کے بعد انکار کرنا عقل سے بہت بعید تھا اس لئے **ثُمَّ** کا لفظ استعمال کیا گیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد و قتادہ نے کہا اللہ نے اس سورت میں جن نعمتوں کی تفصیل کی ہے کافر ان کو پہنچاتے تھے۔ پھر جب ان سے کہا گیا کہ اس بات کی تصدیق بھی کرو ان نعمتوں کو خدا داد تسلیم کر کے اللہ کے احکام کی تعمیل کرو تو اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے ہم کو تو یہ نعمتیں باپ دادا سے وراثت میں ملی ہیں۔

کلبی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے اقرار کیا اور کہا، ہاں، یہ نعمتیں اللہ ہی نے دی ہیں لیکن ہمارے معبودوں کی سفارش سے ملی ہیں۔ عون بن عبد اللہ نے کہا، نعمتوں کے انکار کا مطلب ہے ظاہر اسباب کی طرف نعمتوں کی حقیقی نسبت کر دینا مثلاً کوئی کہتا ہے، اگر فلاں بات ہوتی (یا فلاں شخص یا فلاں تدبیر ہوتی) تو یہ کام ہو جاتا یہ کام نہ ہونے پاتا (یہ الفاظ بظاہر مشرکانہ ہیں جن کی ممانعت ہے، مترجم)

اکثر ناشکرے ہیں نعمتوں کے اعتراف کے بعد محض ضد و عناد سے انکار کرتے ہیں اکثر سے مراد یا تو کل کافر ہیں یا اکثر ہی مراد ہیں۔ بعض ناقص العقل ہیں اس لئے حق کو پہنچاتے ہی نہیں یا کوتاہ نظر ہیں غور کرتے یا مکلف ہی نہیں ہیں (تابا لئ یا مجنون ہیں) اس لئے ان پر کوئی حجت ہی قائم نہیں ہوتی۔ بہر حال بعض لوگ ناپاس نہیں ہیں حکم مذکور سے مستثنیٰ ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا إِنَّهُمْ لَا يُؤْذَنُ لِلْكَافِرِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن ہر ہر امت میں سے ہر ایک ایک گواہ قائم کریں گے۔ پھر ان کافروں کو اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے اللہ کو راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی۔

شہید سے مراد پیغمبر ہے جو اپنی امت کے کفر و ایمان کی شہادت دے گا اجازت نہ دی جانے سے مراد ہے عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ملنا کیونکہ ان کے پاس کوئی عذر موجود ہی نہ ہو گا یہ مطلب ہے کہ بولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بعض نے کہا کہ دنیا میں واپس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ **وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ** یعنی ان سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کر لو۔ روزِ آخرت تو عمل کا دن ہی نہ ہو گا اور دنیا میں واپس جا کر توبہ و عمل کی اجازت نہ ہو گی غرض یہ کہ ان کے لئے اللہ کی رضامندی کا حصول ناممکن ہو گا۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۸۵﴾

اور جب ظالم (یعنی کافر) عذابِ جہنم کو دیکھیں گے تو وہ عذاب (اندر داخل ہونے کے بعد) ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ (داخل ہونے سے پہلے) ان کو مطلق مہلت دی جائے گی۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَائُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ؕ

اور جب مشرک اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں (یعنی بتوں) کو دیکھیں گے تو کہیں گے، وہ ہمارے (مفروضہ بنائے ہوئے) شریک یہی ہیں جن کو ہم تیرے سوا پوجتے تھے۔ یعنی یہ وہی معبود ہیں جن کی عبادت کرتے تھے یا جن کی اطاعت ہم کرتے تھے یہ مشرکوں کی طرف سے اپنی غلطی کا اعتراف ہو گا یا اس درخواست کا یہ مقصد ہو گا کہ ہمارا عذاب آدھا کر دیا جائے۔

الْأَبْصَارِ

گھدی یعنی گمراہی سے نکال کر سیدھا راستہ دکھانے والا ہے رَحْمَةً یعنی سب لوگوں کے لئے رحمت ہے اگر کوئی اس رحمت سے محروم رہا تو اپنی کوتاہی کی وجہ سے (حضرت مفسرؒ کی یہ تفسیر ہمارے ذکر کئے ہوئے ترجمہ کے خلاف ہے۔ ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے ماخوذ ہے جس میں قرآن کی ہدایت اور رحمت اور خوش خبری خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بتایا گیا ہے۔ اور حضرت مفسرؒ نے ہدایت و رحمت کو عمومی قرار دیا ہے اور بشارات کو صرف مسلمانوں کے لئے بتایا ہے۔ واللہ اعلم بہتر جم)

بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے عدل کا لفظ مساوات کا مقتضی ہے اللہ نے اسی لئے فرمایا ہے أَوْعَدَلُ ذَلِكَ صِيَامًا يَا اس کے برابر روزے وَأَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ اور یہ کہ عورتوں میں ہر طرح سے برابری رکھو۔ فدیہ اور بدلہ کو عدل اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ عدل کا حکم دیتا یعنی بدلہ میں مساوات رکھنے کا۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر اور اللہ حکم دیتا ہے کہ حاکم مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان مساوات کا سلوک کرے کسی ایک کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ جو کچھ فیصلہ کرے اللہ کے حکم کے مطابق کرے۔ اگر عدل کا معنی بدلہ دینے میں مساوات لیا جائے گا تو احسان کا یہ مطلب ہو گا کہ خیر کا بدلہ زیادہ اور بہتر بھلائی کی شکل میں دے اور شر کا بدلہ کم شر سے دے۔ خیر کے مقابلہ میں زیادہ بھلائی کرے اور برائی کے مقابلے میں کم برائی۔

(اور اگر عدل سے مراد مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان مساوات ہو تو احسان کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے) میں کہتا ہوں، عدل سے مراد استقامت علی الحق بھی ہو سکتی ہے یعنی کج روی اور جور کا مخالف مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے عدل، جور (کج روی) کی ضد ہے اور طبیعت کے اندر کسی چیز کے مستقیم ہونے کے خیال کے جماؤ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض علماء نے عدل کو بمعنی اعتدال کہا ہے یعنی ہر چیز میں توسط جیسے تعطل (اللہ کا تمام صفات سے خالی ہونا) اور شرک (اللہ کی صفات میں مخلوق کو شریک قرار دینا) کے درمیان توحید (صفائی) کا درجہ ہے (یعنی اللہ نہ صفات سے خالی ہے نہ اس کی صفات مخلوق میں پائی جاتی ہیں بلکہ وہ اپنی صفات کے لحاظ سے واحد لا شریک ہے) یا جیسے جبر و قدر کے درمیان کسب کا درجہ ہے (بندہ بالکل نہ مجبور ہے نہ اپنے افعال کا خود خالق اور قادر بلکہ کاسب ہے۔ خالق افعال اللہ ہے اور افعال کو کرنے والا بندہ) یا جیسے اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کا درمیانی درجہ کہ نہ عبادت خدا میں اتنا غرق ہو جائے کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ترک کر دے اور دنیا کو چھوڑ بیٹھے نہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جائے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی چھوڑ دے۔ واجب نفل کچھ ادا نہ کرے۔ یا جیسے سخاوت کہ بخل و فضول خرچی کے درمیانی درجہ کا نام ہے یا شجاعت کا جو احمقانہ سجاد لیری اور بزدلی کے درمیانی وصف کا نام ہے یا جیسے عفت کہ پاکدامنی کو کہتے ہیں زنا کاری بے حیائی اور جائز قربتِ صنفی کے ترک کے درمیان عفت کا درجہ ہے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عدل سے مراد) توحید ہے اور احسان سے مراد اداءِ فرائض۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے خالص توحید کا نام احسان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے (یعنی عبادت میں مشاہدہ رب کا درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھتے رہنا ہی چاہئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) رواہ عمر بن الخطاب کذافی الصحیحین

مقاتل نے کہا، عدل توحید ہے اور لوگوں سے درگزر کرنا احسان ہے۔ بعض علماء نے کہا عدل سے مراد فرض ہے اور احسان سے مراد نفل اگر فرض میں کوئی قصور آجاتا ہے تو نفل سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے (گویا نفل فرض ناقص کو حسین یعنی کامل بنا دینے والی چیز ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اللہ نہ اس کے صرف کو قبول فرمائے گا نہ عدل کو یعنی نہ نفل کو نہ فرض کو۔

وَأَيُّ نَجْوَى ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ
قرابتداروں کو دینے کا اور بے حیائی سے اور بری باتوں سے اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اور (حکم دیتا ہے)

قرابتداروں کو دینے سے مراد ہے حاجت روائی کرنا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا یعنی کنبہ پروری کرنا۔ فحشاء حد سے بڑھی ہوئی برائی (کھلی برائی) قولی ہو یا فعلی (سخت بری بات سخت، برا کام) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، الفحشاء یعنی زنا المنکر ہر برا کام جس کو شریعت نے برا قرار دیا ہو اور عقل سلیم بھی اس کو برا جانتی ہو۔ البغی تکبر اور ظلم۔ بیضاوی نے لکھا ہے فحشاء سے مراد ہے قوت شہوانیہ کے استعمال میں حد (اعتدال) سے آگے بڑھ جانا جیسے زنا انسانی احوال میں حد سے بڑھی ہوئی شہوانیت یعنی زنا بہت ہی بری حالت ہے منکر قوت غضبیہ کے ہیجان سے مغلوب ہو کر ایسا کام کرنا جو (عقلا و نقلا) برا ہے۔ البغی غرور، تکبر لوگوں پر جبر اور زبردستی، سب سے اونچا ہو جانا۔ یہ شیطنت قوت وہمیہ کا کرشمہ ہے انسان کی ہر برائی اور شرانہی تینوں اقسام میں سے کسی نہ کسی قسم کے ذیل میں داخل ہے اسی لئے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، قرآن مجید میں سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول سعید بن منصور نے الادب میں بخاری میں نے محمد بن منصور اور ابن جریر نے ابن المنذر ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ الادب میں بخاری نے اور امام احمد (ابن ابی حاتم و طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہی آیت حضرت عثمان بن مظعونؓ کے مسلمان ہو جانے کا سبب ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے کہا ظاہر و باطن برابر ہو جانا عدل ہے باطن کا ظاہر سے اچھا ہونا احسان ہے اور ظاہر بہ نسبت باطن کے اچھا ہو تو یہ فحشاء اور منکر ہے۔

اللہ تم کو اس لئے نصیحت کر رہا ہے کہ تم نصیحت قبول کرو۔ یعنی بَعْظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾
امروئسی (کی پابندی) اور اچھائی برائی میں تمیز کرنے کی نصیحت اللہ تم کو کرتا ہے تاکہ تم اس کو مانو اور اس پر کار بند ہو۔ بیضاوی نے لکھا ہے اگر قرآن میں اس آیت کے سوا کوئی اور آیت ہی نہ ہوتی تب بھی قرآن کو تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ کہنا صحیح ہوتا۔

بغوی نے ایوب کا قول نقل کیا ہے کہ عکرمہؓ نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت ولید کو سنائی تو ولید بولا بھتیجے ذرا اس کو دوبارہ پڑھو۔ حضور ﷺ نے دوبارہ تلاوت فرمائی ولید کہنے لگا خدا کی قسم اس میں عجیب شیرینی اور ایک خاص حسن ہے (یہ کھجور کے درخت کی طرح ہے) اس کا بالائی حصہ (یعنی ظاہر) ثمر آفریں اور نچلا حصہ (یعنی باطن) خوشوں سے بھرا ہوا ہے یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا

اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم اس عہد کو (خصوصاً عموماً) اپنے ذمے لے لو اور قسموں کو مضبوط کرنے کے بعد توڑو اور تم تو خود (اپنی قسموں) پر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو۔ عہد پختہ اقرار۔ ابن جریر نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے بیعت لینے اور رسول اللہ ﷺ نے بیعت کرنے کے متعلق نازل ہوئی بغوی نے لکھا ہے عہد اس جگہ بمعنی قسم ہے شعبی نے کہا (اس جگہ) عہد بمعنی قسم ہے اور اس کو توڑنے کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے الایمان یعنی بیعت کے عہد یا عام قسمیں بعد توکید یا یعنی اللہ کا نام لے کر قسموں کو پختہ کرنے کے بعد کفیل یعنی بیعت کا گواہ۔ کفیل جس چیز کی کفالت کرتا ہے اس کی نگرانی رکھتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۱۱﴾
جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے یقیناً واقف ہے یعنی عہد پورا کرو یا توڑو اللہ سب سے واقف ہے مجاہد نے کہا، اس آیت کا نزول حلف جاہلیت کے متعلق ہوا (یعنی اسلام کے دور سے پہلے جو لوگ باہم محالے کرتے تھے اس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی) اس کے بعد آیت ذیل میں عہد شکنی کی مثال دے کر سمجھایا ہے فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ غَزَاهُمْ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا
عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت کا تنے کے بعد ریزہ ریزہ کر کے نوچ ڈالا۔

عَزَل بَنَاتٍ، كَاتِنًا، مَضْبُوطًا، كَرَنًا، اِنْكَاتٍ، نِكْثٍ كِي جَمْعُ رِيْزَةٍ رِيْزَةٌ سَارَةٌ يَلُّ كَهْلَةً هُوَ۔

ابن ابی حاتم نے ابو بکر بن ابی حفص کا بیان نقل کیا ہے کہ (مکہ کی ایک عورت) سعیدہ اسدیہ یا گل تھی بال اور کھجور کی چھال کے ریشے جمع کرتی تھی اسی کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی یعنی نے لکھا ہے کہ کلبی اور مقاتل نے کہا کہ ربطہ بنت عمر بن سعد بن کعب بن زید بن مناتہ بن تمیم ایک الٹریو قوف عورت تھی۔ اس کا لقب جعر تھا۔ اس کے دماغ میں کچھ خرابی تھی اس نے ایک چرخہ ہاتھ بھر کا اور اس میں ایک میخ انگل بھر کی اور مڑا کہ بہت بڑا بنا رکھا تھا (روز) وہ اون روئیں اور بالوں کی کتابی کرتی تھی اور اپنی باندیوں سے بھی کتواتی تھی سب مل کر دوپہر تک کاتتی تھیں دوپہر کو وہ سب کا کاتا ہوا دھاگہ کھول ڈالتی تھی (اور ریزہ ریزہ کر دیتی تھی) یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اس پس منظر میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ عورت جو کاتنے کا کام برابر کرتی تھی کاتنا ترک نہیں کرتی تھی اور کاتنے کے بعد کتے ہوئے سوت کو توڑنے سے باز نہیں رہتی تھی تم اس کی طرح نہ ہو جاؤ یا تو عہد ہی نہ کرو اور کرو تو اس کو پورا بھی کرو۔ ہر مرتبہ معاہدہ کر کے اس کو نہ توڑو۔

تَتَّخِذُونَ اٰيْمَانَكُمْ دَخْلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ

(کہ اس طرح) تم بھی اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو۔ محض اس وجہ سے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ ”دخْلٌ“ بگاڑ، دھوکہ، فریب، خیانت۔ ”دخْلٌ لغوی (ساخت کے) اعتبار سے اس چیز کو کہتے جس کو کسی دوسری چیز کے اندر اس کو خراب کرنے اور بگاڑنے کے لئے داخل کیا جائے۔ بعض علماء نے کہا دخل اور دخل یہ ہے کہ ظاہر میں تو وفا عہد کرے اور باطن میں اس کو توڑ دے۔ اربی تعداد اور مال میں زیادہ۔ مجاہد نے کہا (دور جاہلیت میں) عرب کا دستور تھا کہ ایک قبیلہ یا ایک جماعت دوسری جماعت سے باہمی امداد کا تقسیم معاہدہ کر لیتی تھی (یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کی حلیف ہو جاتی تھی) دونوں کا معاہدہ بحلف ہو جاتا تھا) لیکن ان دونوں قبیلوں میں سے کسی کو اپنے حلیفوں کی دشمن جماعت زیادہ طاقت ور یا مالدار نظر آتی تھی تو اپنے حلیفوں سے غداری کر کے حلیفوں کے دشمنوں سے جا کر مل جاتے تھے اور ان سے مخالفہ کر لیتے تھے۔ مجاہد کی تشریح کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ کمزوروں سے عہد شکنی کر کے طاقتوروں سے تم معاہدے کر لیتے ہو۔ محض اس لئے کہ تم کو غلبہ اور طاقت حاصل ہو جائے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ تم اپنی قسموں کو فساد کا ذریعہ صرف اس وجہ سے بنا لیتے ہو کہ تمہارا ایک گروہ دوسرے ہم معاہدہ گروہ سے تعداد اور مال میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے طاقت ور گروہ کو معاہدہ شکنی کی کوئی پروا نہیں ہوتی جس طرح قریش نے حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں سے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے قریش کی تعداد زیادہ ہے اور مالی طاقت بھی بڑھ کر ہے اس لئے دو ہی سال میں معاہدہ توڑ دیا۔

اِنَّهَا يٰۤاَيُّهَا اللّٰهُ بِهٖٓ وَكَيْبِسِنِّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

پس اس سے اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے قیامت کے دن ان سب کو تمہارے سامنے عملاً ظاہر کر دے گا۔

یعنی ایک جماعت کو دوسری جماعت سے بڑا اور برتر کر کے اللہ جانچ کرتا ہے کہ یہ جماعتیں اللہ سے کئے ہوئے عہد اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہتی ہے یا مؤمنوں کی قلت اور قریش کی کثرت و شوکت دیکھ کر توڑ دیتی ہیں۔ اور دنیا میں کئے ہوئے اختلافی امور کا فیصلہ جب قیامت کے دن اللہ کرے گا اور ہر ایک اعمال کا بدلہ دے گا تو جن لوگوں نے عہد کو پورا کیا ہو گا ان کو ثواب اور جن لوگوں نے وعدہ شکنی کی ہو گی۔ ان کو عذاب دے کر حقیقت کو ظاہر کر دے گا۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ

يَّشَاءُ ۗ وَلَسْتَ لَنْ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن (اس کی مشیت ہے) وہ جس کو چاہتا ہے بے راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ پر ڈال دیتا ہے اور (قیامت کے دن) تم

سے تمہارے اعمال کی ضرورت باز پرس ہوگی۔

ایک ہی طریقہ کا بنادینے کا مطلب یہ ہے کہ سب کو اسلام پر متفق کر دیتا اور سب و فاعمد کرنے والے ہو جاتے آپس میں اختلاف نہ رہتا۔ بے راہ کر دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو بے مدد چھوڑ دیتا۔ مدد نہ کرتا اور راہ پر ڈالنے کا معنی یہ ہے کہ اس کو ایمان و خیر کی توفیق دے دیتا۔ ہر شخص سے باز پرس لا جواب بنانے اور سزا جزا دینے کے لئے ہوگی۔

وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۰﴾

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ۔ کہیں (اس کو دیکھ کر کسی اور کا) قدم چمنے کے بعد نہ پھسل جائے اور اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے پھر تم کو تکلیف بھگتنا پڑ جائے اور (آخرت میں) تمہارے لئے بڑا عذاب ہو جائے۔
”دخل“ فساد دھوکہ۔ یعنی قسموں کو فریب دہی اور فساد انگیزی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ لوگ تمہارے معاہدات پر اعتماد کر لیں اور تمہاری طرف سے مطمئن ہو جائیں اور تم ان کو فریب دے کر قسمیں اور معاہدے توڑ دو۔

قدم چمنے کے بعد پھسل جانے کا مطلب یہ ہے کہ بے خوف اور مطمئن ہو جانے کے بعد تم ہلاک ہو جاؤ۔ عرب کا محاورہ ہے کہ عافیت کے بعد اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا سلامتی کے بعد کسی گڑھے میں گر پڑتا ہے تو کہتے ہیں اس کا قدم پھسل گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی بیعت اسلام کی شاہراہ تھی۔ بیعت پر قائم رہنا اور اس کو نہ توڑنا راہ اسلام پر برابر چلتے رہنے اور استقامت رکھنے کا نام تھا اور بیعت توڑ دینا لغزش قدم بھی تکلیف کا مزہ چکھنے سے مراد ہے دنیا میں تکلیف بھگتنا اور عذاب عظیم سے مراد ہے آخرت کا بڑا عذاب۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ شَيْئًا قَلِيلًا
اور تم لوگ عہد خداوندی (اور بیعت رسول) کے عوض (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو۔ یعنی اللہ سے کیا ہوا عہد اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت اور معاہدات اس لالچ میں نہ توڑ دو کہ دنیا کا کچھ مال تم کو مل جائے۔

إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لِّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۱﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ ط
جو کچھ (دنیوی اور آخروی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ (اس دنیا سے جس کے تم طلب گار ہو) تمہارے لئے بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا یعنی جو کچھ دنیوی مال و متاع تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور اللہ کی رحمت کے خزانے کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ یہ جملہ لَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ کی

علت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی دنیا کو پسند کرتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے اور جو آخرت کو پسند کرتا ہے وہ اپنی دنیا کا ضرر کرتا ہے تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی (دنیا) پر ترجیح دو (آخرت کو پسند کرو دنیا کی پرواہ مت کرو اور الہام پسند صحیح واحد)

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۲﴾
اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ہم ان کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔ یعنی جن لوگوں نے بیماری افلاس، کفار کی ایذا، پابندی احکام کی مشقت اور جہاد میں ڈٹے رہنے کی مصیبتوں پر صبر کیا اللہ ان کے صبر کا انکو ثواب عطا فرمائے گا اور اتنا ثواب دے گا کہ ان کے اعمال کے مقررہ اجر سے بہت اچھا ہو گا ہر نیکی کو سات سو گنا تک بڑھا دے گا اور اس سے بھی زیادہ جتنی اللہ کی مشیت ہوگی۔ بعض علماء نے کہا أَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ سے مراد فرائض اور مستحبات ہیں۔ ممنوعات اور مباحات سے فرائض و مستحبات بہر حال بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۗ

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) بالطف زندگی عطا کریں گے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۴﴾ اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا اجر عطا کریں گے۔

وہو مؤمن بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، ایمان کی شرط اس لئے لگائی کہ کافر کسی ثواب کے مستحق نہیں خواہ کیسے ہی اچھے اعمال کریں زیادہ سے زیادہ عذاب کی تخفیف کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک ثواب کا مدار خلوص اور حسن نیت پر ہے (یعنی محض خوشنودی خدا کے لئے ہونا ضروری ہے) اور کافروں کی نیکیوں میں یہ چیز مفقود ہے۔

حیاتِ طیبہ سے مراد سعید بن جبیر کے نزدیک رزقِ حلال ہے اور حسن کے نزدیک قناعت۔ مقاتل بن حبان نے کہا طاعت میں زندگی گزارنا حیاتِ طیبہ ہے۔ ابو بکر و راق نے کہا طاعت کی شیرینی پاکیزہ زندگی ہے بیضاوی نے کہا۔ پاکیزہ زندگی گزارنے والا اگر مالدار اور فراخ حال ہے تو ظاہر ہے اس کی دنیوی زندگی پاکیزہ ہوگی اور اگر تنگ دست ہے تو ظاہر ہے کہ قناعت کرے گا۔ تقسیمِ خداوندی پر راضی ہوگا اور آخرت میں اجرِ عظیم ملنے کا امیدوار ہوگا اس طرح اس کی زندگی خوش عیشی کے ساتھ گزرے گی۔ کافر کی زندگی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ تنگ دست ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے اور مالدار ہے تب بھی اس کو موجودہ دولت کے زوال کا اندیشہ رہتا ہے اور ہر وقت حرص میں گرفتار رہتا ہے اور اس کی وجہ سے خوش عیش زندگی اطمینان کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ میں کہتا ہوں آیت اِنَّا لَهُ مُعِيْشَةٌ ضَنْكًا بھی یہی مطلب ہے۔ میں کہتا ہوں، بندے کو جب اللہ سے محبت ہوتی ہے تو جو کچھ محبوب کی طرف سے اس کو پہنچتا ہے، تلخی ہو یا شیرینی وہ سب سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ حضرت مجددؑ نے فرمایا ہے، محبوب کی طرف سے جو دکھ پہنچتا ہے وہ محبوب کی طرف سے ملنے والے سکھ سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ دکھ تو صرف رضا محبوب ہوتی ہے اور سکھ میں کچھ ذاتی مقصد بھی ہوتا ہے اور خالص رضا محبوب زیادہ لذت آفریں ہوتی ہے اور محبت کو محبوب کی مرضی ہی سب سے پیاری ہوتی ہے۔ شیخ عارف رومی قدس سرہ نے فرمایا:

عاشق من لطف و بر قہرت بجد
اے عجم من عاشق من بر ہر دو ضد
ناخوش ازوے خوش بود در جان من
جاں فدائے یار جاں رنجان من

میں کہتا ہوں، حیاتِ طیبہ کی تشریح میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کے حق میں فرمایا ہے لَهِمْ اَلْبَشْرٰی فِی الْحَیٰوَةِ الدُّنْیَا ان کے لئے دنیوی زندگی میں بشارت ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورہ یونس میں گزر چکی ہے جب مؤمن کو اس زندگی میں اللہ کی خوشنودی کے حصول اور بارگاہِ قدس میں مرتبہ قرب پر پہنچنے اور درجات بلند ہونے کی بشارت مل جاتی ہے تو دنیا میں ہی اس کو وہ نعمت و راحت مل جاتی ہے جس کی جنت کے اندر ملنے کی اس کو امید ہوتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ اہل جنت سے فرمائے گا کیا تم راضی ہو گئے جنتی عرض کریں گے (اے ہمارے رب) راضی نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے تو نے تو ہم کو وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی شخص کو نہیں دیں۔ اللہ فرمائے گا کیا ان نعمتوں سے بھی بڑی نعمت تم کو دوں۔ پھر فرمائے گا (وہ سب سے اعلیٰ نعمت یہ ہے کہ) میں تم کو اپنی خوشنودی عطا کرتا ہوں آئندہ کبھی میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی روایت سے طبرانی نے الاوسط میں بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ اسی حدیث کے مضمون کو پڑھ کر ایک عارف نے کہا ہے:

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است
در حیرتم کو وعدہ فردا برائے چست

شیخ محمد عابد مجددیؑ فرماتے تھے، جو لذت و راحت دنیا میں اہل فقر کو حاصل ہے اگر بادشاہوں اور امیروں کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اہل فقر پر رشک کرنے لگتے اور جل جاتے۔

اگر دنیا میں حسبِ بیان مذکور لذت و راحت کی وہ حالت حاصل ہو جاتی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے تو پھر ایمان کہاں جاتا۔ دنیا میں تو خوف و امید دونوں ایمان کے لوازم میں سے ہیں۔ (ایمان بیم و رجاء کی درمیانی حالت کا نام ہے)

رازِ الہ

حالتِ مذکورہ تو نتیجہ ہے اُنس و محبت کا۔ یہ خوف کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خوف ہوتا ہے اللہ کی عظمت و کبریائی کو دیکھ کر۔ مؤمن کے دل سے خوف کبھی دور نہیں ہوتا۔ وہ انبیاء جن کو اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اور اپنے حسنِ خاتمہ میں کوئی شک نہیں ہوتا ان کو دوسروں کے مقابلے میں اللہ کی عظمت و بزرگی کا زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے، اس لئے دوسرے مؤمنوں کے مقابلے میں ان کو اللہ کا خوف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو جانتا اور تم سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں۔ صحابہ کو قطعی وحی کے ذریعے سے حصولِ رضا خداوندی اور داخلہ جنت کی بشارت دے دی گئی تھی، اللہ نے صحابہ کرام کے متعلق فرمایا ہے۔ لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ اِسْ قَطْعِي بَشَارَتِ كَيْ بَاوْجُوْهُ كَامِلٌ طُوْرٍ پَرِ اللّٰهُ سَے ڈرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی یہ حالت تھی تو صحابہ کے بعد جن مؤمنوں کو کشفِ ظنی کے طور پر بشارت دے دی جاتی ہے، ان کا تاثر بشارت، خوف کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیاتِ طیبہ سے مراد ایسی زندگی ہو جو بہر حال خیر و برکات سے پُر ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے۔ سوائے مؤمن کے اور کسی کو یہ بات حاصل نہیں۔ مؤمن پر اگر راحت آتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر بن جاتا ہے اگر اس پر کوئی بد حالی اور دکھ آتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ صبر اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ رواہ احمد فی المسند و مسلم فی الصحیح عن صہیب و احمد و ابن حبان عن انس و ابی ہریرۃ بسند صحیح عن سعید۔

مجاہد و قتادہ کے نزدیک حیاتِ طیبہ سے جنت کی زندگی مراد ہے۔ عوف نے حسن بصری کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ حسن نے فرمایا جنت کے علاوہ دنیا میں کسی کی زندگی طیب نہیں ہوتی۔

اول الذکر تفسیر (یعنی دنیا میں پاکیزہ زندگی مراد لینا) ظاہر ہے کلام کی رفتار سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾
جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کریں یعنی جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو شروع کرنے سے پہلے اللہ سے پناہ کی دعا کریں تاکہ شیطان مردود قرأت میں وسوسہ نہ پیدا کر سکے اور تلاوت میں کوئی غیر لفظ شامل نہ کرے۔ کیونکہ شیطان کی عادت ہے کہ اللہ نے جو بھی پیغمبر یا نبی بھیجا اور اس نے اللہ کا کلام پڑھا تو شیطان نے اس کی قرأت میں مداخلت ضرور کی۔ اس آیت میں قرأت کرنے سے مراد ہے ارادہ قرأت کرنا یا بجز کلام کے لئے ارادہ کی تعبیر فعل سے کی۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو شخص عبادت کا ارادہ کر لے تو اس کے بعد عبادت ضرور کرے (ایسا نہ ہو کہ ارادہ کر لے اور عبادت نہ کرے) مخفی اور ابن سیرین نے ظاہر لفظ کو دیکھ کر (یعنی اِذَا قَرَأْتَ کا ظاہری مطلب لے کر صراحت کی ہے۔ کہ تلاوت کرنے کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھی جائے۔ اسکے علاوہ تاخیرِ تعوذ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عبادت اقرب الی الاجابت ہو جائے گی ویسے شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ کی طلب تو ہمیشہ ہی کرنا چاہئے۔ (آغازِ قرأت پر ہی موقوف نہیں ہے)

صحیح روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرأت سے پہلے دعا کرتے (یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھا کرتے) تھے جمہور سلف و خلف کا اسی پر اجماع ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک قرأت سے پہلے تعوذ سنت ہے اور عطاء نے اسی آیت کو استدلال میں پیش کرتے ہوئے واجب ہونے کی صراحت کی ہے کیونکہ اِسْتَعِذْ امر کا صیغہ ہے اور امر کا حقیقی مفہوم وجوب ہے۔ اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کا حکم شیطانی وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے دیا گیا ہے اور مسنون ہونے کی علامت ہے (اگر انوعاء شیطانی کا اندیشہ نہ ہو تو ترکِ تعوذ جائز ہے) یہ دلیل کمزور ہے وجوبِ تعوذ اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔

جمہور علماء تعوذ کے واجب ہونے کے قائل نہیں کیونکہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے قرأت سے پہلے تعوذ کو ترک کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور کے نزدیک بعض وقت ترک تعوذ جائز ہے اگر بعض وقت تعوذ کو ترک کرنا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت نہ ہوتا تو علماء بھی ترک تعوذ کو جائز نہ قرار دیتے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعوذ پڑھے بغیر بھی قرآن کی تلاوت فرمائی۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ آخری تہائی رات کو اُٹھ بیٹھے اور سورہ آل عمران کی آخرت دس آیات اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اَخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولٰٓئِی الَّذِیْنَ اَلْبَابِ سے پڑھیں پھر کھڑے ہو کر وضو کیا الی آخرہ۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہم ایک روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اچانک آپ کو غفلت سی ہو گئی پھر کچھ دیر کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! حضور ﷺ کے مسکرانے کی کیا وجہ ہے فرمایا، ابھی مجھ پر ایک سورت اتری ہے اس کے بعد آپ نے تلاوت کی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّا اَعْطٰیْنٰکَ الْکُوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَاَنْحَرِ اِنَّ شَآئِئِکَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔

مسئلہ: کیا نماز کے اندر ہر رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھنا چاہئے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد قائل ہیں کہ نماز کی صرف پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھی جائے امام شافعی ہر رکعت میں تعوذ کے قائل ہیں۔ شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حسن اور عطاء اور ابن سیرین کے نزدیک ہر رکعت میں اعوذ پڑھنی مستحب ہے امام مالک نے کہا فرض نماز میں تعوذ نہ کیا جائے۔ بیضاوی نے امام شافعی کے قول کی تائید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ جو حکم کسی شرط پر مرتب ہو قیاس کا تقاضا ہے کہ تکرار شرط سے تکرار حکم ہوگی پس جب بھی کسی رکعت میں کوئی شخص قرأت کرے گا اعوذ پڑھنا ہوگی۔ خواہ پہلی رکعت ہو یا دوسری۔ امام مالک نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت انسؓ کی روایت پیش کی ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے بھی اور سب جہری قرأت سورہ فاتحہ سے شروع کرتے تھے۔ صحیحین کی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ یہ حضرات نماز کو الحمد لله رب العلمین سے شروع کرتے تھے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں جہراً اعوذ نہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ پوشیدہ چپکے سے بھی نہ پڑھی ہو ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت میں ثناء (سبحانک اللهم) پڑھنے کے بعد اعوذ پڑھا کرتے تھے پہلی رکعت کے علاوہ کسی دوسری رکعت میں اعوذ پڑھنا کسی روایت میں نہیں آیا۔ ابن السنی اور ابن ماجہ نے حضرت جیر بن مطعمؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہو جاتے تھے تو تین بار اللہ اکبر کبیر اور تین بار الحمد للہ کثیر اور تین بار سبحان اللہ بکرۃ واصلیاً کہنے کے بعد اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتے تھے۔ امام احمد اور امام ابن حبان اور ابو داؤد کی روایت میں من الشیطن الرجیم کے بعد من نفعہ و نفعہ و ہمزہ کے الفاظ بھی آئے ہیں (میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں شیطان مردود سے اس کی پھونک سے اور اس کے دم کرنے سے اور اس کے وسوسہ سے) حاکم نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

امام احمد اور حاکم اور اہل السنن نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات میں نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو تکبیر کے بعد سُبْحٰنَکَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَ تَعَالٰی جَدُّکَ وَ لَا اِلٰهَ غَیْرُکَ پھر تین بار لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور تین بار اللہ اکبر کہنے کے بعد پڑھتے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنَ نَفْخِہٖ وَ نَفْثِہٖ وَ هَمَزِہٖ امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ آیا ہے مگر اس کی اسناد میں بعض راویوں کے نام ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے، اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمَزِہٖ وَ نَفْخِہٖ وَ نَفْثِہٖ حاکم اور بیہقی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، جب نماز میں داخل ہوتے تھے، حضرت انسؓ کی روایت سے دارقطنی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اس اسناد میں ایک راوی حسین بن علی بن اسود ہے، اس

کے متعلق اہل علم نے کلام کیا ہے۔ مر اسیل ابو داؤد میں حسن بصری کا قول (بغیر صحابی کے) آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان الفاظ کے ساتھ تعوذ کرتے تھے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔

فائدہ

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰهِ كَمَا اَفْضَلُ ہے اس لفظ سے آیت کے لفظ اِسْتَعِیْذُ کی موافقت ہو جاتی ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ كَمَا بَهِی اِسْمِی کے قریب ہے۔

میں کہتا ہوں، ماہر اہل تجوید اور فقہاء کے نزدیک اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم آیا ہے، دوسرے الفاظ نہیں آئے۔ ثعلبی اور واحدی نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اعوذ باللہ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھی، حضور ﷺ نے فرمایا اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھو، مجھے جبریل نے قلم سے یعنی لوح محفوظ سے (نقل کر کے) ایسا ہی پڑھایا ہے۔

ابو عمر درانی نے التیسیر میں لکھا ہے میں نے بعینہ یہی لفظ (اعوذ) پڑھا اور اسی کو لیا اور قرآن کی تلاوت شروع کرتے وقت (یعنی نماز سے باہر) جہر کے ساتھ یہی لفظ پڑھا جاتا ہے، اہل تجوید میں کسی کی قرأت اس کے خلاف مجھے معلوم نہیں اور پاروں وغیرہ کے شروع میں اسی کو پڑھنا اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔ نص قرآنی کی تکمیل اور سنت کا اتباع اسی سے ہوتا ہے۔

امام القراء حمزہ صرف سورہ فاتحہ کے شروع میں اعوذ کو جہر سے پڑھتے تھے باقی قرآن میں پوشیدہ پڑھتے تھے خلف کی روایت یہی ہے لیکن خلا د نے حمزہ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ آپ کے نزدیک جہر و اخفاء دونوں درست ہیں جہر سے پڑھے یا اخفاء سے دونوں کا اختیار ہے۔ باقی قراء کا کوئی قول جہر و اخفاء کے متعلق منقول نہیں۔

اِنَّهٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہُمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾
یقیناً شیطان کا قابو ان لوگوں پر نہیں جو ایمان دار ہیں اور اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ پر بھروسہ رکھنے والے مؤمن احکام شیطانی پر نہیں چلتے اللہ ان کی حفاظت کرتا ہے ہاں کبھی غفلت کی حالت میں بعض معمولی حقیر و سوسے ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ان و سوسوں کو قبول بھی کر لیتے ہیں اسی لئے ان کو تعوذ کا حکم دیا گیا۔

آیت بالا میں تعوذ کا حکم دیا تھا جس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید شیطان کو اہل ایمان پر تسلط حاصل ہے اس خیال کی نفی اس آیت میں کر دی کہ اِقَالَ الْبِیضَاوِیُّ، میں کہتا ہوں یہ آیت گزشتہ آیت کی علت بھی ہو سکتی ہے مؤمن اللہ سے استعاذہ اس لئے کرتے ہیں کہ انکا بھروسہ اپنے رب پر ہی ہوتا ہے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسی کی پناہ میں دے دیتے ہیں اللہ کی طرف رجوع اور اسی پر بھروسہ رکھنا مؤمن مخلص کا خصوصی وصف ہے جو ہر مؤمن کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے زبان سے تعوذ کرنے کا حکم تو سنت دعا کی تکمیل کے لئے ہے تاکہ ظاہر بھی باطن کے موافق ہو جائے اور شیطان سے پوری پوری امان حاصل ہو جائے۔

اِنَّہُمْ لَیْسَ لَہُمْ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَكَّلُوْنَ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِہٖ مُشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
شیطان کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے رفاقت کرتے ہیں اور ان لوگوں پر ہے جو اللہ کا کسی کو ساجھی قرار دیتے ہیں۔ یعنی جو شیطان کے دوست ہیں اس کی اطاعت کرتے ہیں باوجودیکہ شیطان کو تسلط حاصل نہیں ہے لیکن وہ خود شیطان کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں ہماری اس تفسیر کی رو سے اس آیت میں اور آیت مَا کَانَ لِیْ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْکُمْ فِیْہِمْ کُوْنِیْ اِخْتِلَافٌ نہیں ہے۔

ہم بہ میں بہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یعنی اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دیتے ہیں یا شیطان کی طرف راجع ہے یعنی شیطان کی وجہ سے اس کے اغوا کے سبب شرک کرتے ہیں۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَا آیٰةً مَّکٰنًا اٰیۃً لَا وَاَللّٰہُ اَعْلَمُ بِہَا یُنزِلُ قٰلُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ ۗ بَلْ اَکْثَرُہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور جب ہم ایک آیت کو بدل کر دوسری آیت کو اس کی جگہ رکھ دیتے ہیں اور اللہ جو حکم بھیجتا ہے اسکو وہی خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ از خود تراش لیتے ہیں (اور اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں آپ مفتری نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر جاہل ہیں۔ تبدیل آیت سے مراد کسی آیت کی تلاوت کو منسوخ کرنا ہے یا کسی حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دینا:

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ كَمَا يَهَيِّئُ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ ذُرِّيَّتَهُ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
مینی بر مصلحت تھی لیکن اس کا اب بانی رکھنا غلط ہے یا اس سے پہلے وہ حکم بگاڑ کا سبب بن گیا تھا اس لئے اس کو بدل کر ایسا حکم نازل کر دیا جو اصلاح خلق کرنے والا ہے خلاصہ یہ کہ لوگوں کے لئے کب اور کون سا حکم مناسب ہے اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

مُفْتَرِي (اللہ پر) دروغ بندی کرنے والا۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں نے کہا محمدؐ اپنے ساتھیوں سے مذاق کرتے ہیں۔ آج ایک حکم دیتے ہیں اور کل اس کی ممانعت کر دیتے ہیں، یہ از خود تراش کر اللہ پر دروغ بندی کر دیتے ہیں۔
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ یعنی اکثر کافر احکام کی مصلحت نہیں جانتے یا یہ مطلب ہے کہ اکثر کافر اہل علم و تمیز نہیں ہیں اگر ان کو امتیاز ہوتا تو پہچان لیتے کہ قرآن ایسا کلام نہیں کہ کوئی انسان خود بنا سکے اور محمدؐ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کو دروغ باف اور بہتان تراش کہا جاسکے۔

تبارک اللہ ما وحی بمکتسب ولا نبی علیٰ غیب بمثلہم

اللہ بزرگ ہے۔ کوئی وحی دماغی تراشیدہ نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی نبی ایسا ہوتا ہے کہ وحی کے معاملہ میں اس پر الزام لگایا جاسکے۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اس کو جبرئیل میرے رب کی طرف سے حکمت کے مطابق لے کر آئے ہیں تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے۔ ”روح القدس“ سے مراد جبرئیل ہیں قدس کا معنی ہے پاکی یعنی پاکی والی روح۔ نزول تنزیل مصدر، تنزیل کا معنی تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کرنا۔ یہ لفظ تنبیہ کر رہا ہے کہ قرآن کا مصالح کے مطابق تدریجی نزول تبدیل کا مقتضی ہے (اگر بعض احکام کو بدلنا نہ ہوتا تو یکدم سب قرآن نازل کر دیا جاتا) الحق حکمت کاملہ۔ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا یعنی تدریجاً اس لئے نزول ہوا کہ جو لوگ اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں مزید استحکام ہو جائے اور ناسخ کو سننے کے بعد جب وہ غور کریں اور سمجھیں کہ حکمت و مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ پچھلا حکم اس وقت منسوخ کر کے یہ نیا حکم نازل کر دیا جائے تو ان کے عقائد میں مزید پختگی پیدا ہو جائے اور اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔

یایہ مطلب ہے کہ ناسخ کو نازل کر کے ایمانداروں کی جانچ کرنی مقصود ہے جب وہ قدیم حکم کی جگہ جدید حکم کو برحق یقین کر لیں اور سمجھ جائیں کہ اللہ حکمت والا ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں تو اس سے ان کو مزید استحکام ایمانی حاصل ہو جائے۔ لِلْمُسْلِمِينَ مسلمانوں سے مراد ہیں فرمان بردار۔ مطیع حکم صرف مسلمانوں کے لئے ہدایت و بشارت کا ذریعہ قرار دینے سے درپردہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غیر مسلموں کے لئے یہ باعث ہدایت و بشارت نہیں ہے۔

وَلَقَدْ نَعَلْنَا أَنفُسَنَا بِمَا يَبْتِغُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ
اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو یہ کلام آدمی سکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ بغوی نے لکھا ہے، جس شخص کے متعلق وہ قرآن سکھا جانے کی جھوٹی نسبت کرتے تھے وہ کون آدمی تھا، اس کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے ابن جریر نے مسند میں ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں ایک عیسائی جمعی غلام تھا جو لوہار تھا اس کا نام بلعام تھا رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آتے جاتے تھے مشرکوں نے آپ کو بلعام کے پاس آتا جاتا دیکھ کر کہا ان کو بلعام سکھا دیتا ہے۔ عکرمہ نے کہا بنی مغیرہ کا ایک غلام

تھا جس کا نام یعیش تھا وہ کتابیں پڑھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو قرآن سکھاتے تھے قریش کہنے لگے ان کو یعیش سکھا دیتا ہے۔ فرار نے کہا حویطب بن عبد العزی کا ایک غلام تھا جس کی زبان عجی تھی اس کا نام عائش تھا۔ مشرک کہنے لگے یہ عائش سے سیکھ لیتے ہیں۔ آخر میں عائش مسلمان ہو گیا تھا اور اسلام میں پختہ رہا۔ ابن اسحاق نے بیان کیا رسول اللہ مر وہ پہاڑ کے قریب ایک رومی عیسائی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اس کا نام جبر تھا جبر بنی الحضرم قبیلہ میں سے کسی کا غلام تھا، اور کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ عبد اللہ بن مسلم حضرمی کا بیان ہے ہمارے دو غلام تھے جو یمن کے تھے۔ ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ یسار کی کنیت ابو فکیہہ تھی۔ دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور توریت و انجیل پڑھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ ان کی طرف سے گزرتے اور وہ (انجیل یا توریت) پڑھتے ہوتے تو حضور ﷺ ٹھہر کر سننے لگتے۔ ابن ابی حاتم نے حصین بن عبد اللہ کے طریق سے ایسا ہی بیان کیا ہے ضحاک کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کفار دکھ دیتے تو آپ ان دونوں غلاموں کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ اور ان کے کلام سے کچھ سکھ محسوس کرتے۔ مشرک کہنے لگے محمد انہی دونوں سے سیکھ لیتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مشرکوں کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا۔

لِسَانَ الَّذِي يُلْجِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجِبِي ۖ وَ هَذَا السَّانُ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾

جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے قاموس میں ہے لَحْدَ إِلَيْهِ اس کی طرف مائل ہو اللتحد کا بھی یہی معنی ہے لَحْدَ کا معنی بھی ”مائل ہوا، مڑا ہے“ جس کی طرف مائل ہوتے ہیں یعنی اشارہ کرتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ اپنے قول کی سچائی اور استقامت سے موڑ کر اس شخص کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

أَعْجِبِي صاف عربی نہ بولنے والا۔ قاموس میں ہے لَفْظًا أَعْجَمٌ قوم اور شخص دونوں کی صفت میں آتا ہے أَعْجَمٌ اور اعجمی گونگا اور وہ شخص جو صاف (عربی) نہ بول سکے۔ عجی عجم کا رہنے والا جو جس عجم سے ہو خواہ فصیح البیان ہو، غیر عرب کو عجم کہتے ہیں۔ بعض محققین لغت کا قول ہے کہ عجمہ کا معنی لیا نت کے معنی کے مقابل ہے یعنی صاف زبان میں بات نہ کرنا۔ اعجام کا معنی ہے ابہام۔ اسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ گھر گونگا ہو گیا یعنی سب گھر والے مر گئے کوئی جواب دینے والا بھی باقی نہیں رہا۔

ہذا، یعنی یہ قرآن مبین، واصل، صاف، فصیح۔ کافروں کی بہتان تراشی کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے جس کی تقریر دو طرح سے ہو سکتی ہے (۱) وہ شخص جس کی طرف قرآن کی نسبت کی جاتی ہے اس کی بولی عجی ہے جس کو نہ رسول اللہ ﷺ سمجھتے ہیں نہ تم لوگ سمجھتے ہو اور قرآن کی زبان عربی فصیح ہے جس کو تم لوگ سمجھتے ہو پھر یہ قرآن اس شخص کا بتایا ہوا کیسے ہو سکتا ہے۔ (۲) قرآن کے معانی معجزہ ہیں اور معانی کی طرح الفاظ کی ترکیب بھی معجزہ ہے وہ عجیب شخص تو ہے اور انجیل پڑھتا ہے توریت و انجیل کے معانی سے قرآن کے معانی مطابقت ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان معانی کو معجز عربی عبارت میں ادا کرنا بھی تو معجزہ ہے جو کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے آیت فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ مِثْلِهِ مِثْلِهِ میں جو دعوتِ مقابلہ دی گئی ہے اس کے مقابلہ سے سب کا عاجز رہنا خود بتا رہا ہے کہ قرآن کا مقابلہ بشری طاقت سے باہر ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آسمانی کتابوں کے علوم حاصل کرنا اتنا آسان نہیں جب تک کوئی ماہر اور قابلِ معلم نہ ہو جو تمام علوم سماویہ میں پوری دستگاہ رکھتا ہو اور ایک طویل مدت تک درس نہ دیتا رہے اس وقت تک ان علوم کا حصول ناممکن ہے۔ ایک معمولی غلام جو آسمانی علوم کا خود ہی ماہر نہ ہو کچھ شد بدرکھتا ہو اور اس کی زبان بھی عجی ہو اس کے پاس کبھی کبھی کسی عربی شخص کا آنا جانا کس طرح عربی شخص کو علوم سماویہ کا اس حد تک ماہر بنا سکتا ہے کہ وہ عربی زبان میں تمام کتابوں کے علوم کو اعجازی طور پر منتقل کر دے جبکہ استاد کی زبان سے شاگرد واقف بھی نہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيَهُمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۴﴾

جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے (اور ان کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں مانتے) یقیناً اللہ ان کو کبھی راہ پر نہیں لائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی یعنی راہِ حق پر نہیں لائے گا یا نجات اور جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا اور آخرت میں ان کو دکھ

کی سزا دی جائے گی۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿۱۵﴾

بس جھوٹ تراشنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ پورے جھوٹے ہیں یعنی حقیقت میں یہی جھوٹے ہیں ایمان لانے والے جھوٹے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں تمام صحابہؓ سچے اور عادل تھے یا یہ مطلب ہے کہ کامل جھوٹے اور پورے پورے کاذب یہی لوگ ہیں کیونکہ ظہور معجزات کے بعد اللہ کے معصوم نبی اور اللہ کی آیات کا انکار اور اللہ کے رسول ﷺ پر تہمت تراشی سب سے بڑا جھوٹ ہے یا **هُمُ الْكٰذِبُونَ** سے یہ مراد ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں ان کو جھوٹ سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ شرافت، نہ دین یا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ جو آپ ﷺ کو مُفْتَرِي قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی آدمی آپ کو سکھاتا ہے اس قول میں یہ ہی جھوٹے ہیں **إِنَّمَا يَفْتَرِي** جملہ فعلیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ افترا کرنے والے صرف یہی لوگ ہیں اور **أُولَئِكَ هُمُ الْكٰذِبُونَ** جملہ اسمیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ جھوٹ بولنا ان کی عادت و لازمہ ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن حراذ نے فرمایا، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ کیا مؤمن زنا کر سکتا ہے۔ فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن چوری کر سکتا ہے فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن جھوٹ بول سکتا ہے۔ فرمایا نہیں۔ اللہ نے فرمادیا ہے **إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكٰذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ط**

امام احمد نے حضرت ابو امامہ کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے خیانت اور جھوٹ کے مؤمن کی سرشت میں تمام (اچھی بری) باتیں ہو سکتی ہیں۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور امام مالکؒ نے مرسل بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا مؤمن ڈر پوک ہو سکتا ہے۔ فرمایا ہاں، عرض کیا گیا کیا مؤمن بخیل ہو سکتا ہے، فرمایا ہاں، پوچھا گیا کیا مؤمن بڑا جھوٹا ہو سکتا ہے، فرمایا نہیں۔ میں کہتا ہوں ان احادیث میں جو مؤمن کا ذکر آیا ہے بظاہر اس سے مراد وہ مؤمن ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے (ورنہ بعد کے زمانہ میں تو بکثرت مؤمن جھوٹے تھے اور اب بھی ہیں) اسی لئے تمام صحابہؓ کے سچے اور عادل ہونے پر علماء کا اجماع ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی صحابی کی روایت قابل جرح نہیں ہے (بشرطیکہ صحابہؓ تک روایت کا سلسلہ غیر مجروح ہو) یا احادیث میں جس مؤمن کا ذکر کیا ہے اس سے مراد کامل مؤمن ہے یعنی صوفی صافی عارف خد افانی فی اللہ باقی باللہ۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ

بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۶﴾

جو لوگ ایمان لانے کے بعد (لوٹ کر) اللہ کے (یعنی اس کی ذات، صفات یا قیامت و نبوت کے) ساتھ کفر کرنے لگیں اور جی کھول کر (دل کی خوشی کے ساتھ) کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑے دکھ کی سزا ہو گی ہاں جو لوگ کفر کرنے پر مجبور کئے گئے ہیں اور ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو (اور زبان سے کلمات کفر مجبوری کہہ گزریں) وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول عمار بن یاسرؓ کے حق میں ہوا۔ مشرکوں نے عمار کو ان کے باپ یاسر کو ان کی ماں سمیہ کو اور صہیب کو بلال و خبیب و سالم کو پکڑ کر سخت ترین جسمانی دکھ دیئے حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا (ایک ٹانگ ایک اونٹ سے دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے) اور شرم گاہ میں نیزہ ڈال کر چیرہ دیا گیا۔ حضرت یاسر کو بھی قتل کر دیا گیا اسلام میں سب سے اول یہی دونوں شہید ہوئے۔ عمار نے مجبوری وہ بات زبان سے نکال دی جو مشرک چاہتے تھے۔ قتادہ نے کہا بنی مغیرہ نے عمار کو پکڑ کر چاہ میمون میں غوطے دیئے اور کہا محمد ﷺ کا انکار کر حضرت عمار نے وہی بات کہہ دی جو مشرک چاہتے تھے۔ مگر آپ کا دل اس بات سے نفرت کرتا تھا دل کو انکار رسالت گوارا نہ تھا۔ کسی نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دے دی کہ عمار کافر ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، عمار کے اندر تو چوٹی سے قدم تک ایمان بھرا ہوا

ہے اس کے خون اور گوشت میں ایمان سرایت کر گیا ہے۔ آخر حضرت عمارؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بات بُری ہے، میں نے آپ کو بُرا کہہ دیا اور (انکار کے طور پر) آپ کا ذکر کیا فرمایا اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت تم کو محسوس ہو رہی تھی۔ عرض کیا دل تو ایمان پر مطمئن تھا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے عمارؓ کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا اگر وہ دوبارہ تمہارے ساتھ ایسی حرکت کریں تو تم دوبارہ (بھی یہی کفر یہ الفاظ) لوٹا سکتے ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ثعلبی اور واحدی نے بھی اسی طرح یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کو ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو مشرکوں نے بلالؓ، خبیثؓ اور عمارؓ کو پکڑ لیا۔ عمارؓ نے تقیہ کر کے وہ بات کہہ دی جو مشرکوں کو پسند تھی پھر جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا (کلمات کفر) کہنے کے وقت تمہارے دل کی کیا حالت تھی۔ عرض کیا، دل تو آپ کے قول پر مطمئن تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول مکہ کے چند مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا بعض صحابہؓ نے (مدینہ سے) ان کو لکھا تھا کہ مکہ چھوڑ آؤ۔ جب تک ہجرت کر کے ہمارے پاس نہ آ جاؤ گے ہم تم کو اپنے میں شمار نہیں کریں گے۔ اس تحریر پر وہ لوگ مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چل دیئے راستہ میں انکو قریش نے پکڑ لیا اور سخت دکھ دیئے۔ مجبوراً بنفرت خاطر ناگواری کے ساتھ کلمات کفر کہہ دیئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے بیان کیا کہ عامر بن حضرمی کے غلام جبر کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ان کے آقا نے ان پر زبردستی کی تھی مجبوراً جبر نے کلمات کفر کہہ دیئے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے پھر جبر کا آقا بھی مسلمان ہو گیا اور اسلام میں پختہ رہا اور جبر کو ساتھ لے کر اس نے بھی مدینہ کو ہجرت کر لی۔

ایمان پر دل کے مطمئن ہونے کا یہ مطلب ہے کہ عقیدہ میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ دل ایمان پر قائم رہا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ دل سے سچا جاننا ایمان کا رکن ضروری ہے (خالی شہادت ایمان بغیر دلی عقیدہ کے اللہ کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے) کفر کے لئے سینہ کے کشادہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دل نے کفر کو پسند کر لیا اور بخوشی کفر کو قبول کر لیا۔

۱۰۔ اِکْرَاهُ كَيْفَ تَحْقِيقُهُ

کسی کو ایسے کام پر آمادہ کرنا جس کو وہ دل سے گوارا نہ کرتا ہو اِکْرَاهُ ہے اِکْرَاهُ کی دو صورتیں ہیں (۱) کسی کو کسی ناگوار کام کے کرنے پر اس طرح آمادہ کرنا کہ اگر وہ انکار کر لے تو اس کو اذیت اور دکھ اٹھانا پڑ جائے لیکن یہ ایذا اور دکھ اس کو بے اختیار نہ بنا دے مثلاً انکار کی صورت میں مارنا قید کر دینا۔ ظاہر ہے کہ رہنے اور قید ہو جانے کے بعد بھی مضروب اور قیدی بے اختیار نہیں ہو جاتا صرف جسمانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (۲) انکار کی صورت میں مجبور آدمی اپنے اختیار کا مالک ہی نہ رہے مثلاً ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قتل کر دینا۔ ان دونوں صورتوں میں اِکْرَاهُ کا حکم اس وقت جاری ہوگا کہ مجبور کرنے والا اس اذیت دینے پر قدرت رکھتا ہو جس کی دھمکی دے رہا ہے اور جس کو مجبور کیا جا رہا ہو اس کا بھی غالب خیال ہو کہ اگر میں انکار کر دوں گا تو اس شخص کی طرف سے مجھے یہ دکھ پہنچ جائے گا۔ آیت میں اِکْرَاهُ کی اول صورت مراد نہیں ہے ایسے اِکْرَاهُ کا اثر تو صرف خرید و فروخت، اقرار قرض، کسی جائیداد کے ٹھیکہ کے لین دین وغیرہ پر ہی پڑتا ہے اس صورت میں جب خوف اذیت نہ رہے اور ایذا رساں طاقت سے آزادی مل جائے تو مجبوری کی حالت میں جو عقد، اقرار، ٹھیکہ وغیرہ کا لین دین کیا ہو اس کو صحیح کر دینا جائز ہے چاہے قائم رکھے چاہے منسوخ کر دے۔ تجارت، لین دین، وغیرہ ایسے عقود ہیں، جن کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اَلَا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةٌ عَن تَرَاضٍ بَيْنَ كُمْ اِکْرَاهُ کی شکل میں مجبور شخص کی رضامندی نہیں ہوتی اس لئے جبر ختم ہونے کے بعد اس کو اختیار ہے چاہے معاملے کو صحیح کر دے چاہے قائم رکھے۔ اگر قیمت پر بخوشی قبضہ کر لیا تو بیع کو نافذ قرار دیا جائے گا قبول قیمت علامت رضامندی ہے۔

آیت مذکورہ میں اکراہ کی دوسری قسم مراد سے علماء کا اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا گیا ہو اور وہ بے بس ہو جائے تو ظاہری طور پر کفر اختیار کر لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ دل میں اطمینانِ ایمانی ہو۔ حضرت عمارؓ کے متعلق اس آیت کا نزول اس مسئلے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمارؓ کو کافر نہیں قرار دیا گیا ایسے ظاہری کافر کا نکاح بھی فسح نہیں ہوگا لیکن اگر کلمہ کفر زبان پر لانے سے انکار کر دے اور جان کی قربانی دے دے تو افضل ہے جیسے حضرت عمارؓ کے والدین نے کیا۔ حضرت خبیثؓ، حضرت زید بن دثنہؓ اور حضرت عبداللہ بن طارقؓ نے بھی مرتد ہونا پسند نہیں کیا اور شہادت کو اختیار کر لیا۔ اصحابِ سیر نے سریہ رجب کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت خبیثؓ کو جب قتل کیا جانے لگا تو آپ نے قتل سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خبیثؓ ہی نے سب سے پہلے قتل کے وقت دو رکعت پڑھنے کا طریقہ قائم کیا۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو آپ کو ایک تختہ سے باندھ دیا پھر مدینہ کی طرف منہ کر دیا اور بندش مضبوط کر دی پھر کہنے لگے اسلام سے لوٹ جاؤ ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت خبیثؓ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اسلام سے مرتد ہونے کی شرط پر مجھے ساری دنیا کی دولت مل جائے کافر کہنے لگے اب تو چاہتے ہو گے کہ محمدؐ میری جگہ ہوتے اور میں اپنے گھر بیٹھا چین کرتا۔ حضرت خبیثؓ نے فرمایا نہیں خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمدؐ کے کوئی کاٹا چھب جائے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھ رہوں کافر برابر کہتے رہے خبیثؓ اسلام سے لوٹ جاؤ حضرت خبیثؓ نے فرمایا، نہیں میں کبھی اسلام سے نہیں پھرنے کا۔ کہنے لگے اگر اسلام سے نہ پھرو گے تو ہم تم کو قتل کر دیں گے بولے اللہ کی راہ میں مارا جانا ایک حقیر چیز ہے۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت خبیثؓ نے شہادت سے پہلے چند اشعار پڑھے تھے جن میں سے دو شعر یہ تھے:

”اگر مسلمان ہونے کی حالت میں مارا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ کس بل سے اللہ کی راہ میں زمین پر گرتا ہوں میرا یہ قتل ہونا اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے اگر اللہ چاہے گا تو پارہ پارہ میں جسم کے جوڑ جوڑ میں برکت عطا فرمائے گا۔“

ابن عقبہ کا بیان ہے کہ حضرت خبیثؓ اور حضرت زیدؓ دونوں ایک ہی دن شہید کئے گئے اور جس روز ان کی شہادت ہوئی اسی روز لوگوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے وعلیکم السلام۔

ابن ابی شیبہ نے حسن بصری کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا اور ایک سے کہا محمد ﷺ کے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں مسیلمہ نے کہا، میرے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا آپ بھی مسیلمہ نے دوسرے سے پوچھا محمد ﷺ کے متعلق تو کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ مسیلمہ نے پوچھا: میرے متعلق تو کیا کہتا ہے اس نے جواب دیا میں بہرا ہوں۔ مسیلمہ نے یہی بات تین بار دہرائی اور اس شخص نے بھی یہی جواب دہرا دیا۔ آخر مسیلمہ نے اس کو قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی تو اول شخص کے متعلق فرمایا اس نے اللہ کی دی ہوئی اجازت کو اختیار کر لیا اور دوسرے نے بلند آواز سے اعلانِ حق کیا اس کو مبارک ہو۔

مسئلہ: اگر کسی مسلمان کا مال تلف کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے تو اس کا مال تلف کرنا اس کے لئے جائز ہے ضرورت کے وقت غیر کا مال مباح ہو جاتا ہے جیسے سخت بھوک کے وقت کسی کا مال کھا لینا جائز ہے۔ لیکن صاحبِ مال مجبور کرنے والے سے اپنے مال کا تاوان وصول کرے گا کیونکہ مجبور شخص تو اس جابر کا آلہ کار ہے اور جس صورت میں آلہ کار بننا درست ہے اس میں تاوان آلہ کار بنانے والے سے لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر شراب پینے یا مردار کو کھانے پر مجبور کیا جائے تو ایسا کر لینا بائنا اتفاق علماء جائز ہے۔ لیکن کیانہ کھانا اور جان دے دینا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک حرام کو کھاپی لینا واجب ہے انکار کر کے جان دے دینا جائز نہیں۔ جیسے حلال چیز (یعنی پرانی حلال چیز کو) جان بچانے کے لئے کھاپی لینا واجب ہے ویسے ہی شراب اور مردار کا حکم ہے۔ اگر کھانے پینے سے انکار کر کے

جان دے دے گا تو گناہ گار ہو گا اور بلا ضرورت اپنی جان کھودینے میں اس جابر کا بدگار مانا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر کھانے پینے سے انکار کر کے جان دے دے گا تو گناہ گار نہ ہو گا۔ امام شافعیؒ کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں شراب پینے کی اجازت اور رخصت ہے اباحت نہیں ہے۔ شراب مباح نہیں ہو جاتی۔ اب اگر اس نے عزیمت کو اختیار کیا، اور شراب کی حرمت پر قائم رہ کر جان دے دی (تو گناہ گار نہیں ہو سکتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا یہ رخصت نہیں اباحت ہے اضطراب کی حالت میں مردار بھی ذبیحہ کی طرح حلال ہو جاتا ہے۔ آیت میں حالت اضطراب مستثنیٰ ہے فرمایا ہے **إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ** استثناء کر کے حالت اضطراب کو عدم اضطراب کی حالت سے حکم میں علیحدہ کر لیا گیا ہے (اور ظاہر ہے کہ عدم اضطراب کی حالت میں حرمت کا حکم ہے تو اضطراب کی حالت میں اباحت ہو گی، رخصت نہ ہو گی) ہاں اگر غیر کمال کھانے پر مجبور کیا گیا اور انکار کرنے کی صورت میں مارا گیا تو باقی علماء ماجور ہو گا، کیونکہ غیر کے مال کی حرمت ہر حال میں قائم ہے (کھالینے کی صرف رخصت ہے) یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اگر اسے خطاب نہیں بدلا کر تاکہ ایک ہی چیز ایک مرتبہ مباح اور فرض ہو جائے اور پھر کبھی وہی چیز حرام ہو جائے اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے ایک عام ضابطہ قائم کر دیا ہے کہ جس تصرف کا حکم الفاظ پر جاری ہوتا ہو دل کی رضا پر موقوف نہ ہو وہ حکم اس وقت بھی مرتب ہو گا جب وہ تصرف جبر کی حالت میں کیا جائے۔ اس قسم کے تصرفات (جو الفاظ پر مبنی ہوں اور ان میں دل کی رضامندی ضروری نہیں) دس ہیں۔ نکاح، طلاق، طلاق سے رجوع، ایذا دہنی، ظہار، غلام کی آزادی، قصاص کی معافی، قسم، نذر (ان سب کے احکام صرف زبان سے کہنے سے نافذ ہو جائیں گے، زبانی ایجاب و قبول سے نکاح ہو جائے گا۔ زبان سے لفظ طلاق کہہ دینے سے طلاق ہو جائے گی۔ صرف زبان سے آزاد کرنے سے غلام آزاد ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ، ان احکام کے مرتب ہونے کے لئے دل کی رضامندی ضروری نہیں پس کسی نے جبراً اگر طلاق یا نکاح میں ایجاب و قبول یا معافی یا قسم وغیرہ کے الفاظ کہلوائے تو احکام مرتب ہو جائیں گے) شعبی، نخعی اور ثوری کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کوئی جبری تصرف جاری نہیں ہو سکتا جبر سے احکام مرتب نہیں ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے اغلاق و جبر کی صورت میں نہ طلاق ہے نہ باندی غلام کی آزادی۔ رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ، الحاکم و ابن الجوزی، ابویعلیٰ، ابویسعی، ابویسعی، ابویسعی من طریق صفیہ بن عثمان عن شیبہ۔ اس سلسلے کو حاکم نے صحیح کہا ہے لیکن اس سند میں ایک راوی محمد بن عبیدہ مکی ہے جس کو ابو حاتم رازی نے ضعیف کہا ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قتادہ نے کہا اغلاق کا معنی ہے اگر اسے (جبر کرنا) یہ لفظ **أَغْلَقْتُ** الباب سے مأخوذ ہے۔ گویا مجبور آدمی کو جابر کی مرضی کے خلاف کرنے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اغلاق کا ترجمہ شدتِ غصہ کیا ہے۔ سنن ابوداؤد میں یہ ترجمہ آیا ہے اور امام احمد نے بھی اس لفظ کی یہی تشریح کی ہے لیکن یہ تشریح اچھی نہیں ہے۔ ابن اُسَید نے اس کو پسند نہیں کیا ہے اور صراحت کی ہے اگر اغلاق کا ترجمہ غصہ کیا جائے گا تو کوئی اطلاق ہی نہیں پڑے گی کیونکہ ہر شخص سخت غصہ کی حالت میں ہی طلاق دیتا ہے۔ حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تمہارے لئے بھول چوک کو معاف کر دیا اور اس کو بھی جس پر تم کو مجبور کیا گیا ہو۔ رواہ ابن الجوزی، اس حدیث سے اصل مدنی کا ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ کا کام جبراً کسی سے کر لیا گیا ہو اللہ اس کا مواخذہ نہیں کرے گا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی احکام بھی مرتب نہ ہوں گے۔ اسی حدیث کی ہم معنی وہ حدیث بھی ہے جو طبرانی نے از روایت ثوبان نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے بھول چوک (کی سزا) اٹھالی گئی ہے اور وہ کام بھی جس پر لوگوں کو مجبور کیا گیا ہو حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی آیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کی سند میں ضعف ہے اس مضمون کی حدیث مختلف روایات سے ابن ماجہ، ابن حبان، دارقطنی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے بحوالہ اوزاعی بانتساب ابن عباسؓ بیان کی ہیں لیکن اہل روایت نے ان روایات کو منکر قرار دیا ہے حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث ابن ماجہ نے بیان کی ہے اس کے سلسلہ میں شہر بن حوشب واقع ہے اور سند میں انقطاع ہے لیکن اگر حدیث کو صحیح مان لیا جائے تب بھی امام شافعیؒ وغیرہ کا اس سے استدلال غلط ہے۔

بھوک چوک اٹھالیے جانے کا یہ معنی تو ہرگز نہیں کہ بھول چوک واقع نہ ہوگی، یہ تو واقعہ کے خلاف ہے اس لئے تین ہی معنی ہو سکتے ہیں۔

(۱) بھول چوک کا مواخذہ آخر دی اٹھالیا گیا ہے یعنی اللہ نے بھول چوک کی سزا معاف کر دی ہے یہی مطلب صحیح ہے (۲) بھول چوک کا عمومی مطلب اٹھالیا گیا ہے (نہ حکم دینا بھول چوک پر مرتب ہوتا ہے نہ آخرت کا حکم یعنی سزا) یہ مطلب غلط ہے عموم حکم کسی لفظ سے نہیں معلوم ہوتا۔ مقتضی النص میں عموم نہیں ہوتا۔ (۳) احکام دنیا اٹھالنے گئے ہیں یہ مطلب اجماع کے خلاف ہے۔ بالاتفاق حکم آخرت یعنی مواخذہ کا اٹھالیا جانا اس جگہ مراد ہے اس لئے حکم دنیا مع حکم آخرت کے مراد نہیں ہو سکتا ورنہ عموم مقتضی لازم آئیگا کذا قال ابن ہمام۔

ابن جوزی نے شافعیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا ہے عہد فاروقی میں کوئی شخص کسی پہاڑ پر چڑھ گیا اس کی بیوی اور بلندی پر جا بیٹھی بیوی نے کہا یا تو مجھے تین طلاقیں دے دے ورنہ میں اوپر سے پتھر لڑھکا کر تجھے قتل کر دوں گی اس شخص نے عورت کو ہر چند اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا اور اللہ سے ڈرایا لیکن وہ نہ مانی۔ مجبور آس شخص نے تین طلاقیں دے دیں پھر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا آپ نے فرمایا لوٹ کر اپنی بیوی کے پاس چلا جا۔ یہ طلاق نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے بھی اپنے مسلک کی تائید میں چند احادیث نقل کی ہیں جن میں سے ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہیں جن میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی (کا حکم رکھتی) ہے نکاح، طلاق، رجعت، رواہ ابو داؤد و الترمذی و ابن ماجہ و احمد و الحاکم و الدارقطنی۔ ترمذی نے اس کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

ابن جوزیؒ نے کہا اس کی سند میں ایک راوی عطاء بن عجلان ہے جو متروک الحدیث ہے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے، ابن جوزی سے غلطی ہو گئی انہوں نے عطاء کو عطاء بن عجلان سمجھ لیا حالانکہ عطاء بن عجلان نہیں عطاء بن ابی رباح ہے (جو قوی راوی ہے) ابو داؤد کی روایت میں اس کی صراحت آئی ہے اور حاکم نے بھی اس کی صراحت کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک شخص عبد الرحمن بن جبیر آیا ہے اور اس شخص کے متعلق اختلاف ہے نسائی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور دوسرے علماء نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہم اس حدیث کو حسن کہتے ہیں۔

..... ایک شبہ

تصرف شرعی کے لئے صاحب تصرف کا بااختیار ہونا ضروری ہے اگر بطور ہنزل (یعنی مذاق کے طور پر) کوئی طلاق دے دے تو اس کا یہ کلام بھی اپنے اختیار سے ہی ہوتا ہے البتہ وہ کلام کے حکم (یعنی طلاق پر کراہی نہیں ہوتا مگر رضا قلب کو وقوع طلاق میں کوئی دخل نہیں ہے لہذا وہ شخص جس نے اپنے اختیار سے بطور ہنزل طلاق دے دی ہو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی لیکن اگر وہ میں تو متکلم کا اختیار نہیں ہوتا اس سے سرزد ہونے والی طلاق کو ہنزل کی طلاق سے کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

..... ازالہ

ہم کہتے ہیں جس شخص پر جبر کیا گیا وہ بھی تو بااختیار ہوتا ہے اس کا کلام بھی اختیار ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور ہنزل کے طور پر طلاق دینے والے کی طرح وہ بھی حکم کلام (یعنی طلاق) کو پسند نہیں کرتا وہ خوب واقف ہوتا ہے کہ جبر کرنے والے کی مخالفت بھی تکلیف دہ ہے اور وقوع طلاق بھی دکھ دینے والا ہے مگر دونوں میں آسان مصیبت کو وہ جان کر اختیار کرتا ہے لہذا مکرمہ (مجبور) کی طلاق کا واقعہ ہونا ضروری ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے، نفی حکم طلاق میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں جب حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد سے کفار نے قسم لے لی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے دونوں حضرات سے فرمایا ہم کافروں کی طرف سے لئے ہوئے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے بتا دیا کہ قسم اپنی خوشی سے کھائی جائے یا کسی کے جبر سے دونوں برابر ہیں محض لفظ پر جو حکم مرتب ہوتا ہے اس کی نفی میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں (اختیار سے اس لفظ کا صدور ہو یا اکراہ سے دونوں برابر ہیں) بیع کی حالت اس سے جدا ہے بیع کی صحت کا تعلق الفاظ یا قائم مقام الفاظ سے ضرور ہے مگر دل سے رضامندی ضروری ہے اور اکراہ کی صورت میں یہ رضامندی نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں (حضور ﷺ نے فرمایا) ہر طلاق نافذ ہے سوائے پاگل، مغلوب العقل کی طلاق کے۔ ترمذی نے کہا، ہم کو یہ حدیث صرف عکرمہ بن خالد کی وساطت سے بروایت ابو ہریرہؓ معلوم ہوئی ہے عطاء بن عجلان از عکرمہ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے مگر عطاء ضعیف اور منکر الحدیث ہے (اس لئے عطاء کی وساطت سے اس حدیث کی روایت ناقابل اعتبار ہے)

امام شافعیؒ کے قول کی تائید میں صفوان بن اضم کی روایت کردہ حدیث بھی آئی ہے صفوان نے ایک صحابی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا بیوی یکدم اٹھی اور چھری لے کر مرد کے سینہ پر بیٹھ گئی اور چھری اس کے حلق پر رکھ کر بولی مجھے طلاق دے دے ورنہ تجھے ذبح کر دوں گی۔ مرد نے اس کو اللہ کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی، آخر مرد نے اس کو تین طلاقیں دے دیں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا طلاق میں قبول نہیں۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ بخاری نے کہا طلاق مکہ کے بارے میں صفوان بن اضم کی روایت کردہ حدیث منکر ہے اس کو نہیں مانا جائے گا۔

ابن ہمام نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چار مسئلے مبہم ناقابل حل ہیں جن کی کوئی واپسی نہیں نکاح، طلاق، غلاموں کی آزادی اور صدقہ (یعنی ان چاروں میں اکراہ اور جبر سے بھی حکم مرتب ہو جاتا ہے) میں کہتا ہوں، بظاہر امام ابو حنیفہؒ کا استدلال قوی ہے اور اگر احادیث میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو قیاس کی طرف رجوع لازم ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ (مکرہ کی) طلاق، عتاق وغیرہ کا وقوع ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۷﴾

یہ (ایمان کے بعد کفر یا وعید) اسوجہ سے ہے کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دے رکھی ہے اور یہ (سبب بھی ہے) کہ اللہ ان لوگوں کو راہ پر نہیں لاتا۔ جو (اس کے علم میں) کافر ہیں یعنی ایسا راستہ نہیں بتاتا کہ وہ ایمان پر جم جائیں اور نہ ان کو کج روی سے بچاتا ہے۔ اللہ نے اس آیت میں کافروں کے کفر کے دو سبب بیان فرمائے۔ ایک ظاہری دوسرا حقیقی ظاہری سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے خود کفر کو پسند کر رکھا تھا اور آیات الہی میں غور نہیں کرتے تھے اور حقیقی سبب یہ تھا کہ اللہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اعمال جبر اور قدر کے درمیان ہیں (نہ انسان بالکل قادر ہے نہ محض مجبور اور بے اختیار)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَتَبَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمِعَتْ أَبْصَارُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۸﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہ ہی لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں۔

دلوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو حق نہیں جانتے اور کانوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو گوش قبول سے نہیں سنتے اور آنکھوں پر مہر لگنے کی وجہ سے چشم عبرت اندوز سے آیات خداوندی کو نہیں دیکھتے پس یہ بالکل غافل ہیں کہ صانع عالم کی طرف سے غافل ہیں باوجودیکہ جانور اور بے عقل پتھر بھی اپنے بنانے والے سے بے خبر نہیں ہیں۔

لَا جَرَمَ لَهُمْ فِي الْأَخْوَةِ هُمُ الْخَسِرُونَ ﴿۱۹﴾ (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ ہی لوگ گھائے میں رہیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگیاں بالکل بے کار کھو دیں ایسے کاموں میں عمروں کو ضائع کیا جو دوائی عذاب میں ان کو لے جائیں گے اور کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو عذاب سے بچا سکے، اور منزل کامیابی تک پہنچا سکے۔ برخلاف گناہ گار مسلمانوں کے یہ بھی اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ نفسانی خواہشات اور گناہوں میں برباد کرتے ہیں لیکن انہوں نے چونکہ توحید کا دامن پکڑ لیا ہے اس لئے کبھی نہ کبھی عذاب الہی سے ان کو نجات مل جائے گی اور توحید کا عقیدہ ان کو جنت میں لے جائے گا۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فَنَدْنَا لَمْ يَجْهَدُوا وَأَوْصَبُوا إِنْ رَبُّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۰﴾

پھر بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے مبتلائے کفر ہونے کے بعد (ایمان لا کر) ہجرت کی پھر جہاد کیا اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب ان اعمال کے بعد ان کی بڑی مغفرت کرنے والا اور (ان پر) بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

چونکہ مسلمانوں کے اور کفر پر قائم رہنے والوں کے حالات میں بڑا بعد تھا اس لئے لفظ ثم استعمال کیا۔ فُتِنُوا یعنی ان کو اسلام سے روکا گیا اور بڑے بڑے دکھ دیئے گئے ابن سعد نے طبقات کبریٰ میں عمر بن حاکم کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ کو ایسے سخت دکھ دیئے جاتے تھے کہ وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) حضرت صہیبؓ، حضرت ابو فکیہہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عمار بن فہمیرہؓ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کی بھی یہی حالت تھی اور ایسے سخت دکھ ان کو دیئے جاتے تھے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) انہی حضرات کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ابو جہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہؓ، ابو جندل بن سہیل بن عمروؓ، ولید بن ولید بن مغیرہؓ، سلمہ بن ہشامؓ اور عبید اللہ بن اسید ثقفیؓ کے متعلق ہوا مشرکوں نے ان کو سخت اذیتیں دی تھیں، انہوں نے مشرکوں کی ایذا سے بچنے کے لئے کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو مشرک کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چلے گئے۔

پھر انہوں نے جہاد کیا یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر کافروں سے لڑے اور صبر کیا یعنی ایمان طاعت الہی جہاد اور برداشت مصائب پر ثابت قدم رہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روک رکھا۔ (صبر کے بعد اگر علی لفظ آتا ہے تو جم جانے اور ثابت قدم رہنے کا معنی ہوتا ہے اور اگر صبر کے بعد عن آتا ہے تو بچنے، گریز کرنے اور باز رہنے کا معنی ہوتا ہے اور چونکہ آیت میں صبر و العالی ہے نہ عن اس لئے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، اس لئے تفسیر میں ثابت قدم رہنے اور گناہوں سے باز رہنے کے الفاظ سے مراد ہی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ (مترجم)

حسن بصریؒ اور عکرمہ نے کہا اس آیت کا نزول عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق ہوا عبد اللہ رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا پھر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور کافروں سے جا ملا، فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اس کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا عبد اللہ چونکہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا اخیانی بھائی تھا اس لئے اس نے حضرت عثمانؓ سے پناہ کی درخواست کی حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کر دی اور حضور ﷺ نے اس کو پناہ دے دی (اور قتل کا حکم واپس لے لیا) اس کے بعد عبد اللہ پکا مسلمان ہو گیا اور اس کی اسلامی حالت بہت اچھی رہی۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن عامر کی قرأت میں فُتِنُوا آیا ہے، یعنی کافر ہونے اور مسلمانوں کو دکھ پہنچانے کے بعد ایمان لا کر انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا (اس صورت میں) اس آیت کا نزول عامر حضرمی اور ان کے غلام جبر کے متعلق قرار دیا جائے گا جبر مسلمان ہو گئے تھے۔ عامر ان کو طرح طرح کے دکھ دیتے تھے، یہاں تک کہ جبر (بظاہر) مرتد ہو گئے تھے کچھ مدت کے بعد عامر خود مسلمان اور پختہ مسلمان ہو گئے اور جبر کو جن کو زبردستی مرتد بنایا گیا تھا ساتھ لے کر ہجرت کر کے مدینہ میں آگئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہ کر کافروں سے جہاد کیا اور مصائب پر صبر کیا۔

مِنْ أَعْدِهَا یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کے بعد۔ پچھلے گناہوں کو اللہ معاف کرنے والا، اور آئندہ دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کے موافق نعمت و راحت عطا کرنے والا ہے۔

مکرر اِنَّ رَبَّكَ کا ذکر محض لفظی تاکید ہے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهِيَ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۱۱﴾

جس روز ہر شخص اپنی ہی طرف داری میں بات کریگا اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا

جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یَوْمَ کا تعلق رَحِيم سے ہے یعنی اس روز اللہ تم پر مہربان ہوگا جس روز، یا اذکر محذوف سے تعلق ہے یعنی یاد کرو اس دن کو

جس دن.....

تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا یعنی ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہوگی ہر شخص کو اپنے ہی بچاؤ کی فکر اور کوشش ہوگی، دوسرے کا خیال بھی نہ ہوگا۔ کافر کے گائے ہمارے مالک! انہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا، اے ہمارے مالک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہا مانا، ہم اپنے رب کی قسم کھا کر کہتے ہیں جو معبود برحق ہے کہ ہم (خود) مشرک نہیں تھے۔ ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دے ہم نیک عمل کریں گے مؤمن کے گائے رب میں تجھ سے اپنی جان کی امان مانگتا ہوں مجھے کافر لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر دینا۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ قیامت کے دن جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ فرمایا: ساتویں زمین سے لایا جائے گا اس کی ایک ہزار سال کی مسافت پر رہ جائے گی تو ایک سانس کھینچے گی جس کی وجہ سے ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مرسل دوزانو بیٹھ کر عرض کرے گا، اے میرے مالک! میری جان (بچا دے) بغوی نے لکھا ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے کعب احبارؓ سے فرمایا (کچھ آخرت کا تذکرہ کر کے) ہمارے اندر (اللہ کا) خوف پیدا کر دو۔ کعب احبارؓ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! اگر ستر پیغمبروں کے برابر عمل کر کے آپ قیامت کا دن پائیں گے تب بھی قیامت آپ پر بار بار ایسے حالات لائے گی کہ اس وقت آپ کو اپنی جان کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال ہی نہیں رہے گا جہنم ایک ایسا دم کھینچے گی کہ ہر مقرب فرشتہ اور ہر برگزیدہ نبی دوزانو بیٹھ جائے گا یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ بھی کہہ اٹھیں گے میں تجھ سے صرف اپنی جان کی امان مانگتا ہوں اس کی تصدیق اللہ کی بھیجی ہوئی آیت میں موجود ہے ارشاد فرمایا ہے یَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا۔

عکرمہ نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں باہم جھگڑا برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ رُوح اور بدن میں بھی باہم جھگڑا ہوگا، رُوح کہے گی اے میرے رب! نہ میرے ہاتھ تھے جن سے میں پکڑتی نہ میرے پاؤں تھے جن سے میں چلتی نہ میری آنکھ تھی کہ میں دیکھتی (جو کچھ بد اعمالی ہے وہ اس بدن کی ہے) بدن کہے گا تو نے مجھے لکڑی کی طرح (بے حس، بے شعور، بے جان) پیدا کیا تھا میرے ہاتھ نہ تھے کہ میں پکڑتا میرے پاؤں نہ تھے کہ میں ان سے چلتا نہ میری آنکھیں تھیں کہ ان سے دیکھتا۔ جب یہ میرے اندر نور کی شعاع کی طرح آئی تو میری زبان بولنے لگی میری آنکھ بنا ہو گئی اور میرے پاؤں رواں ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: اللہ نے رُوح اور جسم کو اس طرح بنایا ہے جیسے ایک اندھا اور ایک لاپہنج کسی کے باغ میں پہنچ گئے باغ میں درختوں پر پھل لگے ہوئے تھے، اندھا تو پھلوں کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا اور لاپہنج (دیکھتا تو تھا) پھلوں تک پہنچ نہ سکتا تھا آخر اندھے نے لاپہنج کو اپنے اوپر سوار کر لیا اس طرح دونوں نے پھل حاصل کر لئے (اور دونوں چوری کے مجرم قرار پائے) رُوح اور بدن بھی دونوں اسی طرح عذاب میں پکڑے جائیں گے۔

تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا میں نفس سے مراد ذات ہے۔ عین شیء اور ذات شیء کو نفس شیء کہا جاتا ہے اور جو عین اور ذات نہ ہو اس کو غیر کہتے ہیں یعنی ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے دفاع کرے گا۔

لَا يُظْلَمُونَ کا یہ مطلب ہے کہ کسی کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا، کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ
فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ

اور اللہ ایک بستی والوں کی حالت عجیب بیان فرماتا ہے کہ وہ بڑے امن اور اطمینان سے رہتے تھے ان کے کھانے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں۔ پس انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی۔ یعنی اللہ نے ایک بستی کو جس کے اوصاف مندرجہ آیات تھے۔ ہر اس قوم کو مثال کے طور پر بیان فرمایا جس کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا، پھر بجائے شکر کرنے کے وہ مغرور ہو گئے اور کفر کرنے لگے۔ آخر اللہ نے ان کو عذاب میں گرفتار کر دیا۔ قریۃ سے مراد ایک مفروضہ بستی ہے جس کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور ممکن ہے کوئی ایسی بستی گذری ہو جس کا ذکر اللہ نے مکہ کی تشبیہ دینے کے لئے کیا ہے تاکہ اہل مکہ کو ان کے بڑے انجام کا تذکرہ پڑھ کر عبرت حاصل ہو۔ بغوی نے لکھا ہے قریۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ اس تفسیر پر مکہ کا ذکر دوسری بستیوں کو سبق سکھانے کے لئے ہو گا۔

آيَةُ امْنٍ جَلِيں سے، نہ ڈاکوؤں کا خوف نہ کسی کے حملے کا اندیشہ۔
مُطْمَئِنَّةٌ: اپنی جگہ برقرار سکون سے رہنے والے تنگ دستی یا دشمن کے خوف کی وجہ سے ترک سکونت نہ کرنے والے۔
عام عرب آبادی کو ہر وقت دشمنوں کے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور غذائی اشیاء کی بھی کمی تھی اس لئے بہت زیادہ خانہ بدوش رہتے تھے۔ لیکن مکہ والوں کی یہ کیفیت نہ تھی ان کو کھانے پینے کی رسد میں کُلِّ مَكَانٍ ہر طرف اور ہر جگہ سے پہنچتی تھی خشکی کے راستہ سے بھی اور سمندر کے ذریعہ سے بھی۔

فَكَفَرَتْ اس بستی نے یعنی اس کے باشندوں نے ناشکری کی۔
بِأَنْعُمِ اللَّهِ اللہ کی نعمتوں کی انعم بعت کی جمع ہے یا نعم کی جیسے درع کی جمع اورع اور بؤس کی جمع ابؤس آتی ہے۔
فَاذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿۱۱۱﴾ اس پر اللہ نے ان کو ان کے حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔

مزہ چکھانے سے مراد ہے بھوک اور خوف کے ضرر کے اثر کا محسوس کرنا اور لباس سے مراد ہے وہ اثر جو بھوک اور خوف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی لاغری اور رنگ کا تغیر۔
مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ سے مراد ہے کفر اور ناشکری۔

بغوی نے لکھا ہے اہل مکہ سات برس تک کال میں مبتلا رہے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تمام عرب نے مکہ کو کھانے پینے کا سامان بھیجنا بند کر دیا ہر طرف سے رسد کی بندش ہو گئی اور اس قدر فاقوں کی نوبت آگئی کہ لوگوں نے جلی ہوئی ہڈیوں مردار جانور مردہ کتے اور علز یعنی اونٹوں کے اون اور خون کا پکا ہوا مخلوط قوام تک کھالیا فاقوں کی وجہ سے نظر کی یہ حالت ہو گئی کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا اس حالت سے مجبور ہو کر سرداران مکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا دشمنی تو مردوں سے ہے عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے آخر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غلہ کی رسد پہنچانے کی اجازت دے دی اور عرب مکہ کو خوردنی جنس بھیجنے لگے۔ اہل مکہ اس زمانہ میں مشرک تھے۔

میں کہتا ہوں، یہ سورت تو ملی ہے اور مکہ والوں پر جو ہفت سالہ قحط پڑا اور رسول اللہ ﷺ کے فوجی دستوں کے حملہ کرنے کا خوف ہو اوہ ہجرت کے بعد ہوا، لا محالہ ان آیات کو یا تو مدنی تسلیم کیا جائے گا یا قریۃ سے مراد مکہ نہ ہو گا کوئی اور بستی ہو گی جس کا ذکر اللہ نے بطور تمثیل کیا ہے تاکہ اس کی بد انجامی کو سن کر اہل مکہ کو بھی خوف پیدا ہو اور چونکہ اہل مکہ اس ذکر کے بعد بھی

نے سلیم بن عمر کا بیان ہے میں ام المومنین حضرت حصہ کے ساتھ تھا۔ آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کو جا رہی تھیں راستہ میں اطلاع ملی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے آپ فوراً لوٹ پڑیں اور فرمایا تم بھی میرے ساتھ لوٹ آؤ تم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہی بستی ہے جس کا ذکر اللہ نے آیت قَرْيَةٍ كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً میں کیا ہے۔ اِزَالَةُ الْخِطَاءِ۔

عبرت اندوز نہیں ہوئے اس لئے ان کا بھی نتیجہ ہوا جو مذکورہ بستی والوں کا ہوا تھا۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۳﴾

اور ان کے پاس انہیں میں کا ایک رسول (اللہ کی طرف سے) آیا سو اس رسول کو انہوں نے جھوٹا بتایا آخر اللہ کے عذاب نے ان کو آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔

اللہ نے قریہ کے ذکر کے بعد اہل مکہ کے ذکر کی طرف کلام کا رخ پھیر دیا، ”ضمیر اہل مکہ کی طرف راجع ہے اور رسول اللہ ﷺ سے مراد محمد ﷺ ہیں اور عذاب سے مراد ہے سخت کال یا بدر کا واقعہ۔

یہ آیت خود دلالت کر رہی ہے کہ اس کا نزول ہجرت کے بعد ہوا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہم ظالمون کفرت کی ضمیر سے حال ہو اور رسول ﷺ سے وہ پیغمبر مراد ہو جو اہل قریہ کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِنِعْمَتِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لَآيَاكُم تَعْبُدُونَ ﴿۱۴﴾

سو جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال پاک دی ہیں انکو کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو

اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِنِعْمَتِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لَآيَاكُم تَعْبُدُونَ ﴿۱۴﴾

كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِنِعْمَتِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لَآيَاكُم تَعْبُدُونَ ﴿۱۴﴾

اللہ نے کفر پر توبیح کی اور ایک ناشکری قوم کی مثال دے کر ان کا نتیجہ بد اور ان پر عذاب نازل ہونے کا ذکر کیا تاکہ مشرک اعمال جاہلیت سے کنارہ کش ہو جائیں اور باطل مذاہب چھوڑ کر ایمان لے آئیں۔ اس آیت میں اہل ایمان کو خطاب کر کے حلال چیزوں کو کھانے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔

بعض علماء نے کہا جن لوگوں کو سابق آیت میں خطاب کیا تھا انہیں کو اس آیت میں بھی خطاب کیا ہے۔ پہلی آیت جو کفر پر زجر کی تھی اس آیت میں نعمت کا شکر ادا کرنے اور حلال چیزوں کو کھانے کا حکم دیا۔ کفار کا دعویٰ تھا کہ ہم صرف اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں اور بتوں کی پوجا تو صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ سے ہماری شفاعت کریں گے (اس آیت کے آخری جملہ میں تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو اس کی نعمت کا شکر ادا کرو اور جو چیز اس نے حلال اور پاکیزہ قرار دی ہے اس کو کھاؤ اور جس چیز کو کھانے کی اس نے ممانعت کی ہے اس کو نہ کھاؤ)

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلِيَ لِيُغْيِرَ اللَّهُ بِهِ فَمِنْ اضْطَرَّ غَيْرِ بَاغٍ وَلَا عَادٍ

فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵﴾ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ السُّنْتِكُمْ الْكُذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ

الْكُذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۶﴾

تم پر تو صرف مردار کو حرام کیا ہے اور خون کو خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور اس چیز کو جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے نامزد کر دی گئی ہو اس حکم کے بعد اگر کوئی بہت ہی سخت مجبور ہو بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو اور نہ حد (ضرورت) سے آگے بڑھنے والا ہو (اور اس حالت میں ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) تو اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے ان کی نسبت یوں مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت باندھو گے بلاشبہ جو لوگ اللہ پر خود تراشیدہ دروغ بندی کرتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے۔

کفار از خود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام کہتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے مافی بطنون ہذہ الانعام خالصۃ لکونرنا یہ پیٹ کے اندر کے بچے صرف ہمارے مردوں کے لئے حلال ہیں یا بحیرہ اور سائبہ (جیسے بجا روں اور سانڈوں) کو حرام قرار دیتے تھے۔

اللہ نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی تمام درندے، کیڑے مکوڑے حلال کر دیئے ہیں بلکہ یہ حصر اضافی ہے یعنی کافروں نے جن چیزوں کو از خود حرام بنا رکھا ہے وہ خدا کی حرام کردہ نہیں ہیں اللہ نے تو صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ چونکہ حصر اضافی ہے اس لئے صحیح احادیث سے ان چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی جو حرمت ثابت ہے وہ قرآنی عبارت کے خلاف نہیں ہے اس کی پوری تفصیل سورہ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

الْكَذِبُ: لَا تَقُولُوا مَا كَفَرْنَا بِهِ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ۝۱۴

اس کی حلت و حرمت کو اللہ پر مت باندھو اور اس کی تحریم و تحلیل کو اللہ کا حکم مت قرار دو اور صرف اپنی زبانوں سے اشیاء کی حرمت و حلت کا فیصلہ بغیر دلیل کے نہ کرو۔

(دنیا میں ان کے لئے یہ) چند روزہ عیش ہے اور (آخرت میں) دردناک سزا ہے۔ یعنی جس عیش کے لئے یہ افترا بندی کرتے ہیں وہ بہت ہی حقیر اور زوال پذیر ہے۔ عنقریب فنا ہو جائے گا اور اس افترا بندی کی سزا مرنے کے بعد بڑی دردناک ہوگی۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَمْنَا مَا كَصَحَّبْنَا عَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ أَلَمْ نَكْفُرْ بِهِمُ عَنِ الْيَهُودِ وَلَا نَكْفُرُهُمْ إِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝۱۵

اور صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں۔ جن کا بیان ہم آپ سے اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر زیادتی کیا کرتے تھے سوئے انعام میں پہلے اللہ بیان کر چکا تھا وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ أَلَمْ نَكْفُرْ بِهِمُ عَنِ الْيَهُودِ وَلَا نَكْفُرُهُمْ إِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝۱۵ یعنی بعض حلال چیزوں کو یہودیوں کے لئے ہم نے حرام کر کے ان پر زیادتی نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی تھی اس کی سزا میں ان کے لئے بعض حلال چیزیں حرام کر دی گئی تھیں۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی چیز کی حرمت کبھی تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے کرنے میں ضرر اور نہ کرنے میں فائدہ ہوتا ہے اور کبھی محض سزا کے طور پر بھی حلال چیزوں کو حرام کر دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۶

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے نادانی کے سبب گناہ کر لیا ہو پھر اس کے بعد توبہ کر کے اعمال درست کر لئے ہوں بلاشبہ توبہ کے بعد آپ کا رب (ان کو) معاف کر دینے والا بڑا مہربان ہے۔

عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ: یعنی اللہ کو اور اس کے عذاب کو نہ جاننے کی حالت میں اور نتیجہ پر غور نہ کرنے کے سبب محض خواہش نفس کے زیر اثر کوئی گناہ کر لیا ہو۔ لَغَفُورٌ: اس گناہ کو معاف کر دینے والا ہے۔ رَحِيمٌ: بڑا مہربان ہے توبہ کرنے اور اللہ کی طرف رجوع ہو جانے کا ثواب عطا فرمائے گا۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝۱۷ شَاكِرًا لِنِعْمَةِ اللَّهِ وَهُدًى وَهُدًى إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۱۸

بے شک ابراہیم بڑے مقتدا تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ بالکل ایک طرف کے (یعنی اللہ کی طرف کے) ہو رہے تھے شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

لے حضرت ابو النضرہ نے فرمایا، میں نے جب سورہ نحل کی آیت وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنْتُمْ تُكْفَرُونَ كَذِبًا هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ پڑھی ہے اس وقت سے آج تک (کسی چیز کی حرمت و حلت کا) فتویٰ دینے سے ڈرتا ہوں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا آئندہ لوگ (از خود) کہیں گے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس کی ممانعت کی ہے اور اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے یا بعض لوگ کہیں گے اس کو اللہ نے حلال کر دیا ہے اور اس کو حرام کر دیا ہے اور اللہ اس سے فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ اِزَالَةُ الْخُفَاءِ (از مقسّر)

امت کے معانی صاحبِ قاموس نے حسب ذیل بیان کئے ہیں وہ شخص جس میں ہر طرح کی اچھائی اور خوبی ہو۔ وہ شخص جو حق پر ہو اور تمام مذاہب (باطل) کا مخالف ہو، چستی، طاعت، عالم وغیرہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے اندر اتنے فضائل اور محاسن جمع تھے جو متعدد اشخاص میں بھی پائے جائے دشوار ہیں۔ آپ سب لوگوں کے مقتدا تھے، حق پر قائم تھے، تمام باطل مذاہب کے مخالف تھے، (اللہ کی فرماں برداری میں) مجتہد نشاط و طاعت تھے اللہ اور اسکے احکام کو جانتے تھے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ معلم خیر تھے دنیا کے لوگ آپ کی اقتدا (کا دعویٰ) کرتے ہیں۔ اُمّ کا معنی ہے قصد کرنا اُمَّةٌ بروزن فَعَلْتَهُ بمعنی اسم مفعول ہے یعنی مقصودِ کل۔ مجاہد نے کہا تھا آپ ہی مؤمن تھے باقی سب لوگ کافر تھے۔

قَانِتٌ یعنی اللہ کے فرماں بردار احکام خداوندی پر قائم، حَنِيفٌ باطل سے پھر جانے والے، حق کی جانب مڑنے والے، بعض علماء نے حنیف کا ترجمہ کیا، دین اسلام پر قائم رہنے والے، بعض نے ترجمہ کیا ہے مخلص۔ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قریش کا دعویٰ تھا کہ ہم ابراہیمؑ کے دین پر ہیں اللہ نے اس دعویٰ کی تردید کر دی کہ ابراہیمؑ مشرک نہ تھے (اور تم مشرک ہو) صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ سے مراد ہے دین اسلام اور اللہ کی طرف آنے کی دعوت۔

وَأَتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دی تھیں۔

حَسَنَةً سے مراد ہے پیغمبری اور خالص دوستی۔ حضرت مجدد نے فرمایا حسنة سے مراد خلت (خالص دوستی) ہے ہر شخص اپنے خلیل کو ان اسرار سے واقف کرتا ہے جو محبت یا محبوب سے تعلق رکھتے ہیں اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اور اپنی آل کے لئے اسی طرح کی رحمت نازل ہونے کی درخواست کی تھی جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر نازل کی گئی تھی آپ نے دعا کی تھی اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ۔

... علامہ مفسر کی زبانِ قلم سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعریف ...

رسول اللہ ﷺ خالص محبوبیت کے مرتبہ پر فائز تھے۔ خلت کا درجہ خالص محبوبیت کے درجہ سے نیچا ہے مقامِ خلت محبوبیتِ خالصہ کے راستہ میں واقع ہے اس لئے حضور مقامِ خلت پر نہیں ٹھہرے نہ ٹھہرنے کی اجازت تھی لیکن آپ کی خواہش تھی کہ مقامِ خلت میں بھی کچھ استقرار کریں اور استقرار کی اجازت مل نہیں سکی اس لئے اللہ نے حضور ﷺ کے مقبوعین میں سے ایک ہزار سال کے بعد ایک شخص کو مقامِ خلت میں استقرار عطا فرمادیا۔ تابع کا کمال متبوع کے کمال کا جز ہوتا ہے اور جز کل میں داخل ہوتا ہے پس حضرت مجدد کا کمال یعنی مقامِ خلت میں استقرار رسول اللہ ﷺ کے کمالِ محبوبیت کا ہی ایک حصہ تھا اور حضور ﷺ کے اتباع ہی سے حضرت مجدد کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا۔ کسی گورنر، کمانڈر یا شاہی ملازم کا کسی قلعہ کو سر کرنا کسی شہر پر قبضہ کر لینا اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ اس فاتح کا تعلق مرکزِ سلطانی سے ہوتا ہے اور ملازم کی فتح یابی اور قبضہ سلطانِ معظم کی کامیابی اور فتح ہوتی ہے، پس حضرت مجدد کو مقامِ خلت پر فائز کرنا اور استقرار عطا کرنا حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کو ہی مقامِ خلت پر فائز کرنا ہے۔

وَأِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۲﴾
اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے "صالحین" سے مراد ہیں انبیاء معصومین۔ صلاح کی تکمیل بغیر عصمت (یعنی تمام گناہوں سے بچنے کی منجانبِ اللہ توفیق) کے نہیں ہوتی اور عصمت کا تقاضا ہے کہ آخرت میں ہر نیکی کا ثواب بغیر کمی کے پورا پورا ملے اور یہ خصوصیت صرف اہل عصمت ہی کی ہے کہ ہر نیکی کا پورا پورا ثواب حاصل ہو کیونکہ کسی صغیر یا کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے توازنِ اعمال کے وقت نیکیوں کے وزن میں کچھ کمی آ جانے کا احتمال ہے اس لئے اگر رحمتِ خداوندی شامل حال نہ ہو تو غیر معصوم کی نیکی کا ثواب مقابلہ گناہ کے وقت کچھ کم ہو سکتا ہے ہاں اگر کوئی گناہ ہی نہ ہو تو خفتِ حسنات کا کوئی احتمال ہی نہیں ہے گویا یہ آیت جواب ہے اس دعا کا جو حضرت ابراہیمؑ نے

کی تھی اور کہا تھا اَلْحَقِّنِي بِالصَّالِحِينَ -

ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنْ اَتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳﴾

پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلیں جو اللہ ہی کی طرف یکسو ہو گئے تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

یعنی توحید میں نرمی کے ساتھ اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے میں پے در پے دلیلیں پیش کرنے میں ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق مناظرہ کرنے میں، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں، دین ابراہیمی کے اصول و شرائع اختیار کرنے میں ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو۔ یہ تمام چیزیں وہ نعمتیں تھیں جو اللہ نے ابراہیمؑ کو عطا فرمائی تھیں اور حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کیا تھا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ طریق ابراہیمؑ کی پیروی میں یہ تمام امور داخل ہیں۔

..... فائدہ

رسول اللہ ﷺ کو ملت ابراہیمؑ پر چلنے کا حکم دیا کیونکہ حضور ﷺ مرتبہ خلت پر پہنچنے کے بڑے مشتاق تھے اور آپ کو حضرت ابراہیمؑ سے بہت زیادہ محبت تھی آیت قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ اس محبت پر دلالت کر رہی ہے۔

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ یہ جملہ دوبارہ ذکر کرنے سے یہودیوں اور اہل مکہ اور عیسائیوں کی تردید مقصود ہے کیونکہ یہ سب ملت ابراہیمی پر چلنے کے مدعی تھے (مگر ان کے مسلک شرک آمیز تھے)

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۴﴾

ہفتہ (کے دن کی تعظیم و عبادت اور حرمت کا پاس) تو صرف ان لوگوں

پر فرض کیا گیا تھا جنہوں نے اس میں خلاف کیا تھا اور آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

جُعِلَ السَّبْتُ یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم اور دنیا کے تمام مشاغل کی حرمت اور محض عبادت لازم کر دی گئی تھی۔

اخْتَلَفُوا فِيهِ یعنی سنیچر کے معاملہ میں انہوں نے اپنے پیغمبر کی مخالفت کی کلبی کا بیان ہے بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ

نے حکم دیا تھا کہ ہر سات دن میں ایک روز یعنی جمعہ کے دن کوئی کام اور پیشہ نہ کریں صرف عبادت کیا کریں چھ دن اپنے پیشے کیا کریں۔ بنی اسرائیل نے کہا ہم تو (عبادت کے لئے مخصوص) وہ دن چاہتے ہیں جس روز اللہ سارے عالم کی پیدائش سے فارغ ہو گیا تھا یعنی سنیچر کا دن۔ اللہ نے سنیچر کا دن مقرر کر دیا اور سختی کر دی (کہ ان کے پابند رہیں) پھر حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے جمعہ کے دن کو پیش کیا (یعنی جمعہ کا دن عیسائیوں کے لئے مقرر کیا) کہنے لگے، ہم کو تو یہ بات پسند نہیں کہ ہماری عید کے بعد ہی ان (یہودیوں) کی عید ہو جائے۔ غرض عیسائیوں نے (عبادت کے لئے) اتوار کا دن پسند کر لیا آخر اللہ نے جمعہ کا دن اس امت کو دے دیا اور اس امت نے عطاء الہی کو قبول کر لیا اور اللہ نے امت اسلامیہ کو اس دن کی برکات بھی عطا فرمادیں۔

شیخین نے شیخین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہم (دنیا میں) پیچھے ہیں قیامت کے دن آگے ہوں گے باوجود اس کے کہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہم کو ان کے پیچھے پھر یہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا یعنی جمعہ کا دن پر انہوں نے اس کی مخالفت کی لیکن اللہ نے ہم کو اس کی ہدایت کر دی سب لوگ اس روز عبادت میں ہمارے پیچھے ہیں یہودیوں کے لئے کل کا دن ہے (یعنی سنیچر) اور عیسائیوں کے کل کے بعد کا دن (یعنی اتوار)

بغوی کی روایت میں اس حدیث کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ اللہ نے فرمایا، إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ -

مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت حذیفہؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں الفاظ ہیں ہم دنیا والوں سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن اول ہوں گے ہمارا فیصلہ اور لوگوں سے پہلے کر دیا جائے گا۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے سینچر کے دن کی تعظیم اور حرمت صرف ان لوگوں کے لئے لازم کی تھی جنہوں نے اس کے سلسلے میں اختلاف کیا تھا یعنی یہودیوں پر سینچر کی تعظیم لازم کی تھی مگر لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا سینچر کا دن سب سے بڑی عظمت کا دن ہے۔ اللہ تمام چیزوں کو پیدا کر کے جمعہ کے دن فارغ ہو گیا اور سینچر کے دن آرام کیا۔

بعض لوگوں نے کہا تو ان کا دن سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اللہ نے اسی روز مخلوق کو پیدا کرنے کا افتتاح کیا تھا۔ غرض یہ کہ اللہ نے ان کے لئے جمعہ کی تعظیم فرض کی تھی، مگر خدا کے فرض کردہ دن کے علاوہ انہوں نے دوسرے ایام کی تعظیم کو اختیار کیا۔

بعض اہل تفسیر نے آیت مذکورہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ نے سینچر کے دن کو لعنت اور صورت بگاڑ دینے کا سبب بنا دیا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس کے حکم کی مخالفت کی یعنی یہودیوں کے لئے لعنت اور ان کی صورتیں مسخ ہو جانے کا سبب سینچر کا دن ہوا۔ بعض یہودیوں نے سینچر کے دن مچھلی کا شکار حلال بنا لیا تھا اور کچھ دوسرے لوگ اس کو حرام کہتے تھے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمُ بِأَلْحَمَّةٍ وَالنَّوْعِ عِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِ لَهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیں اور (اگر بحث آپڑے تو) ان کے ساتھ اچھی طرح بحث کریں (کہ تک مزاجی اور سخت کلامی نہ ہو) یعنی اے محمد! آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اَلْحَمَّةُ سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن ایک محکم، مضبوط، اٹل کلام ہے جس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی (گویا حَمْمَةٌ بمعنی محکم کے ہے اور اس سے مراد قرآن ہے) اور الْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَةُ سے مراد معارضہ ہے معارضہ ایسی دلیل کو کہتے ہیں جس سے حق واضح ہو جائے اور شبہات دور ہو جائیں۔ اس کا حسن یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ ترہیب اور ترغیب بھی ہو (یعنی نہ ماننے پر سخت عذاب کا ڈر اور ماننے کے بعد بہترین نتیجہ کی بشارت) بعض علماء نے کہا کہ مَوْعِظَةُ حَسَنَةٍ سے مراد ایسا نرم کلام ہے جس میں درشتی اور چڑچڑاپن نہ ہو۔

وَجَادِ لَهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ یعنی بہت اچھے عمدہ طریقہ سے ان سے مناظرہ کرو اور اس طرح بحث کرو کہ اس میں نفس کی تیزی اور شیطانی وسوسہ کو دخل نہ ہو چڑچڑاپن اور غلبہ نفسانی کی خواہش نہ ہو بلکہ محض لوجہ اللہ ہو، اور اللہ کا بول بالا کرنا مقصود ہو۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۷۵﴾

آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ میں گم ہو اور وہی راہِ حق پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ یعنی آپ کا فریضہ تو صرف تبلیغ اور دعوت ہے، حصول ہدایت اور سزا کا علم اللہ کو ہے اس کی ذمہ داری آپ کو نہیں جو کوئی گمراہ ہو یا ہدایت یافتہ سب سے واقف اللہ ہے اور وہی ہر ایک کو جزا و سزا دینے والا ہے حاکم نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی

روایت سے بیان کیا ہے کہ احد کے روز جب لوگ میدان جنگ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کو نہ پایا، ایک شخص نے کہا میں نے فلاں چٹان کے پاس ان کو دیکھا تھا وہ کہہ رہے تھے میں اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا شیر ہوں اے اللہ! میں تیرے سامنے اس بات سے سبزی کا اظہار کرتا ہوں جس کو یہ لوگ (یعنی ابو سفیان وغیرہ) لائے ہیں اور ان لوگوں یعنی مسلمانوں نے جو شکست کھائی ہے ان کی طرف سے میں عذر خواہ ہوں (اس شخص سے اطلاع پا کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کی طرف آئے اور آپ کی لاش کو دیکھ کر رو دیئے اور جب آپ کے کان ناک کٹے اور صورت بگڑی ہوئی پانی تو چیخ پڑے اور فرمایا کیا

کھانے پینے اور مسکن کی کمی۔ ضیق دل کی کھٹن، کبیدگی، غم۔ ابو قتیبہ نے کہا ضیق کھٹن کا مخفف ہے جیسے فتن فتن کا اور کین کین کا اس قول پر ضیق صفت کا صیغہ ہوگا یعنی تنگ امر۔

۱۶
۲۲

اللہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ﴿۱۶﴾

ہے جو (گناہوں سے) بچتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

اتَّقُوا یعنی گناہوں سے پرہیز رکھتے ہیں محسنون یعنی نیک کردار ہیں۔ یا اتَّقُوا سے مراد ہے وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور مُحْسِنُونَ یعنی نیک کردار ہیں یا اتَّقُوا سے مراد ہیں وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں اور مُحْسِنُونَ سے مراد ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں یا اتَّقُوا سے مراد ہیں وہ لوگ جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے سے بچتے ہیں اور مُحْسِنُونَ سے مراد ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو معاف کرتے ہیں۔

اللہ کے ساتھ ہونے سے مراد ہے اللہ کی رفاقت، دوستی مہربانی اور مدد و نصرت کا ساتھ ہونا یا معیت ذاتیہ مراد ہے جو بے کیف ہے اس کی کوئی کیفیت نہ سمجھی جاسکتی ہے نہ بیان کی جاسکتی ہے۔

ابن سعد وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے اسی حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی قسم کا کفارہ دے دیا اور جو ارادہ کیا تھا اس سے باز رہے اور صبر کیا۔ ابن المنذر، طبرانی اور بیہقی نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی طرح حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے حدیث مذکورہ بیان کی ہے اور شان نزول کے سلسلے میں ایسی ہی حدیث سورت کے آغاز میں ہم نے ابن اسحاق، ابن جریر اور عطاء کے حوالہ سے ذکر کر دی ہے۔

عبداللہ بن امام احمد نے زوائد المسند میں اور نسائی اور ابن المنذر اور ابن حبان اور ضیاء اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ نے فرمایا احد کی جنگ میں ۶۳ انصار اور چھ مہاجر کام آئے۔ مہاجرین شہداء میں حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے ان سب کو کافروں نے مثلہ کیا یعنی سب شہیدوں کے ناک کان بھی کاٹ لئے تھے (انصار نے کہا اگر ہم کو کسی روز ایسا موقع ہاتھ لگا تو ہم بھی ان کی حالت قابل رحم بنادیں گے) یعنی ہم بھی مثلہ کر دیں گے کہ جو لاشوں کو دیکھے گا اس کو ان کی ذلیل خستہ حالت دیکھ کر رحم آئے گا) کچھ مدت کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو اللہ نے آیت وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عَوْقَبْتُمْ بِهِ لِإِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ نازل فرمادی۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم بدلہ نہ لیں گے صبر کریں گے۔ چار آدمیوں کے علاوہ باقی سب سے ہاتھ روک لو، کسی کو قتل نہ کرو۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت شہداء احد کے متعلق نازل ہوئی۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مشرکوں نے ہمارے شہدائے کے پیٹ چاک کئے اور بہت ہی برے طریقہ سے لاشوں کے ناک کان کاٹے ہیں ہر شہید کو مثلہ کر دیا گیا ہے صرف حنظلہ بن ابو عامر راہب کو مثلہ نہیں کیا تھا کیونکہ حضرت حنظلہ کا باپ ابو عامر (جس کو رسول اللہ ﷺ نے راہب کے بجائے فاسق فرمایا تھا) اس روز ابوسفیان کے ساتھ تھا اسی وجہ سے حنظلہ کو مثلہ کرنے سے انہوں نے چھوڑ دیا تھا تو کہا اگر اللہ نے ہم کو ان پر غالب کر دیا تو جو حرکت انہوں نے کی ہے ہم اس سے بھی زیادہ کریں گے ایسا مثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی کو نہ کیا ہوگا، اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے پاس کھڑے تھے مشرکوں نے آپ کے کان ناک اور آلات مردانہ کاٹ لئے تھے اور پیٹ چاک کر دیا تھا، ہندہ بنت عتبہ (زوجہ ابوسفیان) نے آپ کے جگر کا ایک ٹکڑا اچھا ڈالا تھا اور اس کو نگل گئی مگر وہ پیٹ میں رک نہ سکا اور اس نے اگل دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا سنو! اگر وہ کھا لیتی تو آگ میں کبھی داخل نہ ہوتی حمزہؓ کو اللہ نے یہ عزت عطا فرمادی ہے کہ ان کا کوئی حصہ دوزخ میں نہیں جائے گا رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کی جو یہ حالت دیکھی تو ایسا منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ اس سے زیادہ دل خراش منظر کبھی نہیں دیکھا تھا فرمایا: ابو السائب: آپ پر اللہ کی رحمت ہو، مجھے معلوم ہے کہ آپ بڑے نیک کردار اور صلہ رحمی کرنے والے تھے اگر آپ کے بعد رہنے

والوں کے رنجیدہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی کہ آپ کو یونہی (بے گور و کفن) چھوڑ دوں تاکہ قیامت کے دن آپ کا حشر متعدد (درندوں اور پرندوں کی) گروہوں کے اندر سے ہو خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے ان پر فتح عنایت کی تو آپ کی جگہ میں ان کے ستر آدمیوں کو ضرور ضرور مثلہ کروں گا، اس پر اللہ نے آیات مذکورہ نازل فرمائیں اور نزول آیات کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ہم (انتقام نہیں لیں گے بلکہ) صبر کریں گے چنانچہ آپ اپنے ارادہ سے باز آگئے اور قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔

فائدہ: حضرت ابی بن کعب کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول فتح مکہ کے وقت ہوا۔ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابن عباسؓ، اور عطاء بن یسارؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُحد کے موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ابن الحصار نے دونوں متضاد روایتوں میں ایک صورت جامعہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان آیات کا نزول اول مکہ میں پھر اُحد میں پھر فتح کے بعد یادداشت کے طور پر ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے فرمایا، اس آیت کا حکم سورہ برأت کے نزول سے پہلے تھا جب کہ حضور ﷺ کو پہلے آغاز قتال سے منع کیا گیا تھا اور لڑنے والوں سے لڑنے کا حکم دیا تھا لیکن اللہ نے اسلام کو غالب کر دیا اور سورہ برأت نازل ہو گئی اور عمومی جہاد کا حکم دے دیا گیا تو یہ آیت منسوخ کر دی گئی۔

مجمعی، ثوری، سدی، مجاہد اور ابن سیرین کے نزدیک یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہوئی جن لوگوں نے ظلم کیا ہو ان کے ظلم کے مطابق انتقام لینے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے یہی اس کی شان نزول ہے ظالم نے جتنا ظلم کیا ہو اس سے زیادہ انتقام لینا جائز نہیں بقدر ظلم بدلہ لیا جاسکتا ہے اور معاف کر دینا بہتر ہے۔

مسئلہ: باتفاق علماء مثلہ کرنا ناجائز ہے ابن اسحاق نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (تقریر فرمانے کے لئے) جس مقام پر بھی کھڑے ہوئے جب تک اسی جگہ صدقہ (خیر خیرات زکوٰۃ) دینے کا حکم نہیں دے دیا اور مثلہ کرنے کی ممانعت نہ کر دی وہاں سے نہ ہٹے۔

مثلہ کرنے کی ممانعت بکثرت احادیث میں آئی ہے۔

سورہ نحل کی تفسیر ۲، رجب ۱۳۰۲ھ کو ختم ہوئی۔ الحمد للہ کہ سورہ نحل کی تفسیر کا ترجمہ ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ کو بعونہ تعالیٰ ختم ہوا

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ

تمت